باسمہٖ تعالیٰ

ہماری بصیرت کے مطابق

طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) ۲۵/بی۔ گلبرگ ۲ لاہور

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات

قرآنی فیصلے

(جلد اوّل)

مضمون	صفحہ
۱۔ نماز	
۱۔ نماز اور صلوٰۃ میں کیا فرق ہے۔	۵
۲۔ نماز کی رکعات، اوقات، ارکان وغیرہ کا تعین کیسے کیا جائے گا۔	۸
(عبادات اور قوانین میں فرق)	۱۱
۳۔ نمازوں کی تعداد کیسے مقرر ہوئی تھی۔	۱۲
بخاری کی روایت	۱۲
۴۔ نظامِ صلوٰۃ اور مؤقت فریضۂ صلوٰۃ میں باہمی تعلق کیا ہے؟	۱۳
۵۔ میں نماز کس طرح پڑھتا ہوں۔	۱۶
۶۔ انفرادی طور پر نماز پڑھنے کا مقصد کیا ہے۔	۱۸
تعلق باللہ سے کیا مراد ہے۔	۲۱
موجودہ حالات میں کیا کیا جائے۔	۲۱
ہمارے موجودہ مذہبی اعمال نے ملی شعائر کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اُن زندہ رکھنا ضروری ہے۔	۲۳

۶ ۔ حلال وحرام

۱۴ - متفرقات

۱۵۔ معاشی نظام

س

ص

ض

نام کتاب ---------- قرآنی فیصلے جلد اول

مصنف ---------- غلام احمد پرویزؒ

ناشر ---------- طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

---------- 25-B گلبرگ II لاہور 54660

---------- فون: 576 4484

ایڈیشن ---------- دوم- اپریل 1987ء

---------- سوم- مارچ 1992ء (بلا ترمیم)

---------- چہارم مئی 1997ء (بلا ترمیم)

طلوع اسلام ٹرسٹ سے حاصل شدہ جملہ آمدن

قرآنی فکر عام کرنے پر صرف ہوتی ہے

پیش لفظ

آپ اپنی زندگی پر غور کیجئے اور سوچئے کہ صبح سے شام تک کتنے معاملات ایسے ہوتے ہیں جن کے متعلق آپ خود سوچ کر کسی فیصلے پر پہنچتے ہیں اور کتنے ایسے جن کے متعلق آپ بلا سوچے سمجھے، وہ کچھ کہہ دیتے ہیں یا کرتے ہیں جو کچھ آپ بچپن سے سنتے یا دیکھتے چلے آتے ہیں۔ مثلاً شبِ برات کا تیوہار آتا ہے اور آپ اُسے بڑی دھوم سے مناتے ہیں۔ لیکن آپ نے کبھی اتنا سوچنے کی بھی زحمت گوارا کی ہے کہ یہ تیوہار کس تقریب کی یاد میں ہے؟ ہم اسے کیوں مناتے ہیں؟ اس کے منانے میں جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ کیوں کیا جاتا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ آپ نے کبھی یہ کچھ سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ آپ بچپن سے دیکھ رہے ہیں کہ ایسا کچھ ہوتا چلا آرہا ہے، وہی کچھ آپ کر دیتے ہیں۔ لیکن زندگی میں کوئی وقت تو ایسا آنا چاہیئے۔ جب آپ ذرا تھم کر سوچیں کہ ہم جو کچھ کہتے یا کرتے چلے آرہے ہیں، اس کی وجہ کیا ہے؟

طلوعِ اسلام کے اجرائے کراچی (۱۹۴۸ء) سے ہم نے قارئین سے کہا کہ روزمرہ کے مسائل پر غور کریں اور جن کی بابت انہیں الجھن پیش آئے، وہ ہم سے پوچھ لیں۔ چنانچہ قارئین کی طرف سے مختلف مسائل کے متعلق استفسارات آنے شروع ہوئے اور ہم نے ان کے جوابات لکھے۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہے۔ ہمارا مسلک یہ ہے کہ زندگی کے مسائل کا حل قرآن کریم سے دریافت کیا جائے۔ اس لئے ہم نے ان استفسارات کے متعلق بھی جو کچھ لکھا وہ اپنی بصیرت کے مطابق قرآن کریم ہی کی روشنی میں لکھا۔ پانچ چھ سال کے عرصے میں ان استفسارات اور ان کے جوابات کا اچھا خاصا ذخیرہ جمع ہوگیا، تو قارئین کی طرف سے تقاضے موصول ہوئے کہ انہیں الگ مجموعہ کی شکل میں شائع کردیا جائے کیونکہ ان میں ایسے ایسے امور کے متعلق قرآن کریم کی تعلیم پیش کی گئی ہے، جن سے آئے دن واسطہ پڑتا رہتا ہے اور عندالضرورت یہ تلاش کرنا مشکل ہوجاتا ہے کہ فلاں سوال کے متعلق طلوعِ اسلام کی کونسی اشاعت میں جواب لکھا گیا تھا۔

اس تقاضا کی معقولیت کے پیشِ نظر "قرآنی فیصلے" کے نام سے ایک مجموعہ شائع کیا گیا۔ جس میں ۱۹۵۳ء تک کے اہم استفسارات اور ان کے جوابات شامل کئے گئے۔ یہ کتاب بڑی مقبول ہوئی۔ چنانچہ ایک عرصہ ہوا کہ اِس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوگیا۔ اِس کے جدید ایڈیشن کے لئے مدت سے تقاضا ہو رہا تھا۔ لیکن اس دوران میں نئے استفسارات موصول اور ان کے جوابات طلوعِ اسلام میں شائع ہوتے رہے۔ چنانچہ اب جو ہم نے اس سلسلہ کو یکجا کیا تو معلوم ہوا کہ یہ ذخیرہ بہت وافر ہوگیا ہے اور اس کی جامعیت کا یہ عالم ہے کہ زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جو اس کے احاطہ سے باہر رہ گیا ہو۔ چنانچہ اس تمام ذخیرے کو از سرِ نو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے۔ اندازہ یہ ہے کہ یہ تین یا کم از کم دو جلدوں میں سما سکے گا۔ چنانچہ اس کی جلد اوّل پیشِ خدمت ہے۔

نام تو اس جلد کا وہی ہے جو ۵۳ء میں تجویز کیا گیا تھا یعنی 'قرآنی فیصلے' لیکن مشمولات کے اعتبار سے یہ ایک بالکل نئی تالیف ہے۔ اس میں پہلے ایڈیشن کے بھی کچھ استفسارات ہیں لیکن بیشتر ایسے ہیں جو اُس ایڈیشن میں شامل نہیں تھے۔ جب یہ پورا مجموعہ مکمل ہو کر آپ کے پاس پہنچ جائے گا تو آپ محسوس کریں گے کہ قرآنی معلومات کی کس قدر بیش بہا متاع ان میں جمع اور محفوظ ہے اور آپ کے لئے یہ معلوم کرنا کس قدر آسان ہوگیا ہے کہ فلاں معاملہ کی اصل وحقیقت کیا ہے اور قرآن کریم کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے۔

۲۔ ہم نے استفسارات کے جواب میں یہ انداز کبھی نہیں رکھا کہ محض قرآن کریم کی متعلقہ آیت نقل کر دی جائے یا اس کا حوالہ دے دیا جائے۔ اس کے برعکس ہم اِس باب میں قرآن کریم کی تعلیم اور اس کا مفہوم اس انداز سے پیش کرتے ہیں کہ بات واضح طور پر سمجھ میں آجائے۔ تجربہ نے بتایا ہے کہ یہ انداز زیادہ مفید ہے

۳۔ ہم نے ان جوابات میں فقہی موشگافیوں یا منطقی (اور مناظرانہ) نکات آفرینیوں کو بھی دخیل نہیں ہونے دیا ہر سوال کا جواب قرآن کریم کی روشنی میں سیدھے سادے الفاظ اور دل نشین پیرایہ میں دینے کی کوشش کی ہے۔ بعض سوالات اور ان کے جوابات ایک سے زیادہ بار آپ کے سامنے آئیں گے۔ اس سے مقصد تکرار نہیں ایسا وہیں کیا گیا ہے جہاں یہ دیکھا گیا کہ مزید جواب میں بات اور واضح ہوگئی ہے۔

۴۔ بعض جوابات میں صیغہ واحد متکلم (مَیں) استعمال ہوا ہے۔ وہ استفسارات پرویز صاحب کو موصول ہوئے اور انہوں نے ہی اس کے جواب دیئے تھے۔ ویسے تو طلوعِ اسلام میں جو کچھ لکھا جاتا ہے وہ بالعموم انہی کی قرآنی فکر سے مستنیر ہوتا ہے۔ لیکن صیغہ واحد متکلم سے قارئین کے دل میں جو سوال پیدا ہو سکتا ہے۔ اُس کے لئے اِس وضاحت کو ضروری سمجھا گیا ہے۔

۵۔ جوابات کے اخیر پر بالعموم سن تحریر کا حوالہ دیا گیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ بعض مقامات پر سن کا اندراج خود جواب کے کسی گوشے کی وضاحت کے لئے ضروری تھا۔ (۵۳ءسے بالعموم مراد یہ ہے کہ یہ سوال کتاب کے پہلے ایڈیشن میں آگیا تھا۔)

۶۔ آخر میں ہم ان جوابات کے سلسلہ میں ایک اہم نکتہ کی وضاحت ضروری سمجھتے ہیں۔ ان میں آپ کو اکثر باتیں ایسی ملیں گی جو ہمارے عام معتقدات اور رسوم کے خلاف ہیں۔ ایسے مواقع پر عام طور پر یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ اعتقادات اور رسوم و اعمال صدیوں سے ہمارے ہاں مروّج چلے آرہے ہیں۔ اگر یہ اسلام کے مطابق نہیں تھے تو اُن کے خلاف کسی نے آواز کیوں نہ اٹھائی اور یہ ہمارے معاشرہ میں اس طرح متوارث کیسے چلے آئے۔ اس قسم کے اعتراضات اکثر (سطحی بیں) طبائع کے لئے پریشانی کا موجب بن جاتے ہیں۔ لیکن اس میں پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ جب کوئی قوم اپنے آپ پر تحقیق کا دروازہ بند کر لیتی ہے۔ تو تقلید اس کے معاشرہ کی عام روش قرار پاجاتی ہے۔ تقلید کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے اُسے اُسی طرح ہوتا رہنے دیا جائے اور قوم اُسی کے مطابق عمل کرتی رہے۔ اور اس کی سند میں صرف اتنا کہہ دیا جائے کہ یہ ہمارے اسلاف کی روش ہے، اور اسلاف کی روش کبھی غلط نہیں ہو سکتی۔ لیکن بادنیٰ تعمق اس دلیل کا بودا پن واضح ہو جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا کوئی غلط بات اس لئے صحیح قرار پا سکتی ہے کہ وہ مدتوں سے اسی طرح متوارث چلی آرہی ہے؟ ظاہر ہے کہ غلط بہر حال غلط ہے، خواہ اس پر صدیوں سے عمل کیوں نہ ہو رہا ہو۔ کسی بات کے صحیح ہونے کے لئے یہ دلیل ہی غلط ہے کہ وہ صدیوں سے اسی طرح چلی آرہی ہے۔ اس سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ پھر غلط اور صحیح کا معیار کیا ہے؟ مسلمانوں کے لئے اس کا جواب نہایت آسان اور واضح ہے اور وہ یہ کہ ہمارے لئے غلط اور صحیح کے پرکھنے کی کسوٹی خدا کی آخری کتاب (قرآن کریم) ہے جو بات اس کے مطابق ہے وہ صحیح ہے۔ جو اس کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔ یہی وہ کسوٹی ہے جس کے مطابق ہم اُن تمام معتقدات اور رسوم کو پرکھتے ہیں۔ جو ہمارے معاشرہ میں مروّج ہیں اور اُسی کے مطابق ہم استفسارات کا جواب دیتے ہیں۔ اس بات کا البتہ ہمیں اعتراف ہے کہ انسانی کوشش بہر حال انسانی کوشش ہوتی ہے، جس میں سہو و خطا کا امکان ہے۔ اس لئے ہم یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ جو کچھ ہم نے لکھا ہے اُس میں کوئی غلطی نہیں۔ ہم نے جو کچھ لکھا ہے اس میں اگر آپ کو کوئی غلطی نظر آئے تو اُس سے ہمیں مطلع فرمائیے۔ لیکن

اس کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ آپ اس کی وضاحت فرمائیں کہ وہ بات کس طرح قرآن کریم کے خلاف ہے ۔
اس کے لئے ہم آپ کے شکر گزار ہوں گے ۔

۷۔ ادارہ طلوعِ اسلام کی شائع کردہ کتابیں مختلف سائزوں میں تھی ۔ یہ فیصلہ کیا گیا ہے کہ تمام کتابوں کو طباعتِ جدید کے وقت ایک ہی سائز میں کر دیا جائے ۔ لہٰذا اس جلد میں سابقہ جلدیں اوّل، دوم اور سوم یکجا کر دی گئیں ہیں اور ان کا سائز بھی بڑا کر دیا گیا ہے ۔

۸ ۔ اس کے بعد جب جلد چہارم اور پنجم کی طباعتِ جدید سامنے آئے گی تو انہیں بھی یکجا کر کے اسی سائز پر چھاپنے کا پروگرام ہے ۔ انشاء اللہ ۔

اُمید ہے قارئین اسے پسند فرمائیں گے ۔

والسلام

انتظامی سربراہ : طلوعِ اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)

لاہور

اپریل ۱۹۸۷ء

یہ نیا ایڈیشن بلاترمیم شائع کیا جا رہا ہے ۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآنی فیصلے

١

نماز

سوال:

ایک صاحب نے مجھ سے حسب ذیل سوالات دریافت کئے ہیں۔

١۔ آپ کہتے ہیں کہ اسلام قوانینِ خداوندی کا نام ہے۔ اس میں نماز کی اہمیت اور مقام کیا ہے؟

٢۔ نماز اور صلوٰۃ میں کیا فرق ہے؟۔ آپ نے کہیں اس کی صراحت کی ہے کہ صلوٰۃ سے مراد نماز ہے؟

٣۔ کیا آپ نماز کی موجودہ شکل کے علاوہ کوئی اور شکل تجویز کرتے ہیں؟

جواب:

اسلام نام ہے زندگی کے ہر شعبے میں احکامِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے کا۔ اُن کی پوری پوری اطاعت کرنے کا، نماز اس طرح سرِ تسلیم خم کرنے کا عملی اعتراف اور محسوس مظاہرہ ہے۔ خدا کے سامنے سر جُھکا دینے

اسلام سے مفہوم

(سجدہ ریز ہو جانے) سے انسان اس امر کا اقرار (یا اظہار) کرتا ہے کہ وہ اپنے ہر ارادے فیصلے اور عمل میں اُس کے احکام کی اطاعت کرے گا جس کا دل، جذباتِ فرماں پذیری اور اطاعت گذاری سے لبریز ہو، اس کا سر خود بخود خدا کے حضور جُھک جائے گا اور جو خدا کے حضور سر جھکانے میں عار یا سُبکی محسوس کرتا ہے وُہ اس کی اطاعت کیا کرے گا؟ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی واضح ہے کہ جو شخص زندگی کے مختلف شعبوں میں قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتا ہے، اُس کا نماز میں رسمی طور پر سر جُھکا دینا، مقصدِ صلوٰۃ کو پُورا نہیں کر سکتا۔

۳۔ نمازؔ، فارسی (بلکہ پہلوی) زبان کا لفظ ہے جو اہلِ ایران کے قدیم طریق پرستش کے لئے استعمال ہوتا تھا بعد میں یہ لفظ اجتماعات صلوٰۃ کے لئے استعمال کر لیا گیا اور اب ہمارے ہاں یہی لفظ مروّج ہے۔ (میں سمجھتا ہوں کہ جو اصطلاحات قرآن کریم نے مقرر کی ہیں۔ انہیں اسی طرح استعمال کرنا زیادہ اچھا ہے) قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ آیا ہے جو معنوی اعتبار سے بڑا وسیع اور جامع ہے۔ اس کے بُنیادی معنی کسی کا اتباع یا اطاعت و محکومیت اختیار کرنا ہیں۔ قرآن کریم نے اس لفظ کو نماز کے اجتماعات کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ لہٰذا جب ہم نماز کا لفظ بولیں گے تو اس کا مطلب صرف نماز ہوگا۔ لیکن جب صلوٰۃ کا لفظ استعمال کریں گے تو اس میں نماز بھی آجائے گی اور اس کے علاوہ اور مفہوم بھی۔ میں نے اکثر مقامات پر اس کی صراحت کر دی ہے کہ صلوٰۃ کا لفظ نماز کے اجتماعات کے لئے بھی قرآن کریم میں آیا ہے۔ مثلاً لغات القرآن میں لفظ صلوٰۃ (مادہ ص۔ ل۔ و) کے تحت آپ کو یہ عبارت ملے گی۔

نماز کا لفظ

صلوٰۃ کے مختلف مفاہیم اوپر بیان ہوئے ان سے ظاہر ہے کہ ایک عبد مومن زندگی کے جس گوشے میں بھی قوانینِ خداوندی کے مطابق اپنے فرائضِ منصبی ادا کرتا ہے وُہ فریضۂ صلوٰۃ ہی کو ادا کر رہا ہوتا ہے۔ اس کے لئے وقت، مقام، یا شکل کا تعین ضروری نہیں۔ لیکن قرآن کریم میں بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں صلوٰۃ کا لفظ ایک خاص قسم کے عمل کے لئے استعمال کیا گیا ہے۔

صلوٰۃ

اس کے بعد قرآن کریم کی وہ آیات دی گئی ہیں۔ جن میں صلوٰۃ کا لفظ نماز کے لئے آیا ہے۔ اس کے بعد لکھا ہے:

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ قرآن کریم میں صلوٰۃ کا لفظ ان اجتماعات کے لئے بھی آیا ہے جنہیں عام طور پر نماز کے اجتماعات کہا جاتا ہے۔

(نماز کا لفظ عربی زبان کا نہیں۔ پہلوی زبان کا ہے۔)

اس کے بعد ارکانِ صلوٰۃ کی اہمیت کے سلسلے میں لکھا ہے:

انسان اپنے جذبات کا اظہار جسم کے اعضا کی محسوس حرکات سے بھی کرتا ہے اور یہ چیز اُس میں ایسی راسخ ہو چکی ہے کہ اس سے یہ حرکات خودبخود سرزد ہوتی رہتی ہیں۔ غم و غصہ، خوشی، تعجب

عزم و ارادہ، ہاں اور نہ، وغیرہ قسم کے جذبات اور فیصلوں کا اظہار انسان کی طبعی حرکات سے بلاساختہ ہوتا رہتا ہے۔ یہی کیفیت جذبات عزم و احترام اور اطاعت و انقیاد کے اظہار کی ہے۔ تعظیم کے لئے انسان کا سر بلا اختیار نیچے جھک جاتا ہے۔ اطاعت کے لئے "سرِ تسلیم" خم ہو جاتا ہے۔ اگرچہ قرآن کریم عمل کی روح اور حقیقت پر نگاہ رکھتا ہے۔ اور محض ــــــــ (FORMALISM) کو کوئی وزن نہیں دیتا۔ لیکن جہاں کسی جذبہ کی روح اور حقیقت کے

ارکان صلوٰۃ

اظہار کے لئے (FORM) کی ضرورت ہو، اس سے روکتا بھی نہیں۔ بشرطیکہ اس (FORM) ہی کو مقصود بالذات نہ سمجھ لیا جائے۔ صلوٰۃ کے سلسلہ میں قیام و سجدہ وغیرہ کی جو عملی شکل ہمارے سامنے آتی ہے۔ وہ اسی مقصد کے لئے ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ جب ان جذبات کا اظہار اجتماعی شکل میں ہو تو اظہار جذبات کی محسوس حرکات میں ہم آہنگی کا ہونا نہایت ضروری ہوتا ہے، ورنہ اجتماع میں انتشار ابھرتا دکھائی دے گا۔ احترام و عظمت انقیاد و اطاعت اور فرماں پذیری و خود سپردگی کے والہانہ جذبات کے اظہار میں نظم و ضبط کا ملحوظ رکھنا بجائے خویش بہت بڑی تربیتِ نفس ہے۔

مفہوم القرآن میں قرآنی اصطلاحات کے ضمن میں لکھا گیا ہے:۔

قرآن کریم کی ایک خاص اصطلاح "اقامتِ صلوٰۃ" ہے جس کے عام معانی نماز قائم کرنا یا نماز پڑھنا لئے جاتے ہیں۔ لفظ صلوٰۃ کا مادہ (ص۔ ل۔ و) ہے۔ جس کے بنیادی معنی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں، اس لئے صلوٰۃ میں قوانین خداوندی کے اتباع کا مفہوم شامل ہوگا۔ بنابریں اقامتِ صلوٰۃ سے مفہوم ہوگا۔ ایسے نظام یا معاشرہ کا قیام جس میں قوانینِ خداوندی کا اتباع کیا جائے یہ اس اصطلاح کا وسیع اور جامع مفہوم ہے۔ نماز کے اجتماعات میں قوانینِ خداوندی کے اتباع کا تصور، محسوس اور سمٹی ہوئی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ اس لئے قرآن کریم نے اس اصطلاح کو ان اجتماعات کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ قرآنی آیات پر تھوڑا سا تدبر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ کس مقام پر اقامتِ صلوٰۃ سے مراد اجتماعاتِ نماز ہیں اور کس مقام پر قرآنی نظام یا معاشرہ کا قیام۔ مفہوم القرآن میں یہ معانی اپنے اپنے مقام پر واضح کر دیئے گئے ہیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ میں نے صلوٰۃ کے معنی نماز اور اقامتِ صلوٰۃ کے معنی اجتماعاتِ صلوٰۃ کا قیام

واضح الفاظ میں دیئے ہیں اور اس سے مراد وہی نماز ہے جسے ہم پڑھتے ہیں۔

۳۔ ایک مقام پر نہیں، متعدد مقامات پر اور ایک مرتبہ نہیں، متعدد بار اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کیا جا چکا ہے کہ اُمت کے مختلف فرقے جس جس طریق سے نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ ان میں کسی قسم کے ردّ و بدل کرنے کا حق کسی کو حاصل نہیں۔ اسی وجہ سے میں فرقہ اہلِ قرآن سے بھی اختلاف رکھتا ہوں جنہوں نے اپنے لئے الگ نماز تجویز کر رکھی ہے۔ البتہ میں یہ ضرور کہتا ہوں کہ اگر مسلمانوں میں پھر سے خلافت علیٰ منہاج نبوت کا قیام ہو جائے اور وہ تمام اُمت کے لئے نماز کی ایک ہی شکل تجویز کر دے تو یہ اُمت میں وحدت پیدا کرنے کے لئے بڑا مؤثر اقدام ہوگا۔ یہ تو ہمیں تسلیم کرنا پڑے گا کہ عہدِ رسالت مآب اور خلافتِ راشدہ میں امت ایک ہی طریق پر نماز ادا کرتی ہوگی۔ اس وقت اُمت میں وحدت تھی۔ اِس لئے جب ہم پھر سے اسی عہد سعادت مہد کی طرف رُخ کریں گے تو اُمت میں وحدت پیدا کرنے کی کوشش بھی ضرور کرنی ہوگی اور نماز اس کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ اب اُمت میں وحدت پیدا ہونے کا امکان ہی نہیں، تو میں اس سے بحث نہیں کرتا۔ (نومبر ۱۹۶۱ء)

ردّ و بدل

پچھلے کسی پرچہ میں زکوٰۃ کے متعلق آپ نے فرمایا تھا کہ قرآن نے چونکہ اس کے نصاب کی مقدار متعین نہیں کی تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر زمانہ میں وہ حکومت جو قرآنی اصولوں کے مطابق اور اسلامی سیرت کے حامل حکمرانوں سے بنے گی وہ اپنا نصاب مقرر کرنے میں آزاد ہوگی جس چیز کی حد قرآن مجید نے مقرر نہیں کی، اس پر صرف اس لئے مصر ہونا کہ آں حضرت (صلعم) کے زمانے سے لے کر آج تک تمام مسلمانوں کی حکومتوں میں ایسا ہی دستور رہا ہے۔ یا فقیہوں نے ایسا ہی فیصلہ صادر کیا ہے ــــ آپ کے نزدیک غلط ہے۔

دُوسرا سوال

لیکن اِس کے ساتھ دوسرا سوال پیدا ہوتا ہے۔

(ا)۔ قرآن مجید میں نماز کی تاکید موجود ہے۔ لیکن اس کے اوقات، تعداد، ارکان اور ادائیگی کی تفصیل موجود نہیں۔ جماعت اہلِ قرآن نے اسی بنا پر کوشش کی کہ نماز پنجگانہ کا جواز قرآن سے نکالا جائے۔ ان کے دلائل کی کمزوری کی ایک صریح علامت یہ ہے کہ ان میں ہی کا ایک گروہ صرف تین نمازوں کا قائل ہو سکا۔

(ب)۔ رکعات نماز کا بھی یہی معاملہ ہے۔

(ج)۔ نماز کے ارکان اور اس کی ادائیگی کی تفصیل بھی بڑا وقت طلب معاملہ ہے۔ اگر حدیث صرف تاریخ دین ہے،

اور دین نہیں جو قابلِ پیروی یا اطاعت ہو تو رکوع و سجود کی ترتیب بدلی جا سکتی ہے، سجدہ ایک بھی کافی ہو سکتا ہے رکعتوں کا تعین بھی انفرادی یا مجموعی فیصلے پر ہر زمانے میں بدلا جا سکتا ہے۔ سورۂ فاتحہ کے علاوہ جو کچھ بھی نماز میں پڑھا جاتا ہے، اس کی جگہ جو چیز قرآن سے مناسب سمجھی جائے، تلاوت کی جا سکتی ہے۔

چنانچہ اہلِ قرآن کے ایک گروہ نے موجودہ طریقۂ نماز کو بدل کر مولوی عبداللہ مرحوم کے قائم کردہ طریقہ کو ترجیح دی ہے۔

(اہلِ قرآن کا ذکر بار بار کرنے سے میرا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ آپ کا مسلک اُن کا سا ہے۔ کیونکہ مجھے یاد ہے کہ آپ نے اپنی کتابوں میں اس مسلک سے علیحدگی کا اظہار کیا ہے مفہوم صرف یہ ہے کہ صرف قرآن مجید تک محدود رہنے سے یہ حالت پیدا ہو سکتی ہے۔)

کافی عرصہ ہُوا کہ میں نے آپ کا پمفلٹ شخصیت پرستی پڑھا تھا۔ اب اُن شکوک کو لکھتے ہوئے میں نے وہ رسالہ تلاش کیا۔ لیکن معلوم ہوتا ہے کہ وہ کہیں گم ہو گیا ہے۔ اِس لئے میں حافظہ کی مدد سے لکھ رہا ہُوں۔

اِس رسالہ میں آپ نے کہا تھا کہ نماز کا معاملہ تواتر سے حل ہو سکتا ہے۔ چونکہ ساڑھے تیرہ سو سال سے نماز اسی نہج پر پڑھی جاتی رہی ہے۔ اس لئے آج بھی ہمیں اسی طرح پڑھنی چاہیئے۔

اگر نماز کے معاملہ میں تواتر کی دلیل صحیح ہے تو زکوٰۃ میں کیوں نہ ہو؟ براہِ مہربانی اس تضاد کو رفع کرنے میں مدد دیجئے۔

جواب

میں نے اپنے مضمون میں جو کچھ لکھا تھا۔ وہ یہ ہے کہ قرآن کریم نے جن قوانین کا صرف اصولی ذکر فرمایا ہے اور ان کی جزئیات کو متعین نہیں کیا۔ ان جزئیات میں زمانہ کے بدلنے والے تقاضوں کے ماتحت ردّ و بدل ہو سکتا ہے لیکن اس تغیّر و تبدل کا مجاز کوئی فرد یا افراد کی جماعت نہیں ہو سکتی۔ بلکہ یہ حق صرف جانشینانِ رسولؐ اللہ کو حاصل ہے اور جانشینِ رسولؐ اللہ سے مراد ہے وہ حکومت جو قرآن کا حکم چلانے کے لئے قرآنی اصولوں کے مطابق عمل میں آئی ہو۔

جزئیات میں تبدیلی سب سے اوّل تو یہ دیکھئے کہ اس میں بحث قوانین سے ہے، عبادات سے نہیں۔ کسی قانون کی جزئیات میں زمانہ کے بدلتے ہوئے تقاضوں

کے ماتحت ردّ وبدل کی ضرورت بالکل واضح ہے۔ لیکن عبادات میں یہ ضرورت بالکل شاذ ہے۔ مثلاً نماز، اور زکوٰۃ کو لیجئے۔ زکوٰۃ (یعنی حکومت کے ٹیکس) کی شرح میں تغیّر و تبدّل کی ضرورت ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لئے کسی دلیل کی ضرورت نظر نہیں آتی۔ اس کے برعکس نماز کو لیجئے تو زمانے کے تقاضے (ذاتی رجحانات نہیں بلکہ زمانے کے تقاضے) اس کی جزئیات پر کہاں اثر انداز ہوں گے۔ وہ کون سی ضرورت ہوگی جو اس کی مقتضی ہو کہ رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّیَ الْعَظِیْمِ کی جگہ سُبْحَانَ اللّٰہِ تَعَالٰی عَمَّا یَصِفُوْنَ۔ کہا جائے۔ یا سجدہ دو کی بجائے ایک ہی ہو۔

اختلافات

لیکن بایں ہمہ یہ حقیقت بھی ہمارے سامنے ہے کہ نماز کی موجودہ جزئیات میں بھی مسلمانوں کی مختلف جماعتوں میں اختلافات موجود ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ قرآن کے مطابق اسلامی حکومت کا سب سے پہلا فریضہ یہ ہونا چاہیئے کہ وہ ان اختلافات کو بتدریج مٹاتی چلی جائے جو مسلمانوں میں فرقہ بندی اور گروہ سازی کی دیواریں بن کر کھڑے ہیں۔ اگر رسولؐ اللہ کے بعد آپ کی جانشینی کا سلسلہ قائم رہتا تو یہ فرقے وجود ہی میں نہ آتے۔ کیونکہ رسولؐ اللہ نے ملّتِ واحدہ کو چھوڑا تھا۔ فرقوں اور گروہوں میں بٹی ہوئی قوم نہیں چھوڑی تھی۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اگر قرآنی حکومت نماز کی ایک متفقہ علیہ شکل متعین کرے گی تو اس میں موجودہ اختلافی جزئیات میں ردّ و بدل ناگزیر ہوگا۔ لیکن بایں ہمہ جو شکل اس حکومتِ قرآنی کی طرف سے متعین ہوگی وہ شرعی نماز ہوگی۔

تواتر

لیکن جس حالت میں ہمارے ہاں قرآنی حکومت نہ ہو، تو اس میں تشتّت و انتشار کو روکنے یا کم کرنے کے لئے یہی صورت ہو سکتی ہے کہ بجائے اس کے کہ ہر فرد اور ہر جماعت اپنی اپنی مرضی کے مطابق طریقے وضع کرتی جائے۔ جس حد تک ہم مطمئن ہو سکیں کہ فلاں عمل عہد رَسُوْلَ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ سے ہم تک علی التواتر چلا آرہا ہے، اسے علیٰ حالہٖ قائم رکھا جائے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے ماتحت میں ہندوستان میں (اور یہاں بھی جب تک قرآنی حکومت کا قیام نہ ہو) مسلمانوں کے لئے یہی راہ سلامتی کی سمجھتا تھا اور سمجھتا ہوں کہ جو اعمال ملّت میں تواتر سے چلے آرہے ہیں۔ انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے۔ بشرطیکہ وہ قرآن کے کسی واضح حکم سے ٹکرا نہ رہے ہوں۔ اس سے قوم مزید انتشار و خلفشار سے بچ سکتی ہے۔

اہلِ قرآن کی بنیادی غلطی میرے نزدیک یہ ہے کہ وہ ان احکام کی جزئیات بھی قرآن سے متعین کرنے

اہلِ قرآن کی غلطی

لگ گئے جن کا صرف اصولی حکم قرآن نے دیا ہے۔ اس کا نتیجہ سوائے قیاس آرائیوں کے اور کیا ہو سکتا تھا۔ پھر جن قیاسات پر یہ لوگ اس طرح سے پہنچے۔ وہ قوم کے لئے فیصلہ کی حیثیت تو نہیں رکھ سکتے تھے۔ یہ حق جیسا کہ میں نے بارہا کہا ہے، صرف حکومت قرآنی کو حاصل ہے میں دینی لامرکزیت کے دور میں اعمال متواترہ کو ایسے انفرادی قیاسات سے انسب سمجھتا ہوں۔

میں یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے قوانین اور عبادات میں جو اوپر فرق بیان کیا ہے تو وہ محض اس بات کو سمجھانے کے لئے کیا ہے کہ مؤخر الذکر میں زمانہ کے تغیرات سے ردّو بدل کی ضرورت شاذ ہی

عبادات اور قوانین

ہوتی ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قوانین کا تعلق ہماری دنیاوی زندگی سے ہے اور عبادات کا تعلق آخرت سے یا قوانین مادی دُنیا سے تعلق ہیں اور عبادات روحانی سے۔ اسلام میں دُنیا اور آخرت اور مادہ اور رُوح میں کوئی امتیازی خطوط نہیں۔ اِس کے قوانین، اور اس کے تمام اعمال اس کی عبادات ہیں۔ ہر قرآنی قانون کی اطاعت عبادت ہے اور ہر عبادت زندگی کے لئے خود ایک قانون کا درجہ لئے ہوئے ہے۔ اس نہج سے آپ سمجھنا چاہیں تو جس اصول کا میں نے اپنے مضمون میں ذکر کیا ہے۔ قانون اور عبادات دونوں پر منطبق ہو گا۔ یعنی اگر جانشین رسولؐ اللہ (یعنی قرآنی حکومت) نماز کی کسی جزئی شکل میں جس کا تعین قرآن نے نہیں کیا اپنے زمانے کے کسی تقاضے کے ماتحت کچھ ردّو بدل ناگزیر سمجھے۔ تو وہ ایسا کرنے کی اصولاً مجاز ہو گی۔

ہماری دشواری یہ ہے کہ جب ہم اس مسئلہ پر غور کرتے ہیں تو ردّو بدل کا تصور کرتے وقت ہماری موجودہ حکومتوں کے ارباب حل و عقد ہماری نگاہوں کے سامنے آجاتے ہیں اور اس تصور سے ہماری رُوح کانپ اٹھتی ہے کہ ان لوگوں کو یہ حق کیسے دے دیا جائے کہ یہ ان احکام میں تغیر و تبدل کر دیں جو رسولؐ اللہ نے متعین فرمائے تھے۔ ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ حق صرف رسولؐ اللہ کے جانشینوں کو پہنچتا ہے اور کسی کو نہیں، اور جانشینِ رسولؐ اللہ جب رسولؐ اللہ کے کسی حکم میں تبدیلی کا خیال کریں گے، تو ظاہر ہے کہ وہ اُسی وقت ایسا کریں گے جب وہ دل کے پورے اطمینان اور یقین کے ساتھ اس نتیجہ پر پہنچیں کہ . . . . . اگر اس وقت رسولؐ اللہ موجود ہوتے تو وہ خود اپنے اس حکم میں ایسی تبدیلی فرما دیتے۔ یہ تمام الجھاؤ اس فرق کو ملحوظ نہ رکھنے سے پیدا ہوتا ہے

(۱۹۵۳ء)

سوال ؛ نمازوں کی تعداد

یہاں ایک مولوی صاحب ہیں۔ ان سے ذکر آیا کہ وحی صرف قرآن شریف ہے اور کوئی وحی نہیں۔ تو انہوں نے فرمایا کہ اگر تم وحی خفی (یعنی غیر متلو) کے منکر ہو تو بتاؤ کہ پانچ وقت کی نمازوں کا ذکر قرآن کریم میں کہاں ہے۔ اُن کا ارشاد ہے کہ یہ وقت رسُول اللہ نے وحی خفی کی بنا پر مقرر فرمائے تھے۔

جواب :

یہ تو ہم کبھی پھر عرض کریں گے کہ نماز کے متعلق قرآن کریم میں کیا کچھ ہے۔ سردست آپ اتنا دیکھئے کہ اس وحی خفی (غیر متلو) کی کیفیت کیا ہے جس کی رُو سے پانچ وقتوں کی نماز فرض ہوئی تھی۔ بخاری شریف میں ہے کہ نمازیں شبِ معراج میں فرض ہوئی تھیں۔ اس کی تفصیل خود بخاری کے الفاظ میں ملاحظہ فرمایئے۔

نمازیں کیسے فرض ہوئیں

انس بن مالک کا قول ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے میری اُمت پر پچاس وقت کی نمازیں فرض کی تھیں لیکن جب میں (واپس ہوکر) موسیٰؑ کی طرف سے گزرا تو انہوں نے دریافت کیا کہ خدا تعالےٰ نے آپ کی اُمت پر کیا فرض کیا ہے؟ میں نے کہا کہ پچاس وقت کی نمازیں۔ وُہ کہنے لگے۔ اپنے پروردگار کے پاس واپس جاؤ۔ کیونکہ تمہاری اُمت میں اس کی طاقت نہ ہوگی۔ مَیں نے جاکر اپنے رَبّ سے کمی کرائی تو خدا تعالےٰ نے آدھی ساقط کر دیں۔ جب میں موسیٰؑ کے پاس آیا تو ان سے کہا کہ آدھی ساقط کر دی گئیں تو انہوں نے کہا کہ دوبارہ اپنے رب کے پاس جاؤ۔ تمہاری اُمت میں اس کی بھی طاقت نہ ہوگی۔ مَیں نے خدا سے اور کمی کرائی۔ خدا تعالےٰ نے فرمایا کہ پانچ وقت کی نمازیں فرض رہیں اور وہ ثواب میں پچاس کے برابر ہیں۔ میرے ہاں حکم میں تغیر نہیں ہوتا۔ اس کے بعد جب میں موسیٰؑ کی طرف لوٹا تو انہوں نے کہا کہ اب کے پھر اپنے رب کے پاس جاؤ۔ میں نے کہا اب مجھے اپنے رب سے شرم آتی ہے۔ (بخاری۔ کتاب الصلوٰۃ)

غور فرمایا آپ نے کہ پانچ نمازیں کس طرح فرض ہوئیں؛ اللہ میاں حکم دینے والے اور حضور نبی اکرمؐ اس حکم کو امت کی طرف لانے والے۔ خدا نے پچاس نمازوں کا حکم دے دیا اور رسولؐ اللہ اس حکم کو لے کر چلے آئے۔ نہ خدا کو (معاذ اللہ) اس کا احساس ہوا کہ میں کیسا ناممکن العمل حکم دے رہا ہوں، نہ رسولِ اکرمؐ کو اس کا خیال گزرا کہ میری اُمت اس بوجھ کو کیسے اٹھائے گی۔ اگر اس کا احساس ہوا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو۔ اُن کے

کہنے پر رسولؐ اللہ کو بھی خیال ہوا کہ واقعی بات ٹھیک ہے۔ چنانچہ آپ واپس تشریف لے گئے تو اللہ تعالیٰ کو بھی اس کا احساس ہوا کہ حکم میں واقعی زیادتی تھی۔ چنانچہ ایک دو بھی نہیں، اکٹھی آدھی نمازیں ساقط ہوگئیں۔ اللہ نے سمجھ لیا کہ اب حکم مناسب ہے اور رسولؐ اللہ بھی مطمئن ہو گئے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے پھر کہا کہ اب بھی زیادہ ہیں۔ یہ سُن کر رسولؐ اللہ پھر اللہ میاں کے پاس تشریف لے گئے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کو پھر اپنے حکم کی زیادتی کا احساس ہُوا تو پچیس سے پانچ رہ گئیں۔ چنانچہ حضورؐ پھر مُطمئن ہو کر واپس تشریف لے آئے۔ لیکن حضرت موسیٰؑ نے پھر فرمایا کہ اب بھی زیادہ ہیں۔ اس پر رسولؐ اللہ نے یہ نہیں فرمایا کہ نہیں میں سمجھتا ہوں کہ اب حکم ٹھیک ہے، بلکہ فرمایا یہ کہ (آپ کہتے تو ٹھیک ہیں لیکن میں کیا کروں) مجھے بار بار جاتے شرم آتی ہے۔ اس لئے اب جو ہو گیا سو ہو گیا۔

غور فرمایا آپ نے کہ دین کے محکم احکام کس طرح متعین ہوتے تھے؟ ہم صرف اتنا عرض کریں گے کہ آپ کسی وقت ٹھنڈے دل سے سوچیئے کہ اس قسم کی باتیں جب غیر مسلموں کے سامنے آتی ہوں گی تو وہ ہمارے خدا اور خدا کے رسول (علیہ التحیۃ والسلام) کے متعلق کیا کچھ نہ کہتے ہوں گے۔ اس روایت سے صاف نظر آتا ہے کہ یہ کسی یہودی نے گھڑی ہے تاکہ اس سے حضرت موسیٰؑ کی فضیلت ثابت ہو جائے اور مسلمانوں کو یہ بتا دیا جائے کہ (معاذ اللہ) یہ ہے ہمارے پیغمبر کے سامنے تمہارے رسول کی حیثیت۔ لیکن اس یہودی کا کیا گلہ! اُس کا تو یہ کام ہی تھا۔ مسلمانوں سے پوچھیے جو ان چیزوں کو ہزار برس سے اپنے سینے سے لگائے پھر رہے ہیں اور جب کوئی ان کی طرف اس طرح توجہ دلاتا ہے تو اس پر بُری طرح برس پڑتے ہیں۔

لیکن اب یہ چیزیں زیادہ عرصہ نہیں رہ سکتیں۔ اگر مسلمانوں نے انہیں اسی طرح اپنے ساتھ چمٹائے رکھا تو یہ چکی کے پاٹ کی طرح انہیں بھی اپنے ساتھ لے ڈوبیں گے اور اس کے بعد وہ قوم آئے گی جو قرآن کی مشعلِ ہدایت کی روشنی میں تمام انسانیت کو صراطِ مستقیم پر لے جائے گی۔

بہر حال یہ ہے نمونہ اس "وحی خفی" کا جس کی رُو سے ہمارے مولوی صاحبان کے مطابق وہ احکام متعین ہوا کرتے تھے جن کا ذکر انہیں وحی جلی (قرآن کریم) میں نہیں ملتا۔ (۱۹۵۳ء)

(س): **نظامِ صلوٰۃ اور نماز** | آپ نے نظامِ صلوٰۃ کے متعلق جستہ جستہ جو کچھ آج تک لکھا ہے اُس کا بنظرِ مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ نے دین کے ایک اہم اور بنیادی گوشے

پر نہایت عمدگی سے روشنی ڈالی ہے۔ لیکن ایک بات ہنوز وضاحت طلب ہے اور وہ یہ کہ اس نظام صلوٰۃ میں اس صلوٰۃ کا کیا مقام ہوگا جسے مؤقت فریضہ کہا گیا ہے۔

اگر جرأت عرض معاف ہو تو کیا میں یہ بھی دریافت کر سکتا ہوں کہ آپ نماز کس طرح پڑھتے ہیں؟

جواب :

اگر آپ میری تحریروں کا مسلسل اور بالاستیعاب مطالعہ کرتے چلے آرہے ہیں تو آپ پر یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ جہاں تک میں قرآن کو سمجھ سکا ہوں۔ قیام صلوٰۃ قرآن کی ایک نہایت جامع اور بلیغ اصطلاح ہے، جس سے

قیام صلوٰۃ

درحقیقت مقصود اس معاشرے کا قیام ہے، جس میں قانون خداوندی عملاً نافذ ہو اور اس طرح ہر فرد معاشرہ کی مضمر صلاحیتوں میں پوری پوری نشوونما ہوتی جائے۔ تاکہ وہ اس زندگی اور اس کے بعد کی زندگی کی سرفرازیوں سے بہرہ یاب ہوتا ہوا اپنے ارتقائی منازل طے کرتا چلا جائے۔ لہٰذا نظام الصلوٰۃ ایک مردمومن (یا جماعت مومنین) کی پوری پوری زندگی کو محیط ہوگا۔ ان کا ایک ایک سانس اس حقیقت کبریٰ پر شاہد ہوگا کہ وہ مصلّے (یعنی خدا کے پیچھے پیچھے جانے والے کارواں کے افراد) ہیں۔ اُن کی زندگی کا ایک ایک گوشہ اور ایک ایک شعبۂ عبادت (یعنی قانون خداوندی کی محکومیت) کا مظہر ہوگا۔ اُن کے کاروبارِ حیات کا فلم سامنے آجائے تو وہ منشائے خداوندی کی جیتی جاگتی تصویر دکھائی دے گا۔ اس اجتماعی نظام سے وابستگی کی بنا پر ان کی حیات ارضی، از ابتدا تا انتہا الاسلام کی جامع تفسیر ہوگی۔ (ولا تموتن الّا وانتم مسلمون۔) اس نظام کے اجزاء یہ ہیں :-

(۱) ۔ قرآن۔ یعنی ضابطۂ آئین اسلام۔

(۲) ۔ مرکز۔ یعنی ضابطۂ خداوندی کی قوت نافذہ۔

(۳) ۔ جماعت۔ افراد معاشرہ جن سے یہ نظام متشکل ہوگا۔

اور اس کی عملی تشکیل کے اصول ومبانی یہ ہیں :-

(الف) ۔ افراد معاشرہ میں کامل ائتلاف۔ یعنی یک دلی و یک نگہی و یک قدمی ۔ اور

(ب) ۔ مرکز کی اطاعت

ہمہ وقتی پروگرام

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ نظام جماعت مومنین کی پوری کی پوری زندگی پر چھایا ہوتا ہے اور دن اور رات میں ایک لمحہ بھی ایسا نہیں ہوتا جس میں وہ اُس کے

احاطے سے باہر ہوں۔ یہ ان کی "حیاتِ انسانی" کے لئے وہی حیثیت رکھتا ہے جو ان کی "حیاتِ طبعی" کے لئے ہوا کی حیثیت ہے۔ ہوا پر انسانی زندگی کا دار و مدار ہے اور کوئی انسان ایسا نہیں جو اس کی ضرورت اور اہمیت کا معترف نہ ہو۔ لیکن بایں ہمہ ڈاکٹروں کو اکثر و بیشتر یہ فقرہ دہرانا پڑتا ہے کہ صحت اور زندگی کے لئے کھلی اور تازہ ہوا کی اشد ضرورت ہے۔ دہرانا اس لئے پڑتا ہے کہ اس کی یاد دہانی (ذکر) سے اس کی اہمیت اُبھر کر سامنے آجاتی ہے۔ آئینِ خداوندی نے بھی اس کا انتظام کر رکھا ہے کہ اس نظام کی یاد دہانی کرائی جائے تاکہ اس کے اصول و مبانی اُجاگر ہوتے جائیں اور اس کی اہمیت نگاہوں سے اوجھل نہ ہونے پائے۔ اس یاد دہانی کا نام صلوٰۃ کا فریضہ مؤقت ہے۔ یعنی خاص اوقات کا

صلوٰۃ

اجتماعِ صلوٰۃ۔

دین کے نظام (اسلامی معاشرہ) کا بنیادی اصول یہ ہے کہ فوز و فلاح کی زندگی انفرادی نہیں، اجتماعی ہے۔ اجتماعی صلوٰۃ کی ابتدا اسی اصول سے ہوتی ہے یعنی ایک آواز پر بکھرے ہوئے افراد کا ایک مقام پر جمع ہوجانا۔

دین کے نظام میں اگلا قدم اطاعتِ مرکز ہے۔ اجتماعی صلوٰۃ میں اس کا مظاہرہ عملی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ جب یہ اجتماع اپنے میں سے سب سے بہتر فرد کو بہ حیثیت امام چن لیتا ہے (اور بہتر ہونے کا معیار یہ ہوتا ہے کہ کس کی زندگی سب سے زیادہ قانونِ خداوندی سے ہم آہنگ ہے) یہی امام اس اجتماع کا نمائندہ ہوتا ہے اس ایک کی آواز پر سب کو اُٹھنا ہوتا ہے اور اسی کی آواز پر جھکنا۔ اور یہ جھکنا اور اُٹھنا ایک ساتھ ہوتا ہے جو شہادت دیتا ہے اس حقیقت کبریٰ کی کہ اس جماعت کے افراد میں کامل ہم آہنگی فکر و عمل ہے۔ اس سے معاشرے کی ناہمواریاں مٹتی ہیں۔

امام

("امام" اس تاگے کو کہتے ہیں جس سے معمار یہ دیکھا کرتا ہے کہ دیوار بالکل سیدھی اُٹھ رہی ہے۔ اس کی اینٹیں آگے پیچھے تو نہیں ہیں۔)

دین کے نظام کا اگلا اصول یہ ہے کہ یہ نظام عالمگیر حیثیت رکھتا ہے اور اُس کا مرکز محسوس بیت اللہ ہے۔ لہٰذا اجتماعِ صلوٰۃ میں اس حقیقت کی یاد دہانی کے لئے جماعت کا رُخ قبلے کی طرف رکھا جاتا ہے یعنی ساری دُنیا کے مسلمانوں کا مطمح نگاہ اور نصب العین ایک ہوگا۔

اسلامی معاشرے کا قیام قانونِ خداوندی کی رُو سے ہوتا ہے اور اجتماعِ صلوٰۃ سے مقصود اُسی اصل الاصول کی یاد دہانی ہے۔ اس لئے قرآن کے بغیر صلوٰۃ کا تصور ہی نہیں ہوسکتا۔ اس کی غایت ہی

افرادِ معاشرہ کی توجہات کو قرآن پر مرکوز کرتا ہے۔ اسی مقصد کی یاددہانی کے لئے یہ اجتماعات رکھے گئے ہیں۔ اسی لئے ان میں قرآن دہرایا جاتا ہے تاکہ اس ایمان (نصب العین حیات) کی تجدید ہوتی رہے کہ ہم نے ہر غیر قرآنی نظام کی مخالفت میں سینہ سپر ہو کر قائم رہنا ہے اور جھکنا ہے تو صرف اسی کے فیصلوں کے سامنے جھکنا ہے۔

صلوٰۃ اور معاشرت

یہ بھی واضح رہے کہ صلوٰۃ کے اجتماعات محض اس یاددہانی کے لئے نہیں۔ ان اجتماعات میں اُمت کے معاملات کے متعلق باہمی مشورہ کیا جاتا ہے یہ درحقیقت قرآنی حکومت کی "مجلس مشاورت" کے اجتماعات ہوتے ہیں۔ چنانچہ سورۂ شوریٰ میں مومنین کی صفات یہ بتائی گئی ہیں کہ وَالَّذِيْنَ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ۔ (۴۲/۳۸) یہ لوگ اقامتِ صلوٰۃ کرتے ہیں اور انکے معاملات باہمی مشورہ سے طے پاتے ہیں" یہاں اقامتِ صلوٰۃ اور باہمی مشاورت کا یکجا حکم صلوٰۃ کے اجتماعات کی غرض وغایت کو واضح کرتا ہے۔ چنانچہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ خلافتِ راشدہ میں جب کوئی معاملہ پیش ہوتا تو خلیفہ کی طرف سے منادی کرائی جاتی کہ "الصلوٰۃ الجامعہ" لوگ مسجد نبوی میں جمع ہوتے۔ پہلے دو رکعت نماز ادا ہوتی۔ پھر خلیفہ معاملہ پیشِ نظر کی وضاحت کرتا اور مجلس کے باہمی مشورہ سے اُس کے متعلق فیصلہ کیا جاتا۔

مَیں کس طرح نماز پڑھتا ہُوں

اب آپ کے سوال کا دوسرا حصہ سامنے آتا ہے کہ مَیں نماز کس طرح پڑھتا ہُوں۔ آپ کو اس سوال کے پوچھنے میں کسی معذرت طلبی کی ضرورت نہ تھی۔ اگر آپ میرے پاس ہوتے تو از خود دیکھ لیتے کہ مَیں نماز کس طرح پڑھتا ہوں۔ لیکن چونکہ آپ یہاں سے دُور ہیں اس لئے آپ کو لکھ کر پوچھنے کی ضرورت پڑ گئی۔ میں بھی اسی طرح نماز پڑھتا ہوں جس طرح جمہور مُسلمان (فقہ حنفی کے مطابق) نماز پڑھتے ہیں۔ اِس فرق کے ساتھ کہ اگر کہیں فقہ حنفی کے علاوہ دیگر طریق پر بھی نماز ہو رہی ہو (اور مجھے وہ طریق آتا ہو) تو اُن کے ساتھ شامل ہو جانے میں بھی توقف نہیں کرتا۔ (۱۹۵۴ء)

صلوٰۃ سے متعلق مختلف گوشے

نومبر ۱۹۵۳ء کے طلوعِ اسلام میں ایک صاحب کا مقالہ شائع ہوا، جس میں انہوں نے ہماری پیش کردہ اس حقیقت کی تائید کی تھی کہ اقامتِ صلوٰۃ سے مفہوم فی الواقعہ ایسے معاشرہ کا قیام ہے جس میں تمام افرادِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے جائیں اور یوں افراد کی ذات کی نشوونما کے ساتھ ساتھ ان کی اجتماعی زندگی

بھی سرفرازیوں اور خوشگواریوں کی حامل بنتی چلی جائے۔ اس مقالہ کے بعد طلوعِ اسلام کی طرف سے اس پر ایک استدراک شائع ہوا تھا جو اس کے بعض مقامات کی وضاحت کرتا تھا اور دو ایک نکات سے اختلاف۔ اسے ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

استدراک

ہمیں خوشی ہوئی کہ طلوعِ اسلام نے جو یہ آواز اٹھائی تھی کہ "اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے معنی فقط "نماز پڑھنا" نہیں بلکہ اس سے مفہوم ہے قرآنی معاشرہ کا قیام جو زندگی کے تمام گوشوں کو محیط ہو۔ اس کا چرچا اب دور دور تک ہونے لگ گیا ہے۔ فالحمد للّٰہ علٰی ذالک۔

محترم...... صاحب اس باب میں ہمارے ہم صفیر ہیں اور اُن کا زیرِ نظر مقالہ اسی دعوت کی تبلیغ ہمارے محترم نے اپنے مقالہ کے اخیر میں البتہ ایک ایسی بات کہی ہے جس سے ہمیں بصد احترام تھوڑا سا اختلاف ہے۔ یا یوں کہیئے کہ ہمارے نزدیک وہ نکتہ وضاحت طلب ہے۔ جیسا کہ انہوں نے اپنے مضمون میں بصراحت لکھا ہے۔ قرآن کی رُو سے صلوٰۃ ایک اجتماعی عمل ہے۔ جس سے صحیح قرآنی معاشرہ قائم ہوتا ہے صلوٰۃ کے معنی ہی متوازن اور پیہم حرکت اور قانونِ خداوندی کا مسلسل اتباع ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ چیز اجتماعی ہے انفرادی نہیں۔

انفرادی نماز

جہاں تک ہماری بصیرت یاوری کرتی ہے، ہمیں قرآن سے انفرادی صلوٰۃ کی طرف راہ نمائی کہیں نہیں ملتی۔ حقیقت یہ ہے کہ اجتماعی اور انفرادی صلوٰۃ میں یہی فرق نہیں کہ جب صلوٰۃ کو بہت سے لوگ مل کر ادا کریں تو وہ اجتماعی کہلاتی ہے اور جب اُسے ایک فرد تنہائی میں ادا کرے تو وہ انفرادی صلوٰۃ ہوتی ہے۔ ان دونوں میں بنیادی فرق ہے۔ اجتماعی صلوٰۃ اور انفرادی صلوٰۃ (اگر انفرادی صلوٰۃ کو بھی صلوٰۃ کہا جا سکے تو) دو الگ الگ تصورات کی ترجمان ہیں۔ اجتماعی صلوٰۃ کی بنیاد اس تصوّر پر ہے کہ قرآن کی رُو سے فرد کی تربیتِ ذات معاشرے کے اندر (اور اُس کا جُزو بننے) ہی سے ہوسکتی ہے اور عبادت سے مفہوم ہے۔ قوانینِ خداوندی کی بے لاگ اور بے لوث اطاعت جو (پھر) معاشرہ کے اندر ہی ممکن ہے، انفرادی طور پر ممکن نہیں، اس کے برعکس، انفرادی صلوٰۃ کی بنیاد اس تصوّر پر ہے کہ ایک فرد اپنا "تزکیۂ نفس"، معاشرہ سے الگ ہٹ کر، انفرادی طور پر کرسکتا ہے، اور عبادت سے مقصود ہے۔ خُدا کی پرستش، جو انفرادی طور پر بھی کی جاسکتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں تصورات، اپنی اصل و بنیاد کے اعتبار سے، ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ قرآن انفرادی تصوّرِ حیات کے خلاف صدائے احتجاج ہے اور اجتماعی تصوّرِ حیات کا داعی۔ لہٰذا یہ ہو نہیں سکتا کہ قرآن، جو اجتماعی صلوٰۃ کا نقیب ہو، ساتھ ہی انفرادی صلوٰۃ کی

بھی راہنمائی کرے اور اس کے فوائد بتائے۔ جسے انفرادی صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ وہ درحقیقت دعا ہے (قرآنی صلوٰۃ نہیں جسے قائم کیا جاتا ہے) اور خود حضرت زکریاؑ کا واقعہ جس سے محترم ..... صاحب انفرادی صلوٰۃ کی دلیل لائے ہیں اس کی تائید کرتا ہے۔

حضرت زکریاؑ کی صلوٰۃ

قصہ حضرت زکریاؑ کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے۔ (ھنالك دعا زکریا ربه ($\frac{3}{38}$) زکریاؑ نے اپنے رب سے دعا مانگی اور کہا کہ تو مجھے اپنا ہاں سے اولاد عطا فرمادے۔ (انك سميع الدعاء) اس کے بعد ہے کہ وہ ہنوز قربان گاہ میں کھڑا دعا مانگ رہا تھا کہ خدا نے اسے بیٹے کی بشارت دے دی۔ (فنادته الملئكة وهو قائم يصلى فى المحراب۔ ($\frac{3}{38}$) قرآن نے ان الفاظ (وھو قائم یصلی فی المحراب) کا اضافہ یہ بتانے کے لئے کیا ہے کہ حضرت زکریاؑ نے ابھی اپنی دعا ختم بھی نہیں کی تھی کہ خدا نے اسے استجابت سے نواز دیا۔ سورۂ مریم میں اس امر کی صراحت کر دی گئی ہے۔ کہ زکریاؑ کا دعا مانگنا، اس کی دعا کا قبول ہو جانا اور اسے اپنے بیٹے کی بشارت مل جانا، سب ایک ہی وقت میں ہو گیا تھا۔ چنانچہ جب یہ کچھ ہو گیا تو ——— (فخرج على قومه من المحراب ($\frac{19}{11}$) زکریاؑ قربان گاہ سے نکل کر اپنے لوگوں کی طرف آیا۔) لہٰذا حضرت زکریاؑ کے قصہ میں (یصلی فی المحراب) کے معنی قرآن کی مصطلحہ صلوٰۃ ادا کرنا نہیں۔ بلکہ بیٹے کی دعا مانگنا ہے۔ صلوٰۃ کا لفظ دعا کے معنوں میں قرآن میں متعدد مقامات پہ استعمال ہوا ہے مثلاً (صلوٰتك سكن لهم ($\frac{9}{103}$) تیری دعا ان کے لئے وجہ تسکین ہوتی ہے) لہٰذا یہ کہنا تو درست ہے کہ دعا[1] انفرادی طور پہ مانگی جا سکتی ہے۔ لیکن یہ کہنا ٹھیک نہیں ہوگا کہ قرآنی صلوٰۃ، اجتماعی طور پہ بھی ادا ہو سکتی ہے اور انفرادی طور پہ بھی واضح رہے کہ جو نمازیں اس وقت ہم باجماعت (یعنی بزعم خویش اجتماعی) بھی پڑھتے ہیں وہ بھی درحقیقت انفرادی صلوٰۃ ہے۔ اس لئے کہ اس میں بنیادی تصور خدا کی پرستش اور انفرادی تزکیہ کا ہے۔ لہٰذا اس وقت نہ تو کسی ایک فرد کی الگ ادا کردہ نماز ہی قرآنی صلوٰۃ ہے اور نہ ہی نماز باجماعت مقصود کے اعتبار سے قرآنی۔

وقتی اجتماعات

قرآن نے تشکیل معاشرہ کا جو پروگرام دیا ہے، اس میں اس کی بھی صراحت کر دی ہے کہ اس مقصد کے لئے وقتی اجتماعات بھی ضروری ہیں۔ جن میں خدا کی حمد و ستائش اور

[1] قرآن کی رو سے دعا کا مفہوم کیا ہے؟ اس کی تشریح کسی دوسرے مقام پہ کی جائے گی۔

اقرار اطاعت و انقیاد کے بعد، اہم معاملات کے متعلق باہمی مشاورت کی جائے۔ انہی کو مؤقت اجتماعاتِ صلوٰۃ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ قرآن میں باہمی مشاورت اور قیامِ صلوٰۃ کا حکم اکٹھا آیا ہے۔ سورۂ الشوریٰ میں ہے۔

وَالَّذِیْنَ استجابوا لربھم۔ واقاموا الصلوٰۃ وامرھم شوریٰ بینھم و مما رزقنٰھم ینفقون۔ (۴۲/۳۸) یعنی یہ ان لوگوں کی جماعت ہے جو اپنے خدا کے قانونِ ربوبیت پر لبیک کہتے ہوئے نظامِ صلوٰۃ کو قائم کرتے ہیں اور ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پاتے ہیں اور جو کچھ ہم نے انہیں دے رکھا ہے اُسے ربوبیت عامہ کے لئے کھلا رکھتے ہیں۔

تاریخ ہمیں یہ بھی بتاتی ہے کہ عہد نبی اکرمؐ اور صحابہؓ میں جب کبھی کوئی ایسا اہم واقعہ پیش آیا جس کے لئے فوری اجتماع کی ضرورت ہوتی تو اس کے لئے جو اعلان کیا جاتا تھا اس میں کہا جاتا تھا کہ "الصلوٰۃ جامعۃ" چنانچہ اس اعلان کو سُن کر لوگ جمع ہو جاتے اور مسئلہ پیش نظر پر غور و خوض کر لیا جاتا۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ اس دور میں الصلوٰۃ کا مفہوم کیا تھا۔

انفرادی صلوٰۃ کی درستگی

اس کے بعد محترم ...... صاحب فرماتے ہیں کہ "اگر ہم انفرادی صلوٰۃ کو درست کر سکیں جو زیادہ مشکل نہیں تو جماعتی صلوٰۃ کے لئے تدریجاً راستہ ہموار ہو سکتا ہے۔" ان صاحب نے اس کی وضاحت نہیں فرمائی کہ "انفرادی صلوٰۃ کی درستگی" سے اُن کا مقصود کیا ہے؟ یہ آواز ہزار برس سے (اور قریب قریب ہر نماز کے وقت ہر مسجد سے) ہمارے کانوں میں آرہی ہے کہ تم اپنی نمازوں کو درست کرو۔ لیکن یہ کوئی نہیں بتاتا کہ اس سے مفہوم کیا ہے۔ مسجد میں آواز دینے والے کا مفہوم تو یہ ہوتا ہے کہ تم نماز کے فرائض و واجبات، سنن، مستحبات وغیرہ کا نہایت احتیاط سے خیال رکھو۔ اس کے ارکان کو ٹھیک ٹھیک طور پر ادا کرو۔ کھڑے ہو تو دونوں پاؤں میں اتنا فاصلہ ہو، تکبیر کے لئے ہاتھ اٹھیں تو کانوں کی لَو تک پہنچیں۔ قیام میں ہاتھ فلاں مقام پر رہیں۔ رکوع میں جھکنے کی یہ شکل ہو، سجدہ میں یہ صورت وغیرہ وغیرہ۔ خلوت میں ایسی تاکید کرنے والے سے پوچھو تو وہ کہہ دے گا کہ نماز خضوع و خشوع کے ساتھ ادا کرو۔ اس میں حضورِ قلب نہایت ضروری ہے۔ انسان کو عاجزی اور ناتوانی سے خدا کے حضور رونا اور گڑگڑانا چاہیئے۔ یہ ظاہر ہے کہ اس ہزار برس میں کروڑوں انسان ایسے گزر چکے ہیں (اور آج بھی کروڑوں نہیں تو لاکھوں ایسے ہوں گے) جو اپنی نمازوں میں تعدیلِ ارکان کا بھی خیال رکھتے تھے (اور رکھتے ہیں) اور اُن کے دل میں خشوع و خضوع بھی تھا (اور ہوتا ہے) لیکن اس کے باوجود یہ نمازیں وہ نتائج

تو مرتب نہ کر سکیں (نہ آج کر رہی ہیں) جنہیں قرآن نے صلوٰۃ کا لازمی ثمرہ قرار دیا ہے اور جن کا ذکر محترم موصوف نے اپنے مقالہ میں اس حسن و ایجاز سے کیا ہے۔ اگر آپ غور سے دیکھیں تو یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی۔ کہ ہماری اصلی خرابی یہ بھی کہ ہم نے سمجھ لیا کہ انفرادی صلوٰۃ کو درست کرنے سے قرآنی صلوٰۃ کے نتائج مرتب ہو سکتے ہیں۔ لیکن جب انفرادی صلوٰۃ، قرآنی صلوٰۃ ہے ہی نہیں تو اس کی درستگی سے قرآنی صلوٰۃ کے ثمرات کس طرح حاصل ہو سکتے ہیں؟ آپ انفرادی نماز میں "خشوع و خضوع اور حضور قلب" پیدا کر کے زیادہ سے زیادہ یہی کر سکتے ہیں کہ اپنی دعائیں اور رقت پیدا کر لیں اور خدا کی پرستش پوری توجہ کے ساتھ کر لیں۔ انفرادی نماز کی درستگی سے اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے؟ لیکن اس سے وہ ثمرات تو حاصل نہیں ہو جائیں گے۔ جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے اس میں شبہ نہیں کہ جماعت مومنین جب نظامِ صلوٰۃ سے قوانین و احکامِ خداوندی کا اتباع کرے گی تو وہ اتباع محض مشینی طور پر نہیں ہوگا۔ اس میں پورا پورا سوز و گداز اور عجز و نیاز شامل ہوگا۔ یعنی وہ اتباع، دل کی گہرائیوں سے اُبھرے گی اور خون کے ذرہ ذرہ میں حلول کر جائے گی اور اس اتباع سے جو درخشندہ نتائج مرتب ہوں گے وہ انسان کے لئے حقیقی مسرت اور سچی طمانیت کا موجب بن جائیں گے۔ اس طرح اسی نظامِ صلوٰۃ میں انسان کی عقل و بصیرت اور جذبات دونوں حقیقی تسکین حاصل کر لیں گے۔ لیکن جب نظامِ صلوٰۃ باقی نہ رہے تو "دنیا پرست" عقلی حیلہ جوئیوں سے ساز و سامانِ زندگی حاصل کر لیتے ہیں اور اس طرح ان کے جذبات کی تسکین ہو جاتی ہے۔ اور "دیندار" انفرادی پرستش سے اپنے جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کر لیتے ہیں۔ قرآن نے جب یہ کہا تھا کہ (فخلف من بعدھم خلف اضاعوا الصلوٰۃ واتبعوا الشھوات فسوف یلقون غیا (۱۹/۵۹)) یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام کے بعد ان کے متبعین نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا اور شہوات کے پیچھے لگ گئے سو اس کا نتیجہ تباہی اور بربادی تھا تو اس میں اتباعِ شہوات سے مراد یہ تھی کہ یہ لوگ اپنے جذبات کی تسکین قوانینِ خداوندی کے بجائے دوسرے طریقوں سے چاہتے تھے۔ یہ تھی ان کی غلطی۔ واضح رہے کہ قرآن کی رُو سے جذبات کی تسکین بُری بات نہیں۔ بُری بات یہ ہے کہ جذبات کی تسکین غیر خدائی طریقوں سے کی جائے۔ جذبات کی تسکین کا ایک ذریعہ قیامِ صلوٰۃ ہے جس میں دنیاوی خوشگواریوں کے حصول اور انسانی ذات کی تربیت و استحکام سے انسانی جذبات کی صحیح صحیح تسکین ہو جاتی ہے

رہبانیت

دوسرا طریقہ یہ ہے کہ صلوٰۃ ضائع کر کے اپنے طور پر جذبات کی تسکین کا سامان فراہم کرنا، یہ طریق غلط ہے۔ یہ بھی ظاہر ہے کہ انسانی جذبات صرف "حیوانی جذبات" تک ہی

محدود نہیں، ان میں وہ "مقدس جذبات" بھی شامل ہیں جن کی تسکین مذہب پرست طبقہ انفرادی پرستش کی رُو سے حاصل کر لیتا ہے (اور جسے قرآن نے رہبانیت کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے) لہذا، اگر رہبانیت میں "انفرادی صلوٰۃ" (یعنی خدا کی پرستش سے سکون حاصل کر لینے کا طریقہ) خُدا کے مقرر کردہ خوشگوار نتائج کا حامل نہیں بن سکتا تھا (اور اسی لئے خدا نے اعلان کر دیا تھا کہ اس نے اس طریق کا حکم نہیں دیا) تو ہمارے ہاں وہی چیز کس طرح حسنِ نتائج کی کفیل ہو سکتی ہے خواہ اُسے کتنا ہی درست کیوں نہ کر لیا جائے۔

تعلق باللہ

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ انفرادی پرستش، تعلق باللہ کا ذریعہ بنتی ہے، سو، سب سے پہلے تو یہ دیکھنا چاہیئے کہ تعلق باللہ سے مفہوم کیا ہے؟ اگر مفہوم یہ ہے کہ انسان اپنے دل میں یہ محسوس کرنے لگ جائے کہ اس کا خدا سے تعلق پیدا ہو رہا ہے تو اس انفرادی احساس کو نماز ہی کے ساتھ کس طرح وابستہ کیا جا سکتا ہے؟ ہر مذہب کا پیرو اس کا مدعی ہے کہ خدا کی عبادت یا ایشور کی بھگتی سے اس کا احساس ہو جاتا ہے کہ ہمارا تعلق خدا یا ایشور یہ حاتما سے پیدا ہو رہا ہے۔ اس سے بھی نزدیک آیئے تو ہمارے ہاں ہر پیر پرست اس کا مدعی ہوتا ہے کہ ان اوراد و وظائف سے جو اس کا پیر باطنی طور پر بتا تا ہے، تعلق باللہ پیدا ہو جاتا ہے تو آپ کس طرح کہہ سکتے ہیں کہ تعلق باللہ کے متعلق اُن کا دعوےٰ غلط ہے اور آپ کا دعوےٰ صحیح ہے۔ جب دعویٰ کا ثبوت اپنے اپنے دل کا احساس ٹھہرا تو آپ کو کیا حق حاصل ہے کہ دوسرے کے احساسِ قلب کے متعلق فیصلہ کر دیں کہ وہ باطل کا احساس ہے لہذا تعلق باللہ کا یہ مفہوم ہی غیر قرآنی ہے اور اسی سے دُنیا میں باطل مذہب پرستی کا وجود قائم ہے۔ انسان اور خُدا کے تعلق کا ذریعہ ایک ہی ہے اور وہ ہے وحی کا ذریعہ۔ یہ وحی جو آج اس آسمان کے نیچے صرف قرآن کے اندر ہے۔ اس لئے تعلق باللہ کا ذریعہ فقط قرآن ہے۔ جب ہم قرآن کا اتباع کرتے ہیں تو ہمارا تعلق خُدا سے قائم ہو جاتا ہے۔ اب رہا یہ کہ ہم قرآن کا اتباع بھی صحیح طور پر کر رہے ہیں یا نہیں تو اس کا معیار وہ نتائج ہیں جو خود قرآن نے اپنی اتباع کا لازمی ثمرہ بتائے ہیں۔ یہ ہے صحیح تعلق باللہ! اگر قرآن درمیان میں نہ رہے تو کوئی انسان خُدا سے اپنا تعلق پیدا نہیں کر سکتا۔ (خدا سے براہِ راست تعلق کا ذریعہ نبوت تھی جس کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔)

اب کیا کیا جائے

اب اس کے بعد وہ سوال سامنے آتا ہے جو ہر اس شخص کے لئے ایک دشوار مرحلہ بن جاتا ہے۔ جو مسلمانوں کی موجودہ روش میں صحیح تبدیلی کا آرزومند ہوتا ہے

وہ سوال یہ ہے کہ مسلمان میں جو کچھ مذہب کے نام پہ ہو رہا ہے وہ ان نتائج کا حامل نہیں، جنہیں قرآن، اسلامی زندگی کا لازمی نتیجہ قرار دیتا ہے اور جو کچھ از روئے قرآن ہونا چاہیئے وہ اس وقت موجود نہیں (اگر اس کے لئے آج سے کوشش بھی شروع کر دی جائے تو بھی اس کے لئے ایک عرصہ درکار ہے) لہذا اس درمیانی عرصہ میں کیا کیا جائے؟ کیا جو کچھ ہو رہا ہے اسے ہونے دیا جائے یا اسے چھوڑ دیا جائے اور قرآنی نظام زندگی کے قیام کی کوشش کی جائے۔ یہ سوال فی الواقعہ ایسا ہے جو ہر اس شخص کے ذہن میں پریشانیاں پیدا کر دیتا ہے جس کا دل صحیح قرآنی انقلاب کا متمنی ہو۔ دنیا میں انقلاب کی آرزو رکھنے والوں میں اکثر ایسے لوگ شامل ہوتے ہیں جن کا ماضی اُس ماحول سے وابستہ ہوتا ہے جس سے وہ خود نکلنا اور دوسروں کو نکالنا چاہتے ہیں۔ اور اُن کی توقعات اس مستقبل سے وابستہ ہوتی ہیں جس کی تعمیر کے لئے وہ کوشاں ہوتے ہیں۔ لہذا انہیں ایک مدت تک اس برزخی کشمکش میں رہنا پڑتا ہے۔ یعنی ان کے دامن کا ایک سرا ماضی سے بندھا رہتا ہے اور دوسرا مستقبل سے منوط۔ ان میں سے اکثر تو اس جگر سوز اور جانکاہ کشمکش کی تاب، نہ لا کر پھر سے ماضی کی طرف لوٹ جاتے ہیں اور کچھ ایسے بھی ہوتے ہیں جنہیں یہ توفیق ارزانی ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے ماحول سے کٹ کر کافتہً اس مستقبل کے ساتھ وابستہ ہو جائیں جو ان کی امیدوں کا مرکز ہوتا ہے۔ اس برزخی مقام میں بالعموم جی یہ چاہتا ہے کہ ماضی سے تعلق بھی یکسر منقطع نہ ہو اور مستقبل بھی قریب آتا چلا جائے لیکن انقلاب کا فرشتہ بڑا سخت گیر واقع ہوا ہے۔ وہ مفاہمت (COMPROMISE) تو جانتا ہی نہیں۔ اس کا تقاضا یہ ہوتا ہے کہ اس کا اعلان کر دو کہ:

اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَا اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۔ (۶/۱)

میں نے ہر طرف سے اپنا تعلق منقطع کر کے اپنا رُخ خالصتہً اُس خدا کے قانون کی طرف پھیر لیا جو فاطر السموٰات والارض ہے اور اس طرح میں نے شرک کی رگِ حیات کو کاٹ دیا۔

وہ اس اعلان سے ورے اور کسی اعلان کو تسلیم نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک:

اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

لہذا جو لوگ آج ہم میں قرآنی نظام زندگی کو بار دیگر متشکل دیکھنے کے آرزو مند ہیں اور اس انقلاب کے داعی ہیں انہیں اس اہم سوال کے متعلق ایک ہی مرتبہ فیصلہ کر لینا ہوگا۔ اگر وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے

وہ قرآن نہیں ہے تو انہیں بے لاگ لپیٹ، کھلے کھلے الفاظ میں اس کا اعلان کرنا ہوگا خواہ اس میں (اور تو اور) خود اپنے ذاتی جذبات بھی کیسے ہی مجروح کیوں نہ ہوں۔ اور اگر وہ سمجھتے ہیں کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس میں کتربیونت سے قرآنی نظام زندگی پیدا ہو جائے گا تو (کم از کم) ہم تو اپنی حقیر سی بصیرت کے مطابق اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ اس سے قرآنی انقلاب کبھی نہیں آسکے گا۔

ملّی شعار

لیکن اس کے ساتھ ہی طلوعِ اسلام ایک اور بات بھی کہتا ہے۔ جو کچھ ہمارے ہاں مذہب کے نام پہ ہو رہا ہے اس نے اپنی دینی حیثیت تو کھو دی ہے لیکن وہ ہمارا ملّی شعار سا بن چکا ہے۔ مثلاً سب سے پہلے اس کلمہ کو لیجئے جو دین کی بنیاد ہے۔ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ۔ "دین کی رُو سے اس کے معنی یہ ہیں کہ میں اس حقیقتِ کبریٰ کا اعلان کرتا ہوں کہ کائنات میں خدا کے قانون و اقتدار کے علاوہ اور کسی کا قانون و اقتدار کارفرما نہیں۔ اس لئے میری زندگی بھی اسی قانون کے تابع رہے گی۔ میں اس کے سوا کسی اور قانون اور اقتدار کو تسلیم نہیں کروں گا اور یہ قانون ہمیں رسالتِ محمدیہ کی وساطت سے ملا ہے جو قرآن کے اندر محفوظ ہے۔" یہ ہے کلمہ کا مفہوم دین کی رُو سے۔ یہ ظاہر ہے کہ ہمارے ہاں یہ کلمہ اپنا دینی مفہوم کھو چکا ہے لیکن یہ ہمارا اس قسم کا ملّی شعار بن چکا ہے کہ جو شخص اس کلمہ کا اقرار کرتا ہے۔ اسے ہم مسلمانوں کے گروہ کا ایک فرد سمجھتے ہیں اور جو اس سے انکار کرتا ہے اسے ہم اس گروہ سے باہر قرار دیتے ہیں۔ اسی کلمہ کا اشتراک ہے کہ (اگرچہ غیر قرآنی تصورِ حیات کے ماتحت، دنیا کے مسلمان قوموں، نسلوں، جغرافیائی حد بندیوں اور سیاسی تقسیموں کے مطابق الگ الگ ٹکڑیوں میں بٹ چکے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ) دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے مسلمان اپنے اندر ایک غیر مرئی سی وحدت محسوس کرتے ہیں۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ کلمہ ہمارا ملّی شعار بن چکا ہے۔ یہی حیثیت دینی ارکان مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ کی ہے۔ یہ سب اپنی دینی معنویت سے محروم ہو چکے ہیں۔ لیکن یہ ہمارے ملّی شعار بن گئے ہیں۔ چونکہ ملّی شعائر بھی ایک حد تک افراد میں احساسِ یگانگت کے زندہ رکھنے کا موجب ہوتے ہیں۔ اس لئے طلوعِ اسلام کے نزدیک یہ ضروری ہے کہ (اس دوران میں جب ہم صحیح قرآنی معاشرہ کی تشکیل کے لئے جدوجہد کریں) یہ ملّی شعائر اسی طرح آگے منتقل ہوتے رہیں۔ (بجز ان کے جو قرآن کے خلاف ہوں) اس سے (جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے) مختلف افراد میں کچھ نہ کچھ احساسِ یگانگت تو باقی رہے گا۔ اگر ہم قرآنی معاشرہ کی تشکیل میں کامیاب ہو گئے تو یہی ملّی شعائر دینی ارکان بن جائیں گے اور ان سے وہی نتائج مرتب ہونے لگ جائیں گے، جن کی وضاحت

قرآن نے کی ہے۔ یہ ہے وہ مقصد جس کے پیشِ نظر طلوعِ اسلام ان شعائر کو باقی رکھنے کے حق میں ہے اور انہیں مٹانے اور ان میں ردّ و بدل کرکے قوم میں تشتت و انتشار پیدا کرنے کو سختی سے روکتا ہے۔ ہم سے پہلے جن حضرات نے قرآن کی طرف دعوت دینے کی جدوجہد کی (خدا انہیں ان کی نیک نیتوں اور حسنِ مساعی کا اجر دے) ایسا نظر آتا ہے کہ ان کے پیشِ نظر قرآنی معاشرہ کی تشکیل نہیں تھی وہ صرف موجودہ (غیر قرآنی) فقہ کو قرآنی فقہ سے بدلنا چاہتے تھے۔ اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا (جیسا کہ ہونا چاہیئے تھا) کہ معاشرہ میں کوئی تبدیلی تو واقع ہوئی نہ، اور قوم میں مزید تفرقہ پڑگیا۔ طلوعِ اسلام کے پیشِ نظر قرآنی معاشرہ کی تشکیل ہے۔ اگر قرآنی معاشرہ قائم ہوگیا تو وہ اپنے دور کے تقاضوں کے مطابق فقہی جزئیات میں خود بخود ضروری تبدیلیاں کرلے گا۔

ارکانِ اسلام کی صحیح حیثیت

یہ کام ہمارے کرنے کا نہیں ہے۔ یہ وجہ ہے کہ طلوعِ اسلام موجودہ مذہبی ارکان کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنا چاہتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اس حقیقت کو بھی دہرائے جاتا ہے کہ ان کی حیثیت محض ہمارے ملّی شعائر کی ہے۔ انہیں دینی حیثیت اس وقت حاصل ہوگی جب ان سے وہ نتائج مرتب ہونے لگ جائیں گے جن کی صراحت قرآن نے کردی ہے اور یہ چیزیں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک معاشرہ کی تشکیل قرآنی خطوط پر نہ ہوجائے۔ قرآن نے جب کتاب کے ساتھ حکمت کو بھی منزّل من اللہ قرار دیا ہے (یعنی اللہ نے قرآن میں کتاب اور حکمت دونوں کو نازل کیا ہے) تو اس سے ایک بہت بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کتاب کے معنی قانون اور حکمت کے معنی ہیں اس قانون کی غایت (THE WHY OF IT) یعنی اس نے کہا ہے کہ "یہ کرو تاکہ یہ ہوجائے"۔ "یہ کرو" قانون ہے اور "تاکہ یہ ہوجائے" اس قانون کی حکمت ہے۔ اسی کو قانون کے نتائج کہتے ہیں۔ لہٰذا قرآن نے جہاں قانون کو خدا کی طرف سے دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی ان نتائج کو بھی خود ہی بیان کردیا ہے جن کا حامل وہ قانون ہے۔ یہ اس لئے کیا ہے تاکہ ہم ایک ایک قدم پر اس کا جائزہ لیتے رہیں کہ ہم قانون کی صحیح صحیح پیروی کررہے ہیں یا نہیں۔ اگر اس قانون کے اتباع سے وہی نتائج مرتب ہورہے ہیں جن کی صراحت قرآن نے کردی ہے تو سمجھ لیجئے کہ قانون کی ٹھیک ٹھیک اطاعت ہورہی ہے۔ لیکن اگر اس سے وہ نتائج مرتب نہیں ہورہے تو پھر یقین کرلیجئے کہ اس کی اطاعت ٹھیک ٹھیک نہیں ہورہی۔ (خواہ آپ بزعمِ خویش

نتائج معیار ہیں

اس کی اطاعت کیسی ہی عمدگی سے کیوں نہ کر رہے ہوں اور اس سے آپ کے جذبات کی تسکین کیسی ہی اچھی کیوں نہ ہو جاتی ہو) پہلی قومیں اس لئے تباہ نہیں ہوئی تھیں کہ انہوں نے اپنے دینی احکام سے انکار کر دیا تھا۔ وہ اس لئے تباہ ہوئی تھیں کہ وہ جس انداز سے ان احکام کی اتباع کرتے تھے اس سے وہ نتائج مرتب ہوتے نہیں تھے جن کے لئے وہ احکام دیئے گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود وہ سمجھتے یہ تھے کہ ہم ان احکام کی اطاعت ٹھیک ٹھیک کر رہے ہیں۔ مثلاً (قرآن اس پر شاہد ہے کہ) انبیائے بنی اسرائیل نے اپنی قوم کو "قیام صلوٰۃ" کا حکم دیا۔ یہودی آج تک برابر نماز پڑھتے چلے آ رہے ہیں۔ عیسائی بھی نماز پڑھتے ہیں۔ یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ ان کی موجودہ نماز کی شکل بھی وہی ہو جو ان کے اس ابتدائی معاشرہ میں رائج تھی۔ جب یہ کتاب اللہ پر ٹھیک عمل کرتے تھے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے "صلوٰۃ کو ضائع کر دیا"
(اضاعوا الصّلوٰۃ) اور اس طرح تباہ و برباد ہو گئے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ صلوٰۃ کی شکل قائم رکھنے کے باوجود ان سے کیا غلطی ہوئی تھی۔ جس کی وجہ سے قرآن نے کہا ہے کہ انہوں نے صلوٰۃ کو ضائع کر دیا۔ غلطی یہ ہوئی تھی کہ انہوں نے اس کا جائزہ نہیں لیا کہ ان کی صلوٰۃ وہ نتائج مرتب کر رہی ہے یا نہیں جن کی صراحت خدا نے کی تھی۔ ان کی صلوٰۃ نے وہ نتائج اس وقت سے مرتب کرنے چھوڑ دیئے تھے جب سے انہوں نے صلوٰۃ کو دینی معاشرہ کے بجائے انفرادی دعا یا پرستش، سمجھ لیا۔ چنانچہ ان کے ہاں صلوٰۃ کے لئے لفظ بھی دعا (PRAYER) یا پرستش (WORSHIP) کا استعمال ہوتا ہے۔ (بعینہٖ یہی پوزیشن ہماری نماز کی ہو چکی ہے جسے ہم "انفرادی صلوٰۃ" کہتے ہیں۔)

لہٰذا یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمارے مذہبی ارکان، دین کے اجزا بن چکے ہیں یا نہیں۔ ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ ان سے وہ نتائج مرتب ہو رہے ہیں یا نہیں جن کی تفصیل قرآن نے خود دے دی ہے، جب تک وہ نتائج مرتب نہیں ہوتے ان ارکان کی دینی حیثیت کچھ نہیں رہتی۔ یہ صرف قومی شعائر کی حیثیت رکھتے ہیں

مروّجہ نماز کی اہمیت کم ہو گئی ہے

اب آیئے اس سوال کی طرف جو ہم سے اکثر (اعتراضاً اور بعض اوقات طعناً) پوچھا جاتا ہے۔ وہ سوال یہ

ہے کہ طلوع اسلام نے جب سے "نظامِ صلوٰۃ" کی آواز بلند کی ہے لوگوں کے دلوں میں مروجہ نماز کی اہمیت کم ہوگئی ہے حتیٰ کہ مسجدوں میں نمازی کم ہوتے جارہے ہیں۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں طلوعِ اسلام کی آواز کو حقیقت سے زیادہ اہمیت دی جارہی ہے۔ اگر ان حضرات کے نزدیک طلوعِ اسلام کی آواز کا اثر یہی ہے کہ اس سے مروجہ نماز کی اہمیت کم ہو جاتی ہے تو بھی یہ کہنا مبالغہ ہے کہ یہ اس آواز کا اثر ہے کہ مسجدوں میں نمازی کم ہوتے جارہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے اربابِ مذہب کا شروع سے یہ انداز چلا آرہا ہے کہ اگر لوگ ان کے کسی عقیدہ یا مسلک سے بے اعتنائی برتنا یا برگشتہ ہونا شروع ہوتے ہیں تو یہ بجائے اس کے کہ یہ سوچیں کہ اس عقیدہ یا مسلک میں کیا خرابی ہے جس کی وجہ سے اس نے اپنی جاذبیت کھودی ہے، ان کی نگاہ ہمیشہ اس طرف جاتی ہے کہ اس کا الزام کس کے سر تھوپا جائے؟ چنانچہ وہ آسانی سے "شریعتِ حقہ" کے اس مخالف کو تلاش کر لیتے ہیں اور اسے ملحد و بے دین قرار دے کر عوام کو اس کے پیچھے لگا دیتے ہیں اور بزعمِ خویش مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس سے اس عقیدہ یا مسلک کی گرتی ہوئی عمارت کی روک تھام ہو گئی ہے۔ یہی کچھ آج کل ہو رہا ہے۔ ہمارا نوجوان طبقہ، ہمارے فرسودہ (اور انسانوں کے خود ساختہ) مذہب سے بیزار اور اس مذہب کے حاملین کے کردار سے متنفر ہوتا جارہا ہے اور یہ حضرات بجائے اس کے کہ اپنے مزعومات و اعمال کا جائزہ لیں، یہ کہہ کر دوسروں کو (اور شاید اپنے آپ کو بھی) فریب دے لیتے ہیں کہ ان میں کوئی نقص نہیں۔ یہ سب کچھ طلوعِ اسلام کی "فتنہ پردازی" کا اثر ہے۔

بات یہ ہے کہ مذہب ہو یا زندگی کا کوئی اور گوشہ، انسان ان اعمال پر جن کا کوئی نتیجہ سامنے نہ آتا ہو، صرف اسی وقت تک کاربند رہ سکتا ہے جب تک اس کے دل میں یہ کاوش پیدا نہ ہو کہ میں جو کچھ کر رہا ہوں، اس کا بالآخر نتیجہ کیا ہے۔ ہمارے اس دور میں (متعدد وجوہات کی بنا پر) یہ سوال اُبھر کر سامنے آنا شروع ہو گیا ہے کہ ہر عمل کا کوئی نہ کوئی نتیجہ ہونا ضروری ہے ایک تو سائنس کی بڑھتی ہوئی تحقیقات جس نے قدم قدم پر یہ بتانا شروع کر دیا کہ کائنات میں ایک پتہ کی جنبش بھی بلا نتیجہ نہیں رہتی۔ دوسرے اقوامِ مغرب کی فتوحات جن سے مغلوب اقوام یہ سوچنے پر مجبور ہو گئیں کہ اقوامِ مغرب کی طاقت کا راز کیا ہے۔ جہاں تک پاکستان کے مسلمانوں کا تعلق ہے، ان اسباب میں ایک اور سبب کا بھی اضافہ ہوا ہے۔ تقسیمِ ہند سے پہلے کی زندگی میں مسلمانوں کے سامنے اپنی حفاظت کا سوال ہی نہیں تھا۔ وہاں ہم یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہندوستان

اور اس کے باشندوں کی حفاظت کی ذمہ داری انگریز کے سر ہے۔ اس لئے ہمیں اس کی کاوش ہی نہیں ہوتی تھی کہ زمانہ کا رُخ کس طرف کو ہے اور ہمارے سامنے کون کون سے خطرات ہیں۔ تشکیل پاکستان کے بعد یہ صورت حالات یکسر بدل گئی۔ اب کیفیت یہ ہے کہ کہیں پتہ بھی کھڑکے تو ہمیں خطرہ پیدا ہو جاتا ہے کہ اس کی زد ہم پہ ہی نہ ہو۔ ان حالات میں ہر وہ شخص جس کے دل میں تحفظِ ذات کا ذرا سا بھی احساس ہے یہ سوچنے پر مجبور ہو گیا ہے کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے۔

نتیجہ کیا نکلتا ہے

آپ نے غور کیا ہوگا کہ اب لوگوں کو لیڈروں کی تقریریں، بیانات، وعدے یا مختلف جماعتوں کے ریزولیوشن حتیٰ کہ حکومت کی منصوبہ بندیاں (PLANS) بالکل مطمئن نہیں کر سکتے۔ ہر شخص یہ پوچھتا ہے کہ ہمیں بتاؤ کہ جو کچھ تم کہتے یا کرتے ہو، اس کا نتیجہ کیا نکلتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جب تمام فضا اس قسم کے خیالات سے معمور ہو جائے تو پھر مذہبی اعمال کے متعلق بھی ضرور یہ خیال پیدا ہوگا۔ بالآخر ان کا نتیجہ کیا ہے؟ مُلّا کی طرف سے اس سوال کا جواب یہ ملتا ہے کہ ان اعمال سے اللہ تعالےٰ کی خوشنودی حاصل ہوتی ہے۔ لیکن اس جواب سے اس زمانے کے انسان کا اطمینان نہیں ہوتا۔ اول تو اس کے نزدیک اس طرح کا خدا کا تصور جیسا کہ مُلّا پیش کرتا ہے، ایک مستبد حاکم کا تصور ہوتا ہے جو محض اپنی خوشنودی کے لئے لوگوں سے ایسے کام کرائے جن کا نتیجہ بجز اس کی خوشی کے اور کچھ نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ اس سے اس دور کا نوجوان یہ سوچنے پر بھی مجبور ہو جاتا ہے کہ یہ عجیب تماشا ہے کہ جو لوگ خدا کی خوشنودی حاصل کر رہے ہیں وہ دنیا میں سب سے زیادہ پست اور ذلیل ہیں اور جو اقوام خدا کی ہستی تک کی بھی قائل نہیں وہ دن بدن قوت اور سطوت حاصل کئے جا رہی ہیں۔ چونکہ ہمارے نوجوان طبقہ کو مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ان سوالات کا اطمینان بخش جواب نہیں ملتا، وہ مذہبی اعمال کو چھوڑتا جا رہا ہے۔ یہ ہے اصل وجہ اس حقیقت کی کہ۔۔۔ مسجدیں مرثیہ خواں ہیں۔ کہ نمازی نہ رہے۔ اس کی وجہ طلوعِ اسلام نہیں۔ آپ کو لاکھوں کی تعداد میں وہ نوجوان ملیں گے جنہوں نے آج تک طلوعِ اسلام کا نام تک بھی نہیں سُنا۔ لیکن وہ بھی ان مذہبی اعمال سے برگشتہ ہو چکے ہیں۔ طلوعِ اسلام کا اتنا ہی قصور ہے کہ اس نے قوم کے سامنے قرآن کو کھول کر رکھ دیا ہے۔ انہیں قرآن کے ایک ایک صفحہ پر لکھا ملتا ہے کہ ہر عمل کا ایک نتیجہ ہوتا ہے۔ قوموں کا عروج و زوال ان کے اپنے اعمال ہی کا نتیجہ ہوتا ہے جنہیں مذہبی اعمال کہا جاتا ہے۔ ان کا نتیجہ بھی اسی طرح مرتب ہوتا ہے جس طرح

دیگر اعمال کا۔ ذلت اور رسوائی خدا کا عذاب ہے۔ عزت اور قوت، دولت اور حشمت اس کی نعمت ہے۔ انسانی اعمال کے نتائج اس دنیا کی زندگی میں بھی سامنے آتے ہیں اور انہی اثرات کا سلسلہ مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی مسلسل قائم رہتا ہے۔ طلوعِ اسلام نے اتنا ہی کہا ہے۔ اگر کوئی یہ کہتا ہے کہ اگر طلوعِ اسلام قرآن کو اس طرح کھول کر سامنے نہ رکھ دیتا تو لوگوں کے دل میں یہ تجسس اور کاوش پیدا نہ ہوتی تو طلوعِ اسلام بے شک اپنے اس جرم کا اقبالی ہے۔ اس کے بعد سوچنے کی بات یہی رہ جاتی ہے کہ کیا قرآن کو بند کر دیا جائے تاکہ مسلمان بدستور (قرآن کی طرف سے جہالت کی بنا پر) بے نتیجہ مذہبی اعمال پر کاربند رہے یا قرآن کو اور وضاحت سے پھیلایا جائے تاکہ لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں کہ ان بے نتیجہ اعمال میں قرآنی نتائج کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں؟ اس باب میں ہم صرف اتنا عرض کر دینا چاہتے ہیں کہ اگر ہم نے قرآن کو بند کر دیا تو جو طبقہ زمانہ کے تقاضوں سے موجودہ بے نتیجہ مذہبی اعمال سے برگشتہ ہو چکا ہے، ان سے برگشتہ ہی رہے گا اور ان کے ساتھ اور لوگ بھی ملتے چلے جائیں گے (کیونکہ آپ اپنی خوش فہمیوں سے زمانے کے دھارے کو موڑ نہیں سکتے) لیکن اس کے ساتھ یہ طبقہ قرآن سے بھی برگشتہ ہو جائے گا (جیسا کہ اس وقت بھی ایک طبقہ موجود ہے جو موجودہ نماز روزہ ہی سے برگشتہ نہیں بلکہ خدا اور وحی تک سے برگشتہ ہو رہا ہے) لیکن اگر آپ نے ان کے سامنے قرآن کو کھول کر رکھ دیا تو اس کی توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اسلام سے برگشتہ نہیں ہوں گے۔ کیونکہ قرآن میں اتنی قوت ہے کہ وہ اس قسم کے برگشتہ ہونے والوں کو تھام لے۔ اس نازک دور میں طلوعِ اسلام کی یہی کوشش ہے۔ باقی اگر کوئی کہتا ہے کہ میں نے موجودہ مذہبی اعمال (نماز روزہ وغیرہ) کو اس لئے چھوڑا ہے کہ طلوعِ اسلام ایسا کہتا ہے تو وہ جھوٹ بولتا ہے۔ وہ خود ہی ان اعمال کو چھوڑنا چاہتا تھا۔ یہ اس کی بزدلی ہے کہ وہ اس کا کھلے بندوں اقرار نہیں کرتا، اور طلوعِ اسلام کی آڑ میں چھپنا چاہتا ہے۔ (نومبر ۱۹۵۳ء)

رسول اللہ کی نماز

قرآن کریم میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ صلوٰۃ (نماز) کا طریقہ نہیں آیا۔ یہ طریقہ نبی کریمؐ نے تجویز فرمایا تھا۔ ظاہر ہے کہ حضورؐ نے عمر بھر نماز پڑھی۔ صحابہؓ کو پڑھائی۔ اُس وقت سے اس وقت تک یہ عمل

امت میں متواتر چلا آرہا ہے۔ اس سے لازماً یہ ہونا چاہیئے تھا کہ ساری امت میں نماز کا طریقہ ایک ہی ہوتا۔ لیکن ہم دیکھ رہے ہیں کہ امت کے مختلف فرقوں میں نماز کی جزئیات میں اختلاف ہے اور ہر فرقہ کا دعویٰ یہ ہے کہ جس طریق سے وہ نماز ادا کرتا ہے رسول اللہؐ کا وہی طریق تھا۔ آپ سوچئے کہ کیا یہ بات باور کی جانے کے قابل ہے کہ مروجہ مختلف طریقوں میں سے ہر طریقہ رسول اللہؐ کا ہو! کہا جاتا ہے کہ حضورؐ نے پہلے ایک طریق سے نماز پڑھی۔ پھر دوسرے طریق سے۔ اس طرح مختلف طریقے سب رسول اللہؐ ہی کے ہیں۔ اوّل تو اس بات کو سمجھ لینا چاہیئے کہ جب رسول اللہؐ نے اپنے پہلے طریقہ کو چھوڑ کر دوسرے طریقہ کو اختیار فرمایا تو اُمّت کے لئے اس دوسرے طریقہ کا اتباع اتباعِ سُنت ہوگا۔ پہلا طریقہ منسوخ ہو گیا۔ پھر کسی فرقے کا پہلے طریقہ پر کاربند رہنا اور اُسے اتباعِ سُنت کہنا غلط ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر مختلف فرقوں کے یہاں مروجہ طریقے سب رسول اللہؐ کے ہیں۔ تو پھر ان طریقوں کے اختلاف پر مختلف فرقے آپس میں سر پھٹول کیوں کرتے ہیں۔ اُن کے اس "سر پھٹول" کی شدت یہاں تک ہے کہ اگر ایک فرقہ کا مسلمان دوسرے فرقے کے مسلمانوں کی مسجد میں جا کر اپنے طریق پر نماز ادا کرتا ہے تو یہ لوگ اپنی مسجد کے فرش کو صاف کرتے (اور بعض مقامات میں تو کہا جاتا ہے کہ وہ فرش کو اکھیڑ دیتے ہیں) اس سے واضح ہے کہ ان فرقوں کے نزدیک ہر فرقہ کی نماز رسول اللہؐ کی نماز نہیں ہے۔ طریق نماز کے سلسلہ میں فرقہ اہلِ حدیث اور اہل قرآن سے متعلق

اہلِ حدیث اور اہلِ قرآن

حضرات کی باہمی چپقلش بڑی دلچسپ ہوتی ہے۔ اہلِ حدیث حضرات کا اعتراض یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم صرف قرآن کو مانیں اور حدیث کو نہ مانیں تو بتایئے کہ ہم نماز کیسے پڑھیں۔ کیونکہ قرآن میں نماز کی تفاصیل درج نہیں ہیں۔ اس کے جواب میں اہلِ قرآن حضرات کہتے ہیں کہ آپ یہ فرمایئے کہ احادیث کی موجودگی میں ہم نماز کس طرح پڑھیں۔ کیونکہ احادیث سے نماز کی کوئی ایک شکل متعین نہیں ہوتی۔ پوری نماز کی ایک شکل تو کجا، ایک ایک تفصیل کے لئے اختلافی احادیث ملتی ہیں۔

ہمیں ایک مختصر سا پمفلٹ موصول ہوا ہے جس کا عنوان ہے "نماز"، لکھنے والے ہیں "فیض رحمانی" صاحب۔ شائع ہوا ہے مکتبہ رحمانی بہاولپور سے۔ ہمیں معلوم نہیں کہ یہ صاحب کس فرقے سے متعلق ہیں۔ لیکن وہ شروع میں لکھتے ہیں کہ:

جاننا چاہیئے کہ اہلِ سنت والجماعت کا طریقہ نماز عمل متواتر سے ثابت ہے اور قرآن حکیم و سنت صحیحہ

سے تائید وتصدیق ہوتی ہے۔

نماز کے اختلافات

لیکن اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ احادیث میں (جن کا سلسلہ جلیل القدر صحابہؓ اور واجب الاحترام صحابیاتؓ تک منتہی ہوتا ہے اور جن کے سب راوی ثقہ اور معتبر بیان کیے جاتے ہیں) نماز کے متعلق ایسی تفاصیل ملتی ہیں جو ایک دوسرے سے نہیں ملتیں۔ مثلاً:

۱۔ ترمذی میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے وقت شانوں تک ہاتھ اٹھاتے تھے۔ ابوداؤد میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے وقت کانوں کی لو تک ہاتھ اٹھاتے تھے۔

۲۔ مسلم میں روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے بعد نماز کو الحمد للہ رب العالمین سے شروع کرتے تھے۔ بخاری میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے بعد فاتحہ سے قبل اَللّٰھُمَّ بَاعِدْ بَیْنِیْ الخ دعا پڑھتے تھے۔ ابوداؤد میں روایت ہے۔ رسول اللہ تکبیر کے بعد فاتحہ سے قبل اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ پڑھتے تھے۔ نسائی میں روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے بعد فاتحہ سے قبل اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ الآیہ پڑھتے تھے۔ نسائی میں دوسری روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے بعد فاتحہ سے قبل اِنِّیْ وَجَّھْتُ وَجْھِیَ لِلَّذِیْ الآیہ۔ پڑھتے تھے۔ ترمذی اور ابن ماجہ میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم تکبیر تحریمہ کے بعد فاتحہ سے قبل سُبْحٰنَکَ اللّٰھُمَّ ثنا پڑھتے تھے۔

۳۔ ترمذی، ابوداؤد۔ نسائی میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے صرف تکبیر تحریمہ کے وقت ہاتھ اٹھائے کانوں تک۔ پھر بار بار رفع الیدین نہیں کیا۔ ساری نماز میں بخاری اور مسلم میں روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم نماز شروع کرتے وقت دونوں ہاتھ مونڈھوں تک اٹھاتے تھے اور رکوع کے بعد بھی رفع الیدین کرتے تھے۔

۴۔ سنن امام شافعیؒ اور مسند احمد بن حنبل میں روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم نماز میں بحالت قیام سینہ پر ہاتھ باندھتے تھے۔ موطا امام مالکؒ میں روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم ہاتھ چھوڑ کر نماز پڑھتے تھے۔

۵۔ ترمذی، نسائی، ابوداؤد میں روایت ہے۔ رسول اللہ صلعم نے فرمایا جس شخص کو قرآن میں سے کچھ بھی یاد نہ ہو وہ نماز میں صرف سبحان اللہ اور لا الٰہ الا اللہ قیام میں پڑھ کر رکوع کرے۔ اس کے لئے یہ ہی کافی ہے۔ موطا، ابن ماجہ۔ بخاری، مسلم میں روایت ہے۔ رسول اللہؐ نے فرمایا۔ بغیر فاتحہ

نماز ناقص ہے۔

۶۔ مؤطا میں روایت ہے کہ نماز باجماعت میں امام کے پیچھے قرأت فاتحہ ناجائز ہے، خواہ نماز جہری ہو یا سری۔ مؤطا میں دوسری روایت ہے کہ نماز باجماعت میں امام کے پیچھے قرأت فاتحہ جہری نماز میں ممنوع ہے اور سری میں جائز ہے۔ بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ نماز باجماعت میں امام کے پیچھے قرأت فاتحہ فرض ہے۔ خواہ نماز جہری ہو یا سری۔

۷۔ مؤطا میں روایت ہے آمین بالجہر ابتدائے اسلام میں تھا۔ پھر متروک و منسوخ ہوا۔ ترمذی اور ابوداؤد میں روایت ہے کہ بعد فاتحہ آمین بالسر آہستہ کہنا چاہیئے۔ خواہ نماز باجماعت ہو یا تنہا۔ بخاری و مسلم میں روایت ہے کہ جہری نماز میں بعد فاتحہ آمین بالجہر اور سری نماز میں بالسر کہنا چاہیئے خواہ جماعت ہو یا تنہا۔

۸۔ بخاری میں روایت ہے رسول اللہ صلعم نے نماز کے قعدہ کے لیئے یہ تشہد تعلیم فرمایا۔ اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ وَالطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِيْنَ۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ۔ مسلم میں روایت ہے رسول اللہ صلعم نماز کے قعدہ کے لئے یہ تشہد سکھاتے تھے۔ اَلتَّحِيَّاتُ الْمُبَارَكَاتُ الصَّلَوَاتُ الطَّيِّبَاتُ لِلّٰہِ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِيْنَ۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ نسائی میں روایت ہے کہ رسول اللہ صلعم نے نماز کے قعدہ کے لیئے یہ تشہد تعلیم فرمایا۔ بِسْمِ اللّٰہِ وَبِاللّٰہِ اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰہِ وَالصَّلَوَاتُ الطَّيِّبَاتُ اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ اَيُّهَا النَّبِيُّ وَرَحْمَةُ اللّٰہِ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِيْنَ۔ اَشْهَدُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ وَاَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُهٗ وَرَسُوْلُهٗ اَسْئَلُ اللّٰہَ الْجَنَّةَ وَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ النَّارِ۔ مؤطا میں روایت ہے کہ عبداللہ بن عمرؓ یہ تشہد قعدہ میں پڑھتے تھے۔ بِسْمِ اللّٰہِ اَلتَّحِيَّاتُ لِلّٰہِ الصَّلَوَاتُ لِلّٰہِ الزَّاكِيَاتُ لِلّٰہِ اَلسَّلَامُ عَلَى النَّبِيِّ وَرَحْمَةُ وَبَرَكَاتُهٗ اَلسَّلَامُ عَلَيْنَا وَعَلٰى عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِيْنَ۔ شَهِدْتُ اَنْ لَّا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰہُ شَهِدْتُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ۔ مؤطا میں تیسری روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نماز کے

قعدہ میں یہ تشہد پڑھتی تھیں۔ اَلتَّحِیَّاتُ الطَّیِّبَاتُ الصَّلَوٰتُ الزَّاکِیَاتُ لِلّٰہِ اَشْھَدُ اَنْ لَّآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ وَحْدَہٗ لَا شَرِیْکَ لَہٗ وَ اَنَّ مُحَمَّدًا عَبْدُ اللّٰہِ وَرَسُوْلُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ اَیُّھَا النَّبِیُّ وَرَحْمَۃُ اللّٰہِ وَبَرَکَاتُہٗ اَلسَّلَامُ عَلَیْنَا وَ عَلٰی عِبَادِ اللّٰہِ الصَّالِحِیْنَ۔

ان اختلافی روایات کو نقل کرنے کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ:

> اب کون فیصلہ کرے کہ ان مختلف روایتوں میں صحیح کیا ہے۔ راویوں کی جرح و تعدیل اور سلسلہ سند کے اتصال وغیرہ پر بحث کرنے کی بجائے ان روایتوں کو قرآن کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے۔

قرآن سے دلیل کی مثال

ان روایتوں کو قرآن حکیم کی روشنی میں کس طرح دیکھا گیا ہے، اس کا اندازہ حسب ذیل مثال سے لگایئے۔ وہ فرماتے ہیں:

> قرآن کریم میں ارکان و اذکار نماز کی آیات بھی ملتی ہیں جن سے احادیث شریفہ کی تصحیح ہو سکتی ہے۔ جو روایات قرآنی آیات کے خلاف مروی ہیں وہ سب یقیناً وضعی ہیں۔ مثلاً نماز کے قیام میں ہاتھ چھوڑ کر کھڑے ہونے یا زیر ناف ہاتھ باندھنے کی روایات قرآنی ہدایات کے خلاف ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ہوا تھا کہ گریبان میں ہاتھ ڈالو" اُسْلُکْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ" اس کے ساتھ ہی یہ حکم بھی تھا کہ ایک ہاتھ سے دوسرے کو پکڑو۔" وَاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھْبِ۔" سینہ پر اس طرح ہاتھ باندھو کہ ایک ہاتھ سے دوسرا ہاتھ پکڑے رہو با ادب ہو کر۔

آپ نے غور فرمایا کہ "نماز میں سینہ پر ہاتھ باندھنے" کی تائید کون سی آیت قرآنی سے حاصل کی گئی ہے؟ اس آیت سے جس کا صلوٰۃ سے دُور کا بھی تعلق نہیں۔ یہ سورۂ قصص کی آیت ہے جس میں حضرت موسیٰؑ سے کہا گیا ہے کہ۔ اُسْلُکْ یَدَکَ فِیْ جَیْبِکَ تَخْرُجْ بَیْضَآءَ مِنْ غَیْرِ سُوْٓءٍ وَّاضْمُمْ اِلَیْکَ جَنَاحَکَ مِنَ الرَّھْبِ فَذٰنِکَ بُرْھَانٰنِ مِنْ رَّبِّکَ اِلٰی فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِہٖ۔ اِنَّھُمْ کَانُوْا قَوْمًا فٰسِقِیْنَ۔ (۲۸/۳۲) اس کا لفظی ترجمہ یہ ہے:" اپنا ہاتھ اپنے گریبان میں ڈال۔ وہ بغیر کسی عیب کے سفید ہو کر نکلے گا اور خوف میں اپنا بازو اپنی طرف ملا لے۔ یہ دو روشن دلیلیں تیرے رب کی طرف سے فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف ہیں۔ وہ نافرمان لوگ ہیں۔" اس آیت سے یہ

نتیجہ نکالنا کہ خدا نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ نماز میں ہاتھ سینہ پر باندھا کرو (معاف فرمائیے) قرآن سے دل لگی کرنا ہے (یہ دلیل بالعموم فرقہ اہل قرآن کی طرف سے پیش کی جاتی ہے۔ اور اگر ہم غلطی نہیں کرتے تو مولانا عبداللہ چکڑالوی مرحوم نے اسی کو بطور دلیل پیش کیا ہے)۔

حقیقت یہ ہے کہ نہ تو قرآن کریم نے صلوٰۃ کی ان تفاصیل کا ذکر کیا ہے اور نہ ہی نماز کی کوئی واحد شکل احادیث کی رُو سے متعین ہو سکتی ہے۔ اگر ایسا ہو سکتا تو ہمارے مختلف فرقوں میں نماز کی تفاصیل میں اختلاف کیوں ہوتا درآنحالیکہ تمام فرقے اپنی اپنی تفاصیل کی سند میں احادیث پیش کرتے ہیں اور سب اپنی اپنی احادیث کو صحیح اور دوسروں کی احادیث کو ضعیف قرار دیتے ہیں۔ ان اختلافات کے رفع کرنے کی آج کوئی شکل نہیں۔ اس کی ایک ہی شکل ہے اور وہ یہ کہ اُمت میں پھر سے خلافت علیٰ منہاج رسالت کا احیاء ہو جائے جس کی بنیاد قرآن کریم کے محفوظ اور غیر متبدل آئین پر ہو۔ اس نظام کو اس کا حق پہنچے گا کہ وہ اُمت کے اختلافات کا فیصلہ کر کے اُن میں پھر سے اس قسم کی وحدتِ فکر و عمل پیدا کرے جیسی وحدت عہدِ محمد رسول اللہ والذین معہ (رضی اللہ تعالےٰ عنہم) میں تھی جب تک ایسا نہ ہو اُمت میں جو طریقے رائج چلے آرہے ہیں۔ انہیں علیٰ حالہٖ رہنے دیا جائے۔ ان میں کسی قسم کی تبدیلی پیدا کرنا امت میں مزید تفرقہ کا موجب ہوگا اور تفرقہ قرآن کی رُو سے شرک ہے۔

طلوعِ اسلام کی یہی دعوت اور یہی پکار ہے۔ (دسمبر ۱۹۵۹ء)

عملِ متواتر

لاہور سے ایک دردمند مسلمان (جن کی ساری عمر ملت کی غمخواری میں گذری ہے) لکھتے ہیں،

"آپ کوشش کرتے ہیں (اور آپ کی یہ کوشش بڑی نیک ہے۔ اللہ آپ کو اس کی جزا دے) کہ مسلمان اپنے اختلافات اور فرقوں کو چھوڑ کر پھر سے ویسی امتِ واحدہ بن جائیں۔ جیسی رسول اللہ کے زمانہ میں تھی۔ لیکن میری سمجھ میں تو یہ بات نہیں آسکی کہ یہ کیسے ممکن ہوگا۔ کیا آپ کو یقین ہے کہ مسلمان اپنے ان اختلافات کو چھوڑ دیں گے جن سے ذرا ذرا سی بات پر وہ مرنے مارنے پر تیار ہو جاتے ہیں۔ آپ عقائد کو چھوڑ دیجئے۔ اعمال کو لیجئے۔ ہمیں یہ حضرات بتاتے ہیں کہ عملِ متواتر یقینی حیثیت رکھتا ہے۔

یعنی عملِ متواتر کے متعلق یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ نے ایسا ہی کیا تھا۔ اس لئے اس کا اتباع ہمارے لئے فرض ہو جاتا ہے۔ اس قسم کے اعمالِ متواترہ میں نماز کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ اب اس نماز کو آپ دیکھئے کیا کسی ایک فرقے کی نماز دوسرے فرقے سے ملتی ہے؟ اور ہر فرقہ اپنی نماز کو رسول اللہ کی نماز قرار دیتا ہے۔ سال بھر کی عام نمازوں کو چھوڑیئے۔ رمضان المبارک اور عید کی نمازوں کو لیجئے۔ رمضان میں ایک فریق آٹھ رکعت تراویح کو صحیح قرار دیتا ہے اور دوسرا گروہ بیس رکعت کو، اور دونوں عملِ متواتر ہیں۔ کیا یہ دونوں عمل یقینی طور پر رسول اللہ کے ہیں؟ رمضان کے پورے مہینے کے اس بیّن اختلاف کے بعد عید کی صبح کو اُٹھیئے۔ آپ کو اخبارات میں ایک لمبی چوڑی فہرست اُن مسجدوں کی ملے گی (یعنی مختلف فرقوں کی مسجدوں کی) جن میں نمازِ عید ہو گی۔ اس میں پہلا فرق تو یہ نظر آئے گا

عید کی نماز

کہ بعض کے نزدیک عید کی نماز مسجد میں نہیں ہو سکتی کھلے میدان میں ہو سکتی ہے دوسروں کے نزدیک یہ مسجد میں بھی ہو سکتی ہے۔ اس کے بعد نماز کے وقت کا سوال آتا ہے۔ اس ضمن میں آپ دیکھیں گے کہ صبح چھ بجے سے لے کر دس بجے تک مختلف اوقات میں نمازِ عید پڑھی جائے گی۔ اور اُن میں سے ہر ایک اپنے وقت کو عمل متواتر بتائے گا۔ آپ اب نمازِ عید میں شریک ہو جائیں۔ ایک جگہ آپ کو بارہ تکبیریں سنائی دیں گی۔ سات پہلی رکعت میں (نیت کی تکبیر کے علاوہ) اور پانچ دوسری میں (رکوع والی تکبیر کے علاوہ) دوسری جگہ آپ کو چھ تکبیریں ہی دکھائی دیں گی۔ تین پہلی رکعت میں (نیت کی تکبیر اور رکوع کی تکبیر کے علاوہ) اور تین دوسری رکعت میں (رکوع کی تکبیر کے علاوہ) یہ بھی ہر گروہ میں عمل متواتر کے طور پر چلا آ رہا ہے۔ تکبیروں کے بعد قرأت کی طرف آیئے۔ ایک گروہ پہلی رکعت میں الحمد شریف سے پہلے زاید تکبیریں کہے گا اور دوسری رکعت میں قرأت کے بعد رکوع میں جانے سے پہلے۔ لیکن دوسرا گروہ دونوں رکعتوں میں قرأت سے پہلے تکبیریں کہے گا۔ یہ عمل بھی متواتر سے چلا آ رہا ہے۔ تعداد کے بعد انداز کی طرف آیئے۔ ایک گروہ ان تکبیروں کے وقت کانوں تک ہاتھ اٹھائے گا، دوسرا بغیر ہاتھ اٹھائے تکبیریں کہے گا اور دونوں اپنے اپنے عمل کو متواتر کہیں گے۔

فرمایئے کہ جہاں عملِ متواتر میں بھی اختلافات کی حالت یہ ہو، وہاں وحدت کیسے پیدا ہو سکتی ہے؟ اور یہ اختلافات ابھی صرف اہلِ سنت والجماعت کے دو فرقوں (حنفی اور اہلِ حدیث) کے ہیں۔ باقی

فرقوں کے ساتھ میں نے نماز نہیں پڑھی۔ اس لئے مجھے ان کا علم نہیں۔

آپ کی کوششوں کی خدا آپ کو جزا دے۔ لیکن مجھے تو وحدت پیدا ہونے کی کوئی امید نظر نہیں آتی۔ ابھی ابھی عید کی نماز پڑھ کر آیا ہوں اور یہ خط آپ کو لکھ رہا ہوں۔ آپ بھی کہیں گے کہ یہ کس قسم کی عید مبارک کا خط ہے لیکن جب دل سے یہی آواز نکلے تو جھوٹی خوشی کا اظہار کیسے ہو؟

طلوعِ اسلام یہ درست ہے کہ جب تک غلط اور صحیح کے پرکھنے کے لئے ہمارے معیار وہی رہیں گے جو اس وقت ہیں۔ اُمت میں وحدت پیدا ہونے کی کوئی صورت نہیں ہو سکے گی۔ لیکن معیار کے بدل دینے سے اختلافات کا مٹ جانا مشکل نہیں ہوگا۔ اور وہ معیار یہ ہے کہ عقیدہ ہو یا عمل، جو کچھ قرآن کے مطابق ہے وہ صحیح ہے اور جو اس کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔

اب رہیں وہ جزئیات جن کا ذکر قرآن میں نہیں۔ تو ان میں وحدت کی شکل صرف اسلامی نظام پیدا کر سکتا ہے۔ طلوعِ اسلام کی یہی کوشش ہے کہ صحیح اور غلط کے متعلق ہمارا معیار قرآنی ہو جائے اور پاکستان میں اسلامی نظام علیٰ منہاجِ نبوت قائم ہو جائے تاکہ وہ ہمارے ان اختلافات کو مٹا کر ہمیں پھر سے امتِ واحدہ بنا دے۔ ہمیں اس نظریہ کی صحت پر کامل یقین اور اس کی کامیابی کی پوری پوری امید ہے۔ اب رہا یہ کہ اس کی کامیابی کب سامنے آئے گی، سو اس کے متعلق ہم کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اس کے متعلق تو خود نبی اکرمؐ سے کہہ دیا گیا تھا کہ فَاِنَّمَا عَلَیْكَ الْبَلٰغُ وَ عَلَیْنَا الْحِسَابُ (۱۳/۴۰) تمہارے ذمّے اس پیغام کو پہنچاتے چلے جانا ہے۔ یہ چیز ہمارے ذمّے ہے کہ اس کے نتائج کب مرتب ہو کر سامنے آئیں گے۔ لہٰذا ہمیں اپنا کام کرتے رہنا چاہیئے۔ مایوس نہیں ہونا چاہیئے۔ (۱۹۵۷ء)

شیعہ حضرات کی نماز کراچی سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ:۔

"طلوعِ اسلام کے جون کے پرچہ[1] میں آپ کے ایک مکتوب نگار نے یہ بتایا ہے کہ اہلِ حدیث اور حنفی حضرات کے ہاں تراویح اور عید کی نماز میں کتنے اختلافات ہیں اور ہر فریق اپنے اپنے عمل کو تواتر سے

---

[1] یہ۔ مندرجہ بالا شذرہ

صحیح ثابت کرتا ہے۔ لیکن میرے نزدیک حنفی فرقہ سے کہیں زیادہ اہم فرقہ شیعہ ہے۔ اس لئے کہ حنفی تو پھر بھی بعد میں پیدا ہوئے تھے، شیعہ خلافت راشدہ کے زمانے میں موجود تھے۔ اس لئے جس نماز کو شیعہ حضرات اپنا عمل متواتر قرار دیتے ہیں اس کا زمانہ رسول اللہ صلعم کے زمانے سے متصل ہے۔ دوسری طرف اہل سُنت والجماعت حضرات کا دعویٰ ہے کہ ان کی نماز بھی تواتر سے عہد رسالت مآب صلعم اور عہد خلافت راشدہ تک پہنچتی ہے۔ اب آپ ذرا شیعہ حضرات کی نماز کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا یہ نماز رسول اللہ صلعم کی نماز ہے یا سُنی حضرات کی نماز۔

۲۔ شیعہ حضرات کے ہاں نماز صرف فرضوں کی رکعات کا نام ہے۔ نیز وہ بجز زمین یا نباتات کے جو زمین سے اُگے اور کسی چیز پہ سجدہ جائز نہیں سمجھتے۔

۳۔ ان کے ہاں غالباً امام کی غیبت کی وجہ سے نماز انفرادی طور پر پڑھی جاتی ہے۔ اس لئے سب سے پہلے اذان دینا ضروری ہے اور اذان میں اَشْهَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَسُوْلُ اللّٰہِ کے بعد اَشْهَدُ اَنَّ اَمِیْرَالْمُؤْمِنِیْنَ وَ اَمَامَ الْمُتَّقِیْنَ عَلِیًّا وَلِیُّ اللّٰہِ وَ وَصِیُّ رَسُوْلُ اللّٰہِ وَخَلِیْفَةٌ بلافصل بھی کہا جاتا ہے۔ اسی طرح حیّ علی الفلاح کے بعد حیّ علی خیر العمل بھی دو مرتبہ کہا جاتا ہے۔ اذان کے بعد نمازی خود ہی اقامت کہتا ہے۔

۴۔ نماز شروع کرنے کے لئے سات تکبیریں کہی جاتی ہیں پھر یہ دعا پڑھی جاتی ہے۔ اللھم انت الملك الحق المبین لا الٰہ الا انت سُبحٰنك وبحمدك انی ظلمت نفسی فاغفرلی ذنبی انہ لا یغفر الذنوب الّا انت۔ اس کے بعد نمازی پھر اسی طرح دو مرتبہ اللہ اکبر کہے اور یہ دعا پڑھے۔ اللّٰھُم لبیك وسعدیك والخیر فی یدیك والشر لیس الیك والمھدی من ھدیت عبدك وابن عبدیك ذلیل بین یدیك لا ملجاء الا الیك ولا مھرب منك الا الیك سبحٰنك وحنانیك تبارکت وتعالیت سُبحٰنك ربنا ورب البیت الحرام پھر ایک مرتبہ اللہ اکبر کہے اور ربّ اجعلنی مقیم الصلٰوۃ والی دعا پڑھے یہ ہو گئیں سات تکبیریں پھر تکبیر تحریمہ کہے اور یہ دعا پڑھے۔ وجہت وجھی للذی فطر السمٰوٰت والارض۔

قیام میں دونوں ہاتھ رانوں پر رکھے۔ سورۂ فاتحہ اور ایک سورت کے بعد ہاتھوں کو کانوں تک اٹھائے اور اللہ اکبر کہہ کر رکوع میں جائے۔

دوسری رکعت میں الحمد اور سورت کے بعد کذالک اللہ ربی تین بار کہے پھر ہاتھوں کو دعا کے لئے اپنے منہ کے برابر اٹھائے اور یہ دعا پڑھے۔ اللھم اغفرلنا وارحمنا وعافنا واعف عنا فی الدنیا والاٰخرۃ انک علیٰ کل شیئ قدیر۔ پھر پہلی رکعت کی طرح دوسری رکعت پوری کرے۔ اگر نماز دو رکعتی ہے تو پہلے تشہد پڑھے یعنی اشھد ان لا الٰہ .... عبدہٗ ورسولہٗ اس کے بعد اللھم صل علیٰ محمد وال محمد پڑھے اور پھر کہے السلام علیک ایھا النبی .... یہ پہلا سلام ہے پھر دوسرا سلام جانب قبلہ کہے اور گوشۂ چشم سے دائیں طرف اشارہ کرے۔

اگر نماز تین یا چار رکعت کی ہو تو تیسری رکعت میں الحمد کے بعد تین بار یہ تسبیح پڑھے سُبحٰن اللہ والحمد للہ والا الٰہ الا اللہ واللہ اکبر استغفر اللہ۔ اس طرح رکعتیں پوری کرکے تشہد اور سلام کے بعد تین بار اللہ اکبر کہے۔ اس سے نماز ختم ہو جائے گی۔

واضح رہے کہ اگرچہ نماز اکیلے اکیلے پڑھی جاتی ہے لیکن قرأت باآواز بلند ہوتی ہے۔

جہاں تک اوقات صلوٰۃ کا تعلق ہے ظہر کا وقت اس وقت تک رہتا ہے جبکہ غروب آفتاب میں پانچ رکعتوں کا وقت باقی رہے۔ یعنی چار رکعتیں ظہر کی پڑھ لی جائیں اور ایک رکعت عصر کی۔ عصر کی باقی تین رکعتیں غروب آفتاب کے بعد بھی پڑھ لی جائیں تو جائز ہے۔ اسی طرح مغرب وعشار کا وقت نصف شب تک ہے۔ بشرطیکہ نصف شب میں چار رکعتوں کا وقت باقی رہے، یعنی تین مغرب کی اور ایک رکعت عشار کی پڑھی جا سکے۔ عشار کی باقی تین رکعتیں نصف شب کے بعد بھی پڑھی جا سکتی ہیں۔

فرضوں کے علاوہ نماز نافلہ میں نماز ظہر سے پہلے آٹھ رکعتیں اور عصر سے پہلے آٹھ رکعتیں پڑھی جائیں۔

جمعہ کی نماز بوجہ غیبت امام علیہ السلام سے ساقط ہے لیکن بعض کے نزدیک نماز جمعہ کو نماز ظہر کے بدلے ادا کیا جا سکتا ہے۔ اس میں رکوع میں جانے سے پہلے ہاتھوں کو دعا کے لئے اٹھا کر یہ پڑھنا چاہیئے۔ اللھم ان عبیدا من عبادک الصالحین قاموا بکتابک وسنۃ نبیک فاجزھم منا خیر الجزاء۔ اسی طرح دوسری رکعت میں پڑھنا چاہیئے۔

بعض کے نزدیک جمعہ کی نماز میں اول رکعت میں ایک مرتبہ الحمد اور سات مرتبہ قل ہو اللہ، اور

دوسری رکعت میں الحمد کے بعد سات مرتبہ تعوذتین پڑھی جائیں۔ سلام کے بعد سات مرتبہ آیتہ الکرسی۔
اسی طرح آٹھ رکعتیں پوری کی جائیں۔

ان نمازوں کے علاوہ ہر مہینہ کی مختلف تاریخوں میں اور بھی کئی نمازیں آتی ہیں جس میں یوم نوروز کی نماز خاص اہمیت رکھتی ہے۔

آپ اگر دیکھنا چاہیں کہ شیعہ حضرات کی نماز میں اور سنی حضرات کی نماز میں کتنا فرق ہے تو آپ کسی صاحب سے کہیں کہ وہ اوپر کے طریق کے مطابق نماز پڑھے۔ صاف نظر آجائے گا کہ دونوں میں کس قدر فرق ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ آیا رسول اللہ صلعم اس طرح نماز پڑھتے تھے جس طرح شیعہ حضرات پڑھتے ہیں۔ یا اس طرح جس طرح سنی حضرات پڑھتے ہیں۔ دعویٰ دونوں کا یہی ہے کہ رسول اللہ ان کی سی نماز پڑھتے تھے اور دونوں نمازیں مسلمانوں میں متواتر چلی آرہی ہیں۔ ایک بات اور بھی قابل غور ہے کہ ہمارے مختلف فرقے مختلف طور پر نماز پڑھتے ہیں اور کوئی دوسرے کے متعلق یہ نہیں کہتا کہ اس نے ایک نئی قسم کی نماز ایجاد کر رکھی ہے۔ اس کی نماز کو بھی وہی نماز سمجھا جاتا ہے۔ جسے اللہ نے فرض قرار دیا ہے۔ یہ تمام حضرات ان مختلف نمازوں کو گوارہ کرتے ہیں۔ لیکن اگر آج کوئی شخص نماز میں کوئی ایسی حرکت کرے گا جو ان فرقوں میں سے کسی کے ہاں نہ پائی جاتی ہو تو اُسے یہ حضرات الحاد اور بے دینی اور فتنہ قرار دینے لگ جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر، ہر وہ اختلاف جس سے ہمارے مولوی صاحبان مانوس ہو چکے ہیں، عین دین ہے۔ لیکن کوئی ایسی بات جس سے یہ مانوس نہیں وہ فتنہ ہے۔ مثلاً حنفی بیس رکعت تراویح پڑھتے ہیں، اور اہل حدیث آٹھ رکعت، شیعہ حضرات پڑھتے ہی نہیں۔ اگر آٹھ رکعت پہلے سے نہ چلی آتیں اور کوئی شخص آج آٹھ رکعت تراویح شروع کر دیتا تو آپ دیکھتے کہ حنفی حضرات اُسے کس طرح دین میں فتنہ قرار دے دیتے۔ لیکن اب یہ حضرات اسے فتنہ نہیں کہتے۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ دونوں میں سے ایک ہی عمل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ ہر گروہ ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے

طلوع اسلام کا مسلک بالکل صحیح نظر آتا ہے کہ اگر قرآن کریم کی بنیادوں پر خلافت علیٰ منہاج النبوت قائم ہو جائے تو پھر یہ اختلافات مٹ سکتے ہیں۔ اس کے سوا امت کی وحدت کی کوئی صورت پیدا نہیں ہو سکتی۔ اور چونکہ اسلام اور فرقہ بندی ایک دوسرے کی نقیض ہیں، اس لئے اسلام وہیں قائم ہو سکتا ہے جہاں اُمت میں وحدت ہو۔ اگر آپ مجھے لا تقنطوا من رحمۃ اللہ۔ کے خلاف جانے

والا قرار نہ دیں تو میرے خیال میں امت واحدہ والا اسلام تو شائد کسی ایسی قوم ہی میں قائم ہو سکے جو صرف قرآن کی بنیادوں پہ اسلام لائے۔ ورنہ یہ ممکن نظر نہیں آتا کہ ہمارے موجودہ فرقے یہ اختلافات چھوڑ دیں۔ ہاں خلافت کے قیام کی بات اور ہے۔

طلوعِ اسلام | یہ خط بیشتر معلومات پر مبنی ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ قرآن کی بنیادوں پہ جہاں بھی خلافت علیٰ منہاج النبوت قائم ہو گئی وہاں اختلافات مٹ جائیں گے۔ ایسی خلافت کے قیام میں سب سے بڑی رکاوٹ ہمارے مولوی صاحبان ہیں۔ جن میں سے کوئی بھی اپنے فرقہ کی نسبت سے بلند ہو کر اپنے آپ کو صرف مسلمان کہنے کے لئے کبھی تیار نہیں ہوتا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ ہر داعی الی القرآن کو ملحد اور بے دین اور نہ جانے کیا کیا قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ فرقہ بندی کو از روئے قرآن شرک سمجھتا ہے

(۱۹۵۷ء ——)

اُردو زبان میں نماز۔ (۱)

اخبارات سے اطلاع ملی ہے کہ لاہور میں ایک تحریک بدیں غرض شروع ہوئی ہے کہ نماز (عربی زبان کے بجائے) اُردو زبان میں پڑھی جائے۔ سوال یہ ہے کہ قرآنی نقطۂ نگاہ سے یہ خیال کیسا ہے؟ ظاہر ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے۔ اُس کا بیشتر حصہ قرآن کریم پر مشتمل ہے۔ لہذا یہ سوال سمٹ کر یہاں آجاتا ہے کہ کیا قرآن عربی زبان کے بجائے اُردو زبان میں پڑھا جا سکتا ہے۔ یا بالفاظ دیگر کیا قرآن کا ترجمہ (اُردو یا کسی اور زبان میں، حتیٰ کہ خود عربی زبان کے اور الفاظ میں) قرآن کہلا سکتا ہے؟

اس سوال کا کھلا ہوا اور دو ٹوک جواب تو یہ ہے کہ قرآن اپنے الفاظ میں خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی ہے اور ان الفاظ کی جگہ اور الفاظ خواہ وہ عربی زبان ہی میں کیوں نہ ہوں کبھی قرآن نہیں کہلا سکتے۔ لیکن اس ضمن میں بعض گوشوں سے مجھے جو خطوط موصول ہوئے ہیں اُن سے مترشح ہوتا ہے کہ بعض لوگوں

ایک غلط خیال | کے دل میں یہ خیال ہے کہ خُدا کی طرف سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف قرآن کا مفہوم وحی ہُوا تھا۔ الفاظ نہیں۔ چونکہ حضورؐ کے اوّلین مخاطب

عرب تھے۔ اس لئے آپؐ نے اس مفہوم کو اُن لوگوں کی زبان میں بیان فرما دیا۔ لہٰذا جن لوگوں کی زبان عربی نہیں وہ اگر قرآن کے مفہوم کو اپنی زبان میں ادا کرلیں تو یہی قرآن کا بدل ہو جائے گا۔ یہ ہے وہ غلط تصور جس کے ازالہ کے لئے میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اس نکتہ پر ذرا تفصیل سے گفتگو کی جائے۔ ورنہ جہاں تک اس سوال کا تعلق ہے کہ نماز اُردو زبان میں پڑھی جا سکتی ہے یا نہیں۔ اس کا جواب تو ایک لفظ میں دیا جا سکتا ہے یعنی ـــــ نہیں۔

علامہ اقبالؒ نے اپنے خطبات میں لکھا ہے کہ یہ بحث کہ قرآن کا صرف مفہوم قلبِ نبویؐ پر وحی ہوا تھا یا اس کے الفاظ بھی، ہماری تاریخ میں ایک مرتبہ (مسئلہ خلق قرآن کے سلسلہ میں) بڑی شدید بحث کا موضوع بن گیا تھا۔ لیکن ایک تو اُس زمانے میں اس مسئلہ کی نوعیت کچھ مختلف تھی۔ دوسرے جن لوگوں نے اب سوال کو اٹھایا ہے وہ قدامت پرست طبقہ سے نہیں بلکہ جدید تعلیم یافتہ گروہ سے متعلق ہیں۔ اس لئے مناسب یہی ہے کہ اِن سے اِن کی زبان میں گفتگو کی جائے تا کہ اُن کے سامنے حقیقت واضح طور پر آجائے۔

وحی کا انکار

ہمارے جدید تعلیم یافتہ گروہ میں کچھ تو وہ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم خود نبی اکرمؐ کے اپنے خیالات اور تصورات کا مجموعہ ہے لیکن چونکہ آپؐ نابغہ (GENIUS) واقع ہوئے تھے اس لئے ایک (GENIUS) کی طرح آپؐ (معاذاللہ) یہی سمجھتے تھے کہ ـــ آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں ـــــ ان لوگوں سے صرف اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس قسم کا خیال وحی اور قرآن کا کھلا ہوا انکار ہے۔ جس کے بعد کوئی شخص اپنے آپ کو مسلمان نہیں کہہ سکتا۔ قرآن خدا کی طرف سے نازل شدہ وحی ہے جس میں نبی اکرمؐ کے اپنے خیالات و تصورات کا کوئی دخل نہیں۔

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو (جیسا کہ پہلے کہا گیا ہے) یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کے خیالات تو خُدا کی

الفاظ اور خیالات کا باہمی تعلق

طرف سے القاء ہوتے تھے۔ لیکن ان خیالات کو حضورؐ بیان اپنے الفاظ میں فرماتے تھے۔ یہی وہ طبقہ ہے جو سرِ دست ہمارا مخاطب ہے۔ جنہیں سب سے پہلے یہ بتانا ضروری ہے کہ خیالات اور الفاظ میں باہمی تعلق کیا ہوتا ہے۔

علامہ اقبالؒ نے ضرب کلیم میں "معانی دتن" کے عنوان کے ماتحت کہا ہے۔

سے ارتباطِ حرف و معنی ۔ اختلاط جان و تن
جس طرح اخگر قبا پوش اپنی خاکستر سے ہے

اس شعر میں انہوں نے نہایت مختصر اور مرتکز انداز سے اُس فلسفیانہ بحث کو سمو دیا ہے۔ جس کی رُو سے اس اہم سوال کو حل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ لفظ اور خیال کا باہمی تعلق کیا ہے۔ اس سوال کو انہوں نے اپنے خطبات (خطبۂ اوّل) میں بھی ضمنی طور پر چھیڑا ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتے ہیں۔

مبہم اور بے زبان احساس (FEELING) اپنے مقصود تک پہنچنے کے لئے تخیل (IDEA) کی شکل اختیار کرتا ہے اور تخیل اپنا لباس آپ بُن کر (لفظ کی صورت میں) مرئی طور پر سامنے آجاتا ہے۔ یہ کہنا محض استعارہ نہیں کہ تخیل اور لفظ دونوں، احساس کے بطن سے بیک وقت پیدا ہوتے ہیں۔ یہ منطقی اندازِ فہم (کا نقص) ہے جو یہ تصور کرتا ہے کہ تخیل اور تلفظ ایک دوسرے کے بعد پیدا ہوتے ہیں اور اس طرح اپنے لئے آپ مشکلات پیدا کر لیتا ہے۔

ڈاکٹر بک ا (R.M. BUCKE) اپنی مشہور کتاب (COSMIC CONSCIOUSNESS) میں تصور (CONCEPT) اور لفظ کے باہمی تعلق کے سلسلے میں لکھتا ہے۔

ہر لفظ کے لئے ایک تصور ہوتا ہے اور ہر تصور کے لئے ایک لفظ۔ ایک دوسرے سے الگ رہ کر ان کا وجود ہی باقی نہیں رہ سکتا۔ کوئی نیا لفظ معرضِ وجود میں نہیں آسکتا۔ جب تک وہ کسی کے تصور کے اظہار کا ذریعہ نہ ہو۔ اور کوئی نیا تصور پیدا نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کے ساتھ ہی اس کے اظہار کے لئے ایک نیا لفظ وجود میں نہ آجائے۔ (ص ۲۷)

پروفیسر اربن (W.M. URBAN) نے اپنی کتاب (HUMANITY AND DEITY) میں اس موضوع پر تفصیل سے گفتگو کی ہے کہ وجدان (INTUITION) اور الفاظ کا باہمی تعلق کیا ہے۔ وہ کروچ (CROCH) کے حوالے سے لکھتا ہے کہ:

الفاظ کے بغیر وجدان کا وجود ہی ناممکن ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ ایک شخص پہلے کسی شے کا تصور کرے اور اس کے بعد اس تصور کے اظہار کے لئے الفاظ تلاش کرے۔ وہ تصور خود الفاظ سے ترتیب پاتا ہے۔ (ص ۵۳)

اس لئے وجدان کو الفاظ سے الگ کیا ہی نہیں جاسکتا۔ (ص۲۹۷)

اسی سلسلہ میں وہ آگے چل کر لکھتا ہے کہ:۔

جو کچھ مذہب کی زبان بیان کرتی ہے اسے دوسرے الفاظ اور اسلوب میں بیان کیا ہی نہیں جاسکتا۔ (ص۶۵)

اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ الہامی کتابوں کا ترجمہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کے لئے اس نے شاعری (POETRY) کو بطور مثال پیش کیا ہے جس سے یہ مطلب ہے کہ آپ کسی بلند پایہ شعر کا ترجمہ کرکے وہ بات پیدا ہی نہیں کرسکتے جو اس شعر کے اصل الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔

عصرِ حاضر کے مفکرین کی یہ تحقیق قرآن کے اس دعویٰ کی تائید کرتی ہے کہ قرآن بالفاظہٖ قرآن ہے۔ وہ عربی زبان کی منزل من اللہ کتاب ہے۔ یعنی اس کے الفاظ منزل من اللہ ہیں۔ جن کا کوئی بدل نہیں ہوسکتا۔ اس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ پر ہمالیہ پہاڑ کی طرح محکم اور اٹل ہے۔

عربی زبان کی وُسعت

اوّل تو عربی زبان ہی ایسی گہری اور جامع ہے کہ (ماہرین علم الُسنہ کی تحقیق کے مطابق) دنیا کی کوئی دوسری زبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکتی۔ (حتےٰ کہ سائنٹیفک ہونے میں بھی نہیں) ڈاکٹر ٹرک کی جس کتاب کا اُوپر حوالہ دیا گیا ہے اس میں اس موضوع پر بڑی دلچسپ بحث کی گئی ہے۔ (یہ بحث اس وقت ہمارے پیش نظر موضوع سے خارج ہے اس کے متعلق تفصیلی گفتگو میرے لغت قرآن میں آئے گی جس سے یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ خُدا نے جہاں بنی اسرائیل کو نبوت وحکومت کے لئے منتخب کیا تھا، دوسری طرف بنی اسماعیل کے ذمے (گویا) یہ فریضہ عاید کردیا تھا کہ وہ عربی زبان کو اس حد تک (DEVELOP) کریں کہ وہ خدا کے آخری پیغام کے اظہار کا ذریعہ بن سکے) یہ ہے وہ عربی زبان جس کے ان الفاظ میں جنہیں خود خدا نے منتخب کیا۔ قرآن نازل ہوا۔ اس کے بعد آپ خود ہی فیصلہ کرلیجئے کہ کیا قرآن کے الفاظ کا بدل کوئی اور الفاظ ہوسکتے ہیں؛ بدل ہونا

قرآن کا ترجمہ نہیں ہوسکتا

تو ایک طرف، قرآن کا تو لفظی ترجمہ بھی ایسا نہیں ہوسکتا جو اُس کے پورے مفہوم کو ادا کرسکے۔ یہ وہ حقیقت ہے جس کا اعتراف غیر مسلم محققین تک نے کیا ہے۔ چنانچہ پروفیسر گب (H.A.R. GIBB) اس باب میں لکھتے ہیں۔

جس طرح ایک بلند پایۂ شعر کا ترجمہ کسی زبان میں نہیں کیا جاسکتا۔ قرآن کا ترجمہ ہو ہی نہیں سکتا۔

ایک ملہم اپنے الہام کو عام زبان میں ادا کر ہی نہیں سکتا (اس کا انداز و اسلوب ہی جداگانہ ہوتا ہے جس میں) اس کے الفاظ اس طرح بکھرے ہوئے ہوتے ہیں جس طرح کسی حسین و جمیل تصویر کو مختلف ٹکڑوں میں منتشر کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان ٹکڑوں سے اصل تصویر کو سامنے لانے کے لئے ضروری ہے کہ اس کی ہر لکیر کے پیچ و خم اور اس کے رنگوں کے لطیف و نازک فرق کا ایک طویل مدت تک نہایت غور و خوض سے مطالعہ کیا جائے۔ لیکن یہ معاملہ تصویر کے خطوط و الوان ہی کا نہیں۔ بات اس سے کہیں آگے ہے۔ قرآن کے الفاظ کا صوتی اثر بھی ایسا ہے کہ سننے والے کے دل کو اس کے پیغام کی معنویت سے ہم آہنگ کرنے میں اس کی موسیقی کا بڑا ہی عمل دخل ہے۔ ایسا عمل دخل جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی کتاب کو دوسرے الفاظ میں پیش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آپ اس کی اصلی صورت کو مسخ کر رہے ہیں۔ آپ سونے کی جگہ مٹی کے ڈھیلے رکھ رہے ہیں۔ آپ زمین کی دلدل میں پھنسی ہوئی بوجھل عقل کو لاہوتی فضاؤں میں اڑنے والے شاہین وحی کا مقام عطا کر رہے ہیں۔ آپ قرآن کا انگریزی زبان میں ترجمہ کرتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس سے آپ کرتے کیا ہیں؟ آپ عربی زبان کی ان تراکیب کی جگہ جو ترشے ہوئے جواہرات کی طرح مختلف پہلو رکھتی ہیں۔ ایسے الفاظ لے آتے ہیں جن کا مفہوم متعین ہوتا ہے اور جو محض اس جگہ ٹھونس دیئے جاتے ہیں۔ اور اگر یہ ترجمہ لفظی ہے تو یہ اور بھی بے رنگ اور پھیکا ہوتا ہے۔ قرآن کے جو حصے قصص یا احکام سے متعلق ہیں، ہو سکتا ہے کہ ان میں یہ کمی زیادہ نقصان دہ نہ ہو۔ اگرچہ جب ان حصوں کا ترجمہ لفظی بھی سامنے آئے گا تو پڑھنے والا یہ سمجھے گا کہ یہ تو ایک عجیب بے ربط اور ناہموار سی کتاب ہے اور اگر اس ترجمہ میں آپ کہیں قرآن کی جمالی نزاکتوں اور جلالی ضرب کاریوں اور خطابتی وقفوں کو بھی لے آئیے (اگر ان کا کسی اور زبان میں منتقل کیا جانا ممکن ہوا) تو سامعین کے دل پر اس کا عجیب اضطراب انگیز بلکہ کارلائل کے الفاظ میں بے ہنگم سا اثر ہوگا (مثلاً) قرآن کی ایک سادہ سی آیت ہے۔ اِنَّا نَحْنُ نُحْیٖ وَ نُمِیْتُ وَ اِلَیْنَا الْمَصِیْرُ (۵۰/۴۳) انگریزی کیا، دنیا کی شاید کوئی زبان بھی ایسی نہیں جو اس شدت اور قوت کا مظاہرہ کر سکے جو ان چھ الفاظ میں پانچ مرتبہ "ہم" کے استعمال سے پیدا ہو رہی ہے۔

(MODERN TRENDS IN ISLAM)

یہ ہے قرآن کے الفاظ کی اہمیت اور ان کا مقام! آپ سوچئے کہ اگر ان الفاظ کی جگہ کسی اور زبان کے الفاظ رکھ دیئے جائیں تو کیا یہ الفاظ قرآن کے اصل الفاظ کا بدل ہو سکتے ہیں یا وہ مقصد پورا کر سکتے ہیں جس کے لئے قرآن کے اصل الفاظ آئے ہیں اس کا تجربہ آپ ہر روز کرتے ہیں۔ قرآن کے اپنے الفاظ گِبؔ جیسے غیر مسلم کے دل پر اثر و جذب کا ایک محشر بپا کر دیتے ہیں لیکن جب ہم مسلمان اسی قرآن کا ترجمہ پڑھتے ہیں تو اس سے ہمارے دل پر کس قدر اثر ہوتا ہے، اس کے متعلق ہم میں سے ہر ایک خود واقف ہے۔ اسے کسی دوسرے سے پوچھنے کی ضرورت ہی نہیں۔ مثال کے طور پر سورۂ قٓ کی اسی آیت کو لیجئے جسے گِبؔ نے پیش کیا ہے وہاں لفظوں میں پانچ مرتبہ "ہم" کے استعمال سے وجد میں آرہا ہے۔ اب آپ اس کا ترجمہ دیکھئے۔ شاہ عبدالقادرؒ کا ترجمہ حسب ذیل ہے:۔

ہمارے تراجم کا اثر

تحقیق ہم جِلاتے ہیں اور مارتے ہیں اور طرف ہماری ہے پھر آنا۔

انگریزی زبان میں خود گِبؔ نے ترجمہ کیا ہے وہ یہ ہے۔

VERILY WE GIVE LIFE AND DEATH AND UNTO US IS THE JOURNEYING

اسی قسم کے تراجم، مارماڈیوک پکتھل، محمد علی لاہوری اور یوسف علی کے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ کیا ان تراجم سے آپ کے دل پر وہی اثر مرتب ہوتا ہے جو اصل آیت سے گِبؔ کے دل پر ہوا ہے۔

اس کی وجہ ہماری استعداد یا زبان کی کوتاہ دستی نہیں بلکہ قرآن کے نخلِ طیبت کی بلندی ہے۔ اسی مشکل کے پیشِ نظر میں نے "لغات القرآن" کے بعد جب "مفہوم القرآن" کا کام ہاتھ میں لیا تو اس میں قرآنی آیات کا ترجمہ نہیں دیا۔ بلکہ ان کا مفہوم بیان کیا ہے۔ یہ مفہوم بھی نہ کسی طرح اصل کا بدل ہو سکتا ہے نہ ہی اس کی حیثیت مستقل قرار پا سکتی ہے۔ جب زمانہ کی علمی سطح اور بلند ہو جائے گی تو یہ مفہوم بھی ناکافی ہو جائے گا۔ اگر کسی دور کے ترجمہ کو سندِ دوام عطا کر دی جائے تو اس سے جو خرابیاں پیدا ہوتی ہیں وہ بالکل واضح ہیں۔

اسی باب میں (مشہور مؤرخ) ڈاکٹر ٹوئن بی اپنی کتاب (A HISTORIAN'S APPROACH TO RELIGION) میں لکھتا ہے:۔

عیسائیت اور اسلام نے جب اپنی آسمانی کتابوں کا ترجمہ فلسفۂ یونان کی اصطلاحات میں کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ کتابیں بے جان اور بے روح ہو کر رہ گئیں۔ اس سے دوسری خرابی یہ پیدا ہوئی کہ زمانۂ مابعد کی سائینٹیفک تحقیقات نے جن صداقتوں کا انکشاف کیا وہ یونان کے فلسفہ اور مابعد الطبیعیات سے کہیں مختلف تھیں۔ لہذا ان آسمانی کتابوں کا یونانی ترجمہ ان کی صداقتوں کے راستے میں سنگِ گراں بن کر حائل ہو گیا۔ یونان کا فلسفہ ایک وقتی اور مقامی حیثیت رکھتا تھا۔ اس کے برعکس یہ آسمانی کتابیں اپنی اصل شکل میں زمان کی قید سے ماورا رہتیں۔ (ص ۱۲۶)

لہذا قرآن کا مفہوم بھی جو کسی ایک دور میں بیان کیا جائے وہ وقتی ہو سکتا ہے۔ ابدی نہیں ہو سکتا۔ ابدیت کی سند صرف قرآن کے الفاظ کو حاصل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ میں اس کا بھی مخالف ہوں کہ ترجمہ بلا متن شائع کیا جائے۔ ترجمہ متن کا بدل نہیں ہو سکتا۔

ان تصریحات سے یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ نماز میں (یا کسی اور جگہ جہاں) قرآن کی آیات آنی چاہئیں۔ وہاں کوئی دوسرے الفاظ (خواہ وہ عربی زبان کے ہی کیوں نہ ہوں) نہیں لائے جا سکتے اور یہ چونکہ نماز میں قرآن پڑھا جاتا ہے اس لئے کسی اور زبان میں نماز، نماز نہیں کہلا سکتی۔

کہا یہ جاتا ہے کہ جو نماز آج کل پڑھی جا رہی ہے اس میں لوگ (باستثنائے چند) نماز کے الفاظ کا مطلب ہی نہیں سمجھتے اور انہیں بغیر سمجھے یونہی دہرائے جاتے ہیں، اس لئے اس نماز سے حاصل کیا ہے۔ اس لئے اس کی جگہ کیوں نہ ایسے الفاظ بولے جائیں جن کا ہم مطلب سمجھ رہے ہوں؟

بلا سمجھے الفاظ کا دہرانا

اس میں کوئی کلام نہیں کہ جس نماز میں الفاظ کے معنی نہ سمجھے جائیں وہ نماز بے مقصد اور بے رُوح ہوتی ہے۔ قرآن نے ایسی نماز پڑھنے سے روکا ہے۔ سورۂ نساء میں ہے:۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَاَنْتُمْ سُكٰرٰى حَتّٰى تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ۔ (۴/۴۳) اے ایمان والو! تم نشہ یا نیند کی حالت میں ہو تو صلوٰۃ کے قریب نہ جاؤ جب تک تم یہ نہ جان لو کہ تم کہہ کیا رہے ہو۔

اس آیت میں حَتّٰی تَعْلَمُوْا مَا تَقُوْلُوْنَ ۔ سے حکم کی علت بھی سامنے آجاتی ہے یعنی صلوٰۃ اسی صورت میں صلوٰۃ ہے جب صلوٰۃ ادا کرنے والا یہ جانتا ہو کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر کسی شخص پہ نشہ یا نیند کے غلبہ کی وجہ سے یہ حالت طاری ہو جائے کہ جو کچھ وہ زبان سے کہہ رہا ہے اُس کا علم نہ رکھے یا جہالت کی بنا پر ایسا ہو۔ تو حکم دونوں کا ایک ہی ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس نکتہ کے متعلق تفصیل سے کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں کہ جن الفاظ کا آپ مطلب نہیں سمجھتے۔ ان کے دہرانے سے کوئی مقصد حاصل نہیں ہو سکتا۔[1] یہ قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم ہے۔ لہٰذا صلوٰۃ کا مقصد اُسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے۔ جب انسان اس کے الفاظ کا مطلب سمجھے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ جب ہم نماز کے الفاظ کا مطلب نہیں سمجھتے تو پھر ان الفاظ کی جگہ اُردو کے الفاظ کیوں نہ بولیں؟ ایسا کہنے کے یہ معنی ہیں کہ درد سر کا علاج سَر کا کاٹ ڈالنا ہے۔ سر درد کا علاج سر کا کاٹ ڈالنا نہیں بلکہ اُس علت کا ازالہ ہے جو سر درد کا موجب ہے۔ یعنی اس جہالت کا دُور کرنا جس کی وجہ سے نماز کے الفاظ کے معانی سمجھے نہیں جاتے۔ بنا بریں کرنے کا کام یہ ہے کہ :۔

سر درد کا علاج

(۱)۔ ہم حکومت پہ زور ڈالیں کہ ملک میں ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی ہو۔[2]

(۲)۔ ابتدائی تعلیم میں نماز کے الفاظ کے ساتھ ان کا مفہوم بھی بتایا اور یاد کرایا جائے۔

(۳)۔ ثانوی سے آخر تک، عربی زبان لازمی قرار دی جائے۔

اس سے نماز بھی بے معنی نہیں رہے گی اور قرآن بھی سمجھ میں آجائے گا۔

---

[1]۔ میں اپنے موضوع سے بہت دور چلا جاؤں گا ورنہ میں اس کی وضاحت کرتا کہ یہ تصور کہاں سے پیدا ہوا کہ الفاظ کا بے سمجھے بوجھے دہرانا بھی ایک اثر پیدا کرتا ہے۔ یہاں صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ یہ تصور یکسر غیر قرآنی ہے۔

[2]۔ قرآنی معاشرہ میں تو آخر تک تعلیم مفت ہوگی۔ لیکن آغاز کار کے لئے اگر ابتدائی تعلیم ہی مفت ہو جائے تو ہمارا ایک قدم صحیح سمت کی طرف اُٹھ جائے گا۔

عربی۔ اُردو نماز

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ایسا کیوں نہ کر لیا جائے کہ نماز میں عربی الفاظ کے ساتھ ساتھ اُردو ترجمہ دہرایا جائے۔ یہ تجویز ناقص بھی ہے اور خطرناک بھی۔ مثلاً:-

(۱)۔ اس وقت نماز باجماعت کے علاوہ انفرادی طور پر بھی پڑھی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ باجماعت نماز میں بھی فرضوں کے علاوہ باقی نماز الگ الگ پڑھی جاتی ہے۔ نماز باجماعت میں تو آپ ایسا کریں گے کہ امام کی عربی قرأت کے ساتھ اُردو کے الفاظ بولتے جائیں۔ لیکن انفرادی نماز میں اس کی کیا شکل ہوگی۔

(۲)۔ نیز جن نمازوں میں، یا فرضوں کی جن رکعتوں میں قرأت بلند آواز سے نہیں ہوتی۔ اُن میں اُردو ترجمہ کا التزام کس طرح کیا جائے گا۔ یا جو الفاظ کسی حالت میں بھی بلند آواز سے نہیں کہے جاتے ان کے ترجمہ کی کیا صورت ہوگی؟ کیا ایسا ہوگا کہ امام عربی کے ان الفاظ کو تو چپکے سے کہہ جائے اور اُردو ترجمہ پکار کر کہے؟

(۳)۔ یہ مثالیں تو اس تجویز کے عملی پہلو سے متعلق ہیں لیکن اس میں خطرہ یہ ہے کہ آپ نماز کی ایک اور شکل پیدا کر کے اُمت میں ایک نئے فرقہ کا اضافہ کر دیں گے۔ یہ ایسا جرم ہوگا جو ان تمام (مزعومہ) فوائد کو لے ڈوبے گا جن کے پیشِ نظر آپ اس جدت کو اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھئے!

نئی نماز

قرآن کی رُو سے فرقہ بندی شرک ہے اور شرک جرم عظیم ہر نئی نماز ایک نئے فرقہ کی بنیاد ہوتی ہے۔ کیا آپ نے نہیں دیکھا کہ ہر فرقہ اپنی نماز سے پہچانا جاتا ہے اور اپنی نماز کی جزئیات کو علیٰ حالہٖ قائم رکھنے پر کس قدر متشدد ہوتا ہے۔ اس لئے کہ اگر اس کی نماز کی وہ جزئیات مٹ جائیں جن سے وہ نماز دوسرے فرقوں کی نماز سے متمیز ہوتی ہے، تو خود اس فرقہ کا وجود معرضِ خطر میں پڑ جائے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جہاں فرقہ بندی کو شرک قرار دیا ہے۔ وہیں اس سے بچنے کے لئے وحدتِ صلوٰۃ کا ذکر کر دیا ہے۔ سورۂ روم میں ہے۔ وَ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَلَا تَکُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ ۔ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَھُمْ وَکَانُوْا شِیَعًا ؕ کُلُّ حِزْبٍۭ بِمَا لَدَیْھِمْ فَرِحُوْنَ ۔ (۳۰/۳۱) تم صلوٰۃ قائم کرو، اور (مومن بننے کے بعد پھر) مشرکین میں سے نہ ہو جاؤ۔ یعنی اُن میں سے جنھوں نے دین میں فرقے پیدا کر دیئے اور خود بھی الگ گروہ بن کر بیٹھ گئے اور پھر حالت یہ ہوگئی کہ ہر فرقہ اپنے اپنے معتقدات میں مگن ہو کر بیٹھ گیا۔

میرا مسلک

یہی وجہ ہے کہ میں شروع سے (نماز کو بامعنی بنانے کی ضرورت پر زور دینے کے ساتھ ساتھ) اس کی شدت سے تلقین کرتا چلا آ رہا ہوں کہ اس وقت جس جس

طریق سے نماز پڑھی جا رہی ہے اس میں کسی قسم کے ردو بدل کرنے کا کسی فرد کو حق حاصل نہیں۔ اس قسم کے ردو بدل سے مختلف فرقوں کی نمازیں وحدت تو پیدا ہو نہیں سکے گی۔ البتہ ایک نیا فرقہ ضرور پیدا ہو جائے گا۔ [1] وحدتِ صلوٰۃ اور وحدتِ امت لازم و ملزوم ہیں۔ وحدتِ امت صرف اسلامی نظام پیدا کر سکتا ہے۔ لہٰذا جب تک اُمت میں اسلامی نظام قائم نہیں ہو جاتا۔ نمازیں کسی قسم کی جدت پیدا کرنا، اُمت میں مزید تفرقہ پیدا کرنا ہے اور تفرقہ پیدا کرنا ایسا سنگین جرم ہے جس کے مقابلہ میں حضرت ہارونؑ نے کچھ وقت کے لیے بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی تک کو بھی گوارا کر لیا تھا۔ (دیکھئے ۲۰/۹۴) لہٰذا جو لوگ نو روزوں، تین نمازوں یا نمازِ اُردو یا اردو۔ عربی نماز کی جدتیں پیدا کر رہے ہیں۔ وہ دین یا اُمت کی کوئی خدمت نہیں کر رہے، الٹا اُسے نقصان پہنچا رہے ہیں۔ ضرورت اس کی ہے کہ امت کے اصلی مرض کی تشخیص کی جائے اور اپنی توانائیوں کو اس کے مداوا میں صرف کیا جائے۔ جس درخت کی جڑ سوکھ رہی ہو، اس کے پتوں پر پانی چھڑکنا، خود پانی کا ضائع کر دینا نہیں تو اور کیا ہے!

یہ ہے اس تحریک کا خطرناک پہلو۔ لہٰذا کرنے کا کام یہ نہیں۔ کرنے کا کام وہی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ کیا گیا ہے۔ یعنی قوم کی جہالت دور کرنے اور اُسے قرآن سے قریب لانے کے لئے عملی اقدامات۔

کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

(جون ۱۹۵۷ء)

اُردو زبان میں نماز

طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں عنوان بالا سے ایک مقالہ شائع کیا گیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ یہ جو

---

[1] آپ کو یہ معلوم کر کے تعجب ہوگا کہ میری بار بار کی اس یقین اور تاکید کے باوجود مخالفین ہر جگہ یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ یہ شخص تین نمازوں کی تعلیم دیتا ہے اور وہ بھی ایک نرالی قسم کی نماز کی۔ اس سے ان کا مقصد واضح ہے اس لئے کہ جب تک وہ یہ نہ کہیں کہ یہ شخص ایک نئی قسم کی نماز ایجاد کر رہا ہے۔ لوگوں کو یہ فریب کس طرح دے سکتے ہیں کہ یہ ایک نیا فرقہ پیدا کر رہا ہے۔

ایک نئی جدت پیدا کی جارہی ہے کہ نماز اردو زبان میں پڑھی جائے یا امام جو کچھ عربی زبان میں پڑھے ایک مترجم ساتھ کے ساتھ اس کا اردو ترجمہ بآوازِ بلند پکارتا چلا جائے۔ یہ مناسب نہیں۔ اس پر ہمیں اس جدت کے حامیوں کی طرف سے چند خطوط موصول ہوئے ہیں۔ جن میں انہوں نے اس پر زور دیا ہے کہ ان کے اعتراضات کا جواب دیا جائے۔ ہم الگ الگ خطوط شائع کرنے کے بجائے ان کے اعتراضات کا جواب مجموعی طور پر عرض کرتے ہیں۔

(۲)۔ ان تمام خطوط کی بنیاد اس اعتراض پر ہے کہ مسلمان جو جہلاء نماز کے الفاظ کو طوطے کی طرح رٹتے رہتے ہیں۔ اگر ان حالات پر نہایت نیک نیتی سے ایک جماعت اس بات کی کوشش کرنے لگی ہے کہ یہاں کی ایک کثیر تعداد جماعت کو کم از کم عربی کی ان عبارتوں کے معانی و مطالب سے کچھ نہ کچھ آشنا کیا جائے، جو نمازیں پڑھی جاتی ہیں تو جناب کے نزدیک یہ ایک ایسا جرم ہوگا جو ان تمام مزعومہ فوائد کو لے ڈوبے گا جن کے پیشِ نظر یہ جدت اختیار کی جارہی ہے۔

آپ نے غور فرمایا ہوگا کہ یہ اعتراض طلوعِ اسلام کے مضمون کو بغور پڑھے بغیر محض غصہ میں آکر کر دیا گیا ہے۔ طلوعِ اسلام آج سے نہیں بیس برس سے مسلسل اور متواتر کہہ رہا ہے کہ قرآن کریم کو بے سمجھے بوجھے پڑھنا کچھ فائدہ نہیں دیتا۔ اس کی اس قسم کی تلاوت سے کوئی ثواب نہیں ملتا۔ الفاظ مطلب سمجھنے کے لئے ہوتے ہیں نہ کہ بے معنی دہرانے کے لئے۔ حتیٰ کہ وہ نماز بھی نماز نہیں ہوتی جس میں انسان مفہوم کو نہ سمجھے۔ ہم نے اپنے سابقہ مضمون میں اس کی پوری پوری صراحت کر دی تھی۔ لیکن اس کے باوجود یہ حضرات کہہ رہے ہیں کہ طلوعِ اسلام اس کی مخالفت کر رہا ہے کہ جہلاء کو قرآن یا نماز کے معانی سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔

طلوعِ اسلام اس کی مخالفت نہیں کر رہا کہ جہلاء کو نماز کا مفہوم کیوں بتایا جارہا ہے۔ وہ مخالفت کر رہا ہے۔ اس طریقہ کی جس کی رُو سے عوام کو نماز کا مفہوم سمجھانے کی کوشش کی جارہی ہے۔ یعنی جو کچھ امام اونچی آواز سے کہے ایک شخص اس کا ترجمہ دہراتا چلا جائے۔ اس طریقہ کے نقائص کو ہم نے واضح طور پر بیان کیا تھا اب انہیں پھر دہرایا جارہا ہے۔ یعنی :

نقائص

۱۔ سب سے پہلے تو یہ کہ پانچ نمازوں میں دو رکعت صبح کی۔ دو مغرب کی اور دو عشاء کی ایسی ہیں جن میں قرأت بآوازِ بلند ہوتی ہے۔ باقی تمام رکعتوں میں امام اور

مقتدی پوری نماز چپکے چپکے پڑھتے ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ افہام و تفہیم مطالب کا یہ طریقہ صرف چھ رکعتوں میں کارفرما ہو سکتا ہے۔

۲۔ نماز باجماعت میں بھی صرف سورۂ الحمد اور ایک اور سورۃ جہری پڑھی جاتی ہے، باقی ساری نماز خفی ہوتی ہے۔ لہٰذا اس طریقہ سے صرف سورۃ فاتحہ اور اس کے ساتھ ایک اور سورت کے مطالب ہی بیان کئے جا سکتے ہیں۔ نماز میں جو کچھ اس کے علاوہ پڑھا جاتا ہے، اس کے مطالب بیان کرنے کا موقع کبھی نہیں آ سکتا۔

اس کے بجائے اگر نماز شروع ہونے سے پہلے نمازیوں کو نماز کے معانی بتا دیئے جائیں تو غور کیجئے کہ یہ طریقہ مندرجہ بالا طریقہ سے بہتر رہے گا یا نہیں۔

(۳)۔ اس جدت کے متعلق ہم نے سب سے بڑا خطرہ یہ بیان کیا تھا کہ اس سے ایک اور فرقہ پیدا ہو جائے گا۔ اس لئے کہ نماز میں اختلاف مختلف فرقوں کا امتیازی نشان ہے۔

اس کے جواب میں کہا گیا ہے کہ جب طلوعِ اسلام مسلمانوں کے موجودہ فرقوں کو گوارا کر رہا ہے تو ان میں اگر ایک اور فرقہ کا اضافہ ہو جائے گا تو کونسی قیامت آ جائے گی۔

ان حضرات کو کون بتائے کہ طلوعِ اسلام موجودہ فرقوں کو اس لئے گوارا کر رہا ہے کہ اُسے ان فرقوں کے مٹانے پر قدرت حاصل نہیں۔ اس کے نزدیک فرقہ پرستی شرک ہے۔ لہٰذا جب وہ دیکھے کہ اس شرک میں ایک نیا اضافہ ہو رہا ہے تو کیا اس کا اس کے خلاف آواز اٹھانا جرم ہے؟ حیرت ہے کہ لوگ غصہ میں کس قسم کی باتیں کر جاتے ہیں۔

یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب طلوعِ اسلام یہ کہتا ہے کہ مختلف فرقے جس جس انداز سے نماز پڑھتے ہیں پڑھتے رہیں تو پھر ایک اور قسم کی نماز پر کیوں اعتراض کیا جاتا ہے۔

طلوعِ اسلام مختلف فرقوں سے یہ کہتا ہے کہ وہ اپنے اختلافات کو باہمی جنگ و قتال کا ذریعہ نہ بنائیں اگر اُن میں اتنی ہمت نہیں کہ وہ خالص قرآن کی آواز کو اپنا کر اس فرقہ بندی کی لعنت سے بلند ہو جائیں تو کم از کم آپس میں امن چین سے تو رہیں تاآنکہ یہاں کبھی خلافت علیٰ منہاج نبوت قائم ہو جائے تو ان فرقوں کی جگہ اسی طرح اُمت کو ملت واحدہ بنا دے جس طرح یہ رسول اللہ صلعم کے زمانہ میں تھی۔ یہ وجہ ہے کہ ایک نئی نماز اور نئے فرقے کے تصور سے طلوعِ اسلام کا دل کانپ اُٹھا ہے۔

کے قوانم دید زاہد جام صہبا بشکند
می پرد رنگم حبابے گر بدریا بشکند

۴ - ایک صاحب فرماتے ہیں کہ ہم نے یہ عجیب بات لکھ دی ہے کہ قرآن کا ترجمہ ہی نہیں ہو سکتا ؟

قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا اس کے یہ معنی ہیں کہ ہم کسی غیر مسلم کو جس کی زبان عربی نہ ہو قرآن سمجھا ہی نہیں سکتے۔ ہمارے اس بھائی نے سمجھنے کی کوشش ہی نہیں کی کہ جب ہم نے کہا تھا کہ قرآن کا ترجمہ نہیں ہو سکتا تو اس کا مطلب کیا تھا۔ ہم نے کہا تھا (اور اسے اب ہم دہراتے ہیں) کہ کسی ترجمہ میں وہ بات پیدا نہیں ہو سکتی جو قرآن کے اصل الفاظ سے پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے قرآن کا کوئی ترجمہ اصل کا بدل نہیں ہو سکتا۔ قرآن تو بہت بلند چیز ہے۔ کسی شعر کا ترجمہ دوسری زبان میں کیجئے، اس سے قطعاً وہ بات پیدا نہیں ہو سکے گی جو اصل شعر میں ہوتی ہے۔ گوئٹے کا "فاسٹ" شیکسپیر کے "ہملٹ" نیٹشے کی کتاب "بقول زردشت" (حالانکہ یہ نثر کی کتاب ہے) کے مختلف زبانوں میں متعدد تراجم ہو چکے ہیں لیکن جو لوگ ان کتابوں کی اصل زبان جانتے ہیں وہ ان ترجموں کے بعد بے ساختہ پکار اُٹھتے ہیں کہ جو بات اصل میں ہے وہ ان ترجموں سے پیدا نہیں ہو سکتی۔ یہی صورت کلام اقبالؒ کے انگریزی ترجموں کی ہے۔

یہ تھی وہ بات جو ہم نے کہی تھی اور اس کے لئے اس پر زور دیا تھا کہ مسلمانوں کو قرآن کی زبان ضرور سیکھنا چاہیئے تاکہ وہ براہِ راست اُس تک پہنچ سکیں۔ البتہ دوسروں کے لئے قرآن کے تراجم ناگزیر ہیں کیونکہ انہیں ہم مجبور نہیں کر سکتے کہ وہ عربی زبان سیکھیں۔ ہم نے ان تک اسلام پہنچانا ہے۔ اس لئے ہمیں بہرحال ان کی زبان میں ہی گفتگو کرنی ہوگی۔ اسی طرح جو مسلمان ہنوز عربی سے نابلد ہیں انہیں بھی قرآن کریم ترجمہ ہی کے ذریعہ سمجھایا جا سکتا ہے لیکن یہ سب کچھ بر سبیل تنزل ہی کیا جائے گا۔ یہ ترجمے نہ اصل کی جگہ لے سکتے ہیں نہ اُن سے وہ بات پیدا ہو سکتی ہے جو قرآن کے اصل الفاظ میں ہے۔

عربی زبان کا تقدس (۵)۔ ایک صاحب نے لکھا ہے کہ یہ بات ہم "عربی زبان کے جھوٹے تقدس" کی بنا پر کہی ہے۔

ان کی خدمت میں عرض ہے کہ ہم کسی زبان کے تقدس کے قائل نہیں البتہ عربی زبان کی اہمیت کے ضرور قائل ہیں اور وہ اس لئے کہ قرآن کریم (جسے ہم اپنی زندگی کا نصب العین کہتے ہیں) وہ عربی زبان میں ہے

اگر قرآن کریم چینی زبان میں ہوتا تو ہمارے نزدیک یہی اہمیت چینی زبان کو حاصل ہوتی ۔

۶۔ ایک صاحب نے طنزاً لکھا ہے کہ اس کے یہ معنی ہیں کہ جب ہم پنجابی زبان میں دعا مانگتے ہیں تو اللہ میاں ناراض ہو جاتا ہو گا۔

طنز کا تو ہمارے پاس کوئی جواب نہیں ۔ گذارش اتنی ہے کہ ہم نے کہیں نہیں لکھا کہ دعا بھی صرف عربی زبان میں مانگنی چاہیئے ۔ ہمارے نزدیک دعا انسان کی شدت آرزو کے اظہار کا نام ہے اور یہ ظاہر ہے کہ یہ اظہار اپنی زبان میں ہو گا (بجز اس کے کہ آپ عربی زبان یا کسی دوسری زبان پر اس حد تک قادر ہوں کہ آپ سوچنا بھی اسی زبان میں شروع کر دیں)۔ اللہ میاں کے نزدیک ہر زبان برابر ہے ۔ اس لئے وہ پنجابی زبان میں دعا مانگنے والے کو جھڑکارتا نہیں ، نہ ہی قرآن کے اردو ترجمے پر اُسے غصہ آتا ہے ۔ بات صرف اتنی ہے کہ قرآن کے الفاظ کا بدل کسی اور زبان کے الفاظ نہیں ہو سکتے ۔

۲

روزہ

قرآن کی رُو سے روزے کے احکام مختصر الفاظ میں بیان کئے جاتے ہیں۔ یہ احکام سورۂ بقرہ میں آئے ہیں۔ متعلقہ آیات یہ ہیں :-

۱- یٰاَیُّھَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیۡنَ مِنۡ قَبۡلِکُمۡ لَعَلَّکُمۡ تَتَّقُوۡنَ ۝

اے پیروان دعوتِ ایمانی! جس طرح تم سے پچھلی قوموں پر روزہ فرض کیا گیا تھا اُسی طرح تم پر بھی روزہ فرض کر دیا گیا ہے تاکہ تم قانونِ خداوندی کی نگہداشت کر سکو۔

۲- اَیَّامًا مَّعۡدُوۡدٰتٍ

یہ روزے چند گنے ہوئے دنوں کے ہیں۔

۳- فَمَنۡ کَانَ مِنۡکُمۡ مَّرِیۡضًا اَوۡ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّۃٌ مِّنۡ اَیَّامٍ اُخَرَ۔

پھر جب کوئی تم میں سے بیمار ہو یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔

۴- وَعَلَی الَّذِیۡنَ یُطِیۡقُوۡنَہٗ فِدۡیَۃٌ طَعَامُ مِسۡکِیۡنٍ۔

اور جو لوگ بہ دشواری روزے رکھ سکیں۔ اُن کے لئے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا کافی ہے۔

۵- فَمَنۡ تَطَوَّعَ خَیۡرًا فَھُوَ خَیۡرٌ لَّہٗ وَاَنۡ تَصُوۡمُوۡا خَیۡرٌ لَّکُمۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تَعۡلَمُوۡنَ ۝

اس کے بعد اگر کوئی اپنی خوشی سے زیادہ کرے تو مزید اجر کا موجب ہوگا۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو تمہارے لئے روزہ رکھنا بہتر ہے۔

۶۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ......

روزے رمضان کے مہینے کے ہیں جس میں قرآن نازل کیا گیا ہے۔

۷۔ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْیَصُمْهُ وَمَنْ كَانَ مَرِیْضًا اَوْ عَلٰی سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَیَّامٍ اُخَرَ ۔ ($\frac{2}{183-185}$)

لہٰذا تم میں سے جو کوئی اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو تو اُسے اس مہینے کے روزے رکھنے چاہئیں۔ البتہ اگر تم میں سے کوئی بیمار یا سفر میں ہو تو وہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرے۔

۸۔ وَكُلُوْا وَاشْرَبُوْا حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَكُمُ الْخَیْطُ الْاَبْیَضُ مِنَ الْخَیْطِ الْاَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ثُمَّ اَتِمُّوا الصِّیَامَ اِلَی الَّیْلِ ($\frac{2}{187}$)

اور کھاؤ پیو یہاں تک کہ تمہارے لئے صبح کی سفید دھاری سیاہ دھاری سے متمیز ہو جائے پھر رات تک روزہ پورا کرے۔

۹۔ اُحِلَّ لَكُمْ لَیْلَةَ الصِّیَامِ الرَّفَثُ اِلٰی نِسَآئِكُمْ ($\frac{2}{187}$)

اور تمہارے لئے روزوں کی راتوں میں اپنی بیویوں سے اختلاط حلال کیا گیا ہے۔

ان آیات سے معلوم ہوگیا کہ:۔

۱۔ روزے رمضان کے مہینے کے ہیں (تین دن یا نو دن کے نہیں بلکہ پورے مہینے کے ہیں)۔

۲۔ روزے ہیں اس وقت سے لے کر جب صبح کی سفیدی نمودار ہو جائے، دن کے ختم ہونے تک، کھانا پینا اور بیوی سے اختلاط منع ہے۔

۳۔ روزے اس کے لئے ہیں کہ جو اس مہینے میں اپنے گھر پر موجود ہو اور تندرست ہو۔ مریض تندرست ہونے پر اور مسافر سفر سے واپسی پر دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کرے۔

۴۔ اب ایک مشکل اور باقی رہ جاتی ہے اور وہ یہ کہ ایک شخص (عام عرفی معنوں میں) نہ تو بیمار ہے نہ مسافر ہے لیکن کسی وجہ سے اُسے روزے رکھنے دشوار ہیں۔ مثلاً ایک بوڑھا آدمی اپنے گھر پر موجود ہے

اور مریض بھی نہیں۔ لیکن بڑھاپے کی وجہ سے کمزور اتنا ہے کہ بمشکل روزہ رکھ سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہ رمضان کے بعد دوسرے دنوں میں روزے رکھ کر گنتی پوری کر دے۔ ایسے لوگوں کا حکم آیت نمبر ۳ میں بیان کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ ایسے ہوں کہ بمشکل روزہ رکھتے ہیں انہیں اپنے آپ کو دشواری میں ڈالنے کی ضرورت نہیں۔ وہ روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

غور فرمایئے، اُوپر کی تینوں شقوں میں ہر قسم کے حالات جمع ہوگئے ہیں اور یہی احکام کی جامعیت کا تقاضا تھا۔

ہم نے وَعَلَى الَّذِيْنَ يُطِيْقُوْنَهٗ ۔ کا ترجمہ۔ وہ لوگ جو بہ دشواری روزہ رکھ سکیں۔ کیا ہے حالانکہ اس کا عام ترجمہ ـــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں ـــ کیا جاتا ہے۔ یہ ترجمہ صحیح نہیں اس لئے کہ اس ترجمہ کی رُو سے مطلب یہ ہوگا کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں، وہ تو ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں اور جن میں روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہ ہو وہ روزے رکھا کریں۔ حالانکہ قرآن کا یہ منشا نہیں ہو سکتا۔ بات یہ ہے کہ لفظ "طاقت" کا جو مفہوم ہمارے ہاں اُردو میں رائج ہے وہ اس سے مختلف ہے جو عربی زبان میں اس کا مفہوم ہوتا ہے۔ اس کے لئے عربی زبان کی لغات دیکھئے۔

محیط المحیط، جلد دوم صفحہ ۱۳۰۴ میں ہے۔

> طاقت کے معنی کسی چیز پر قدرت رکھنا ہیں۔ لیکن یہ قدرت کی ایسی مقدار کو کہتے ہیں جسے انسان بہ مشقت کر سکتا ہے۔ دراصل یہ لفظ اس طَوق سے ماخوذ ہے جو کسی چیز کو اپنے گھیرے میں لے لیتا ہے۔ لَا تُحَمِّلْنَا مَالَا طَاقَةَ لَنَا بِهٖ کے معنی یہ نہیں کہ جس کی ہمیں قدرت نہ ہو بلکہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جس کا بجالانا ہمیں دشوار ہو۔

اسی طرح عربی کی مشہور لغت لسان العرب صفحہ ۲۳۰ جلد ۱۲ میں ہے کہ :

> طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جو کسی انسان کے لئے بہ مشقت کرنا ممکن ہو۔

مفتی محمد عبدہٗ اپنی تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵ جلد ۲ میں فرماتے ہیں کہ :

> اِطَاقَةٌ دراصل مَكْنَتٌ اور قُدْرَتٌ کے بالکل ادنیٰ درجہ کا نام ہے۔ چنانچہ عرب اَطَاقَ الشَّيْئَ صرف اس وقت کہتے ہیں۔ جب اس کی قدرت نہایت ہی ضعیف ہو۔ یعنی بہ دشواری اُسے برداشت کر سکتا ہو۔ چنانچہ يُطِيْقُوْنَهٗ سے مراد بوڑھے، ضعیف اور

اپاہج لوگ ہیں جن کے اعذار کے دور ہوجانے کی کوئی توقع نہیں کی جاسکتی اور وہ لوگ ہیں جو انہی کی طرح معذور ہیں۔ یعنی ایسے کام کاج کرنے والے لوگ جن کی معاش خدا نے پُرمشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ اسی بنا پر امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ طاقت قدرت کی اس مقدار کا نام ہے جس کا کرنا انسان کے لئے بہ مشقت ممکن ہو۔

اس کی تائید تفسیر کشاف سے بھی ہوتی ہے جس میں لکھا ہے کہ:-

طَاقَۃٌ" کے مفہوم میں وہ کام آتے ہیں جنہیں بہ تکلف یا بہ مشقت کیا جاسکے اور وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں ہیں جن کے لئے روزہ نہ رکھ کر فدیہ دینے کا حکم ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر یہ آیت ثابت ہے، منسوخ نہیں ہے۔

(تفسیر کشاف صفحہ ۲۵۵ جلد ۱)

تفسیر روحُ المعانی میں ہے کہ:

عربی زبان میں اَلْوُسعَ کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو سہولت کے ساتھ ہو اور طَاقَۃٌ" کا لفظ اس قدرت کا نام ہے جو شدت اور مشقت کے ساتھ ہو۔ لہذا (آیہ زیر نظر کے معنی یہ ہوں گے "اور ان لوگوں پر جو شدت اور مشقت کے ساتھ روزہ رکھ سکتے ہیں ایک مسکین کو کھانا کھلا دینا ہے" (روح المعانی ص۵۹ جلد ۲)

تصریحاتِ بالا سے آپ نے دیکھ لیا کہ عربی زبان میں لفظ "طَاقَۃٌ" کا مفہوم کیا ہے اور اس بنا پر وَعَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ کا ترجمہ ــــ اور جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہوں۔ صحیح نہیں ہوسکتا اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ ــــ جو لوگ بہ دشواری روزہ رکھ سکیں۔

جیسا کہ آپ جانتے ہیں، قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ ایک اصول بیان کردیتا ہے اور اُسے اُمت کے اجتماعی نظام پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اس کی جزئیات خود متعین کرلے۔ چنانچہ عَلَی الَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ میں بھی یہی اسلوب اجتماعی اختیار کیا گیا ہے۔ یہاں ایک اصول بیان کردیا گیا ہے اور اس کی تفصیلات خود بیان نہیں کیں (کہ وہ لوگ کون ہیں جو بہ مشقت روزہ رکھ سکتے ہیں) اس کی تفصیل پہلے بھی متعین کی جاچکی ہے اور ان پر اب بھی غور کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ علامہ قرطبی کی کتاب "جامع احکام القرآن" (صفحہ ۲۶۸-۲۶۹ جلد ۲) میں ہے کہ:

تمام علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ بوڑھے مرد اور بوڑھی عورتیں جو روزہ رکھنے کی طاقت ہی نہیں رکھتے یا شدید مشقت کے ساتھ طاقت رکھتے ہیں، ان کے لئے روزہ نہ رکھنا جائز ہے۔ مگر اس میں اختلاف ہے کہ ایسے لوگوں کے ذمہ کیا ہے؟ چنانچہ امام ربیعؒ اور امام مالکؒ نے کہا ہے کہ ان کے ذمے کچھ بھی نہیں ہے۔ البتہ امام مالکؒ نے کہا کہ اگر یہ لوگ روزانہ ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں تو میرے نزدیک یہ پسندیدہ ہے اور حضرت انسؓ ابن عباسؓ، قیس بن السائبؓ اور ابو ہریرہؓ نے فرمایا ہے کہ ان لوگوں کے ذمہ فدیہ ہے، قضا نہیں ہے۔

مفتی سید محمد عبدہؒ نے اور بھی اضافہ فرمایا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:۔

اَلَّذِیْنَ یُطِیْقُوْنَہٗ سے مراد بوڑھے۔ ضعیف اور اپاہج لوگ ہیں۔ جن کے اعذار کے دُور ہو جانے کی امید نہیں ہوتی۔ ایسے ہی وہ لوگ بھی اُن کے زمرے میں شمار ہوں گے جو مزدور پیشہ ہوں جن کی معاش خدا نے پُر مشقت کاموں میں رکھ دی ہے۔ مثلاً کانوں سے کوئلہ نکالنے والے اور وہ مجرم جن سے قید خانوں میں مشقت کے کام لئے جاتے ہیں اور جن پر روزہ رکھنا گراں ہو۔ تیسری قسم کے وہ لوگ ہیں جن پر کسی ایسی وجہ سے جن کے دُور ہو جانے کی کوئی اُمید نہ ہو، روزہ رکھنا گراں گزرتا ہو جیسے بڑھاپا اور پیدائشی کمزوری اور ہمیشہ محنت کے کاموں میں مشغولیت اور پرانی بیماری جس کے اچھا ہونے کی اُمید نہ ہو۔ ایسے ہی وہ شخص جس کی مشقت کا سبب پیدا ہوتا رہتا ہے جیسے حاملہ عورت اور دودھ پلانے والی عورت۔ ان سب لوگوں کے لئے جائز ہے کہ وہ روزہ کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔ اتنا کھانا جو ایک اوسط درجے کی خوراک کے آدمی کا پیٹ بھر سکے۔ (تفسیر المنار صفحہ ۱۵۵-۱۵۷ جلد ۲)

ان تفاصیل سے حسب ذیل فہرست مرتب ہو جاتی ہے۔

۱۔ بوڑھا مرد اور بوڑھی عورت۔

۲۔ حاملہ عورتیں

۳۔ دودھ پلانے والی عورتیں۔

۴۔ اپاہج اور معذور لوگ

۵۔ پرانی بیماریوں والے جن کے اچھا ہونے کی امید نہ رہے اور وہ اُن کی وجہ سے روزہ بہ مشقت رکھ سکیں۔

۶۔ ایسے کمزور لوگ جو خلقی اور پیدائشی (CONSTITUTIONALLY) طور پہ کمزور پیدا ہوئے ہوں۔

۷۔ وہ مزدور پیشہ لوگ جن کی معاش ہمیشہ پُرمشقت کاموں میں ہوتی ہے۔ مثلاً کانوں میں کام کرنے والے اور کارخانوں میں کام کرنے والے یا رکشہ چلانے والے۔

۸۔ وُہ مجرم جن سے جیل میں مشقت کے کام لئے جاتے ہوں۔

یہ فہرست جامع اور مانع نہیں۔ بحالات موجودہ اپنے اپنے حالات کے مطابق اس میں اضافہ ہو سکتا ہے۔ اصول یہی ہے کہ جو شخص بہ مشقت روزہ رکھ سکے وہ روزہ نہ رکھے۔

یہ ہیں روزوں کے متعلق مختصر الفاظ میں قرآن کے احکام۔ ان آیات کو آپ خود بھی قرآن کریم میں دیکھ لیں۔ (یعنی سورۂ بقرہ آیات ۱۸۳ تا ۱۸۸) ۱۹۶۳ء

تراویح

لکھنؤ (بھارت) سے ایک صاحب لکھتے ہیں:۔

"احناف کہتے ہیں کہ رمضان میں روزانہ بیس تراویح سُنت مؤکدہ ہیں اور اہلِ حدیث و شیعہ اس کے قائل نہیں۔ اہلِ حدیث کے نزدیک تراویح اور تہجد ایک ہیں اور ان کی تعداد آٹھ رکعات ہیں۔ وہ بیس تراویح کو بدعت کہتے ہیں۔ اس مسئلہ پر احناف اور اہلِ حدیث میں لڑائیاں بھی ہوئی ہیں اور ہوتی ہیں۔ آپ کی تحقیق تراویح کے بارے میں کیا ہے؟ ..... احناف اس امر کا اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے قبل تراویح کا دستور ہی نہ تھا۔ لیکن اس کے باوجود تراویح کے تارک کو گنہگار بتاتے ہیں۔ اس کی اصلیت کیا ہے؟

طلوعِ اسلام

تراویح کا ذکر قرآن کریم میں نہیں آیا۔ ان کی ابتداء رسول اللہؐ کے زمانے سے ہوئی تھی یا حضرت عمرؓ کے زمانہ سے، یہ تاریخ کا سوال ہے اور اس باب میں اہلِ تشیع اور اہلِ تسنن حضرات کا اختلاف ہے اور ان کی بحثیں سب کو معلوم ہیں۔ پھر یہ سوال کہ آیا

ان کی رکعتوں کی تعداد آٹھ ہے یا بیس۔ خود اہلِ سنت کے ہاں اختلاف ہے اور ان کی بحثیں بھی کسی سے پوشیدہ نہیں۔ طلوعِ اسلام ان بحثوں میں نہیں الجھا کرتا۔ جن امور کا ذکر قرآن میں نہیں، ان کے متعلق اس کا مسلک واضح ہے۔

اسلام قرآنی حدود کے اندر ضبطِ خویش کی زندگی کا نام ہے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ انسان (مسلمان) کو معلوم ہو کر قرآنی حدود کیا ہیں اور اس کے ساتھ ہی وہ ضبطِ نفس کا خوگر ہو۔ رمضان کا مہینہ ان ہر دو امور کے پیدا اور مستحکم کرنے کا ایک خصوصی ذریعہ ہے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں اسے ٹریننگ کیمپ یا (REFRESHER COURSE) کہیئے۔ روزہ انسان کو ضبطِ خویش سے مجاہدانہ زندگی کا خوگر بناتا ہے اور اس کے اس مہینے کا تعین جس میں نزولِ قرآن کی ابتداء ہوئی تھی، اس حقیقت کو سامنے لاتا ہے کہ اس ٹریننگ کے کورس میں اس کا خاص انتظام ہونا چاہیئے کہ مجاہدین کے سامنے پورا قرآن آجائے۔ تاکہ وہ اچھی طرح سمجھ لیں کہ دنیا میں "تلوار اور قرآن" کا رشتہ کیا ہے اور یہ کس طرح ایک دوسرے کے محافظ بنتے ہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ دورِ اوّل کے اسلامی نظام نے قرآن کو بیک وقت ذہنوں میں مستحضر کرنے کے لئے یہ طریقہ تجویز کیا تھا جسے اب محض "حصولِ ثواب" کے لئے ادا کر دیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ جس طرح سے اب تراویح میں قرآن دہرایا جاتا ہے، اُسے نہ سنانے والا حافظ سمجھتا ہے کہ میں کیا پڑھ رہا ہوں اور نہ سننے والے مقتدی سمجھتے ہیں کہ ہم کیا سن رہے ہیں اور ظاہر ہے کہ جس قرآن کے الفاظ صرف دہرائے یا سُنے جائیں اور انہیں سمجھا نہ جائے، اس سے قرآن کا مفہوم سامنے نہیں آسکتا اور نہ ہی یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ ہمارے لئے زندگی کا کون سا نقشہ متعین کرتا ہے۔ جب خلافت علیٰ منہاجِ نبوت قائم ہو گی تو یہ دیکھنا اس کا کام ہو گا کہ ہمارے ان مروجہ طریقوں میں کہاں کہاں اصلاح کی ضرورت ہے۔ "گناہ اور ثواب" کا صحیح مفہوم بھی اسی وقت سامنے آئے گا۔ (۱۹۵۶ء)

اعتکاف

کراچی سے ایک صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ پچھلے دنوں نمازِ جمعہ کے سلسلہ میں ایک بڑے مولوی صاحب کے خطبہ کو سننے کا اتفاق ہوا۔ انہوں نے قرآن کریم سے اعتکاف کا حکم ثابت کیا اور بتایا کہ رمضان کے آخری دس دن کا اعتکاف کرنا بڑی ہی اہم عبادت ہے۔ اعتکاف کے احکام انہوں نے کچھ ایسے انداز سے بیان کئے جن سے خالص رہبانیت جھلکتی تھی کہ ایک آدمی کو کچھ عرصہ

کے لئے دنیا و ما فیہا سے کٹ کر مسجد میں بند ہو جانا پڑتا ہے۔ جہاں وہ ہمہ وقتی عبادت (پرستش) الٰہی میں مصروف رہتا ہے۔ میں نہیں سمجھ سکا کہ اسلام اور قرآن اس قسم کی رہبانیت کی تعلیم کیسے دے سکتے ہیں لیکن مجھے حیرت ہوئی کہ انہوں نے اپنی ان باتوں کے لئے قرآن کا نام لیا اور سورۂ بقرہ کی آیت وَلَا تُبَاشِرُوْهُنَّ وَاَنْتُمْ عٰكِفُوْنَ فِي الْمَسٰجِدِ ط کا حوالہ دے کر اپنی ساری باتیں قرآن کے سر تھوپ دیں۔ کیا مہربانی فرما کر آپ بتائیں گے کہ قرآن کی رُو سے اعتکاف کی کیا حقیقت ہے؟ اور محولہ بالا آیت کا صحیح مطلب کیا ہے؟

طلوعِ اسلام آپ نے صحیح سمجھا ہے۔ اس قسم کا اعتکاف جو ہمارے ہاں رائج ہے جس میں اعتکاف کرنے والا کسی مسجد کے ایک کونہ میں چادر تان کر دس روز کے لئے اکم پڑ رہتا ہے۔ اور دن رات قرآن کے الفاظ دہرانے یا سونے کے علاوہ اُسے اور کوئی کام نہیں رہتا۔ وہ قطعاً غیر قرآنی ہے اور اسلام کی روح کے منافی ہے۔ اسلام اس قسم کی رہبانیت یا پرستش کی تعلیم نہیں دیتا۔ قرآن کریم میں اس قسم کے اعتکاف کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ "عاکفون" اور "عاکفین" قرآن کریم میں متعدد جگہ آئے ہیں جن کے معنی کسی کام پر مسلسل لگے رہنا اور جمے رہنا ہیں۔ کعبہ کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ طائفین اور عاکفین کے لئے ہے ($\frac{2}{125}$) وہاں عاکفین کے معنے ایسی جماعت کے ہیں جو نوعِ انسانی کا شیرازہ بکھرنے نہ دے بلکہ انہیں ایک رشتہ میں پرو کر اُن کے حالات کو درست رکھے اور مسلسل اسی دُھن میں لگی رہے (ان الفاظ کے معانی آپ کو لغات القرآن میں ملیں گے)۔

جس آیت کا آپ نے حوالہ دیا ہے اس میں بھی مسلمانوں کو اعتکاف کرنے کا نہ کوئی حکم دیا گیا ہے اور نہ ہی اس کی کوئی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ محولہ بالا آیت میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں ہے کہ ان کے لئے جو عاکفون فی المساجد ہوں، ایک ہدایت دی گئی ہے اور بس۔

عاکفون فی المساجد کے معنی ہیں ـــــ پابندی کے ساتھ مسجدوں میں رہنے والے، مسجدوں میں رُک جانے والے، مسجدوں میں جمے رہنے والے ـــــ یہ عاکفون فی المساجد جن کا تذکرہ ضمناً روزوں کے احکام میں کیا گیا ہے، کون لوگ ہیں؟ اس کو سمجھنے کے لئے مختصراً اتنی بات ذہن میں رکھئے کہ روزے دراصل مسلمانوں میں ضبطِ نفس اور قوتِ برداشت پیدا کرنے کا ایک ٹریننگ کورس ہیں اور مسجدیں مسلمانوں کی حیاتِ ملّی میں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں۔ روزوں کے ضمن میں یہاں مساجد سے مفہوم ٹریننگ سنٹر یا ٹریننگ کیمپ ہیں۔ اس کے بعد یہ سمجھیئے کہ اس سالانہ ٹریننگ کورس میں کچھ لوگ لازماً ایسے بھی ہو سکتے ہیں جن کو رات کے اوقات

بیں بھی کچھ ضروری امور کی تکمیل کے لئے ٹریننگ سنٹر یا ٹریننگ کیمپ میں روک لیا جائے۔ جیسا کہ پچھلی آیات میں وضاحت کے ساتھ بتایا گیا ہے، اس ٹریننگ کورس میں جو لوگ حصہ لے رہے ہیں (یعنی عام روزہ دار) اُن کو جہاں یہ حکم دیا گیا تھا کہ وہ دن بھر کھانے پینے اور بیویوں کے پاس جانے سے احتراز کریں، وہیں اس کی اجازت بھی دے دی گئی تھی کہ رات کے اوقات میں (جبکہ روزہ نہیں ہوتا) یہ لوگ اپنی بیویوں کے پاس جا سکتے ہیں۔ لیکن وہ لوگ جنہیں کسی خاص ڈیوٹی پر لگایا گیا ہو اور رات کے اوقات میں انہیں ٹریننگ سنٹر یا ٹریننگ کیمپس میں روک لیا گیا ہو۔ ایسے لوگوں کو رات کے اوقات میں بھی (عام روزہ داروں کے برعکس) اپنی بیویوں سے جدا رہنا چاہیئے۔ اس کے لئے نہ دس دن کی قید ہے اور نہ رمضان کے آخری دنوں کی۔ اس کا مدار نظام پر ہے کہ وہ آدمی کو رات کے اوقات میں کتنے روز یا کتنے وقت کے لئے ٹریننگ سنٹر یا کیمپ میں روکتا ہے۔ بہرحال جب تک یہ لوگ ٹریننگ سنٹر یا کیمپ میں رہیں گے انہیں اتنے عرصے کے لئے جنسی تمتع سے محترز رہنا ہوگا۔ یہ ہے قرآن کریم کی اس آیت کا مطلب اور محل۔ مگر چونکہ ہماری نگاہوں سے نظام اوجھل ہو چکا ہے اور تمام چیزیں رسمی پرستش کے طور پر کی جا رہی ہیں۔ اس لئے اعتکاف بھی ایک رسمی پرستش کے طور پر ہمارے ہاں باقی رہ گیا ہے۔ (۱۹۵۶ء)

لیلۃ القدر

زندہ قوموں کے سامنے کیا کیا مسائل ہیں جن کے حل کرنے کے لئے وہ دن رات مصروفِ سعی و عمل رہتی ہیں اور مسلمانوں کے سامنے کون سے مسائل ہیں جن کے حل کی تلاش میں وہ مضطرب و بیقرار رہتے ہیں اور اُن کا حل ان کے پیشوایانِ دین بکمالِ عنایت عطا فرماتے ہیں۔ اس کا اندازہ ذیل کی دو مثالوں سے لگائیے۔

ذیل کا استفسار اور اس کا جواب صدق (لکھنؤ) کی ۱۵ رجولائی کی اشاعت میں شائع ہوا ہے:-

"شبِ قدر" کیا چیز ہے؟

اس کو تلاش کرنے سے کیا مراد ہے؟

اس کی کیا کیفیت ہوتی ہے اور یہ کس طرح دکھائی دیتی ہے؟

اس کو کس طرح تلاش کیا جائے؟

یہ سوالات ہیں جو ذہن میں پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے ایک روشنی ہوتی ہے جو بحالتِ عبادت

ریاضت دکھائی دیتی ہے اور کوئی کچھ کہتا ہے۔ جتنے واعظ اتنی ہی تاویلیں ہیں۔ ان سے ذہنی خلجان رفع ہونے کے بجائے بڑھ جاتا ہے۔ سورۃ اِنَّآ اَنۡزَلۡنٰہُ کی تفسیر مولانا محمود الحسن صاحب کے اور مولانا شبیر احمد عثمانی رحمہا اللہ علیہما کے حواشی حوالے قرآن میں دیکھنے سے معلوم ہوا کہ ایک خاص کیفیت یہ ہوتی ہے کہ عبادت و ذکر میں کافی رغبت اور دلچسپی سی حاصل ہوتی ہے۔ تفسیر بیان القرآن میں اس سورۃ کے معنی و تفسیر کو دیکھنے سے بھی کوئی گرہ کشائی نہ ہوئی۔

بخاری کی احادیث نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ معلوم ہوا کہ اس شب میں یعنی رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں "شبِ قدر" دکھائی دیتی ہے۔ کیا چیز ہے جو ان راتوں میں دکھائی دیتی ہے۔ اُمید ہے کہ حضورِ عالی اس کی عقدہ کشائی فرمائیں گے۔ تاکہ ایک مدت کی یہ اُلجھن رفع ہو۔ اُمید کہ رہنمائی فرما کر عزت افزائی فرمائیں گے۔ (نیازمند)

صدق شبِ قدر کا تعلق عالمِ بالا سے ہے۔ اس کی پوری تفصیلات حدیث میں وارد ہوئی ہی نہیں (اور جتنی بھی ہیں۔ ان میں کام کی چیز ہمارے آپ کے لئے بس اتنی ہے کہ ان شبوں میں کرنا کیا چاہیئے۔ یہ سال کی ایک بزرگ اور معزز ترین شب ہے (جیسے ہفتہ کا بزرگ دن جمعہ، اور سال کا بزرگ مہینہ رمضان ہوتا ہے) حدیث میں اس کا پتہ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق تاریخوں میں بتایا گیا ہے جو ۲۱، ۲۳، ۲۵، ۲۷، ۲۹ پانچ راتیں ہوتی ہیں۔ اکثر علماء کا رجحان شب ۲۷ کی جانب ہے مبہم رکھ دینے سے ایک کھلی ہوئی مصلحت شریعت کی یہ معلوم ہوئی کہ پانچوں راتیں (بلکہ عادت پڑجانے پر پوری دسوں راتیں) عبادت ذکرِ الٰہی اور اصلاحِ نفس کی کوششوں میں بسر ہوں۔ یقیناً اس رات میں کچھ خصوصی انوار و تجلیات کا ظہور ہوتا ہوگا اور بعض اہلِ دل کو کچھ مادی آنکھوں سے بھی نظر آجاتا ہوگا۔ باقی اصل شے یہی ہے کہ اس شب میں بیداریٔ روح و تزکیۂ نفس کی زیادہ سے زیادہ تیاریاں کی جائیں اور دعا و ابتہال کا کوئی موقعہ ضائع نہ ہونے دیا جائے۔

طلوعِ اسلام قرآن نے صرف اتنا کہا ہے کہ لیلۃ القدر وہ رات ہے جس میں نزولِ قرآن کی ابتداء ہوئی اور نزولِ قرآن کی ابتداء، رمضان کے مہینے میں ہوئی تھی چونکہ نزولِ قرآن سے دنیا کو نئی اقدار ملی تھیں۔ اس لئے وہ رات جس میں اس کے نزول کا آغاز ہوا، یقیناً لیلۃ القدر تھی۔ اس سے زیادہ قرآن اس رات کے متعلق کچھ نہیں کہتا۔ (۱۹۵۵ء)

عید الفطر

متعدد مقامات سے استفسارات موصول ہوئے ہیں کہ عید الفطر کس تقریب کی یاد میں منائی جاتی ہے اور اس تیوہار کی غایت کیا ہے۔ جواباً عرض ہے کہ رمضان المبارک اور اس کے خاتمہ پر عید الفطر درحقیقت نزولِ قرآن کی سالگرہ منانے کا مقدس جشن ہے۔ دنیا میں عام طور پر جشن و مسرت کے تیوہار، موسموں کی تبدیلی یا کسی انسان کی یادگار قائم کرنے، یا کسی تاریخی واقعہ کو محفوظ رکھنے کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن اسلام یہ کہتا ہے کہ موسموں کا تغیر خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ انسانوں کی یادگاریں مٹ سکتی ہیں اور دنیاوی واقعات بھلائے جا سکتے ہیں۔ لیکن خدا کا وہ پیغام جو قرآن کریم کے اندر محفوظ کر کے رکھ دیا گیا ہے، کبھی مٹ نہیں سکتا کہ اس کی حفاظت کی ذمہ داری اس نے لی ہے۔ جو زندہ ہے اور مر نہیں سکتا۔ ایسا قائم ہے کہ اُسے فناہ و زوال نہیں۔ یہ جشنِ عید اس خدائے حی و قیوم کی زندہ و پائندہ کتاب کے نزول کی یادگار ہے۔ اس جشن کو منانے کے لئے مہینہ بھر سے تیاریاں کی گئیں (وہ تیاریاں بھی درحقیقت اسی جشن کا ایک جزو تھیں) اسلام قوانینِ خداوندی کی اطاعت کا نام ہے۔ زبردستی اطاعت نہیں بلکہ دل کی پوری رغبت سے اطاعت۔ یہ انہی قوانین کی اطاعت ہے کہ ایک عبدِ مؤمن حرام اور ناجائز شے کو چھو نہیں سکتا۔ اس کے ہاتھوں کسی شخص کے مال، جان، عزت و آبرو کو ناحق کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ اُسی جذبۂ اطاعت کی تقویت کے لئے حکم دیا گیا کہ اس کے حکم کے ماتحت کچھ وقت کے لئے حلال اور طیب چیزوں کو بھی چھوڑ دیا جائے تاکہ حرام اور ناجائز کی طرف کبھی نگاہ بھی نہ اُٹھنے پائے۔ انہیں دن بھر بھوک اور پیاس کی شدت برداشت کرنے کا خوگر بنایا گیا تاکہ یہ جہادِ زندگی کے سخت مرحلوں سے ہنستے کھیلتے گذر جانے کے عادی ہو جائیں۔ گویا یہ ایک سالانہ ٹریننگ کیمپ تھا۔ جس میں زندگی میں تازہ ولولے پیدا کرنے کے سامان فراہم کئے گئے تھے۔ ایک یادداشت تازہ کرنے والا (REFRESHER COURSE) تھا۔ جس میں خدا اور بندے کے براہِ راست تعلقات کی یاد تازہ کی گئی تھی۔ اپنا محاسبہ (STOCK TAKING) تھا جس میں سال بھر کے اعمال اور نتائج کی جانچ پڑتال کر کے جائزہ لینا تھا کہ ہم ایک سال میں کس حد تک آگے بڑھے ہیں۔ جب پورے ایک ماہ کی محنت اور اطاعت کے بعد دلوں میں تزکیہ، نگاہوں میں بصیرت، ذہن میں جلا اور روح میں بالیدگی پیدا ہوگئی تو انہیں یکجا جمع ہونے کا حکم دیا گیا تاکہ وہ سر جوڑ کر بیٹھیں اور سوچیں کہ انہیں اس زندگی کے حاصل کرنے اور قائم رکھنے کے لئے کیا کچھ کرنا ہے جو جماعتِ مومنین کی خصوصیت ہے اور جس کے وعدے قرآن کریم کے ایک ایک صفحہ پر بکھرے موتیوں کی

طرح اُبھرے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ اس سوچ بچار کے بعد اپنے لئے ایک پروگرام تیار کرلیں جس کا اعلان
ان کا منتخب امام اپنے خطبہ میں کرے۔ اس کے بعد ان کے نمائندے اس طے شدہ پروگرام کو لے کر
ملّت اسلامیہ کے مرکز محسوس یعنی بیت اللہ شریف کی طرف روانہ ہو جائیں۔ جہاں ان مختلف مقامی پروگراموں
کی روشنی میں تمام ملّت کے لئے مشترک نظام تجویز کیا جائے۔ یہ ہیں اس جشنِ مسرت کے مختلف اجزا اور یہ
ہے ان اجزا کی اجمالی تفصیل۔ انہیں سامنے رکھئے اور پھر دیکھئے کہ یہی تقریبیں، جن کے ہر گوشہ بساط
پر کبھی زندہ آرزوئیں مچلتیں اور تازہ ولولے رقص کرتے تھے۔ ان کی روح کے نگاہوں سے اوجھل ہو
جانے پر کس طرح رفتہ رفتہ رسمی اجتماعوں کی شکل اختیار کر گئیں۔ بقول علامہ اقبالؒ علیہ الرحمتہ ؎

رگوں میں وہ لہو باقی نہیں ہے
وہ دل وہ آرزو باقی نہیں ہے
نماز و روزہ و قربانی و حج
یہ سب باقی ہیں تو باقی نہیں ہے

(۱۹۵۵ء)

حج

سوال

دین کے نظام میں حج کا مقصد کیا ہے اور وہ کس طرح پورا ہوتا ہے۔ موجودہ حج تو ایک انفرادی عبادت ہی سمجھا جاتا ہے۔

جواب

ایک مشکل سوال

اس سرزمین پر جب سے انسانی شعور نے آنکھ کھولی ہے وہ ایک اہم سوال کے حل میں غلطاں و پیچاں نظر آرہا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ انسانوں نے باہمی مل جل کر رہنا ہے اور جب وہ مل جل کر رہتے ہیں تو ان کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے ہیں۔ اس تصادم اور ٹکراؤ سے فساد کی چنگاریاں ابھرتی ہیں جو ان کے خرمنِ امن و سلامتی کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دیتی ہیں، وہ سوال جس نے انسان کو ہمیشہ مضطرب و بیقرار رکھا ہے، یہ ہے کہ کونسی شکل پیدا کی جائے کہ اس دنیا میں انسان امن و سلامتی سے رہ سکیں۔ انسانیت کی تاریخ اسی سوال کے حل کی مسلسل داستان ہے جو ہمیں بتاتی ہے کہ انسان نے اس باب میں کیا کیا سوچا اور تجربہ نے اُسے کس طرح غلط ثابت کر دیا۔ قرآن نے انسان کی اس کوشش اور کوشش کے مآل کو ایک چھوٹی سی مثال میں اس طرح واضح کر دیا ہے کہ نگہِ بصیرت جوں جوں اس پر غور کرتی ہے، وجد و کیف سے جھوم اٹھتی ہے۔ وہ کہتا ہے۔ وَلَا تَكُونُوا كَالَّتِي نَقَضَتْ غَزْلَهَا مِنْ بَعْدِ قُوَّةٍ أَنكَاثًا۔ تمہاری مثال اس بڑھیا کی سی نہ ہو جائے۔ جس نے بڑی محنت سے سوت کاتا اور (پھر خود اپنے ہی ہاتھوں سے) اُسے بکھیر ڈالا۔ قرآن کریم کی اس چھوٹی سی مثال کو سامنے رکھیئے اور پھر تاریخ کے اوراق پر غور کر کے دیکھیئے کہ عبرت و موعظت کی کتنی

داستانیں ہیں جو اس کے اندر لپٹی ہوئی اور انسانی نامرادیوں اور ناکامیوں کے کتنے حوادث ہیں، جو اس میں پوشیدہ ہیں۔ ہر دور کے انسان کی جدوجہد کی تاریخ پر غور کیجئے۔ وہ اپنے لئے ایک عظیم الشان نظامِ تمدن تعمیر کرتا ہے۔ ان فلک بوس عمارات کی تکمیل میں انسانیت کی تکمیل کا راز مضمر دیکھتا ہے وہ ایک عرصہ تک اپنے تصورات کی دنیا میں محو رہتا ہے لیکن ابھی وہ عمارت تکمیل تک بھی نہیں پہنچنے پاتی کہ دنیا اس عبرت انگیز تماشا کو اپنی آنکھوں سے دیکھتی ہے کہ وہی انسان اس عمارت کو خود اپنے ہاتھوں سے زمین پر گرا دیتا ہے اور اس کی آرزوؤں اور تمناؤں کا وہ حسین مرقع خاک کے ڈھیر کے سوا کچھ نہیں رہتا جس کی ٹھیکریاں اپنے مٹے ہوئے نقوش سے آنے والوں کو اپنی حدیثِ الم سے آگاہ کرنے کے لئے باقی رہ جاتی ہیں۔ بابل اور نینوا، مصر اور یونان، چین اور ایران کے کھنڈرات کو چشمِ عبرت سے دیکھئے اور سوچیئے

عصرِ حاضر کا انسان

کہ انسانوں نے اتنی محنت سے کاتے ہوئے سوت کو کس طرح بار بار خود اپنے ہی ہاتھوں سے بکھیر کر رکھ دیا ہے۔ ادوارِ سابقہ کی طرح عصرِ حاضر کے انسان نے بھی اس سوال کے حل میں دماغ سوزی کی اور اس کی فکر و کاوش کا نتیجہ نیشنلزم (قومیت پرستی) کی صورت میں دُنیا کے سامنے آیا۔ جس پر اقوامِ مغرب اور ان کی دیکھا دیکھی دیگر اقوامِ عالم کی موجودہ سیاست کی بنیاد ہے۔ یورپ نے اس نسخۂ کیمیا کو اس قدر کامیاب قرار دیا کہ اُن کے آئینۂ فکر میں قومی محبت (PATRIOTISM) کو شرفِ انسانیت کی انتہا تصور کر لیا گیا ہے۔ لیکن جنگِ اوّل نے بالعموم اور اس کے بعد جنگِ دوم کے اسباب و علل اور نتائج و عواقب نے بالخصوص اس حقیقت کو بے نقاب کر دیا ہے کہ جسے تریاق سمجھا جاتا تھا۔ وہ انسانیت کے لئے زہرِ قاتل ہے۔ چنانچہ اب دانایانِ مغرب اپنی اس سوت کی انٹی کو خود اپنے ہاتھوں سے بکھیرنے کی فکر میں ہیں۔ ڈاکٹر ہکسلے نے ۱۹۴۷ء میں لکھا تھا۔

> قومیت پرستی اخلاقی تباہی کا موجب ہے۔ کیونکہ یہ عالمگیریت کے تصور کے منافی اور ایک خدا کے انکار پر مبنی ہے اور انسان کی قیمت بہ حیثیت انسان کچھ نہیں سمجھتی۔ دوسری طرف یہ تفرقہ انگیزی کا موجب ہے۔ انانیت اور تکبر پیدا کرتی ہے، باہمی نفرت بڑھاتی ہے اور جنگ کو نہ صرف ضروری قرار دیتی ہے بلکہ مقدس بھی ٹھہراتی ہے۔

اب اس مسئلہ کا حل یہ سوچا جا رہا ہے کہ مختلف اقوام کے گروہوں کو ملا کر متحدہ حکومتیں قائم کی جائیں حتیٰ کہ

تمام اقوامِ عالم کی ایک مشترکہ حکومت قائم ہو جائے۔ چنانچہ اقوامِ یورپ کو ایک گروپ بنا لینے کی تجویز یا مجلس اقوامِ متحدہ اور ان کی حفاظتی کونسل کا قیام یا وحدتِ ملکی کا (ONE - WORLD) کا تصور اسی انتہا کا نقطۂ آغاز سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال اقوامِ مغرب کے موجودہ تصورِ حیات کے ماتحت عملی طور پر اس کا امکان ہو یا نہ ہو، نظری طور پر اب یہی سمجھا جانے لگا ہے کہ اس مسئلہ کا حل یہی ہے کہ تمام دنیا کو ایک برادری تصور کر کے ان کے تمدنی مسائل کی پیچیدگیوں کا حل سوچا جائے۔ چنانچہ ڈاکٹر (GAULD) اپنی کتاب (MAN, NATURE AND TIME) میں لکھتا ہے۔

اب جو چیز بالکل فطری نظر آتی ہے یہ ہے کہ تمام نوعِ انسانی کی ایک منظم برادری قائم کی جائے۔

یہ ہے وہ حل جس تک ذہنِ انسانی بیسویں صدی تک پہنچ سکا ہے۔ لیکن آج سے چودہ سو سال پیشتر جبکہ دنیا کی یہ حالت تھی کہ ایک گاؤں کے رہنے والے دوسرے گاؤں کے باشندوں سے بھی

قرآن کی تعلیم

مشکل واقف ہو سکتے تھے۔ قرآن نے یہ بتایا کہ کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیْنَ وَ مُنْذِرِیْنَ۔ چونکہ تمام نوعِ انسانی کو ایک قوم بن کر رہنا ہے۔ اس مقصد کے پیشِ نظر کہ ان کے مفاد کے باہمی تصادم سے فساد کی چنگاریاں نہ ابھریں۔ خدا نے ایسی تعلیم بھیجی جس پر عمل پیرا ہونے سے فساد کا امکان نہ رہے۔ چنانچہ اس نے حضرات انبیائے کرام کا تذکرہ کرنے کے بعد جو اس تعلیم کے حامل تھے، فرمایا کہ اِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۖ وَّاَنَا رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْنِ۔ کہ تمہاری امت، امتِ واحدہ ہے اور اس کی وجۂ جامعیت اس حقیقت پہ ایمان کہ ان سب کا پروردگار ایک ہے اور وحدتِ انسانی کی عملی شکل اس طرح قائم رہ سکتی ہے کہ کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کا حق حاصل نہ ہو۔ سب انسان خدا کے قانون کے محکوم رہیں۔ یہ تعلیم اپنی آخری شکل میں قرآن کی رو سے انسانوں تک پہنچی۔ جس کا مقصود تمام نوعِ انسانی کو ایک برادری تصور کر کے جمعیتِ اقوام کے بجائے جمعیتِ آدم کی عملی تشکیل کرنا ہے۔ اگرچہ اسلام کے تمام احکام اور فرائض اسی نقطہ کی طرف قدم اٹھاتے ہیں۔ لیکن اس کی تکمیل حج کے اجتماع میں ہوتی ہے جو اسلام کا آخری رکن ہے۔

حج سے مفہوم

حج سے مفہوم یہ ہے کہ تمام دنیا کے انسان بلا تفریق رنگ و نسل اور بلا امتیاز وطن و زبان، جو اس نصب العین پر ایمان رکھتے ہوں کہ دنیا میں کسی انسان کو دوسرے انسان پر حکومت کرنے کا حق نہیں، محکومیت صرف خدا کے قانون کی جائز ہے، اپنے اپنے ملکوں سے اپنے نمائندے چنیں۔ یہ نمائندے اپنے میں سے ایک منتخب کردہ امیر کی زیر قیادت، مرکز وحدت انسانیت یعنی کعبۃ اللہ کی طرف روانہ ہوں۔ عرفات کے میدان میں ان تمام نمائندگان کا باہمی تعارف ہو۔ پھر یہ تمام امرائے ملت اپنے میں سے ایک امیر الامراء کا انتخاب کریں اور مختلف ممالک کے احوال وظروف کو سامنے رکھ کر باہمی مشاورت سے ایک ایسا پروگرام مرتب کریں جو آئندہ سال کے لئے اصولی طور پر بطور مشترکہ پالیسی اختیار کیا جائے اور جو امن وسلامتیٔ انسانیت کا ضامن اور فلاح و سعادت آدمیت کا کفیل ہو۔ اُن کا منتخب کردہ امام اپنے خطبۂ حج میں اس پروگرام کا اعلان کر دے جو دنیا کے گوشے گوشے تک پہنچ جائے۔ اس کے بعد یہ تمام نمائندگان، مقام منیٰ میں جمع ہو کر اس اصولی پروگرام کی تفصیلات وجزئیات پر غور کریں اور یہ سوچیں کہ ایک دوسرے ملک پر اس کا عملی اثر اور ردّ عمل کیا ہوگا۔ وہاں باہمی مذاکرات بھی ہوں اور دعوتیں اور ضیافتیں بھی، جس کے لئے قربانی تجویز کی گئی ہے۔ اس کے بعد یہ نمائندگان اپنے اپنے ملکوں میں واپس آجائیں اور اس طے شدہ پروگرام کے مطابق اپنے اپنے لوگوں کو چلائیں۔ یہ ہے وہ عملی طریقہ، جو قرآن کریم نے تمام نوع انسانی کو، ایک امتِ واحدہ بنانے اور ان کے تمدنی مسائل کا حل تجویز کرنے کے لئے بتایا ہے۔ قرآن کریم نے حج کے اس مقصد اور غایت کو دو مقامات پر دو دو الفاظ میں بیان کر دیا ہے۔ آپ ان مختصر ٹکڑوں کی جامعیت پر غور کیجئے اور پھر سوچئے کہ کسی اجتماع کی غایت اس سے بلند، اور کوئی اندازِ بیان اس سے بلیغ بھی ہو سکتا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے کہ حج کے اجتماع سے مقصود یہ ہے۔ لِيَشْهَدُوا مَنَافِعَ لَهُمْ۔ تاکہ لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ اس میں

قیامِ انسانیت

اُن کے لئے کس قدر فائدے ہیں اور اس کی غایت کیا؟ قِيَامًا لِّلنَّاسِ۔ یعنی اس سے دنیا میں انسانیت قائم رہے۔

غور کیجئے کہ کیا دنیا میں کسی کانفرنس، کسی اسمبلی، کسی پارلیمنٹ، کسی اجتماع کا مقصد اس سے بلند ہو سکتا ہے کہ وہ دنیا میں شرفِ انسانیت کے قیام کا باعث ہو۔ قِيَامًا لِّلنَّاسِ۔ کسی خاص

قوم، خاص ملک، خاص ملت کے قیام کا باعث نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے قیام کا باعث۔ یہ ہے حج کے اجتماع کا مقصد۔ یعنی قِیَامًا لِلنَّاسِ ۔ ۱۹۵۰ء

حج کی اہمیّت

سوال

آپ کے متعلق مشہور کیا جاتا ہے کہ آپ حج کی اہمیّت کے بھی قائل نہیں۔ براہِ کرم اس ضمن میں اپنی پوزیشن واضح کر دیجئے۔

جواب

میرے متعلق کیا کیا مشہور نہیں کیا جاتا اور مَیں کس کس باب میں اپنی پوزیشن واضح کروں؟ مشہور کرنے والوں کے پاس پراپیگنڈا کی وسیع مشینری ہے جس کی مدد سے وہ جو جی میں آئے اُسے پھیلا سکتے ہیں۔ کسی کے خلاف افترا پردازی اور کذب بیانی سے انسان کو صرف ایک چیز روک سکتی ہے اور وہ یہ کہ کہنے والے کو اس کا احساس ہو کہ جو کچھ وہ کہتا ہے اس کے متعلق اُس سے خدا کے ہاں بازپُرس ہوگی۔ اگر اس خیال کو دل سے نکال دیا جائے تو پھر اُسے کوئی چیز تہمت تراشیوں اور کذب بافیوں سے باز نہیں رکھ سکتی۔

حج کے متعلق میری متعدد شائع شدہ تحریریں موجود ہیں جن سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ میرے نزدیک اس عظیم اجتماع کی اہمیت کس قدر ہے۔ مَیں صلوٰۃ کے مقامی اجتماعات اور حج کے عالمگیر اجتماع کو، اسلامی نظامِ زندگی کی بنیادیں قرار دیتا ہوں۔ اور اسی لئے اس پر زور دیتا ہوں کہ ان اجتماعات کو رسمی طور پر منعقد نہ کیا جائے بلکہ اس مقصد کو پیشِ نظر رکھا جائے جس کے لئے یہ اجتماعات مقرر کئے گئے ہیں مثلاً میری ایک ریڈیائی تقریر (مطبوعہ فردوسِ گُم گشتہ) کے اخیر میں آپ یہ لکھا ہوا پائیں گے:

جمعیّتِ آدم حج سے مقصود اسی "جمعیّتِ آدم" کی تشکیل تھا۔ اس حج سے جو آج چند رسوم کا بے جان اور بے مقصد مجموعہ بن کر رہ گیا ہے۔ لیکن اس آئینِ کہن میں آج بھی وہی رُوح پیدا کی جا سکتی ہے جو انسانیت کے شرف کی کفیل ہے۔ آج عالمِ اسلامی چاروں طرف سے

مصائب و نوازل سے گھرا ہوا ہے۔ غیر خدائی قوتیں ان کے خلاف متحدہ محاذ قائم کئے ہوئے ہیں۔ کہ دنیا کے نقشے پر کہیں ان کا نشان نہ رہنے پائے۔ مسلم اقوام کے نمائندے مختلف مقامات پر کانفرنسیں منعقد کر رہے ہیں کہ باہمی اتحاد سے ان مخالف قوتوں کا مقابلہ کیا جائے۔ تمام اسلامی ممالک میں اخوت اور روابط کی تحریکیں چلائی جا رہی ہیں۔ باہمی میل ملاپ کے سلیقے ڈھونڈے جاتے ہیں۔ یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔ لیکن کسی کی نگاہ اس طریق ربط و اخوت کی طرف نہیں اٹھتی جسے ہمارے خدا نے ہمارے لئے متعین کیا تھا جس سے ہمارے دلوں میں ائتلاف اور نگاہوں میں یک رنگی پیدا ہو جاتی تھی۔ ہم اسے بے کیف رسم بنائے ہوئے ہیں اور اس میں روح پھونکنے کی کوئی تجویز نہیں سوچتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب تک ہم دیگر اقوام عالم کی تقلید میں کانفرنسیں طلب کرتے رہیں گے ہماری کامیابیاں انہی کے پیمانوں سے ماپی جائیں گی۔ لیکن جس وقت ہم نے اپنے اللہ سے بھلایا ہوا عہد استوار کر لیا اور پھر اسی مرکز کو زندہ کر دیا جس کی زندگی سے تمام نوع انسانی کی زندگی وابستہ ہے، اقوام عالم کی امامت ہمارے حصہ میں آجائے گی۔ ہماری زندگی کے چشمے کی سوتیں عرفان کے منبر سے پھوٹیں گی اور اسی سے ہماری کشت حیات سرسبز و شاداب ہوگی۔ آج مسلمانان عالم کو حج کا فریضہ پکار پکار کر کہہ رہا ہے کہ اس سے مقصود یہ ہے کہ :

ایک ہوں مسلم حرم کی پاسبانی کے لئے
نیل کے ساحل سے لے کر تا بخاک کاشغر

میں قوم کے نوجوانوں کو تلقین اور تاکید کرتا رہتا ہوں کہ اگرچہ ان اجتماعات میں اس وقت ان کی حقیقی رُوح نہیں رہی لیکن اس کے باوجود ان کا قائم رکھنا نہایت ضروری ہے اس لئے کہ اگر کبھی ہماری قسمت نے پلٹا کھایا اور ہم میں اس انقلاب کا احساس پیدا ہُوا، جو قرآن پیدا کرنا چاہتا ہے تو انہی بے جان پیکروں میں پھر سے رُوح آجائے گی اور یہ مناسک و شعائر جس نظام کی یادگار ہیں، اُس کے از سر نو قیام میں آسانی پیدا ہو جائے گی۔ (سلیم کے نام خطوط، حصہ اول صلے ۲)

پچھلے سال میرے ہفتہ وار درس قرآن میں جب حج سے متعلق آیات سامنے آئی تھیں تو میں نے اس کی اہمیت کو کس انداز میں واضح کیا تھا۔ اس کا اندازہ وہ احباب کر سکتے ہیں جو ان درسوں میں شریک تھے۔ یا جنہوں نے انہیں بعد میں ٹیپ ریکارڈ سے سنا ہو گا۔ ۱۹۶۲ء

حج کا فلسفہ

ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا ذکر ان صفحات میں اس سے پہلے کئی بار آچکا ہے۔ وہ یورپ میں بیٹھے "اسلام" کی تبلیغ کرتے ہیں۔ کراچی کے ہفتہ وار اخبار "الاسلام" (بابت یکم جولائی ۱۹۵۹ء) میں ان کا ایک مضمون درج ہے جس میں حج کا فلسفہ بیان کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں آپ فرماتے ہیں:

> جنت سے نکلنے کے بعد (حضرت) آدم اور (اماں) حوا ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ وہ (مدتوں) ایک دوسرے کی تلاش کرتے رہے اور بالآخر خدا کی رحمت سے عرفات کے میدان میں ان کی ملاقات ہو گئی۔ خدا کے اس احسان کے شکریہ کے لئے آدم و حوا کی اولاد، خدا کی طرف رجوع کرتی ہے اور کوشش کرتی ہے کہ اپنے آپ کو بھلا کر بحضور باری تعالیٰ جذب ہو جائیں اور خدا سے سابقہ لغزشوں کی معافی مانگیں اور آئندہ کے لئے اس کی تائید و نصرت کی التجا کریں۔ (ترجمہ از انگریزی)

یہ تو رہا اجتماعِ عرفات کا فلسفہ۔ "رمی الجمار" (پتھر مارنے) کے متعلق ارشاد ہے:۔

> جب (حضرت) ابراہیمؑ نے یہ دعویٰ کیا کہ انہیں خدا کی محبت ہر شے سے بڑھ کر ہے تو اس کے ثبوت میں خدا نے مطالبہ کیا کہ وہ اپنے بیٹے کو قربان کر دے (یہی آزمائش کچھ کم نہ تھی)۔ اس پر طرہ یہ کہ شیطان تین مرتبہ حضرت ابراہیمؑ کے پاس پہنچا تا کہ انہیں اس قربانی سے باز رکھ سکے ___ کہتے ہیں کہ یہ واقعہ منیٰ میں ہوا تھا۔ لیکن حضرت ابراہیمؑ نے ہر مرتبہ شیطان کو پتھر مار کر بھگا دیا۔ لہذا ہر حاجی سنتِ ابراہیمیؑ کے اتباع میں استعارۃً شیطان کو پتھر مارتا ہے تا کہ وہ اس کے وساس سے محفوظ رہے (ایضاً)

آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے ہاں کے ایک "ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی" اہلِ مغرب کے سامنے اسلام کا فلسفہ کس انداز میں پیش فرما رہے ہیں! واضح رہے کہ قرآن میں نہ (حضرت) آدم اور (اماں) حوا کے بچھڑنے اور ملنے کا تذکرہ ہے اور نہ ہی حضرت ابراہیمؑ کے شیطان کو پتھر مارنے کا ذکر۔ (۱۹۵۹ء)

قربانی

سوال: براہ کرم مطلع فرمایئے کہ عید الاضحیٰ کے موقع پر جو قربانی دی جاتی ہے اس کی دینی حیثیت کیا ہے؟ اس باب میں ذرا جرأت سے کام لوں، تو امید ہے کہ آپ بُرا نہیں مانیں گے۔ ہمیں یہ بتایا جاتا ہے کہ قربانی حضرت خلیل اکبر کی یادگار ہے جسے قرآن نے زندہ جاوید بنا دیا ہے۔ لیکن جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ قرآن کریم نے حضرت ابراہیمؑ کے واقعہ میں کہیں یہ نہیں فرمایا کہ تم ہر سال اس طرح جانور ذبح کر کے اس یاد کو منایا کرو۔ پھر اس کی اصل کیا ہے؟ معاف فرمایئے، اب کیفیت یہ پیدا ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کا کم از کم پڑھا لکھا طبقہ اسے محسوس کرتا ہے کہ اس سے قوم کا بہت سا روپیہ بے کار جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ اس احساس کو باہر کہیں بیان نہیں کرتے۔ کیونکہ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ اسلامی شعار ہے، اس لئے اس کے خلاف لب کشائی جائز نہیں۔ امسال کی عید پر ہمارے اقتصادی حالات پیچیدہ تر ہو چکے تھے بیشتر افرادِ ملت کا اثاثہ غارت ہو چکا ہے۔ بے شمار گھروں میں بے خانماں اقربا اور یتامیٰ موجود ہیں۔ ان عوامل کا دبا دبا سا احساس محسوس ہوتا تھا۔ چنانچہ اس موقع پر اس قسم کی سرگوشیاں اکثر سنی گئیں کہ "صاحب میرے ہاں تو اس قدر مہاجر پڑے ہیں۔ میں انہیں چھوڑ کر کس طرح قربانی دے سکتا ہوں؟ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ اپنے آپ کو "چور" سا محسوس کرتے ہیں کہ قربانی نہ دینے سے وہ گنہگار ہو جائیں گے میں خود بھی انہی "مجرموں" میں سے ایک ہوں۔ اس لئے یہ دریافت کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ قربانی کی دینی حیثیت کیا ہے؟

جواب:۔ ہمارے سامنے جب یہ سوال آتا ہے کہ فلاں معاملہ کی دینی حیثیت کیا ہے تو ہم یہ نہیں دیکھتے کہ اس سے ذہنوں میں کس طرح کشمکش پیدا ہو رہی ہے، اور ہمارے اقتصادی یا معاشرتی حالات پر اس سے کیا اثر پڑ رہا ہے۔ ہم صرف یہ دیکھتے ہیں کہ اس باب میں خدا کا حکم کیا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جب قرآن کا صحیح فیصلہ سامنے آجائے تو اس سے وہ تمام ذہنی کشمکش دور ہو جاتی ہے جو انسانوں کے بنائے ہوئے مذہب سے ہر قلب سلیم میں پیدا ہوتی ہے اور اس فیصلہ سے ہمارے اقتصادی اور معاشرتی مسائل بھی خود بخود اعتدال پر آجاتے ہیں کہ اگر قرآن یہ کچھ نہ کرے، تو وہ دین حقہ کیسے ہو سکتا ہے۔ لہٰذا قربانی کے سلسلہ میں ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ اس باب میں خدا کا حکم کیا ہے۔

پہلے یہ متعین کر لیجئے کہ مسئلہ زیر غور کیا ہے۔ اس وقت صورت یہ ہے کہ :

۱۔ حج کے موقعہ پر حاجی مکہ معظمہ میں جانور ذبح کرتے ہیں۔ جسے قربانی کہا جاتا ہے۔

۲۔ ایک ایک حاجی متعدد جانور ذبح کرتا ہے۔ ان جانوروں کو گڑھے کھود کھود کر دبانا پڑتا ہے۔

۳۔ عید کے موقعہ پر تمام دنیا کے مسلمان اپنی اپنی جگہ پر جانور ذبح کرتے ہیں۔ اسے بھی قربانی کہا جاتا ہے۔

سوال یہ ہے کہ ان میں سے کسی بات کا حکم قرآن سے بھی ملتا ہے یا یہ چیزیں یونہی رسماً چلی آ رہی ہیں۔

سوال آپ کے سامنے آچکا۔ اب دیکھئے کہ اس باب میں قرآن کیا کہتا ہے۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ قرآن نے ان جانوروں کے ذبح کرنے کے لئے کہیں "قربانی" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ نہ ہی اس نے اسے خاص طور پر قربِ الٰہی کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ یہ تصور کہ جانوروں کے خون بہانے سے خدا خوش ہو جاتا ہے۔ اس لئے قربانی وجۂ تقربِ خداوندی ہوتی ہے، غیر قرآنی تصور ہے۔

قرآن جس تمدنی نظام (SOCIAL ORDER) کی تشکیل چاہتا ہے۔ اس کا نقطۂ آغاز الصلوٰۃ ہے اور منتہیٰ حج۔ یعنی ملت کی محدود وحدتوں (UNITS) کی صحیح تعمیر سے شروع کر کے پوری کی پوری ملت کو ایک مرکزِ وحدانیت پر جمع کرنا، انہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق چلانا اور اس کے بعد اس ضابطۂ حیات کو ساری دنیا میں نافذ کرنے کا ذریعہ بنانا۔ حج، ملت کے اس عظیم القدر اجتماع کا نام ہے جس میں قرآنی نظامِ حیات کے پروگرام پر غور و خوض کر کے اسے نافذ العمل بنانے کی تراکیب کو سوچا جاتا ہے۔ اس اجتماع کا مرکز "بیت الحرام" (خانہ کعبہ) ہے جو ملتِ اسلامیہ کا مرکز محسوس ہے۔ اس عظیم الشان اجتماع کو کامیاب بنانے میں ہر کوشش مبارک اور ہر اقدام مسعود ہے۔

قرآن کریم میں جانوروں کے ذبح کرنے کا ذکر اسی اجتماع کے سلسلہ میں آیا ہے اور وہ آیات حسب ذیل ہیں۔ (ان آیات پر الگ الگ نمبر بھی دے دیئے گئے ہیں تاکہ آئندہ حوالہ میں سہولت ہو۔ نیز ان کا ترجمہ مروجہ ترجموں کے مطابق ہی کر دیا گیا ہے تاکہ یہ اعتراض نہ پیدا کر دیا جائے کہ ہم نے (خدانخواستہ) اپنے مطلب کے مطابق معانی

قرآنی آیات

پیدا کرنے کے لئے ترجمہ کچھ کا کچھ کر دیا ہے۔ سورۂ الحج میں ہے:

۱۔ وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ یَاْتُوْكَ رِجَالًا وَّ عَلٰی كُلِّ ضَامِرٍ یَّاْتِیْنَ مِنْ كُلِّ فَجٍّ عَمِیْقٍ ۙ لِّیَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ وَ یَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِیْۤ اَیَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰی مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِیْمَةِ الْاَنْعَامِ ۚ فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْبَآىِٕسَ الْفَقِیْرَ۔ (۲۲/۲۷-۲۸)

اور لوگوں میں حج کا اعلان کر دو۔ لوگ تمہارے پاس چلے آئیں گے۔ پیادہ بھی اور دُبلی اونٹنیوں پر بھی جو کہ دُور دراز راستوں سے پہنچی ہوں گی، تاکہ لوگ اپنے فوائد کے لئے آموجود ہوں اور تاکہ ایّامِ مقررہ میں ان چوپاؤں پر (ذبح کے وقت) اللہ کا نام لیں جو اللہ نے انہیں عطا کئے ہیں۔ سو جانوروں میں سے خود بھی کھاؤ اور مصیبت زدہ محتاج کو بھی کھلاؤ۔

ان جانوروں کے متعلق آگے چل کر یوں ارشاد ہے۔

۲۔ لَكُمْ فِیْهَا مَنَافِعُ اِلٰۤی اَجَلٍ مُّسَمًّی ثُمَّ مَحِلُّهَاۤ اِلَی الْبَیْتِ الْعَتِیْقِ۔ (۲۲/۳۳)

ان جانوروں میں تمہارے لئے ایک مُدّتِ معیّنہ تک فائدہ اٹھانا ہے۔ اس کے بعد اُن کے حلال کرنے کی جگہ بیت عتیق (خانہ کعبہ) کے قریب ہے۔

اس سے آگے ہے:۔

۳۔ وَالْبُدْنَ جَعَلْنٰهَا لَكُمْ مِّنْ شَعَآىِٕرِ اللّٰهِ لَكُمْ فِیْهَا خَیْرٌ ۖ فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَیْهَا صَوَآفَّ ۚ فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَ اَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَ الْمُعْتَرَّ ؕ كَذٰلِكَ سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ۔ (۲۲/۳۶)

اور قربانی کے اونٹوں[1] کو ہم نے اللہ کے دین کی یادگار[2] بنایا ہے۔ ان جانوروں میں تمہارے

---

[1] جس لفظ کا ترجمہ "قربانی کے اونٹ" کیا گیا ہے وہ لفظ بُدْن ہے بُدْن کے معنی ہیں موٹا، فربہ۔ بُدْن جمع بَدَنَۃٌ کی جس کے معنی فربہ اونٹ وغیرہ ہیں۔ جنہیں حج کے موقعہ پر مکہ میں ذبح کیا جاتا تھا۔ اس کے لئے انہیں فربہ کیا جاتا تھا۔

[2] شعائر کا ترجمہ یادگار کیا گیا ہے۔ اس کا صحیح مفہوم ذرا آگے چل کر بیان ہوگا۔

لئے (اور بھی) فائدے ہیں۔ سوتم انہیں کھڑا کرکے ان پر اللہ کا نام لیا کرو۔ پس جب وہ کسی کروٹ گر پڑیں توتم خود بھی کھاؤ اور سوال کرنے والے اور سوال نہ کرنے والے محتاج کو بھی کھلاؤ۔ ہم نے ان جانوروں کو اسی طرح تمہارے زیرِ حکم کر دیا تاکہ تم شکر کرو۔

اور اس کے بعد ہے:۔

۴۔ لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَاۤؤُهَا وَلٰكِنْ يَّنَالُهُ التَّقْوٰى مِنْكُمْ كَذٰلِكَ سَخَّرَهَا لَكُمْ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَبَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ۔ (۲۲/۳۷)

اللہ کے پاس نہ ان کا گوشت پہنچتا ہے اور نہ ان کا خون، ولیکن اس کے پاس تمہارا تقویٰ پہنچتا ہے۔ اِس طرح اللہ نے ان جانوروں کو تمہارے زیرِ حکم کر دیا تاکہ تم اللہ کی بڑائی کرو۔ اس پر جس کی اُس نے تمہیں ہدایت کی ہے اور محسنین کے لئے بشارت ہے۔

یہ سورۂ حج کی آیات ہیں۔ انہیں دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ یہ مسئلہ پیشِ نظر کے متعلق کس قدر صاف اور واضح ہیں۔

آیت (۱) ۔ میں سلسلۂ کلام کا آغاز ہی اعلانِ حج سے ہوتا ہے اور اسی ضمن میں فرمایا ہے کہ جانوروں کو ذبح کرو اور ان میں سے خود بھی کھاؤ اور حاجت مندوں کو بھی کھلاؤ۔

آیت (۲) ۔ سے واضح ہے کہ یہ وہ جانور ہیں جن سے پہلے عام جانوروں کا کام لیا جاتا ہے ان پر سواری کرکے یا بوجھ لاد کر، حج کے لئے آیا جاتا ہے اور پھر انہیں حج کی تقریب پر مکہ معظمہ میں ذبح کیا جاتا ہے۔

آیت (۳) بھی آیت (۲) کے مضمون کی تائید کررہی ہے۔ یعنی ان جانوروں کے فوائد (خرا اور اس کے بعد ذبح کرکے خود بھی کھانا اور محتاجوں کو کھلانا۔ (ان کے شعائر اللہ ہونے کا بیان آگے چل کر آئے گا)۔

آیت (۴) میں اس غلط تصور کا ابطال کیا گیا ہے جس کی رُو سے سمجھا جاتا تھا کہ قربانی کی حیثیت افادی نہیں بلکہ خدا کی خوشنودی ہے۔ جو خون بہانے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لئے قربانی کے جانور ذبح کرکے چھوڑ دینے چاہئیں۔ اس کے برعکس یہ واضح کر دیا گیا کہ ان جانوروں کے ذبح کرنے سے مقصود خون بہا کر خدا کو خوش کرنا نہیں بلکہ مقصود صرف یہ ہے کہ اُن کا گوشت تمہارے اور دیگر ضرورت مندوں

کے کام آئے۔ اللہ کے نزدیک قابلِ قدر چیز تمہارا تقویٰ ہے۔ تقویٰ کی تشریح اگلے الفاظ سے کر دی جن میں بتایا گیا کہ تمہارا مقصودِ حیات یہ ہے کہ جس ضابطۂ حیات کی طرف تمہاری راہ نمائی کی گئی ہے، اُسے متشکل اور مستحکم کرو اور اس طرح دُنیا میں قانونِ خداوندی کی عظمت اور کبریائی کو ثبت کر کے دکھا دو۔ اجتماعِ حج اِسی مقصد کے حصول کی کڑی ہے اور یہ جانور اس اجتماع میں شامل ہونیوالوں کے خورونوش کا ذریعہ بنتے ہیں۔

قرآن کی رُو سے دُنیا میں دو ہی قومیں ہیں۔ ایک وہ جو ضابطۂ خداوندی کے مطابق زندگی بسر کریں (مُسلم) اور دوسری وہ جو اس کے علاوہ دیگر ضوابط زندگی کو اپنا مسلک بنائیں (غیر مسلم) قرآن ان دونوں جماعتوں میں واضح اور غیر مبہم امتیازی خطوط قائم کرنا چاہتا ہے تاکہ وہ زندگی کے ہر شعبہ میں بآسانی پہچانے جا سکیں۔ چنانچہ ہر وہ عمل یا وہ شے جو اس قسم کی پہچان کرا سکے، شعائرُاللہ کہلاتی ہے۔ شعار اس خاص نشان کو کہتے ہیں جو جنگ میں استعمال کیا جائے تاکہ اس سے اپنے رفیق اور دوست

شعائرُاللہ

پہچانے جا سکیں۔ حج تمام دنیا کے مسلمانوں کا مرکزی اجتماع اور یک قلبی اور یک نگہی کا عملی مظاہرہ اور ایک ضابطۂ قانون کے تابع زندگی بسر کرنے والوں کی تعارفی تقریب ہے۔ اس سے بڑا دوستوں اور رفیقوں کا اجتماع اور کونسا ہو سکتا ہے۔ اِس لئے حج کے تضمنات (صفا و مروہ اور بُدن وغیرہ) کو خصوصیت سے شعائرُاللہ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورہ مائدہ میں ہے:-

۵- يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تُحِلُّوا۟ شَعَٰٓئِرَ ٱللَّهِ وَلَا ٱلشَّهْرَ ٱلْحَرَامَ وَلَا ٱلْهَدْىَ وَلَا ٱلْقَلَٰٓئِدَ وَلَآ ءَآمِّينَ ٱلْبَيْتَ ٱلْحَرَامَ يَبْتَغُونَ فَضْلًا مِّن رَّبِّهِمْ وَرِضْوَٰنًا ؕ (۵/۲)

اے ایمان والو! بے حرمتی نہ کرو شعائرُاللہ کی اور نہ حُرمت والے مہینے کی، نہ حرم میں قربانی ہونے والے جانوروں کی اور نہ ان جانوروں کی جن کے گلے میں پٹے پڑے ہوں اور نہ اُن لوگوں کی جو بیت الحرام کے مقصد سے جا رہے ہوں اور اپنے رب کے فضل اور رضامندی کے طالب ہوں۔

چونکہ حج سے مقصود، دُنیا میں قوانینِ خداوندی کا عملی نفاذ ہے جس کا نتیجہ یہ ہو گا کہ نوعِ انسانی میں

صحیح توازن پیدا ہو جائے گا اور اس طرح انسانیت اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے گی۔
اس لئے اللہ تعالیٰ نے جہاں بیت الحرام کو وجہِ قیامِ انسانیت قرار دیا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس کے تضمنات کو بھی انہی الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ فرمایا:

۷۔ جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيَامًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَائِدَ ۔ (۵/۹۷)

اللہ نے کعبہ کو، جو کہ حرمت والا مکان ہے، لوگوں کے قیام کا باعث قرار دیا ہے اور عزت والے مہینے کو بھی اور حرم میں قربانی ہونے والے جانوروں کو بھی اور ان جانوروں کو بھی جن کے گلے میں پٹے پڑے ہوں۔

آیات ۱ تا ۴ کو پھر سے سامنے لائیے۔ ان سے یہ حقیقت نکھر کر سامنے آ جاتی ہے کہ قرآن کی رُو سے:

۱۔ قربانی صرف حج کے موقعہ پر ہے۔
۲۔ قربانی کا مقام مکہ معظمہ ہے جہاں حج ہوتا ہے۔
۳۔ قربانی سے مقصود یہ ہے کہ ان جانوروں کا گوشت کھایا جائے۔
۴۔ یہ سمجھنا کہ جانور ذبح کرنے سے قربِ الٰہی حاصل ہوتا ہے، غلط ہے۔

ان حقائق سے یہ واضح ہو گیا کہ:

ا۔ حج کے علاوہ کسی اور تقریب پر قربانی کا ذکر نہیں۔
ب۔ مکہ معظمہ کے علاوہ اور کسی مقام پر قربانی نہیں۔
ج۔ جس جانور کا گوشت کھانے کے کام نہ آئے اُسے قربانی نہیں کہا جا سکتا۔ کیونکہ اس کا صرف خون بہایا گیا ہے اور خون اللہ تک نہیں پہنچتا۔ لہٰذا ایسا کرنا اسراف ہے۔ یعنی بے نتیجہ اور بے مصرف ایک جانور کا ضائع کر دینا۔

فلهذا

۱۔ حج کی تقریب پر جانوروں کو ذبح کر کے مٹی میں دبائے جانا منشائے قرآن کے یکسر خلاف ہے اور

(۱۱)۔ یہ جو عید کی تقریب پر دُنیا بھر کے شہروں میں قربانیاں دی جاتی ہیں، اُن کا حکم تو ایک طرف، کہیں ذکر تک بھی قرآن میں نہیں بلکہ یہ قرآن کے حکم کے خلاف ہے۔ کیونکہ جب قرآن نے قربانی کے مقام کو بالتصریح معیّن کر دیا ہے تو اس معیّن کو عام کر دینا قرآنی منشا کے خلاف ہے مثلاً قرآن نے نماز کے لیے سمت قبلہ کو معیّن کر دیا ہے اس کے بعد ہر طرف منہ کر کے نماز پڑھنا قرآنی حکم کے خلاف ہوگا۔

اب دیگر آیات دیکھئے

سورۂ البقرہ میں ہے :۔

۷۔ وَ اَتِمُّوا الْحَجَّ وَ الْعُمْرَةَ لِلّٰهِ۔ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ

اور حج اور عمرہ کو اللہ کے لئے پورا کرو۔ پھر اگر تم (کسی وجہ سے روک دیئے جاؤ تو قربانی کا جانور جو بھی میسّر آئے (خانہ کعبہ کو بھیج دیا کرو)

وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ۔

اور اپنے سروں کو اس وقت تک مت منڈواؤ جب تک قربانی کا جانور اپنے موقع پر پہنچ نہ جائے (اور وہ موقع حرم ہے)

فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖۤ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ۔

اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا اس کے سر میں تکلیف ہو تو اس کا فدیہ روزے ہیں یا صدقہ یا نسک (قربانی)

فَاِذَاۤ اَمِنْتُمْ فَمَنْ تَمَتَّعَ بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ۔

پھر جب امن کی حالت ہو جائے تو جو شخص عمرہ کو حج کے ساتھ ملا کر دونوں سے متمتع ہو تو جو کچھ قربانی میسّر ہو ذبح کرے۔

فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِى الْحَجِّ وَ سَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ تِلْكَ عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِى الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ۔ (۲/۱۹۶)

پھر جس شخص کو قربانی کا جانور میسر نہ آئے تو اُس کے ذمے تین دن کے روزے ایامِ حج میں
اور سات دن کے جب حج سے لوٹنے کا وقت ہو۔ یہ پورے دس ہوئے یہ اس کے
لئے ہے جس کے اہل و عیال کعبہ کے قریب نہ رہتے ہوں۔

ان آیات میں یہ ارشاد ہے کہ حج اور عمرہ[1] میں، عام حالات میں قربانی کا حکم نہیں ضرورت کے مطابق، باہمی مشاورت سے خورد و نوش کے لئے جانور ذبح کئے جائیں گے۔

لیکن حسب ذیل اسباب میں سے کوئی سبب پیدا ہو جائے تو ھدی یا نسک کا حکم ہے (ان الفاظ کے معانی آگے چل کر آتے ہیں)۔

۱۔ کسی شخص نے حج یا عمرہ کا ارادہ کر لیا لیکن وہ محصور ہو گیا اور خانہ کعبہ تک نہیں پہنچ سکا تو اُسے چاہیئے کہ اپنے ھدی کو کسی کے ہاتھ بھیج دے۔ جب ھدی مکہ میں پہنچ جائے پھر حجامت بنوا کر احرام سے باہر نکل آئے۔ اس سے پہلے حجامت نہ بنوائے۔

۲۔ دوسرا سبب یہ ہے کہ حالتِ احرام میں (جبکہ حجامت بنوانا منع ہے) کسی تکلیف کے سبب حجامت بنوانے کے لئے مجبور ہو جائے تو اس کا بدلہ یہ ہے کہ روزے رکھے یا صدقہ دے یا نسک۔

۳۔ تیسرا یہ کہ حج اور عمرہ ایک ساتھ کرے تو اس صورت میں ھدی دے اور اگر یہ میسر نہ ہو تو دس دن کے روزے رکھے۔

آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ ان مقامات پر صرف قربانی کا حکم نہیں ہے۔ سبب اوّل کے ماتحت اتنا بتا دیا گیا ہے کہ عازمِ حج بحالتِ معذوری (محصور ہو جانے کی شکل میں) کیا کرے۔ اس صورت میں وہ اپنے ھدی کو کعبہ تک بھیج دے۔ سبب دوم میں روزے یا صدقہ یا نسک کا حکم ہے اور سبب سوم میں ھدی کا حکم ہے بشرطیکہ وہ میسر آ جائے۔ اگر میسر نہ آئے تو پھر روزے رکھ لے۔

---

[1] حج تمام دنیا کے مسلمانوں کے نمائندگان کی سالانہ کانفرنس ہے اور سال بھر میں وقتاً فوقتاً جو کانفرنسیں کی جائیں وہ عمرہ ہیں۔

ھدیٰ کے معنی

ان آیات میں ھدیٰ اور نُسک کے الفاظ آئے ہیں۔ ھدیٰ جمع ہے ھَدِیَۃ کی جس کے معنی ہیں تحفہ۔ خود قرآن میں ہے۔ بَل انتم بِھدیتکم تفرحون۔ (۲۷/۳۶) اس لئے یہ بھی ضروری نہیں کہ ھدیٰ صرف قربانی کے جانور ہی ہوں۔ فَمَا اسْتَیْسَرَ مِنَ الْهَدْیِ ۔ نے اس حقیقت کو اور بھی واضح کر دیا ہے۔ یعنی تحائف میں سے جو کچھ بھی میسر آ جائے اُسے کعبہ بھیج دے تاکہ وہاں جمع ہونے والوں کے کام آئے۔ عربوں کے ہاں بہترین تحائف ان کے جانور تھے۔ اس لئے وہ جانوروں کو بطور تحائف پیش کرتے تھے۔ لیکن ضروری نہیں کہ تحائف صرف جانور ہی ہوں۔ لہٰذا، آیاتِ بالا سے مفہوم یہ ہے کہ جب کوئی عازم حج راستہ میں گھر جائے تو اپنے تحائف کعبہ بھیج دے۔ اسی طرح جو شخص حج اور عمرہ سے اکٹھا متمتع ہو اور اُسے کوئی تحفہ میسر آ سکے تو اُسے پیش کر دے، ورنہ روزہ رکھ لے۔

نُسک کے معنی

اسی طرح نُسک کے معنی بھی صرف قربانی نہیں نُسک چاندی کے خالص ٹکڑوں کو کہتے ہیں۔ اخلاص کی بنا پر اس سے مفہوم عام عبادات لیا جاتا ہے (تفصیل آگے چل کر آئے گی) پھر ذبیحہ کو بھی نُسک کہنے لگ گئے۔

لیکن قطع نظر اس کے، اگر ھدیٰ اور نُسک سے مراد قربانی کے جانور ہی لئے جائیں تو بھی آیاتِ بالا سے یہ واضح ہے کہ ان کا مقام کعبہ ہی ہے انہیں وہیں پہنچانا ہوگا۔ (حتّٰی یبلغ الھدی محلّہ) اور وہیں یہ ذبح ہوں گے تاکہ ان سے اجتماعِ حج میں شریک ہونیوالے خورونوش کا کام لیں۔ اس حقیقت کو دوسرے مقام پر اور بھی واضح کر دیا گیا ہے جہاں فرمایا کہ حالتِ احرام میں شکار جائز نہیں۔ اگر کوئی شخص دانستہ کسی جان کا قتل کر دے تو اس کے بدلے میں اس کی مثل ایک ایسا جانور دے جس کا فیصلہ دو صاحب عدل کر دیں۔ هَدْیًا بٰلِغَ الْكَعْبَةِ (۵/۹۵)۔ اِس ہدیہ[1] کو کعبہ تک پہنچایا جائے۔ اس سے بھی واضح ہے کہ ھدیہ کو کعبہ ہی پہنچانا ہوگا۔

آیاتِ بالا سے پھر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ قربانی کا مقام کعبہ ہے۔ کعبہ کے علاوہ اور کوئی مقام نہیں۔

---

[1] :۔ آیت ۲۷ میں اشرف علی صاحب تھانویؒ نے ھدیٰ کا ترجمہ قربانی کیا ہے۔ لیکن اس مقام پر انہوں نے ھدیاً کا ترجمہ نیاز کیا ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں "بشرطیکہ اُسے نیاز کے طور پر کعبہ پہنچایا جائے"۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ ھدیٰ کے معنی صرف قربانی کے جانور نہیں، بلکہ ہر وہ تحفہ ہے جسے تقریب حج میں پیش کیا جائے۔

قربانی کا مقام

اب ایک آیت اور دیکھئے۔ جس سے اس حقیقت کی مزید تصدیق ہوجاتی ہے کہ قربانی کا مقام خانہ کعبہ ہی ہے۔ ۶ھ میں رسول اللہ عمرہ ادا کرنے کے ارادہ سے مدینہ سے عازم مکہ ہوئے لیکن قریش مکہ نے حضورؐ کو مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا۔ یہ حدیبیہ کا مقام تھا جہاں وہ مشہور صلح نامہ لکھا گیا جسے قرآن نے فتح مبین سے تعبیر کیا ہے۔ اس ضمن میں قرآن کریم میں ہے:۔

۸۔ هُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوكُمْ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَالْهَدْيَ مَعْكُوفًا أَنْ يَبْلُغَ مَحِلَّهُ (۴۸/۲۵)

یہ (قریش مکہ) وہ لوگ ہیں جنہوں نے کفر کیا اور تم کو مسجد حرام سے روکا نیز قربانی کے جانوروں (ھدی) کو روک دیا کہ وہ اپنے حلال ہونے کی جگہ تک نہ پہنچ سکیں۔

ہمارے پیش نظر سوال یہ تھا کہ کیا قرآن نے قربانی کے مقام کو معین کر دیا ہے یا اسے غیر معین چھوڑ دیا ہے کہ مسلمان جہاں چاہیں (اپنے اپنے مکانوں اور گلی کوچوں میں) قربانی دے دیا کریں۔ قرآن کی تمام متعلقہ آیات آپ کے سامنے آچکی ہیں۔ آپ انہیں ایک مرتبہ پھر دیکھ لیں اور خود فیصلہ کریں کہ اس باب میں قرآن کا حکم معین ہے یا اس نے اس چیز کو غیر معین چھوڑ دیا ہے۔ آپ دیکھیں گے کہ:

(i)۔ آیت ۲ میں قربانی کے جانوروں کے متعلق تصریح موجود ہے کہ

ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ۔

ان کے حلال کرنے کی جگہ خانہ کعبہ ہے۔

(ii)۔ آیت ۷ میں (اگر ھدی سے مراد قربانی کے جانور لئے جائیں تو) بہ صراحت فرمادیا کہ۔

حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهُ۔

جب تک قربانی کے جانور اپنے ذبح ہونے کے مقام پہ نہ پہنچ جائیں۔

(iii)۔ آیت ۵/۹۵ میں فرمایا:۔

هَدْيًا بَالِغَ الْكَعْبَةِ۔

قربانی کے جانوروں کو کعبہ تک پہنچایا جائے۔

(iv)۔ آیت ۸ میں ارشاد ہے کہ قریش مکہ نے قربانی کے جانوروں کو روک دیا۔

اَنْ یَّبْلُغَ مَحِلَّهٗ ۔

کہ وہ اپنے ذبح ہونے کے مقام تک نہ پہنچ پائے ۔

(۷) ۔ باقی آیات میں قربانی کا ذکر حج کے ضمن میں آیا ہے ۔ اس کے علاوہ کہیں نہیں ۔

ان حقائق کو سامنے رکھیئے اور پھر سوچیئے کہ قرآن کریم کی ایسی کھلی ہوئی صراحت کے بعد اس بات کے متعلق کسی شک وشبہ کی گنجائش باقی رہ سکتی ہے کہ قربانی کا مقام کونسا ہے؟ اگر قرآن صرف اتنا ہی کرتا کہ قربانی کے جانوروں کا ذکر حج کی تقریب کے ضمن میں کر دیتا تو بھی اس حقیقت کے سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہوتی کہ قربانی مکہ ہی میں ہوتی ہے ۔ لیکن اس نے اتنے پر ہی اکتفا نہیں کیا بلکہ بار بار اس کی بھی تصریح فرما دی کہ قربانی کا مقام کعبہ ہے ۔ اگر اس کے بعد بھی اس باب میں کسی کو شبہ ہو سکتا ہے اور وہ سمجھتا ہے کہ نہیں ! قربانی ہر گلی کوچے میں ہو سکتی ہے تو اس کا علاج کسی کے پاس نہیں ۔

وَمن یضلل اللّٰہُ فلا ھادی لہٗ ۔

اب یہ دیکھنا چاہیئے کہ جو حضرات ، قرآن کی ان تصریحات کے باوجود قربانی کو ہر گلی کوچے میں عام کرتے ہیں ۔ ان کے دلائل اور قرآن کی مندرجہ صدر کھلی ہوئی حقیقت کے خلاف ان کے اعتراضات کیا ہیں ۔ اس بات میں اس وقت ہمارے سامنے سید ابوالا علیٰ مودودی[1] صاحب کا وہ مضمون ہے جس میں انہوں نے سال گذشتہ قرآن کی مذکورہ صدر تصریحات کو "فتنہ" قرار دے کر ان کی تردید فرمائی تھی ۔ (جو روزنامہ انجام کراچی کے عید ایڈیشن مورخہ ۲۴ ستمبر ۱۹۵۰ء میں شائع ہوا تھا) اس مضمون میں انہوں نے خاص طور پر یہ احتیاط برتی ہے کہ اس میں ان آیات کا کوئی ذکر تک نہ آنے پائے جن میں قرآن کریم نے بصراحت قربانی کے مقام کو مکہ معظمہ کے ساتھ مختص کیا ہے اور جنہیں ہم نے اوپر نقل کر دیا ہے ۔ اس خصوصی احتیاط کے بعد وہ اپنے مضمون میں تحریر فرماتے ہیں :۔

اعتراضات سب سے پہلے ہمیں یہ دیکھنا چاہیئے کہ قربانی کے متعلق قرآن مجید کیا کہتا ہے ۔ کیا وہ قربانی کو صرف حج اور متعلقات حج تک محدود رکھتا ہے یا دوسرے حالات

---

[1] :۔ ہم نے مودودی صاحب کا نام خاص طور پر اس لئے لیا ہے کہ اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ انہوں نے ہی لکھا تھا اور انہی کے اعتراضات کے جواب سے صحیح پوزیشن واضح ہو سکتی ہے ۔

میں بھی اس کا حکم دیتا ہے۔ اس باب میں وہ آیتیں بالکل صاف ہیں جن کا حج سے کوئی تعلق نہیں۔ پہلی آیت میں سورۂ انعام کے آخری رکوع میں ہے۔ اس کا ترجمہ حسب ذیل ہے۔

اے نبیؐ کہو کہ میری نماز اور میری قربانی اور میرا جینا اور مرنا سب کچھ اللہ رب العالمین کے لئے ہے جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اسی کا مجھے حکم دیا گیا ہے اور میں سب سے پہلے سر اطاعت خم کرنے والا ہوں۔ یہ آیت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی جب کہ نہ حج فرض ہوا تھا اور نہ اس کے مراسم و مناسک مقرر ہوئے تھے اور اس میں کوئی اشارہ بھی ایسا نہیں ہے جس سے یہ سمجھا جائے کہ اس حکم سے مراد حج میں قربانی کرنا ہے۔ نسک کا لفظ جو اس آیت میں استعمال کیا گیا ہے قرآن مجید میں دوسری جگہ قربانی ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ (ملاحظہ ہو۔ البقرع ۲۳)

تم میں سے جو شخص سفر حج میں بیمار ہو جائے یا اس کے سر میں تکلیف ہو، اور وہ سر منڈوالے تو صدقے میں روزے رکھے یا صدقہ یا قربانی کرے۔

(ملاحظہ ہو آیت ۱۹۶ جس میں لفظ نُسک آیا ہے۔ طلوع اسلام)

مودودی صاحب نے جس آیت کا ترجمہ لکھا ہے، وہ آیت سیاق و سباق کے ساتھ اس طرح ہے۔ فرمایا:۔

(۹)۔ قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰی صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۔ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۔ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ۝

کہہ دو۔ مجھے تو میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھایا ہے۔ وہی درست اور صحیح دین ہے۔ ابراہیمؑ کا طریقہ کہ خدا ایک ہی کے لئے ہو جانا اور ابراہیمؑ ہرگز مشرکوں میں سے نہ تھا۔ "حَنِیْفاً" (ایک خدا کے لئے ہو جانا) کی تشریح اگلی آیت میں یوں ہے۔

(۱۰)۔ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ لَا شَرِیْكَ لَهٗ وَبِذٰلِكَ اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ۝

کہہ دو، میری نماز، میرا نسک، میرا مرنا، میرا جینا، سب کچھ اللہ ہی کے لئے ہے جو

تمام جہان کا پروردگار ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں مسلموں میں (یعنی خدا کے فرمانبرداروں میں) پہلا مسلمان ہوں۔

اور اس "توحید" کی مزید تشریح اس طرح فرما دی کہ

(۱۱)۔ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْ رَبًّا وَّهُوَ رَبُّ كُلِّ شَيْءٍ ...... (۶/۱۶۲-۱۶۳)

کہیئے! کیا میں اللہ کے علاوہ کوئی اور پروردگار ڈھونڈوں حالانکہ وہی ہر شے کا پرورش کرنے والا ہے۔

مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ اس میں لفظ نُسُکی کا ترجمہ ہے "میری قربانی" اس لئے اس سے قربانی کا حکم ظاہر ہے ہم نے مندرجہ بالا ترجمہ میں (جو ابوالکلام صاحب آزاد کا ترجمہ ہے) لفظ نُسک کو علیٰ حالہٖ رہنے دیا ہے جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اس لفظ کے لغوی معنی "چاندی کے خالص کیئے ہوئے ٹکڑے" ہیں۔ اس اخلاص کی جہت سے "عبادت گذار کو ناسک کہنے لگے۔ کیونکہ وہ اپنے نفس کو چاندی کے ٹکڑے کی طرح گناہوں کی میل سے صاف کرتا ہے[۱]

منسک کے معنی

قرآن کریم میں نُسک، منسک، مناسک کے الفاظ (ان دو آیتوں کے علاوہ جن کا ترجمہ مودودی صاحب نے لکھا ہے) حسب ذیل مقامات پر آئے ہیں:۔

(۱۲)۔ سورۂ بقرہ میں دعائے ابراہیمی و اسماعیلی۔ وَاَرِنَا مَنَاسِكَنَا۔ (۲/۱۲۹)

(۱۳)۔ سورۂ بقرہ میں حج کے ضمن میں۔ فَاِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ (۲/۲۰۰)

(۱۴-۱۵)۔ سورۂ حج میں۔ لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ۔ (۲۲/۶۷، ۲۲/۳۴)

دیکھیے کہ ان آیات میں ان الفاظ کا ترجمہ مختلف مترجمین نے کیا کیا ہے۔ آیت ۱۲ "مَنَاسِكَنَا" کا

---

[۱]۔ نسک کے معنی زمین شور کو درست کر کے زراعت کے قابل بنانے کے ہیں۔ چنانچہ ارضِ ناسکۃ اس سرسبز زمین کو کہتے ہیں جس پر تازہ بارش برسی ہو۔ صلوٰۃ کے معنی خدا کے پیچھے پیچھے رواں دواں چلنا ہے مصلّی اس گھوڑے کو کہتے ہیں جو گھوڑ دوڑ میں اس انداز سے دوسرے نمبر پر آئے کہ اس کے کان اول نمبر کے گھوڑے کی پشت کے ساتھ ساتھ آ رہے ہیں۔ ان معانی کے پیش نظر آیت نمبر ۱۰ کا صحیح قرآنی مفہوم سامنے آ جاتا ہے لیکن یہ موقعہ اس تفصیل کا نہیں یہ آیت بڑی اہم ہے۔

ترجمہ مختلف تراجم میں اس طرح آیا ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ .... عبادات کی طرح

شاہ رفیع الدینؒ .... طرح عبادت کی

جلالین .... شرائع عبادتنا (یہ اردو ترجمہ نہیں۔ مفہوم واضح ہے)

ابوالکلام آزاد .... عبادت کے سچے طور طریقے

آیت ۱۳۔ '' مَنَاسِكَكُمْ ''

شاہ عبدالقادرؒ .... عبادتیں اپنی

شاہ رفیع الدینؒ .... عبادتیں

جلالین .... عبادت حج

ابوالکلام آزاد صاحب .... حج کے تمام ارکان

آیات ۱۴، ۱۵ '' منسک ''

شاہ عبدالقادرؒ .... طرح عبادت کی

شاہ رفیع الدینؒ .... عبادت کی طرح

جلالین .... شریعت (آیت ۲۲/۳۴ میں اس کے ساتھ ''قربانی'' کی جگہ بھی آیا ہے)

ابوالکلام صاحب آزاد .... عبادت کا طور طریقہ

اس کے بعد وہ آیت لیجئے جسے مودودی صاحب نے بطور سند پیش کیا ہے یعنی '' اِنَّ صلاتی ونُسکی '' اور جس میں انہوں نے نُسُکی کا ترجمہ ''میری قربانی'' کیا ہے۔ اس لفظ کا ترجمہ مذکورہ صدر مترجمین نے حسب ذیل کیا ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ .... عبادتیں

شاہ رفیع الدینؒ .... عبادتیں

جلالین .... عبادات میں حج (حج کی عبادات)

ابوالکلام صاحب آزاد .... میرا حج

یہ ہیں لفظ نُسُک کے معانی اس آیت میں جسے مودودی صاحب نے وجوبِ قربانی میں بطور نصِ قرآنی پیش کیا ہے اور جس کا ترجمہ انہوں نے "قربانی" کیا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ اور شاہ رفیع الدینؒ اس کے معنی "عام عبادت" لیتے ہیں اور تفسیر جلالین اور ترجمان القرآن ابوالکلام صاحب آزاد میں اس کے معنی حج یا حج سے متعلقہ مراسم لکھے ہیں (اور وہ جو کہتے ہیں کہ جادو وہ جو سر چڑھ کر بولے) خود مودودی صاحب نُسُک کا ترجمہ "قربانی" لکھ کر ایک ہی سطر بعد "مناسک" کے معنی "حج کے مراسم" بیان فرماتے ہیں۔ ان کا جو اقتباس اوپر درج کیا گیا ہے، اسے ایک بار پھر پڑھیئے۔ اس میں آپ کو یہ الفاظ دکھائی دیں گے۔

یہ آیت مکہ معظمہ میں نازل ہوئی ہے جبکہ نہ حج فرض ہوا تھا نہ اس کے مراسم و مناسک مقرر ہوئے تھے۔

"حج کے مراسم و مناسک" لکھ کر مودودی صاحب نے خود بتا دیا کہ "مناسک" کے معنی عام قربانی نہیں، حج کے طور طریقے ہیں۔ لہذا اگر "مناسک" کے معنی خود مودودی صاحب کے الفاظ میں "حج کے عام طور طریقے ہیں" تو آیت "اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ" میں نُسُک کے معنی عیدالاضحٰی کی قربانی کس طرح کئے جا سکتے ہیں؟

اب مودودی صاحب کی دوسری دلیل ملاحظہ فرمایئے جس میں ارشاد ہے کہ،

نُسُک کا لفظ جو اس آیت میں استعمال ہوا ہے اُسے قرآن مجید میں دوسری جگہ "قربانی" ہی کے معنی میں استعمال کیا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو البقرہ ۲۴
تم میں سے جو شخص سفرِ حج میں بیمار ہو جائے یا اس کے سر میں تکلیف ہو اور وہ سر منڈوا لے تو فدیہ میں روزے رکھے یا صدقہ یا قربانی کرے۔

اس آیت کے الفاظ آیت ۷ میں دیکھیے۔

پہلے تو یہ دیکھیے کہ مودودی صاحب نے نُسُک کے لفظ کے لئے قرآن کریم کی صرف وہی آیت نقل فرمائی ہے جس سے وہ سمجھتے ہیں کہ نُسُک سے مفہوم قربانی لیا جا سکتا ہے۔ دیگر مقامات کا (جہاں واضح ہے کہ نُسُک یا منسک یا مناسک کے معنی قربانی نہیں لئے جا سکتے) انہوں نے ذکر ہی نہیں کیا۔
آیت ۷ میں ہم یہ لکھ چکے ہیں کہ نُسُک کے معنی ضروری نہیں کہ قربانی ہی لئے جائیں۔ لہذا ایک ایسے مقام کو بطور سند پیش کرنا جس میں مختلف معانی کی گنجائش ہو، دلیل قطعی قرار نہیں دی جا سکتی۔ لیکن

آیت ۲۷ میں نُسُکَ کے معنی "قربانی" ہی لئے جائیں تو وہیں یہ بھی تو موجود ہے کہ یہ حج کے احکام ہیں۔ اس لئے اس "قربانی" سے مراد وہ قربانی ہے جو خانہ کعبہ میں حج کے موقعہ پر دی جاتی ہے۔ لہٰذا اگر نُسُکَ کے معنی "قربانی" لئے جائیں تو اس کے صحیح معنی ہوں گے " وہ قربانی جو حج میں کی جائے۔" اس لئے کہ جب قرآن خود کسی مفہوم کو متعین کر دے تو اس مفہوم کو اسی طرح سے لینا چاہیئے جس طرح قرآن بیان کرتا ہے۔ لہٰذا یہ ظاہر ہے کہ

(i)۔ اِنَّ صلاتی ونُسُکی "کے معنی "میری قربانی" نہیں۔ اس لئے یہ آیت قربانی کے حکم کے لئے بطور نصِ قرآنی پیش نہیں کی جا سکتی۔ اور

(ii)۔ اور اگر اس لفظ کا ترجمہ "قربانی" ہی کرنا ہو تو اس سے مراد ہو گی وہ قربانی جو حج میں کی جاتی ہے کیونکہ قرآن کی جس آیت (۲۷) میں نُسُکَ کے معنی "قربانی" لئے گئے ہیں وہاں نُسُکَ کے معنی وہ قربانی ہے جو حج میں کی جاتی ہے نہ کہ ہر گلی کوچے کی قربانی۔

چنانچہ علامہ حمید الدین فراہیؒ جنہوں نے اس آیت نُسُکی کے معنی "میری قربانی" کے ہیں، فرماتے ہیں:۔

> بالاتفاق تمام مفسّرین کے نزدیک اس آیت میں نُسُک سے مراد حج اور عمرہ میں قربانی کرنا ہے۔ لغت عرب سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

باقی رہی مودودی صاحب کی یہ دلیل کہ چونکہ یہ آیت (اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ ...) مکہ میں نازل ہوئی تھی جب حج فرض نہیں ہوا تھا۔ اس لئے اس سے مراد حج کی قربانی نہیں۔ سو اس کے متعلق پہلی چیز

قرآن کی نزولی ترتیب

قابلِ غور یہ ہے کہ قرآن کریم کی ترتیب نزولی نہیں ہے اس لئے یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ کون سی آیت کب نازل ہوئی تھی۔

خود یہ حقیقت کہ قرآن کی ترتیب نزولی نہیں، اس امر کی دلیل ہے کہ اللہ تعالےٰ کے نزدیک ترتیب نزولی کچھ اہمیت نہیں رکھتی۔ کہا جا سکتا ہے کہ نزول کی ترتیب سے ہم قرآنی تعلیم کے "تدریجی ارتقا" کو معلوم کر سکتے ہیں۔ سو اوّل تو یہ کہ جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے۔ اگر یہ چیز ایسی اہم ہوتی تو خود اللہ تعالےٰ قرآن کی ترتیب نزولی رہنے دیتا۔ قرآنی تعلیم، زمان اور مکان کی بندشوں سے آزاد ہے۔ وہ ہر زمانے اور ہر حالت میں زندگی بخش ہونے کے لئے دی گئی ہے۔ اس لئے وہ ترتیب نزول اور شانِ نزول وغیرہ کے اختصاصات

میں مقید نہیں رکھی جا سکتی - جو کچھ قرآن میں موجود ہے وہ ہر زمانے کے لیے ضابطہ حیات ہے - جس قسم کے حالات ہوں گے اسی قسم کے احکام نافذ ہو جائیں گے - لہذا ترتیب نزولی کچھ اہمیت نہیں رکھتی - دوسرے یہ کہ ترتیب نزولی کے متعلق جو روایات ملتی ہیں وہ باہمدگر مختلف ہوتی ہیں - چنانچہ آپ کتب تفاسیر اٹھا کر ان میں کسی سورت کے متعلق دیکھیے - آپ کو کئی مختلف روایات ملیں گی - کبھی پوری کی پوری سورت کے متعلق اختلافات ہوتے ہیں کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی یا مدینہ میں کبھی ایک سورت کی مختلف آیات کے متعلق اختلاف ہوتا ہے - کہیں یہ بھی ہوتا ہے کہ بعض آیات ہجرت کے بعد مکہ کے قریب نازل ہوئیں تو انہیں مکی لکھ دیا گیا اور خود سورۂ انعام (جس میں آیت " اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُکِیْ ..... ہے) کی بعض آیات کے متعلق اختلاف ہے کہ مکی ہیں یا مدنی - اس لئے اس سورت کو مکی قرار دے کر اس سے نتیجہ زیر نظر اخذ کرنا محکم دلیل قرار نہیں پا سکتا - بہرحال یہ سورت مکی ہو یا مدنی، جو حضرات اس سے " قربانی " مراد لیتے ہیں، وہ (جیسا کہ علامہ فراہیؒ نے لکھا ہے) اس امر پر متفق ہیں کہ نُسک سے مراد وہ قربانی ہے جو حج اور عمرہ میں کی جاتی ہے -

لیکن قطع نظر اور دلائل کے، مودودی صاحب کا یہ بیان کہ یہ سورت مکی ہے، خود ہمارے دعوے کی تائید کر رہا ہے - ہم یہ کہتے ہیں کہ جیسا کہ قرآن نے بصراحت فرما دیا ہے، قربانی کا محل مکہ معظمہ ہے -
مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ چونکہ قربانی کا ذکر اس سورت میں آیا ہے جو ہجرت سے پہلے نازل ہوئی تھی اس لئے اس سے مراد حج کی قربانی نہیں - لیکن یہ ظاہر ہے کہ ہجرت سے پہلے رسول اللہ مکہ میں تشریف فرما تھے اس لئے حضورؐ لامحالہ مکہ ہی میں قربانی کرتے ہوں گے اور یہی ہم کہتے ہیں -

باقی رہا یہ کہ اس زمانہ میں ابھی حج فرض نہیں ہوا تھا تو اس سے مسئلہ زیر نظر پر کیا اثر پڑتا ہے - یہ واقعہ ہے کہ حج فرض ہونے سے پہلے بھی حضورؐ سنت ابراہیمی کے اتباع میں اپنے طور پر حج کرتے تھے سارا عرب حج کیا کرتا تھا اگرچہ اس کا حقیقی مقصد ان کی نگاہوں سے فوت ہو چکا تھا اور اس کے مناسک میں مشرکانہ رسوم داخل ہو چکی تھیں - لہذا جب رسول اللہ حج کرتے ہیں تو قربانی بھی حج کی تقریب پر ہی ہوتی تھی - مشرکین، بتوں کے استھانوں پر جانور ذبح کرتے تھے - حضورؐ انہیں اللہ کے نام پر ذبح کر کے خود کھاتے اور محتاجوں کو کھلاتے ہوں گے -

لہذا، اس دلیل سے بھی واضح ہے کہ قربانی مکہ میں ہی ہوتی تھی اور حج کی تقریب پر (اس باب .

میں ابھی ایک نکتہ باقی ہے جو " وانحر " کے سلسلہ میں ذرا آگے چل کر بیان ہوگا) ۔

اب وہ دوسری آیت دیکھئے جسے مودودی صاحب نے اپنے دعویٰ کی دلیل میں پیش فرمایا ہے۔ لکھتے ہیں ۔

سورۂ کوثر کی آیت

دوسری آیت سورۂ کوثر میں ہے جس کا ترجمہ ہے :۔
" پس اپنے رب کے لئے نماز پڑھ اور قربانی کر "

یہ آیت بھی مکی ہے اور اس میں بھی کوئی اشارہ یا قرینہ ایسا نہیں کہ جس کی بنا پر کہا جا سکے کہ قربانی کا یہ حکم حج کے لئے خاص ہے ۔ اس میں شک نہیں کہ اہل لغت نے نحر کے معنی سینے پر ہاتھ باندھنے، قبلہ رُخ ہونے اور اوّل وقت نماز پڑھنے کے بھی بیان کئے ہیں ۔ لیکن یہ سب دُور کے معنی ہیں ۔ عام فہم عربی میں اس لفظ کا مفہوم قربانی ہی لیا جاتا ہے۔ (اس کے بعد مودودی صاحب نے احکام القرآن کا حوالہ دیا ہے) ۔
یہی وجہ ہے کہ قرآن کے تمام مترجمین شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالقادر صاحبؒ، شاہ رفیع الدین صاحبؒ، مولانا محمود الحسن صاحبؒ، مولانا اشرف علی صاحبؒ، ڈپٹی نذیر احمد صاحبؒ وغیرہم نے بالاتفاق اس لفظ کا ترجمہ قربانی ہی کیا ہے ۔[1]

یہ سورۂ کوثر کی آیت ہے جس کے الفاظ حسب ذیل ہیں ؛
إِنَّا أَعْطَيْنَاكَ الْكَوْثَرَ ۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۔ إِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْأَبْتَرُ ٥

اس میں لفظ نحر قابلِ غور ہے ۔ اس لحاظ سے بھی کہ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ روایات سے قرآن

---

[1] ۔ " اِنَّ صلاتی و نُسکی " والی آیت میں شاہ عبدالقادرؒ، شاہ رفیع الدینؒ، اشرف علی صاحب تھانویؒ وغیرہ نے نُسکی کا ترجمہ عبادات کیا تھا اور چونکہ یہ ترجمہ مودودی صاحب کے منشا کے خلاف تھا ۔ اس لئے مودودی صاحب نے اس مقام پر ان کے ترجموں کا ذکر نہیں فرمایا ۔ چونکہ اب ان کا ترجمہ ان کے منشا کے موافق ہے ۔ اس لئے ان کا بھی ذکر کر دیا گیا ہے ۔

کا صحیح صحیح مفہوم متعین ہو جاتا ہے۔ اگر اُن سے مدد نہ لی جائے تو قرآن کا صحیح مطلب سمجھ میں نہیں آسکتا۔

نحر کے معنی

نحر کا لفظ قرآن میں اسی مقام پر استعمال ہوا ہے۔ اب دیکھئے کہ روایات اس کا کیا مفہوم متعین کرتی ہیں۔

۱۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ نحر سے مراد دائیں ہاتھ کو بائیں ہاتھ کی کلائی پر رکھ کر دونوں ہاتھوں کو نماز میں اپنے سینے پر رکھنا ہے۔

۲۔ حضرت علیؓ سے دوسری روایت ہے کہ جب یہ سورۃ نازل ہوئی تو آں حضرتؐ نے جبریلؑ سے پوچھا کہ یہ نحیرہ کیا ہے جس کا میرے رب نے حکم دیا ہے۔ جبریلؑ نے کہا کہ نحیرہ نہیں۔ لیکن حکم یہ ہے کہ آپ نماز کی پہلی تکبیر، رکوع، بعد رکوع اور سجود کے وقت اپنے ہاتھوں کو بلند کریں۔ یہ ہماری نماز ہے اور ملائکہ کی نماز ہے جو سات آسمانوں میں رہتے ہیں، ہر ایک چیز کی ایک زینت ہے اور نماز کی زینت ہر تکبیر کے نزدیک رفع یدین کرنا ہے۔

۳۔ حضرت ابن عباسؓ کا قول ہے کہ نحر کے معنی ہیں "اپنی گردن قبلہ کے مقابل کرو۔"

۴۔ امام باقرؒ کا ارشاد ہے کہ اس سے مراد نماز کے شروع کے وقت رفع یدین کرنا ہے۔

۵۔ حضرت عطا خراسانیؒ فرماتے ہیں کہ وانحر سے مراد یہ ہے کہ اپنی پیٹھ رکوع سے اٹھاؤ تو اعتدال کرو اور سینے کو ظاہر کرو۔ یعنی اطمینان حاصل کرو۔

ان روایات کے علاوہ دیگر اقوال ملاحظہ فرمایئے:۔

ا۔ ابن الاعرابی نے کہا ہے کہ نحر کا مطلب نماز میں محراب کے سامنے سیدھا کھڑا ہونا ہے۔

ب۔ ضحاکؒ کا بیان ہے کہ اس کے معنی ہیں کہ دونوں ہاتھ دعا کے بعد چھاتی کے اوپر کے حصہ تک بلند کرو۔

ج۔ امام راغبؒ (مفردات) میں لکھتے ہیں کہ نحر چھاتی کے اوپر گلو بند کے مقام کو کہتے ہیں۔ اس لئے وانحر میں حکم ہے۔ ہاتھوں کو نحر کے مقام پر رکھنے کا۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ اس سے شہوت کی بیخ کنی کر کے نفس کشی کی ترغیب دلائی گئی ہے۔

آپ نے نحر کے لفظ کی تحقیق ملاحظہ فرمائی۔ امام رازیؒ کہتے ہیں کہ اس سے مراد ذبح شتر ہے۔ اس لئے اس کے معنی قربانی ہو گئے۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ۔ اپنے رب کی نماز پڑھ اور قربانی کر۔

اَب اس آیت کے مقامِ نزول کے متعلق دیکھیے۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ مکّہ میں نازل ہوئی۔ محمد علی صاحب لاہوری اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:۔

اس سورت کے نزول کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض اسے مکی کہتے ہیں اور بعض مدنی اور بعض نے یہ خیال کیا ہے کہ اس کا نزول دو دفعہ ہوا ہے۔ ایک مکہ میں اور ایک مدینہ میں۔ مگر صحیح یہی معلوم ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں نازل ہوئی۔[1]

لیکن علامہ فراہیؒ فرماتے ہیں کہ یہ صلح حدیبیہ کے دن نازل ہوئی۔ ارشاد ہے۔

یہ سورت صلح حدیبیہ کے دن نازل ہوئی جو فتح مکّہ، حج، نماز، قربانی، غلبۂ اسلام اور کثرتِ اُمّت کا فتح باب ہے۔

ذرا آگے چل کر پوری کی پوری (سورۂ کوثر) کی حکمت کے سلسلہ میں لکھتے ہیں:۔

سادہ لفظوں میں گویا یوں کہا گیا کہ اللہ تعالےٰ نے تمہیں نماز پڑھنے والی، اور راہِ خدا میں خرچ کرنے والی ایک عظیم الشان اُمت دی ہے جو بیت الحرام کا حج کرے گی۔

یعنی وانحر سے مراد "بیت الحرام کا حج" کرنا ہے۔

ابنِ جریرؒ نے اس باب میں لکھا ہے:۔

سعید بن جبیرؓ سے روایت ہے کہ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وانحر والی آیت حدیبیہ کے دن نازل ہوئی۔ جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور فرمایا کہ قربانی کرکے لوٹ جاؤ۔ آں حضرتؐ اُٹھے اور عید الفطر یا عید الاضحیٰ (راوی کو شبہ ہے) کا خطبہ دیا۔ پھر دو رکعت نماز ادا کی اور قربانی دی۔ اس وقت جبریلؑ نے فصل لربك کا پیام دیا۔

یعنی جب کفارِ مکّہ نے حضورؐ کے قافلہ کو حدیبیہ کے مقام پر روک دیا اور قربانی کے جانوروں کو بھی مکّہ تک جانے سے روک دیا گیا (جیسا کہ سورۂ فتح میں مذکور ہے) تو سوال یہ پیدا ہوا کہ قربانی کے جانوروں کو کیا کیا جائے۔ اُس وقت جبریلؑ آئے اور کہا کہ ان کی یہیں قربانی دے کر دو رکعت نماز پڑھ لیجیے۔

---

[1]:۔ یہ نہیں بتایا کہ ان کا اپنا ذریعہ علم کیا ہے؟ محض قیاس

وانحر کے معنی بھی آپ نے دیکھ لئے اور مقامِ نزول کے متعلق بھی بیانات ملاحظہ کر لئے۔ ذرا غور کیجئے کہ ان سے کسی طرح بھی یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وانحر سے مراد ہے دنیا کے ہر گلی کوچے میں قربانی کے جانور ذبح کرنا! اگر یہ سورت (سورۂ کوثر) مکہ میں نازل ہوئی تھی تو اندازہ یہ ہے کہ یہ ہجرت کے قریب کی نازل شدہ سورتوں میں سے ہے۔ کیونکہ موجودہ ترتیب کے لحاظ سے یہ جن سورتوں کے درمیان رکھی گئی ہے ان کا تعلق ہجرت کے واقعہ سے ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مسلمانوں پر شدائد و مصائب ہجوم کر کے آچکی تھیں۔ بنظرِ بظاہر، ہر طرف مایوسی دکھائی دیتی تھی۔ وقت وہ آچکا تھا کہ انہیں اپنے گھر بار کو بھی چھوڑنا تھا۔ مستقبل میں بھی کوئی اُمید کی کرن دکھائی نہیں دیتی تھی۔ ان یاس انگیز حالات میں اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ۔ (یقیناً ہم تمہیں اپنے انعامات سے بڑی کثرت سے نواز ا ہے) کا مژدہ درخشندہ، بڑا حیات بخش (اور مخالفین کے لئے حیرت انگیز) تھا۔ اس کے لئے ارشاد یہ ہوا کہ یہ کثرتِ نعما نتیجہ ہوں گی اس نظام کی تشکیل و تنفیذ کا جس کا آغاز صلوٰۃ سے ہوتا ہے اور انتہا حج کے اجتماع سے۔ (فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ) نحر کے معنی اگر قربانی لئے جائیں تو یہ اونٹ کی قربانی کے لئے مختص ہے۔ "اونٹ کے ذبیحہ" میں ایک اور اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا ہے۔ مدینہ میں اس وقت یہودیوں کا غلبہ تھا۔ ہو سکتا تھا کہ کسی کو خیال پیدا ہو جائے کہ اب "کمزور و ناتواں" مسلمانوں کا یہ قافلہ ہجرت کے بعد مدینہ کے یہودیوں سے مفاہمت (COMPROMISE) کر کے قریش مکہ کا مقابلہ کرے[1] وانحر کے لفظ سے اس شبہ کو بھی مٹا دیا۔ یہودیوں کے ہاں اونٹ حرام تھا۔ مسلمانوں کو اونٹ ذبح کرنے کے لئے کہا گیا۔ یعنی یہود کے علی الرغم۔ یوں سمجھئے جس طرح آج ہندوستان کے شکستہ حال مسلمانوں کو کوئی "اشارہ غیبی" یہ کہہ دے کہ اٹھو اور گائے ذبح کرو۔" اور اگر یہ سورت صلح حدیبیہ کے موقعہ پہ نازل ہوئی تھی تو اس وقت بھی حالات سخت نامساعد تھے۔ بنظرِ بظاہر، وہ صلح شکست ہی کے مرادف تھی۔ لیکن قرآن نے عین اس وقت "عطائے کوثر" کا مژدہ حوصلہ افزا سنایا اور

---

[1] ۔ تفصیل کے لئے دیکھئے "معراج انسانیت" عنوان ہجرت

وانحر[1] سے یہ بتا دیا کہ اگر انہوں نے آج تمہیں مکہ تک پہنچنے سے روک دیا ہے اور تمہاری قربانیوں کو بھی ان کی قربان گاہ (کعبہ) تک نہیں پہنچنے دیا، تو اس کا کیا غم۔ تم عنقریب وہاں پہنچ کر قربانیاں کروگے۔

ان تصریحات کے بعد آپ سوچئے کہ "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" میں وانحر سے عید کے دن ہر گلی کوچے میں قربانی کا وجوب کس طرح ثابت ہوتا ہے؟

لیکن اگر آپ کو اس پر اصرار ہے کہ وانحر سے مراد ہر گلی کوچے میں قربانی ہے تو ذرا حسبِ ذیل امور پر بھی غور کیجئے:۔ فصل لربك وانحر میں فَصَلِّ (نماز پڑھ) امر کا صیغہ ہے۔ جس سے مطلب یہ ہے کہ نماز فرض ہے۔ اسی طرح وانحر بھی امر کا صیغہ ہے۔ لہذا انحر بھی فرض ہوئی۔ یعنی جو حیثیت نماز کی ہے وہی حیثیت قربانی کی ہوگی

کیا قربانی فرض ہے

دونوں برابر کی فرض ہوگی۔ کیونکہ دونوں کا حکم ایک ہے۔ فصلِّ (نماز) کے فرض ہونے کے متعلق تو کسی کو کلام نہیں۔ لیکن دیکھئے کہ وانحر (قربانی) کے متعلق کیا عقیدہ ہے۔ خود مودودی صاحب کے الفاظ میں ملاحظہ فرمائیے۔ تحریر فرماتے ہیں:۔

> قرآن وحدیث کے ان دلائل کی بنا پر فقہائے امت نے بقر کی قربانی کے متعلق بالاتفاق یہ رائے دی ہے کہ یہ ایک مشروع فعل ہے اور سنن اسلام میں سے ہے اختلاف اگر ہے تو اس میں کہ یہ واجب ہے یا نہیں مگر اس کا مشروع اور سنت ہونا متفق علیہ ہے۔ علامہ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں مذاہب فقہاء کا خلاصہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

---

[1]:۔ انحر کے معنی کسی معاملہ پر پورا پورا قابو پالینا بھی ہوتے ہیں۔ نحر الامور کے معنی ہیں، اس نے معاملات کو اپنے (CONTROL) میں کرلیا۔ "نحر العلم نحوا" کے معنی ہیں اس نے اپنے آپ کو علم پر (MASTER) کرلیا۔ اس لئے نعمائے کثیر حاصل کرنے کا طریق یہ ہے کہ نظامِ صلوٰۃ قائم کیا جائے اور اس طرح تمام امور پر پورا پورا غلبہ وتسلط حاصل کرلیا جائے جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمام مخالف قوتیں بیخ وبنیاد سے اکھڑ جائیں گی اور ان کی جڑ کٹ جائے گی۔ ان شانئك هو الابتر۔

اور اس امر میں کوئی اختلاف نہیں کہ بقرعید کی قربانی شرائع دین میں سے ہے۔ شافعیہ اور جمہور کے نزدیک یہ سنت مؤکدہ بطریق کفایت اور شافعیوں میں ایک دوسری رائے یہ ہے کہ مقیم اور خوشحال آدمی پر واجب ہے۔ امام مالکؒ کی رائے بھی ایک روایت کی رُو سے یہی ہے مگر انھوں نے مقیم کی قید نہیں لگائی۔ اوزاعی اور بیعہ کی بھی یہی رائے ہے۔ حنفیوں میں سے ابو یوسفؒ اور مالکیوں میں سے اشہب نے جمہور کی رائے سے اتفاق کیا ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کی رائے یہ ہے کہ قدرت کے باوجود قربانی نہ کرنا مکروہ ہے اور ان کا دوسرا قول یہ ہے کہ قربانی ایک ایسی سنت ہے جسے چھوڑ دینے کی اجازت نہیں۔

آپ نے غور فرمایا کہ عید کی قربانی کسی کے نزدیک بھی فرض نہیں زیادہ سے زیادہ سُنت ہے اور وہ بھی ایسی کہ امام احمدؒ کے نزدیک اگر باوجود قدرت (استطاعت) کے قربانی نہ کی جائے تو یہ مکروہ ہوگا۔ آپ ذرا سوچئے کہ قرآن میں "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" کا حکم آتا ہے۔ صلّ (نماز پڑھ) کے متعلق ہر ایک کا اتفاق ہے کہ یہ فرض عین ہے۔ لیکن اسی حکم کے دوسرے ٹکڑے کے متعلق یہ کیفیت ہے کہ اسے کوئی بھی فرض قرار نہیں دیتا۔ صلوٰۃ کا تارک دائرۂ اسلام سے خارج سمجھا جاتا ہے۔ لیکن استطاعت کے باوجود قربانی نہ کرنے والا مکروہ فعل کا مرتکب گردانا جاتا ہے اور بس! اسی سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ وانحر سے مراد عید کی قربانی لینا کس طرح قرآنی مفہوم کہلا سکتا ہے۔

پھر ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ اگر وانحر سے مراد قربانی ہے تو نحر صرف اونٹ کی قربانی کے لئے مخصوص ہے۔ گائے، بھیڑ، بکری کی قربانی اس میں قطعاً شامل نہیں۔

ایک قدم اور آگے۔ قرآن نے "فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ" فرمایا۔ صلّ کے معنی ہوئے "نماز پڑھ" اور وانحر کے ان کے نزدیک "قربانی کر" اب ظاہر ہے کہ صلّ کے حکم کی ادائیگی اسی شکل میں اور انہی شرائط کے ساتھ ہوگی۔ جو قرآن میں دوسرے مقامات پر مذکور ہیں۔ مثلاً قرآن نے حکم دیا ہے کہ صلوٰۃ کے لئے قبلہ کی طرف رُخ کرنا چاہیئے۔ لہٰذا جب صلّ کہا جائے گا تو اس کے ساتھ یہ تمام شرائط مستلزم ہوں گی۔ جس طرح صلّ کے لئے یہ ضروری ہے، اسی طرح وانحر کے لئے بھی یہ ضروری ہے۔ صلّ کے لئے قرآن نے سمت قبلہ کا تعین فرمایا ہے۔ اسی طرح وانحر کے لئے

قرآن ہی نے کعبہ کے مقام کی تعین کر دی ہے۔ لہذا، جس طرح صلّ (نماز) کے لئے سمتِ قبلہ ضروری ہے اسی طرح نحر (قربانی) کے لئے مقام کعبہ ضروری ہے۔ نہ سمتِ قبلہ کے بغیر (ہر طرف رُخ کر کے) صلوٰۃ ہو سکتی ہے نہ مقام کعبہ کے بغیر (ہر مقام) پر قربانی۔ صلّ (صلوٰۃ) کے متعلق قرآن کی تمام حدود و قیود کا التزام ضروری قرار دینا لیکن انحر (قربانی) کے متعلق قرآن کی متعین کردہ شرط کے یکسر خلاف۔ دُنیا کے ہر گلی کوچے کو قربان گاہ تصور کر لینا تو منون ببعض الکتاب و تکفرون ببعض (کتاب کے ایک حصہ پر ایمان اور دوسرے حصہ سے انکار) کے مرادف نہیں تو اور کیا ہے۔

روایات آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ جب قرآن میں قربانی کے متعلق ایسی تصریحات موجود ہیں تو پھر وہ کونسی وجہ ہے جس کی بنا پر یہ تمام حضرات اس پر مُصر ہیں کہ قربانی کی جگہ مختص نہیں۔ ہر گلی کوچے میں ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ وہی ہے جو دین کے دوسرے شعبوں کو قرآن کے خلاف لے جانے کی وجہ بنی ہے۔ یعنی روایات! کچھ احادیث ایسی ہیں جن میں مذکور ہے کہ نبی اکرمؐ نے عید قربان کے دن اپنے طور پر قربانی کی۔ چونکہ ہمارے ہاں "دین" کی بنیاد قرآن نہیں بلکہ احادیث ہیں، اور احادیث قرآن کی ناسخ بھی ہو سکتی ہیں اور اس پر قاضی بھی، اس لئے جس معاملہ میں قرآن اور احادیث میں اختلاف ہوگا، ان لوگوں کا عمل حدیث کے مطابق ہوگا قرآن کے مطابق نہیں۔ قرآن میں تصریح موجود ہے کہ قربانی حج کے موقعہ پر کعبہ میں کی جاتی ہے۔ لیکن چونکہ چند ایک روایات میں آچکا ہے کہ رسول اللہؐ عید کے دن قربانی کیا کرتے تھے۔ اس لئے قرآن جو کچھ کہتا ہے اُسے کہنے دیجئے، عمل حدیث پر ہوگا۔

لیکن جیسا کہ روایات میں عام طور پر ہوتا ہے، اس باب میں بھی دونوں قسم کی روایات موجود ہیں ایسی بھی جن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضورؐ نے عید کے دن قربانی کی اور ایسی بھی جن سے ظاہر ہے کہ حضورؐ نے یا تو خود مکہ میں قربانی کی یا اپنے قربانی کے جانور مکہ معظمہ میں بھیجے۔

۱۔ بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی، مالک، نسائی سب کے سب اس حدیث کے راوی ہیں۔ جس میں حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آں حضرت کا معمول تھا کہ آپؐ مدینہ سے ہدی کو مکہ روانہ فرماتے تھے تو آپ کے ہدی کے ہار میں بنایا کرتی تھی۔

۲۔ حضرت ابن عباسؓ کی روایت ہے کہ آں حضرتؐ نے حدیبیہ کے سال بہت سے اونٹ بطور ہدیٰ مکہ کو روانہ کئے۔ ان میں ایک اونٹ چاندی کی نتھنی والا بھی تھا۔

۳۔ حضرت نافعؓ کی روایت ہے کہ حضرت عمرؓ اپنی قربانی کے جانوروں کو قباطی، انما ط اور حلل کی جھول پہنانے پھر کعبہ کی طرف روانہ کر دیتے۔

۴۔ زادالمعاد میں علامہ ابن قیمؒ نے لکھا ہے کہ حج ۹ھ میں فرض ہوا۔ اس سال غزوۂ تبوک سے واپسی پر رسول اللہؐ نے حضرت ابوبکرؓ کو کم و بیش تین سو مسلمانوں کے ہمراہ حج کے لئے بھیجا اور اپنے قربانی کے بیس اونٹ جن کے گلوں میں خود اپنے ہاتھ سے قلادے پہنائے تھے، اُن کے ساتھ کر دیئے۔ دوسرے سال (۱۰ھ میں) حضورِ اکرمؐ نے خود حج کیا اور مکہ میں سو جانوروں کی قربانی کی۔ الغرض حج کی فرضیت کے بعد دو سال آپ زندہ رہے اور دونوں سال آپؐ کی طرف سے قربانی مکہ میں ہوئی۔

باقی رہیں وہ روایات جن میں کہا گیا ہے کہ حضورؐ نے مدینہ میں قربانی دی۔ سو جب ہم نے دیکھ لیا کہ قرآن کریم نے قربانی کے لئے کعبہ کا تعین کر دیا ہے تو ہم بلا تأمل کہہ سکتے ہیں کہ یہ روایات صحیح نہیں ہو سکتیں۔ کیونکہ حضورؐ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف نہیں تھا۔

سُنّتِ ابراہیمی

قربانی کو عام طور پر "سُنّتِ ابراہیمیؑ" کہا جاتا ہے۔ قرآن میں اس کا بھی کوئی ذکر نہیں۔ قرآن میں صرف اتنا مذکور ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے خواب میں دیکھا کہ وہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں۔ انہوں نے اس خواب کو حقیقی سمجھا اور حضرت اسماعیلؑ کو قربان کرنے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب انہیں لٹا دیا گیا تو خدا نے آواز دی کہ اے ابراہیمؑ تو نے اپنے خواب کو سچ کر دکھایا۔ قرآن میں یہ کہیں مذکور نہیں کہ حضرت اسماعیلؑ کی جگہ ایک مینڈھا جنت سے بھیجا گیا۔ جس کی قربانی حضرت ابراہیمؑ نے کر دی۔ یہ بیان تورات کا ہے۔ قرآن کا نہیں۔ لہٰذا بکروں کی قربانی سُنّتِ ابراہیمیؑ بھی نہیں۔ اگر کسی کو سُنّتِ ابراہیمی پر عمل پیرا ہونا ہے تو اپنے بیٹے کو ذبح کرنے کے لئے لٹائے۔ اس کے بعد اگر اُسے خدا کی طرف سے آواز آجائے کہ بیٹے کو چھوڑ دو تو چھوڑ دے اور اگر ایسی آواز نہ آئے تو اُسے ذبح کر ڈالے! بیٹے کی جگہ بکرا ذبح کر دینا اور اُسے سُنّتِ ابراہیمی قرار دینا کس طرح درست ہو سکتا ہے؟

ذبحِ عظیم

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن میں ہے کہ خدا نے حضرت اسماعیلؑ کو "ذبحِ عظیم" کے فدیہ میں چھڑا لیا اور وہ "ذبحِ عظیم" یہی (بکریوں اور مینڈھوں) کی قربانیاں ہیں جو ہر سال دی جاتی ہیں۔ یہ عقیدہ بھی خود تراشیدہ ہے۔ اوّل تو اس منطق پر غور کیجئے کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ہم نے (حضرت) اسماعیلؑ کو چھری سے ذبح ہونے سے بچا کر "ذبحِ عظیم" (بہت بڑی قربانی) کے لئے مختص کر لیا اور ہمارے ہاں اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ حضرت اسماعیلؑ کی قربانی کے مقابلہ میں بھیڑوں، بکریوں کی قربانی "ذبحِ عظیم" ہے۔ غور کیجئے کہ اس سے کیسی بلند حقیقت کو کتنی پست سطح پر لایا جاتا ہے۔ حضرت اسماعیلؑ باپ کے پہلوٹھے بیٹے تھے (اور منصبِ سرداری کے مستحق) ہونے کی جہت سے شام کے سرسبز و شاداب وادیوں کے حکمران بننے والے تھے۔ حضرت ابراہیمؑ انہیں اپنے خیال کے مطابق خدا کی راہ میں ذبح کر رہے تھے۔ چھری گلے تک آ پہنچی تھی۔ بس ایک لمحہ میں یہ قربانی ختم ہو جانے والی تھی۔ اللہ نے انہیں چھری سے بچا کر حکم دیا کہ مکہ کی بے برگ و گیاہ وادی میں "ہمارا گھر" بناؤ۔ اور حضرت اسماعیلؑ کو اس کی پاسبانی کے لئے وقف کر دو۔ آپ غور کیجئے۔ سرزمین شام کی شادابیوں اور شگفتگیوں کی جگہ صحرائے عرب کا مسکن، اور منصبِ سرداری اور حکمرانی کے بجائے عبادت گاہ کی تولیت۔ یہ تھی وہ بڑی قربانی جس کے لئے حضرت اسماعیلؑ کو چھڑا لیا گیا تھا۔ وہ قربانی جسے ایک لمحہ میں ختم نہیں ہو جانا تھا بلکہ ساری عمر ساتھ رہنا تھا۔ یہ ایک ایک سانس کی قربانی تھی۔ لمحہ بہ لمحہ قربانی تھی۔ مسلسل و متواتر قربانی تھی۔ عمر بھر کی قربانی تھی۔ بلکہ یوں کہیے کہ پشتوں تک کی قربانی تھی۔ حضرت اسحٰقؑ کی نسل کے حصہ شوکتِ سلیمانی اور دارا سئے داؤدی آ گیا اور حضرت اسماعیلؑ کی اولاد کے حصہ میں صحرائے عرب کی عبادت گاہ کی رکھوالی! کہیئے یہ قربانی بڑی تھی یا ایک لمحہ میں رگِ جان کا کٹ جانا! یہ تھی وہ عظیم الشان قربانی، جس کے اثرات صدیوں تک تولیتِ کعبہ کی شکل میں متوارث آگے بڑھتے رہے، تا آنکہ شاخِ اسرائیل کے بے نم ہو جانے کے بعد، یہ شاخِ اسماعیلیؑ اس حسن و شادابی کے ساتھ گلبار و ثمر ریز ہوئی کہ اس کی تازگی اور شگفتگی میں قیامت تک فرق نہیں آئے گا۔ یہ تھا ثمرہ اس "ذبحِ عظیم"، کا جس کے لئے حضرت اسماعیلؑ کو خدا نے وقف کر لیا تھا۔ اس حقیقت کے بعد سوچیئے کہ "ذبحِ عظیم" سے مراد بھیڑوں، بکریوں کی قربانی لینا، قرآنی عظمتوں کو کن پستیوں تک لے جاتا ہے۔

گذشتہ اوراق میں جو کچھ آپ کی نظروں سے گذر چکا ہے اُسے بغور پڑھیئے۔ یہ حقیقت آپ کے سامنے آجائے گی کہ :۔

۱۔ قرآن کریم نے قربانی کا ذکر حج کے سلسلہ میں کیا ہے۔

۲۔ ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر اس کی تخصیص اور تعین کر دی ہے کہ قربانیوں کا مقام خانہ کعبہ ہے۔

۳۔ قربانی کے متعلق واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ اس سے مقصود سامان خورو نوش کا مہیا کرنا ہے

۴۔ قرآن میں کوئی ایک مقام ایسا نہیں جس سے ثابت ہوتا ہو کہ عید کے دن اپنی اپنی جگہ، ہر گلی کوچے میں قربانیاں دینے کا حکم ہے۔

اس سے یہ واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے :۔

(ا)۔ قربانی حج کی تقریب پر کرنی چاہیئے اور وہ بھی صرف اسی قدر جس سے خورو نوش کا سامان ہو جائے۔ لہذا

(ب)۔ نہ تو حج میں ایسی قربانیوں کی اجازت ہے جنہیں زمین میں دبا دیا جائے اور نہ ہی حج سے باہر قربانیوں کا سوال پیدا ہوتا ہے۔

یہ ہے قرآن کی کھلی کھلی اور واضح تعلیم۔ باقی رہیں احادیث۔ سو

(i)۔ ان میں دونوں قسم کی روایات ملتی ہیں۔ وہ بھی جن سے مترشح ہوتا ہے کہ حضورؐ نے عید کے دن قربانی کی اور وہ بھی جن سے ظاہر ہے کہ حضورؐ نے یا تو خود مکہ معظمہ میں بتقریب حج قربانی کی یا قربانی کے جانوروں کو مکہ معظمہ بھیجا۔

(ii)۔ لہذا قرآن کی تخصیص و تعین مقام و تقریب کے بعد، اوّل قسم کی احادیث کے متعلق یہی سمجھنا چاہیئے کہ وہ :

(و)۔ یا تو اس زمانے سے متعلق ہیں جب قرآن میں ہنوز حج کی قربانی کے احکام نہیں آئے تھے۔

(ب)۔ اگر شق (ا) ناقابلِ تسلیم ہو تو پھر لامحالہ اسی نتیجہ پر پہنچا جائے گا کہ یہ روایات وضعی ہیں۔ کیونکہ رسول اللہ کا کوئی عمل قرآن کے خلاف ہو نہیں سکتا۔

لیکن اگر اس کے باوجود آپ کو اس پر اصرار ہو کہ حج میں ہر حاجی کا ایک ایک، دو دو، چار چار، دس دس، سو سو جانور ذبح کرنے کی اجازت ہے اور ہر جانور کے ذبح کرنے کا ثواب ملتا ہے اور نیز یہ کہ

دنیا کے ہر گلی کوچے میں عید کے دن جانور ذبح کرنا امرِ شروع ہے تو ہم اس سے زیادہ اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ ہمارا کام راستہ دکھانا ہے، راستہ پر لگا دینا نہیں۔

مشکل یہ ہے کہ جب انسان کے ذہن میں کوئی بات اندھی تقلید کی بنا پر بطورِ عقیدہ جم جائے تو اس میں خالی الذہن ہو کر سوچنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہتی۔ اگر ان حضرات میں خالی الذہن ہو کر سوچنے کی صلاحیت ہوتی تو ہم اُن سے کہتے کہ آپ ذرا تصور میں لایئے کہ کسی جگہ قریب ایک[1] لاکھ انسان جمع ہوں اور اُن میں سے ہر ایک دو دو، چار چار بھیڑوں، بکریوں کو ذبح کر کے زمین پر تڑپتا چھوڑ دے اور اس کے بعد ان تمام تین چار لاکھ لاشوں کو گڑھے کھود کھود کر دبا دیا جائے۔ اس کے ساتھ ہی دنیا میں ہر مقام پر کروڑوں کی تعداد میں اسی طرح جانور ذبح کئے جائیں اور دن بھر ان جانوروں کا گوشت اِدھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر گھومتا پھرے اور اس کے بعد یہ قوم اللہ کا شکر ادا کرے کہ اُس نے ایک بہت بڑا کارِ نمایاں انجام دے دیا جس کا انہیں خدا کے ہاں بہت بڑا اجر ملے گا اور یہ جانور انہیں جہنم سے پار لگانے کا موجب بنیں گے۔ یہ منظر تصور میں لایئے اور پھر سوچئے کہ ان دو چار روایتوں نے جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ آپ کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا اور کیا سے کیا بنا دیا۔ روایات نے کیا یہ ہے کہ اسلام جیسے زندگی بخش نظامِ حیات کو رسومات کا مجموعہ بنا دیا ہے اور یہی ان لوگوں کا مقصود تھا۔ جنہوں نے مسلمانوں کو قرآن سے ہٹا کر روایات میں الجھا دیا۔ یہ ہیں قرآن کی رُو سے قربانی کے احکام۔ یعنی

(۱)۔ قربانی، اجتماعِ حج کے ساتھ مخصوص ہے اور اس کا مقصد اس اجتماع میں شریک ہونے والوں کے لئے خوراک بہم پہنچانا ہے۔ لہٰذا اس ضرورت سے زیادہ جس قدر جانور ذبح کئے جاتے ہیں وہ اہلاکِ نسل ہے جسے قرآن نے فساد سے تعبیر کیا ہے۔ (ویہلک الحرث والنسل) (۲:۲۰۵)

(۲)۔ حج کے علاوہ قربانی اور کہیں نہیں۔ لہٰذا یہ جو دنیا کے ہر قریہ اور ہر بستی کے گلی کوچے میں جانور ذبح کئے جاتے ہیں قرآن کی رُو سے اس کی شرعی حیثیت کچھ نہیں۔ ذالک الدین القیم ولکن اکثر الناس لایعلمون۔

(۱۹۵۱ء)

---

[1] ۱۹۶۳ء میں حج کی تقریب پر قریب چودہ لاکھ کا اجتماع بتایا گیا تھا۔

کیا قربانی کا منکر کافر ہے؟

از: علامہ عیاض العقاد۔ مدیر الاسلام (مصر)

سوال

زید قربانی کا منکر ہے۔ بارہا اس نے اپنے منہ سے یہ الفاظ نکالے ہیں کہ ہر سال جتنے جانور ذبح کئے جاتے ہیں، اگر ان کی قیمت حکومت کے حوالہ کر دی جائے تو وہ اس سے سینکڑوں رفاہِ عامہ کے کام کر سکتی ہے بلکہ وہ علی الاعلان کہتا ہے کہ اسی طرح امّتِ مسلمہ کو ہر سال لاکھوں روپے کا نقصان ہو رہا ہے۔ اگر یہ رقم کسی اچھے مصرف میں لگائی جاتی تو بہتر ہوتا۔ پوچھنے والی بات یہ ہے کہ کیا ایسے اعتقاد رکھنے کے بعد زید مسلمان رہ سکتا ہے کیا کہ وہ اس قابل ہے کہ موت کے بعد مسلمان اس کا جنازہ پڑھیں اور کیا مسلمان اس کے ساتھ رشتہ ناطہ کر سکتے ہیں؟ براہِ کرم جواب مفصل دیجئے۔

سائل:۔ غنم بن صفوان العلی۔ مقیم قاہرہ

الجواب

سب سے پہلے تو آپ کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ میں نہ اپنے آپ کو مفتی کہتا ہوں اور نہ ایسی مسندِ افتاء میں نے بچھا رکھی ہے کہ تکیہ سے پیٹھ ٹیک کر بیٹھوں اور لوگوں کے ایمان تولتا رہوں۔ میں جو کچھ بھی کہوں گا محض علمی و تحقیقی انداز میں کہوں گا اور جہاں تک میری بصیرت میری رہنمائی کرے گی حق گوئی میں پوری بے باکی سے کام لوں گا۔

قربانی اور قرآن حکیم

سب سے پہلے یہ دیکھیئے کہ آیا قربانی قرآن حکیم سے ثابت ہے یا نہیں؟ جب آپ اس امر پر غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن میں قطعیت

کے ساتھ یہ کہیں نہیں آیا کہ مسلمان خواہ وہ دُنیا کے کسی گوشے میں بستے ہوں۔ ذی الحج کی فلاں تاریخ کو قربانی کیا کریں۔ عام مفسرین جن آیات سے استدلال کرتے ہیں۔ میں انہیں بھی درج کئے دیتا ہوں۔

۱۔ قُلْ اِنَّ صَلٰوتِیْ وَ نُسُکِیْ وَ مَحْیَایَ وَ مَمَاتِیْ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ ۝ (انعام)

کہہ دیجئے کہ میری صلوٰۃ میری "نسک" میری زندگی اور میری موت رب العالمین کے لئے ہے۔ اس آیت میں "نسک" سے قربانی مراد لی جاتی ہے۔

آیئے۔ "نسک" کا فیصلہ ائمہ لغت سے کرائیں۔

علامہ بستانی لکھتے ہیں :۔

"اس مادہ کے اصل معانی دھو کر پاک صاف کرنا ہیں۔ اس کے بعد یہ ہراس امر کے لئے استعمال ہونے لگا جو خدا کی طرف سے واجب قرار پایا ہو۔ اسی لئے مناسک کا لفظ ان طور طریقوں کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ جو واجبات خداوندی کی ادائیگی کے لئے مقرر ہوئے ہیں۔ (محیط المحیط۔ ملخصاً)

علامہ محب الدّین محمد مرتضیٰ لکھتے ہیں :۔

"نسك السبخة کے معنی ہیں۔ اس نے بنجر زمین کو درست کیا۔ نسك الی طریقة جمیلة۔ اس نے اچھا راستہ اختیار کر لیا۔ اسی لئے نسك اس مقام کو کہتے ہیں جس کی طرف لوگ اکثر آتے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر حج کے امور و مراسم کو بھی مناسک کہتے ہیں۔ نُسُکٌ یا نَسِیْکَۃٌ۔ ذبیحہ یا خون کے معنوں میں بھی آتا ہے۔"

(تاج العروس۔ ملخصاً)

علامہ ابن قتیبہ کہتے ہیں :۔

"نسک ہراس چیز کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ خدا کا تقرب حاصل کیا جائے۔" (کتاب القرطین)

غرض یہاں سے آپ نے معلوم کر لیا کہ اگرچہ بنیادی معنوں کے لحاظ سے یہ لفظ زندگی کے ہر اس طور طریقے پر استعمال ہوتا ہے جو اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لئے اختیار کیا جائے تاہم یہ ذبیحہ کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے اور ذبیحہ بھی وہی جو حصولِ تقرب کے لئے ہو۔ آیہ زیر نظر میں اکثر مصنفین نے نسک سے مناسک حج مراد لئے ہیں۔ کیونکہ قرآن ان معانی میں بھی اس لفظ کو استعمال کرتا ہے۔ دیکھئے۔

فَاِذَا قَضَیۡتُمۡ مَّنَاسِکَکُمۡ ۔ (البقرہ)

جب تم مناسکِ حج سے فارغ ہو جاؤ۔

لیکن قرآن ہی میں یہ لفظ ذبیحہ کے معنوں میں بھی آیا ہے۔

فَفِدۡیَۃٌ مِّنۡ صِیَامٍ اَوۡ صَدَقَۃٍ اَوۡ نُسُکٍ ۔ (بقرہ)

پس اس کا فدیہ روزے یا صدقہ یا ذبیحہ ہوں گے۔

دیکھنا یہ ہے کہ سورۂ انعام کی مذکورۃ الصدر آیت میں نُسک ذبیحہ کے معنوں میں استعمال ہوا ہے یا قربانی کے معنوں میں۔

صلوٰۃ کے ساتھ نُسک اور حیات و ممات کے الفاظ صراحتاً اس امر پر دلالت کر رہے ہیں کہ یہاں لفظ اپنے بنیادی معنوں کے بغیر کسی اور معانی میں استعمال کیا جائے تو ان نئے معانی کے لئے کوئی واضح قرینہ ہونا چاہیئے۔ جیسے فدیہ والی آیت میں ہے کہ وہاں اور کچھ مراد ہی نہیں لے سکتے اور نہ اُسے بُنیادی معنوں پر محمول سمجھ سکتے ہیں۔ سورۂ حج میں ہے۔

لِکُلِّ اُمَّۃٍ جَعَلۡنَا مَنۡسَکًا ہُمۡ نَاسِکُوۡہُ ۔ (الحج)

ہم نے ہر امت کے لئے ایک طریقہ مقرر کر دیا تھا جس پر اُسے چلنا تھا۔

دیکھئے یہاں لفظ صاف طور پر اپنے بنیادی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

باندازِ دگر اچھا ایک لمحہ کے لئے ہم یہ بھی تسلیم کئے لیتے ہیں کہ سورۂ انعام کی آیت میں نسک سے مراد ذبیحہ ہے لیکن اس بات کی کسی کے پاس کیا دلیل ہے کہ اس سے وہ قربانی مراد ہے جو ہر سال حج کے مہینے میں ساری دنیا کے مسلمان کرتے ہیں۔ اس آیت سے بھی زیادہ سے زیادہ یہی ثابت ہو گا کہ مشرکین بتوں کے حضور اپنے جانوروں کو بھینٹ چڑھاتے تھے، "میں اللہ کے لئے جانور ذبح کرتا ہوں"۔

خیال رکھیئے کہ میں اس قربانی پر گفتگو نہیں کر رہا ہوں جو حاجی حج کے موقع پر دیتے ہیں اور جس قربانی کے جانور کو اللہ تعالیٰ "ھدی" کہتا ہے۔ نمائندگان ملتِ اسلامیہ کے عالمگیر اجتماع میں ہدی کی قربانی اس لئے ہے کہ وہاں وہ لوگ ایک دوسرے کی دعوت کریں اور مختلف ممالک کے نمائندوں میں باہم موانست پیدا ہو اور مل بیٹھ کر وہ لوگ اجتماعی مسائل پر سوچیں۔ دینِ اسلام میں ایسا اجتماعات

کے مواقع پر ہر امت کو نبی اکرمؐ سے پیشتر بھی یہ حکم تھا۔

۱۔ وَلِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ ۔ (الحج)

اور ہم نے ہر امت کے لئے یہ طریقہ مقرر کر دیا تھا کہ وہ لوگ اللہ کے دیئے ہوئے جانوروں پر اللہ کا نام لیں (اور انہیں ذبح کریں)

یہ آیت "ہدی" کے سلسلہ میں سورۂ حج میں وارد ہوئی ہے۔

دوسری دلیل

اب ان لوگوں کی دوسری دلیل ملاحظہ فرمایئے جو قربانی کو قرآن سے ثابت کرتے ہیں۔

۲۔ فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ ۔ (کوثر)

اپنے رب کے واسطے صلوٰۃ ادا کر اور نحر کر۔

وانحر کے معنی کئے جاتے ہیں "اور قربانی کر" حالانکہ نحر کئی معنوں میں آتا ہے۔

فراء نحوی کہتا ہے :۔

"وانحر کے معنی ہیں اپنا سینہ قبلہ رُخ کیجئے" (ابن ابی حاتم)

حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ نبی صلعم نے فرمایا۔

جب یہ سورت نازل ہوئی تو میں نے جبریلؑ سے پوچھا۔ یہ نحر کیا ہے۔ انہوں نے کہا یہ ذبح نہیں بلکہ نماز میں پہلی تکبیر، رکوع اور رکوع سے اُٹھتے ہوئے ہاتھ اٹھانے کا حکم دیا جا رہا ہے۔ (ابنِ ابی حاتم - ابن مردویہ)

جعفر کا قول ہے کہ :۔

نحر کے معنی ہیں تکبیر اولیٰ کے وقت ہاتھ اٹھانا۔ (ابن جریر)

حضرت علیؓ کا ایک اور قول ہے کہ :۔

"نحر کے معنی ہیں بائیں کلائی پر دایاں ہاتھ رکھنا اور پھر انہیں سینے پر رکھ لینا۔"

(دار قطنی و تاریخ بخاری)

حضرت ابنِ عباسؓ کا قول ہے کہ :۔

نحؔر کے معنی ہیں دو سجدوں کے درمیان اتنا بیٹھنا کہ چھاتی نظر آئے۔ (روح المعانی)

ضحاک کا قول ہے کہ :۔

نحؔر کے معنی ہیں نماز کے بعد دعا کے لئے ہاتھ اٹھانا۔ (ایضاً)

ان تمام اقوال کو دیکھئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ نحؔر کے وہ معنی ہیں جنہیں بنیادی معنی نہیں کہا جا سکتا۔ یہ سب اس وقت پیدا ہوئے۔ جب نماز کا تصور پیدا ہوا۔ رہی وہ روایت جو حضرت علیؓ کے واسطہ سے نبی صلعم کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ سو اس کا ضعف ظاہر ہے۔ جبریلؑ اس قوتِ عظیمہ کا نام ہے جو انبیاء کے قلوبِ مقدس پر القائے وحی کرتی ہے۔ وہ وحی کے معانی بتانے نہیں آتی۔ اسناد کے لحاظ سے بھی محدثین نے اسے ضعیف کہا ہے۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں :۔

ابنِ کثیر نے اسے منکر قرار دیا ہے اور ابنِ جوزی نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے

(روح المعانی۔ جزء ۳۰)

اب لغت کی طرف آیئے۔ علامہ محب الدین محمد مرتضیٰ لکھتے ہیں :۔

"نحر الصدر سینے کے اوپر کا حصہ" جہاں ہار پہنایا جاتا ہے۔ نحر البعیر نحیرہ نحراً۔ اس نے اونٹ کے سینے سے متصل اس جگہ پر نیزہ مارا جہاں سے حلق شروع ہوتا ہے

(تاج العروس ملخصاً)

اس کے بعد علامہ مذکور نے وہ تمام اقوال نقل کئے ہیں جو میں پہلے لکھ چکا ہوں۔ ان میں دو باتوں کا اضافہ کیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

۱۔ اونٹوں کو ذبح کرنا ، ۲۔ خواہشات کا قلع قمع کرنا۔ (ایضاً)

علامہ زمخشری کہتے ہیں :۔

نحؔر کے معنی ہیں کامل دستگاہ حاصل کر لینا۔ حاوی ہو جانا۔ نحرت الشیئ علماً۔ میں علم کے ذریعہ اس پہ حاوی ہو گیا۔ (اساس البلاغۃ)

علامہ بستانی لکھتے ہیں :۔

نحر کے معنی ہیں اچھی طرح علم حاصل کر لینا۔ نحر الامور علماءً اس نے معاملات کو اچھی

طرح سمجھ لیا۔ النحر والنحریر کے معنی ہیں۔ ماہر، تجربہ کار، کامل دست گاہ رکھنے والا ہر چیز کو سوچ سمجھ کر اپنانے والا اور ڈٹ کر اس پر عمل پیرا ہونے والا۔" (محیط المحیط)

ہمارے زمانے کے مشہور ماہر لغت علامہ سعد الجیلانی لکھتے ہیں:۔

لفظ نحر بنیادی طور پر ان معنوں میں استعمال ہوتا ہے کہ کسی نظریہ کو، کسی علم کو یا کسی عقیدہ کو غور و تدبر کے بعد قبول کرنا اور پھر اس پر مستحکم ہو جانا۔ یا کسی علم پر پوری بصیرت سے حاوی ہو جانا اور پھر مستقل مزاجی کے ساتھ عمل پیرا ہونا، تو قرآنِ حکیم میں فَصَلِّ لِرَبِّكَ وَانْحَرْ کا مفہوم ہوگا۔ پس نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے مستقل مزاجی سے کوشش کر۔ جب تیسری صدی ہجری میں قوی عمل مفلوج ہوئے اور صلوٰۃ کے مفہوم کو صرف ابتدائی ارکان پر منحصر سمجھا گیا تو نحر کے وہ عجیب معانی بھی پیدا کئے گئے کہ اس کے معنی ہیں نماز میں دایاں ہاتھ بائیں پر رکھنا وغیرہ۔ اس کے کچھ عرصہ بعد مجاہد اور اسماعیل بن ابی خالد وغیرہما نے یہ اُپج نکالی کہ نحر کے معنی ہیں قربانی کرنا اور اس قربانی سے گائے، بیل، بھیڑ، بکری، وغیرہ ہر چیز کا ذبح کرنا مراد لے لیا گیا۔ حالانکہ پہلے مجازاً یہ لفظ اونٹ کے ذبح کرنے پر بولا جاتا تھا۔ کیونکہ اس میں بھی نحر کا بنیادی مفہوم پیشِ نظر تھا۔ اونٹ کو کھڑا کر کے اچھی طرح سے اس کا حلق تاک کر نیزہ اس طرح سے مارنا کہ وہ گر جائے بالکل ان معانی کے مشابہ ہے کہ ایک نظریہ کو نصب العین بنایا جائے۔ پھر اس کے ساتھ شعوری لگن پیدا کی جائے اور پھر اس طرح عمل کیا جائے کہ نصب العین حاصل ہو جائے۔

(مقدمہ لسان القرآن ص۴۲)

ان تصریحات سے آپ کو معلوم ہو گیا ہوگا کہ اوّل تو نحر سے ذبح کرنا مراد نہیں لیا جا سکتا، اور اگر یہ معانی لے بھی لئے جائیں تو پھر بھی صرف یہ ثابت ہوگا کہ "اونٹ ذبح کر" کیونکہ نحر کا لفظ اور کسی جانور کے لئے بولا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ علامہ رازی نے اس اعتراض کا جو جواب دیا ہے وہ بھی سُن لیجئے۔

چونکہ نماز بدنی عبادات میں سب سے افضل ہے، اس کے ساتھ قربانی کی قسموں میں

سب سے عظیم قربانی کا ذکر کیا گیا۔ (تفسیر کبیر ج ۸)

یعنی امام رازیؒ صاحب فرماتے ہیں کہ قربانی تو تمام جانوروں کی ہوسکتی ہے لیکن نماز کے ساتھ افضل قربانی کا ذکر کیا گیا۔ گویا اونٹ کی قربانی باقی جانوروں کی قربانی سے افضل ہے۔ اس لئے "وانحر" کا لفظ استعمال کیا گیا۔ تعجب ہے کہ یہ لوگ ایک طرف تو قربانی کو سنت ابراہیمی کہتے ہیں، یہ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام نے مینڈھا ذبح کیا تھا، دوسری طرف یہ کہہ رہے ہیں کہ اونٹ کی قربانی مینڈھے کی قربانی سے افضل ہے۔ اس کے علاوہ اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ علامہ رازی جیسے معقول انسان کو یہ غیر معقول دلیل اس لئے تراشنا پڑی کہ روایات ان کے ذہن میں گھر کر چکی تھیں اور وہ قرآن کے منہ میں روایات کی زبان رکھ کر باتیں کرانا چاہتے تھے۔ اسی چیز کو تفسیر بالرائے کہنا چاہیئے

چلئے ہم نے ایک لمحہ کے لئے یہ بھی مان لیا کہ یہاں وانحر کے معنی ہیں "اونٹ، گائے، بکری بھیڑ ذبح کر۔" لیکن پھر وہی اعتراض ہے کہ آپ یہ کہاں سے ثابت کریں گے کہ اس سے وہی معروف قربانی مراد ہے جو ہر سال حج کے ایام میں دنیا کے ہر گوشے میں ہر مسلمان کرتا ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور اعتراض بھی ہے کہ معروف قول کے مطابق یہ سورۃ مکی ہے تو کیا آپ ثابت کرسکتے ہیں کہ مکہ مکرمہ میں نبی صلعم نے قربانی کی تھی۔ اگر نہیں کی تو کیا آپ حکم خداوندی کی خلاف ورزی کرتے رہے؟ (معاذ اللہ)

یہی دو آیتیں ہیں جن سے یہ لوگ قربانی کے حکم پر استدلال کرتے ہیں۔ مگر آپ دیکھ چکے کہ ان حضرات کا استدلال کتنا کمزور ہے!

احادیث اور قربانی

اب آیئے احادیث کی طرف۔ پورے ذخیرہ روایات میں دو احادیث ایسی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ نبی اکرمؐ نے قربانی کا حکم دیا۔ ایک نظر ان کو ملاحظہ فرمالیجئے۔

نبی صلعم نے عرفات کے میدان میں فرمایا کہ لوگو! گھر والے پر سال میں ایک مرتبہ قربانی ہے اور ایک مرتبہ عتیرہ[1] (ابو داؤد، ترمذی، ابن ماجہ۔ نسائی)

---

[1]: قربانی سے تو ذوالحجہ کا ذبیحہ مراد ہے اور عتیرہ کہتے ہیں۔ دس رجب کے ذبیحہ کو (عیاض العقاد)

اس روایت میں قربانی اور عتیرہ دونوں کا حکم دیا گیا ہے۔ لیکن محدثین کہتے ہیں کہ عتیرہ بالاتفاق منسوخ ہے۔ رہی قربانی تو علامہ ابن حزم کا ارشاد سن لیجئے۔

اس روایت کی اسناد میں، ابو رملہ خامدی واقع ہوا ہے جو ماہرینِ فن کے نزدیک مجہول الحال اور گمنام قسم کا راوی ہے۔ (المحلّی - ج ۷)

دوسری روایت جو بڑے طمطراق سے پیش کی جاتی ہے، وہ یہ ہے۔

جناب ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ جو صاحبِ حیثیت ہو اور قربانی نہ کرے وہ ہماری مسجد کے قریب نہ آئے۔

(مستدرک حاکم - بخاری - ج ۲ - ابن ماجہ)

اس روایت پر بھی علامہ ابن حزم نے قلم اٹھایا ہے۔ فرماتے ہیں:۔

''محدثین و محققین نے کہا ہے کہ اس روایت کی اسناد بالآخر عبداللہ بن عیاش بن عباس پر منتہی ہوتی ہیں جو نہایت مجروح اور حد درجہ ناقابلِ اعتبار تھا۔

(المحلّی - ج ۷)

قائلین قربانی کی طرف سے اس سلسلہ میں، دو اور روایات بھی پیش کی جاتی ہیں۔ ہم انہیں بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہتے۔

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اکرم صلعم مدینہ میں دس سال تک رہے اور قربانی کرتے رہے۔ (مسند احمد - ج ۷ - ترمذی)

اِس روایت میں یہ نہیں بتایا گیا کہ قربانی کب واجب ہوئی تھی۔ اگر وہ حج کے ساتھ واجب ہوئی تو دس سال کا عرصہ کہاں ہوا کیونکہ بالاتفاق ۹ھ کے بعد ہی حج فرض ہوا تھا۔ لیکن اِس سلسلہ میں ہم اپنی طرف سے کچھ نہیں کہنا چاہتے۔ انہی لوگوں کا ایک اصول بیان کر دیتے ہیں جو ان کے استدلال کی عنکبوتیت واضح کر رہا ہے۔ مشکوٰۃ کے مشہور شارح علامہ ابوالحسن عبیداللہ کہتے ہیں:۔

کسی عمل پر نبی صلعم کے دوام اور مواظبت سے یہ لازم نہیں آتا کہ وہ عمل حقیقتاً بھی ضروری ہے۔ (شرح مشکوٰۃ - ج ۲)

اوّل تو یہ تسلیم کرنا کہ آپؐ نے دس سال تک قربانی کی، خلافِ حقیقت ہے اور اگر اسے مان بھی لیں تو

شارح مشکوٰۃ کے قول کے مطابق یہ کیسے لازم آیا کہ وہ عمل اُمت کے لئے شرعی طور پہ واجب ہے۔

ایک اور روایت سے بھی استدلال کیا جاتا ہے۔ وہ بھی دیکھ لیجئے۔

جس نے ذوالحجہ کا چاند دیکھ کر قربانی کا ارادہ کیا اُسے چاہیئے کہ ذبح کرنے سے پہلے نہ تو بال ترشوائے نہ ناخن کاٹے۔ (ابوداؤد۔ نسائی)

اس روایت سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ قربانی کی شرائط بالوں کو نہ ترشوانا اور ناخن نہ کاٹنا بتا رہی ہیں کہ جس طرح ان کی پابندی ضروری ہے اسی طرح قربانی بھی ضروری ہے۔ حالانکہ یہ استدلال بڑا ہی خام ہے۔ کیونکہ یہاں قربانی کو ارادہ سے پہ موقوف ٹھہرایا گیا ہے۔ رہا اس کی شرائط کی پابندی کا سوال تو وُہ ایسے ہے جیسے کوئی شخص نفلی روزہ کا ارادہ کرکے روزہ رکھ لے تو اب اس پر وہ تمام پابندیاں عائد ہو جائیں گی جو فرضی روزوں پہ ہیں۔

غرض یہی کچھ ہیں وہ دلائل جن کی بنا پر قربانی کو ضروری ٹھہرایا جاتا ہے۔ اب یہ دیکھئے کہ ائمہ نے قربانی کی کیا حیثیت سمجھی ہے۔

قربانی اور فقہا

علامہ ابنِ ارشد لکھتے ہیں :-

امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک خوشحال شہری جو حالتِ سفر میں نہ ہوں، ان پر قربانی واجب ہے، مسافروں پر نہیں۔ لیکن امام محمدؒ اور امام ابویوسفؒ کے نزدیک قربانی واجب نہیں۔ (بدایۃ المجتہد۔ ج ۱)

فقہ حنفی امام ابوحنیفہؒ، امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے اقوال سے عبارت ہے کہیں کہیں امام ابوحنیفہؒ کے اقوال پر فتویٰ دیا جاتا ہے لیکن زیادہ تر امام ابویوسفؒ اور امام محمدؒ کے اقوال کو ترجیح دی جاتی ہے۔ لیکن نہ معلوم اس معاملہ میں کس دلیل کی بنا پہ امام اعظمؒ صاحب کے قول کو ترجیح دی گئی ہے۔ ائمہ ثلاثہ یعنی امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ اسے سُنتِ مؤکدہ قرار دیتے ہیں مگر وہ بھی ایسی کہ کرنے والے کو ثواب ملے گا اور تارک پر کوئی گرفت نہیں ہوگی۔

ائمہ ثلاثہ کے نزدیک قربانی سنتِ مؤکدہ ہے۔ کرنے والا ثواب کا مستحق ہے

اور ترک کرنے والے پر کوئی گرفت نہیں۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱)

قربانی واجب نہیں۔ اجماع صحابہ

اب ذرا اس امر پر غور کیجئے کہ کیا صحابہؓ بھی قربانی کو واجب سمجھتے تھے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے تو حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کا عمل ملاحظہ فرمایئے۔ امام شافعیؒ لکھتے ہیں کہ :

ہمیں یہ روایت پہنچی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ قربانی نہیں کرتے تھے۔ اس اندیشے سے کہ کہیں انہیں دیکھنے والے قربانی کو ضروری نہ سمجھیں۔

(کتاب الام۔ ج ۲)

حضرت ابو مسعودؓ انصاری کے متعلق شمس الائمہ سرخسیؒ لکھتے ہیں کہ :۔

حضرت ابو مسعود انصاریؓ نے فرمایا۔ میرے پاس صبح شام ایک ہزار بکریاں آتی جاتی تھیں اور میں نے اس خوف سے قربانی نہ کی کہ کہیں لوگ اسے ضروری نہ سمجھ لیں۔

(المبسوط۔ ج ۱۲)

حضرت ابن عباسؓ اور حضرت بلالؓ کے متعلق علامہ ابن رشد نے لکھا ہے۔

ابن عباسؓ بھی اسے واجب خیال نہیں کرتے۔ عکرمہ کہتے ہیں کہ مجھے حضرت ابن عباسؓ نے دو درہم دے کر گوشت خریدنے کے لئے بھیجا اور کہا کہ جو ملے اُسے کہہ دینا کہ یہی ابن عباسؓ کی قربانی ہے اور بلالؓ کے متعلق روایت ہے کہ انہوں نے مرغ ذبح کیا۔ (بدایۃ المجتہد۔ ج ۱)

اس روایت سے آپ کو معلوم ہو گیا کہ اس وقت قربانی کا رواج اس قدر کم تھا کہ قربانی کے روز گوشت فروخت ہو رہا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کے تعامل کے متعلق امام ابن حزم نے اپنی سند کے ساتھ لکھا ہے کہ :۔

حضرت حذیفہؓ فرماتے ہیں کہ میں نے کئی مرتبہ دیکھا کہ حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ قربانی کو اس خیال سے مکروہ جانتے تھے کہ کہیں لوگ اس کی

اقتدا ضروری نہ سمجھ لیں۔ (المحلّٰی - ج ۷)

امام مذکور نے حضرت ابومسعودؓ کا قول ان الفاظ میں نقل کیا ہے۔

بلاشبہ مسلمانوں کی سہولت اور یُسر کے خیال سے میں قربانی ترک کر دینے کا ارادہ کر چکا ہوں۔ کیونکہ اندیشہ ہے کہ یہ لوگ اسے ضروری سمجھ لیں گے۔ (المحلّٰی - ج ۷)

شارحِ مشکوٰۃ علامہ ابوالحسن عبیداللہ نے امام بیہقی کی صحیح سند کے ساتھ لکھا ہے کہ :-

حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، ابنِ عباسؓ، بلالؓ اور ابنِ عمر صرف اس اندیشہ سے قربانی کو مکروہ سمجھتے تھے کہ کہیں انہیں دیکھ کر لوگ اُسے ضروری نہ سمجھ بیٹھیں۔

(شرح مشکوٰۃ - ج ۲)

انہی شواہد کی بنا پر امام ابن حزم لکھتے ہیں۔

کسی ایک صحابیؓ سے بھی یہ بات ثابت نہیں کہ قربانی واجب ہے۔ (المحلّٰی - ج ۷)

ابنِ حزم کی طرح ابنِ حجر اور شارحِ مشکوٰۃ بھی اسی بات کے قائل ہیں۔

صحابۂ کرامؓ میں سے کوئی بھی ذبیحۂ عید قربان کے وجوب کا قائل نہیں تھا۔

(شرح مشکوٰۃ - ج ۲)

علامہ شوکانیؒ لکھتے ہیں :-

جمہور کے نزدیک قربانی واجب نہیں۔ امام نووی نے کہا کہ ابوبکر صدیقؓ، عمرؓ، بلالؓ، ابومسعود البدریؓ۔ سعید بن المسیب، علقمہ، اسود، عطاء، مالک، احمد، ابویوسف، اسحٰق، ابوثور، مزنی، ابن المنذر اور داؤد وغیرہم بھی اسے واجب نہیں سمجھتے۔ بحر میں ہے کہ ابنِ عباسؓ اور ابنِ مسعودؓ بھی اسے واجب نہیں سمجھتے تھے۔ (نیل الاوطار - ج ۵)

علامہ ابوالحسن عبیداللہ نے اس فہرست میں مندرجہ ذیل ناموں کا اضافہ کیا ہے۔

سعید بن جبیر، حسن بصری۔ طاؤس۔ ابوالشعثاء، جابر بن زید، محمد بن علی بن الحسین۔ سفیان بن عُلَیّنہ۔ عبیداللہ بن الحسن اور ابوسلیمان وغیرہم نے بھی قربانی کو واجب نہیں سمجھا۔ (المحلّٰی - ج ۷)

اس کے بعد علامہ موصوف لکھتے ہیں :۔

"قربانی کو واجب بتا کر حنفیہ نے جمہور علماء کی مخالفت کی ہے ۔" (ایضاً)

انہی شواہد و نظائر کی بنا پر امام موصوف نے فیصلہ دیا ہے کہ :۔

"جو شخص نیک نیتی سے قربانی نہیں کرنا چاہتا اس پر نہ کوئی عتاب ہے نہ شرعی قباحت ۔" (ایضاً)

قربانی کے متعلق بعض دیگر روایات

اب قربانی کے متعلق اور روایات بھی سن لیجئے جو اس کے وجوب کو ختم کرتی ہیں ۔

ابو رافع سے روایت ہے کہ رسول خدا صلعم نے عید الاضحیٰ کے روز ایک مینڈھا ذبح کیا اور فرمایا" میرے خدا یہ میری ساری اُمت کی طرف سے ہے جس نے توحید و رسالت کی گواہی دی ۔ پھر دوسرے مینڈھے کو ذبح کیا اور فرمایا" میرے اللہ یہ محمدؐ اور آل محمدؐ کی طرف سے ہے ۔ راوی کہتا ہے کہ اس کے بعد بنو ہاشم میں سے کسی کو قربانی کرتے نہیں دیکھا ۔" (مسند احمد)

حضرت ابن عباسؓ سے مرفوعاً مروی ہے کہ رسول اکرم صلعم نے فرمایا ۔

مجھے چاشت کی نماز کا حکم دیا گیا ہے اور تمہیں نہیں دیا گیا ۔ مجھے قربانی کا حکم دیا گیا ہے اور تمہیں نہیں دیا گیا ۔ (مسند احمد)

یہی روایت ان الفاظ میں بھی بیان فرمائی ۔

تین چیزیں میرے لئے فرائض کا درجہ رکھتی ہیں اور تمہارے لئے نوافل کا ۔ قربانی، وتر اور چاشت کی نماز ۔ (بزاز، ابن عدی ۔ حاکم)

ایک اور جگہ ہے ۔

مجھ پر قربانی فرض ہے اور تم پر نہیں ۔ مجھے چاشت کی نماز کا حکم دیا گیا ہے اور تمہیں نہیں دیا گیا ۔ (مسند ابو یعلی)

خلاصۂ مباحث

اب ذرا قطع کردہ منازل پر ایک نظر ڈال لیجئے ۔

۱۔ قرآن حکیم میں کہیں بھی قربانی کا حکم نہیں دیا گیا۔

۲۔ کوئی صحیح حدیث قربانی کے وجوب پر دلالت نہیں کرتی۔ بلکہ ایسی روایات بھی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ قربانی کو رسولِ اکرم صلعم نے اپنے لئے مختص کر لیا تھا۔

۳۔ صحابۂ کرامؓ اسے واجب نہیں سمجھتے تھے اور حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ خصوصیت سے قربانی نہیں کرتے تھے۔ پس اگر وہ روایات صحیح ہوتیں۔ جن میں قربانی کو ضروری قرار دیا گیا ہے تو یہ حضرات کبھی ایسا نہ کرتے۔

۴۔ جمہور ائمہ اسے ضروری خیال نہیں کرتے۔

۵۔ صرف امام اعظمؒ ابوحنیفہ اسے واجب سمجھتے ہیں۔

کفر و ایمان کا فیصلہ آپ پر ہے

اب آپ خود ہی فیصلہ کیجئے کہ کیا قربانی (جس کا حکم کہیں صراحت سے نہیں) کا منکر کافر ہے یا مسلمان؟ اگر اس معاملہ میں آپ امام اعظمؒ ہی کو برسرِ حق قرار دیں تب بھی آپ قربانی کے منکر کو کافر نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ حنفیہ کے نزدیک واجب کی تعریف یہ ہے۔

> واجب وہ ہے جو دلیل ظنی سے ثابت ہو اس کا شرعی حکم یہ ہے کہ وہ عملاً لازم ہے اعتقاداً نہیں۔ چنانچہ اس کا منکر کافر نہیں کیونکہ ظنی دلیل سے ثابت شدہ حکم کی بنا پر کسی کو کافر نہیں کہا جا سکتا۔ (الفقہ علی المذاہب الاربعہ ج ۱)

قربانی یا نقد قیمت

اب رہا یہ سوال کہ زید کہتا ہے:۔

> "ہر سال جتنے جانور ذبح کئے جاتے ہیں اگر ان کی قیمت حکومت کے حوالہ کر دی جائے تو سینکڑوں رفاہِ عامہ کے کام ہو سکتے ہیں۔"

تو میرے بھائی اس بات سے کسے انکار ہے۔ دینِ اسلام کے تمام احکام معقول مصالح پر مبنی ہیں۔ اگر ہر سال اتنے جانوروں کا ضیاع بھی کوئی منفعت بخش فعل ہے تو آپ منہ پر مہر لگائے کیوں بیٹھے ہیں۔ ذرا وہ مصلحت تو بتا دیجئے۔ اگر آپ غلط عقاید کی پیدا کردہ جذباتیت سے بلند ہو کر سوچیں تو آپ اسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ اگر حکومتِ عادل کو یہ رقم اکٹھی کر کے دی جائے تو حکومت بڑے مفید کام کر سکتی ہے۔ اور صرف

آپ ہی نہیں، ہر شخص اسی نتیجہ پہ پہنچے گا۔ بلکہ حضرت بلالؓ بھی اسی نتیجہ پہ پہنچے تھے۔ سُنیئے امام ابنِ حزم کیا کہتے ہیں:۔

سوید بن غفلہ روایت کرتے ہیں کہ حضرت بلالؓ نے فرمایا "میں اگر قربانی کرتا تو مجھے کوئی خوف نہ ہوتا کہ بکرے کی بجائے مرغا لے کر ذبح کر دوں۔ لیکن میرا تو یہ خیال ہے کہ ذبیحہ کے نقد پیسے مسکین کو دے دوں جو انتہائی ضرورت مند اور محتاج ہو۔ میرے نزدیک جانور ذبح کرنے سے یہ فعل افضل ہے۔ (المحلّٰی - ج ۷)

صاحبِ ہدایہ قربانی کرنے کو قیمت خیرات کرنے سے افضل سمجھتے ہیں۔ لیکن اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ قیمت خیرات کرنے سے قربانی ادا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ان کا قول ہے کہ:

قربانی کے دنوں میں قربانی کرنا، جانور کی قیمت خیرات کر دینے سے افضل ہے۔

(ہدایہ - ج ۴)

میں نے اپنی طرف سے جو حق سمجھا اُسے واضح کر دیا۔ وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِالصَّوَاب۔
(۱۹۶۳ء)

زکوٰۃ

سوال

اسلام کے پانچ ارکان میں سے زکوٰۃ کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اس کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ جس مال پر ایک سال گزر جائے، اس میں سے اڑھائی فیصد خدا کے نام پر دے دینا زکوٰۃ ہے۔ اگر زکوٰۃ یہی ہے تو اس میں اور خیرات میں کیا فرق ہے؟ اور اگر زکوٰۃ حکومت کو دی جاتی تھی تو اس میں اور حکومت کے ٹیکس میں کیا فرق ہے۔ اسے ذرا وضاحت سے سمجھائیں تاکہ یہ خلش دُور ہو جائے۔

جواب

لفظ زکوٰۃ کا مادہ (ز۔ ک۔ و) ہے۔ جس کے معنی ہیں بڑھنا۔ پھولنا۔ پھلنا۔ نشو ونما پانا۔ زکوٰۃ کے معنی ہیں نشو ونما۔ بالیدگی۔ پھولنا۔ پھلنا۔ بڑھنا۔ قرآن کریم میں اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ اور اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کے الفاظ بار بار آئے ہیں اور بڑی تاکید کے ساتھ آئے ہیں۔ اٰتُوا الزَّکٰوۃَ کے معنی ہوئے "زکوٰۃ دو"۔ لفظ زکوٰۃ کے جو معنی اوپر دیئے گئے ہیں۔ ان کی روشنی میں سوچئے کہ "زکوٰۃ دینے" سے مراد کیا ہوگی۔ یہی کہ دوسروں کی نشو ونما اور بالیدگی کا سامان بہم پہنچاؤ۔ یعنی جماعتِ مومنین کا بنیادی فریضہ یہ ہے کہ نوعِ انسانی کی نشو ونما اور بالیدگی کا سامان بہم پہنچائے۔ وہ ایسا انتظام کرے جس سے افرادِ نسلِ انسانی کی صلاحیتوں کی نشو ونما ہوتی چلی جائے۔ اس میں ان کی طبعی زندگی کی صلاحیتوں کی نشو ونما بھی شامل ہے۔ اور انسانی زندگی کی نشو ونما بھی۔ یعنی انسانی جسم کی پرورش بھی اور انسانی ذات کی بالیدگی اور ارتقا بھی۔ جماعتِ مومنین کی طرف سے یہ فریضہ ان کا نظامِ حکومت ادا کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآنِ کریم میں آیا ہے

کہ اَلَّذِیۡنَ اِنۡ مَّکَّنّٰھُمۡ فِی الۡاَرۡضِ اَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ ۔ (۲۲/۴۱) یعنی یہ وہ لوگ ہیں کہ جب انہیں ملک میں تمکن حاصل ہوگا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے اور ایتائے زکوٰۃ کا انتظام کریں گے ۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن نے ایتائے زکوٰۃ کو حکومتِ اسلامی کا فریضہ قرار دیا ہے ۔ اس سے ظاہر ہے کہ زکوٰۃ ، خیرات کا نام نہیں ۔ خیرات ہم انفرادی طور پر ہر حالت میں دے سکتے ہیں ۔ اس کے لئے اپنی حکومت کی شرط نہیں ۔ ہم انگریزوں کی حکومت کے زمانے میں بھی خیرات دیتے تھے ۔ اب ہندوستان کے مسلمان ، ہندوؤں کی حکومت میں بھی خیرات دے سکتے ہیں اور دیتے ہیں ۔ ایتائے زکوٰۃ کے لئے اپنی حکومت کی شرط زکوٰۃ کی حقیقت کو واضح کر دیتی ہے ۔

اب سوال یہ ہے کہ اسلامی حکومت اپنے اس عظیم فریضہ (یعنی نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانے کے فریضہ) کو سرانجام کس طرح سے دے گی ؟ اس کے لئے ظاہر ہے کہ سب سے پہلے ذرائع پیداوار حکومت کی تحویل میں رہنے چاہئیں تاکہ وہ اس پیداوار (رزق) کو ضرورت مندوں کی نشوونما کے لئے صرف میں لائے ۔ دوسرے یہ کہ افرادِ معاشرہ جس قدر کمائیں وہ اس طرح کھلا رکھیں کہ (ان کی ضروریات پوری ہونے کے بعد) مملکت اس میں سے جس قدر ضرورت سمجھے ، ایتائے زکوٰۃ (دوسروں کی نشوونما) کے لئے لے لے ۔ اس مقصد کے لئے قرآن کریم نے نہ کوئی شرح مقرر کی ہے نہ نصاب ۔ اس میں سوال ضرورت پوری کرنے کا ہے ۔ حتیٰ کہ اس نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ افراد کی اپنی ضروریات پوری ہونے کے بعد جس قدر فاضلہ ہو وہ سب کا سب مملکت کی تحویل میں جا سکتا ہے تاکہ وہ اس سے دوسروں کی نشوونما (زکوٰۃ) کا انتظام کرے ۔ (دیکھئے ۔ ۲/۲۱۹)

لیکن ظاہر ہے کہ اس قسم کا نظام مملکت بتدریج قائم ہوگا ۔ جس عرصہ میں ایسا نظام ہنوز زیرِ تشکیل ہو ، اس میں جماعتِ مومنین سے (آج کی اصطلاح میں) چندے اور عطیے لئے جائیں گے ۔ اس کے لئے قرآن نے "صدقات" کی اصطلاح استعمال کی ہے ۔

یہ تھا زکوٰۃ سے مفہوم اسلامی نظامِ حکومت میں ۔ لیکن جب وہ نظام باقی نہ رہا ، دین اور سیاست میں جدائیگی پیدا ہوگئی ۔ زکوٰۃ کا قرآنی مفہوم (یعنی نوعِ انسانی کو سامانِ نشوونما دینا) نگاہوں سے اوجھل ہو گیا ۔۔۔ حکومت نے اپنے ٹیکس وصول کرنے شروع کر دیئے اور مذہبی پیشوا بہ نیت "زکوٰۃ" کے نام سے اپنا ٹیکس وصول کرنے لگ گئی ۔ باقی رہے غریب اور محتاج ، سوائے کے لئے

امیر آدمیوں کو خیرات کی تلقین ہونے لگی۔ چنانچہ یہی سلسلہ اب تک جاری ہے۔ لوگ حکومت کے ٹیکس الگ دیتے ہیں۔ سالانہ زکوٰۃ الگ۔ اور خیرات ان دونوں سے الگ۔ حتیٰ کہ قرآن کریم نے جو باتیں "صدقات" کے متعلق کہی تھیں، وہ زکوٰۃ کے متعلق سمجھ لی گئی ہیں۔ مثلاً عام طور پر کہا جاتا ہے کہ قرآن کریم نے زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کئے ہیں۔ حالانکہ وہ مصارف "صدقات" کے ہیں۔ زکوٰۃ کے نہیں۔ ($\frac{٦}{٧}$ ب)

تصریحات بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ اس وقت یا تو حکومت کے ٹیکس ہیں اور یا خیرات۔ خواہ اُسے متعین طور پر زکوٰۃ کا نام دے دیا جائے یا غیر متعین طور پر صدقہ اور خیرات۔ زکوٰۃ (یعنی افرادِ معاشرہ کو سامان نشوونما بہم پہنچانا) نہ حکومت کا فریضہ سمجھا جاتا ہے نہ عوام کا۔ اسلامی نظام حکومت میں "زکوٰۃ دینا" حکومت کا فریضہ ہو گا اور اس مقصد کے لئے افرادِ جماعتِ مومنین اپنی ضروریات سے زاید سب کا سب دوسروں کے لئے کھلا رکھیں گے کہ اس میں سے جس قدر ضروری ہو اس مقصد کے لئے صرف کر دیا جائے۔ اس وقت انفرادی خیرات کی ضرورت نہیں رہے گی۔ خیرات لینے والے کا شرفِ انسانیت کچلا جاتا ہے لیکن جب ایتائے زکوٰۃ اسلامی نظام کا فریضہ قرار پاتا ہے تو ہر شخص اُسے بطور اپنے حق کے لیتا ہے اور کسی کا کسی پر احسان نہیں ہوتا۔ قرآن، خیرات کو عبوری دور کی ضروریات کے لئے ہنگامی اور وقتی علاج بتاتا ہے اور زکوٰۃ کو اسلامی نظام کا بنیادی فریضہ اور لازمی شعار۔ یہ ہے زکوٰۃ کی حقیقت از روئے قرآن۔

صدقہ و خیرات

سوال: دریافت کیا گیا ہے کہ جس طرح ہم آج کل خیرات کے پیسے بانٹتے ہیں۔ اس سے کچھ فائدہ بھی ہے؟

جواب: قرآن کریم میں یہودیوں کے متعلق ہے کہ وہ پہلے اپنے اعزہ و اقربا کو غیروں کی اسیری میں دے دیتے تھے اور پھر ان کی طرف سے فدیہ ادا کر کے انہیں قید سے چھڑا لیتے اور اسے بہت بڑا کارِ خیر سمجھ کر اپنی نجات کا ذریعہ قرار دیتے۔

بعینہٖ یہ حالت مسلمان سرمایہ داروں کی ہے۔ یہ لوگ دوسروں کا خون چوس کر خود امیر بنتے اور انہیں غریب اور محتاج بنا دیتے ہیں اور پھر ان کی طرف خیرات کے چند پیسے پھینک کر مطمئن ہو جاتے ہیں کہ اس کارِ ثواب سے ان کی عاقبت سنور جائے گی۔ یعنی جس طرح ہماری متصوفانہ شاعری میں گناہ کو اس لئے ضروری سمجھا جاتا ہے کہ اگر گنہگار نہ رہیں گے تو خدا کی صفتِ غفور رحیمی کا مظاہرہ کس طرح سے ہوگا۔ اسی طرح قوم میں غریبوں اور محتاجوں کی موجودگی کو ضروری قرار دیا جاتا ہے کہ اگر غریب نہ رہیں گے تو پھر خیرات کے احکام کی تعمیل کس طرح ہوگی۔ غور کیجئے نظامِ سرمایہ داری کے جراثیم کا اثر کس قدر دور رس ہوتا ہے۔

اسلام جس نظام کو نافذ کرنا چاہتا ہے۔ اس میں ہر شخص کی ضروریاتِ زندگی کی کفالت حکومت کے ذمہ ہوتی ہے۔ لہٰذا، اس نظام میں محتاجوں کی جماعت کا مستقل وجود تصور ہی میں نہیں آسکتا۔ البتہ بعض انفرادی اور مقامی صورتیں ایسی پیدا ہوسکتی ہیں کہ ان میں فوری امداد کی ضرورت پڑ جائے۔ یا بعض ہنگامی حوادث ایسے رونما ہوسکتے ہیں جن میں خود حکومت کو اس قسم کی ضرورت لاحق ہو جائے اور وہ رضاکارانہ طور پر کوئی فنڈ اکٹھا کرنے کی اپیل کر دے۔ لیکن اس قسم کے واقعات شاذ ہوں گے۔ عام حالت یہی ہوگی کہ ملک میں حکومت کا نظام محتاجوں کی خود کفالت کرے گا۔ لہٰذا اسلام میں عام خیرات (CHARITY) کی ضرورت یا تو ایسے عبوری دور میں پڑے گی جب آپ کا نظام ہنوز بروئے کار نہ آیا ہو۔ یا بعض مقامی اور ہنگامی حوادث کے لئے غریبوں اور محتاجوں کی جماعت کا مستقل وجود اور پھر ان کی طرف خیرات کے ٹکے پھینک کر اُسے اپنے لئے ثواب کا کام تصور کرنا، اسلامی نظام میں بار نہیں پا سکتا۔ یہ سرمایہ داری نظام کا فریبِ نگاہ ہے جسے مذہبی تقدس کے خوش آئند غلاف میں چھپایا جا رہا ہے اور اس کا نتیجہ وہی حبطت اعمالھم کی تفسیر۔ یعنی اس تمام صدقہ و خیرات کے باوجود قوم میں محتاجوں اور غریبوں کی تعداد میں دن بدن اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور تعداد کے علاوہ غربت اور احتیاج کی شدت بھی بڑھتی جا رہی ہے۔ اور یہ سب اس سرمایہ داری کے غیر قرآنی نظام کی بدولت ہے جو ہمارے ہاں ہر جگہ رائج ہے۔ اور جسے بدلنے کے لئے کوئی تیار نہیں۔ اس لئے کہ اُسے "شریعت" کی سند عطا کر دی گئی ہے۔ (۱۹۵۳ء)

صدقۃ الفطر

سوال :- ایک صاحب کا استفسار ہے کہ صدقۃ الفطر کی شرعی حیثیت کیا ہے ؟

جواب :- جیسا کہ طلوع اسلام میں لکھا جا چکا ہے۔ صدقات ان عطیات، وغیرہ کا نام ہے جو حکومتِ اسلامیہ کی طرف سے ہنگامی ضروریات کو پورا کرنے کے لئے لئے جاتے ہیں۔ انہی میں صدقہ فطر ہے جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس زمانے میں عائد فرمایا۔ (یعنی ہجرت کے فوری بعد۔ روزے ۲ھ میں فرض ہوئے ہیں) جب ابھی اسلامی حکومت اپنی منظم شکل میں وجود میں نہیں آئی تھی اور مسلمانوں کو قدم قدم پر ہنگامی ضروریات پیش آ رہی تھیں۔ قرآن میں صدقۃ الفطر کا خصوصیت سے ذکر نہیں اس لئے کہ قرآن نے صدقات کا حکم اصولی طور پر دیا ہے۔ جزئیات متعین کرنے کا کام ہر زمانے کی اسلامی حکومت پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اگرچہ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، صدقۂ فطر اس زمانے میں عائد کیا گیا جب ابھی مسلمانوں میں اجتماعی نظم، حکومت کی شکل میں متعین نہیں ہوا تھا، بایں ہمہ تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے کہ اس زمانے میں بھی یہ امور انفرادی نہیں اجتماعی ہوا کرتے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام دین ہے۔ اور دین (آئینی نظامِ زندگی) ہمیشہ اجتماعی ہوتا ہے، انفرادی نہیں۔ خود صدقۂ فطر کے متعلق تاریخ میں ہے کہ لوگ صدقۂ فطر اپنے اپنے طور پر نہیں دیتے تھے بلکہ ان عاملین کے پاس جمع کرتے تھے جو اس مقصد کے لئے مقرر کئے جاتے تھے۔ اس کے بعد مرکز سے اس کی تقسیم ہوتی تھی۔ چنانچہ طبری میں یہ بھی ہے کہ نبی اکرم صلعم نے حضرت ابوہریرہؓ کو اس مقصد کے لئے عامل مقرر کیا تھا۔ چونکہ یہ طریقہ اسلام کی اجتماعی روح کے عین مطابق ہے اس لئے باور کیا جا سکتا ہے کہ رسول اللہ صلعم کے زمانے میں صدقۂ فطر کا یہی نظام رائج ہو گا۔ لیکن اب ہماری لامرکزیت کا یہ عالم ہے کہ صدقہ کے وجوب کی تاکید میں ہر محراب و منبر سے آوازیں بلند ہوں گی۔ لیکن آپ نے کسی کو یہ کہتے ہوئے نہیں سنا ہو گا کہ سُنتِ رسول اللہ یہ ہے کہ اس صدقہ کو ایک مرکز پر جمع کیا جائے اور پھر اس کی تقسیم مرکزِ ملت کی طرف سے ہو۔ اب سُنتِ رسول اللہ کا صرف اتنا حصہ پیش کیا جاتا ہے کہ نماز سے پہلے صدقۂ فطر نکالا جائے اور اسے اپنے اپنے طور پر غریبوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو روزے معلق رہ جائیں گے۔

غور فرمایا آپ نے، کہ بات کیا تھی اور کیا بن گئی۔

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی

آج سارے عالمِ اسلامیہ کو چھوڑیئے۔ ایک پاکستان کو لیجئے۔ یہاں کے سات کروڑ مسلمانوں میں سے اگر چھ کروڑ بھی ایسے فرض کر دیئے جائیں۔ جن کی طرف سے صدقۂ فطر دیا جاتا ہے۔ اور فی کس بارہ آنے کے حساب سے اس کا شمار کیا جائے تو عید کے دن دس بجے سے پہلے پہلے ساڑھے چار کروڑ کی رقم صرف اس فنڈ میں جمع ہو سکتی ہے جس سے اور کچھ نہیں تو خانماں برباد پناہ گزینوں کو چھت تو نصیب ہو سکتی ہے۔ لیکن جب تک دین کی باگ مولوی کے ہاتھ میں ہے، صدقات نکلتے رہیں گے، زکوٰۃ دی جاتی رہے گی۔ قربانیاں ہوتی رہیں گی۔ لوگ حج بھی کرتے رہیں گے اور قوم بدستور بے گھر، بے در، بھوکی، ننگی، اسلام کے ماتھے پہ کلنک کے ٹیکے کا موجب بنی رہے گی۔

کتنا بڑا ہے یہ انتقام جو ہزار برس سے اسلام سے لیا جا رہا ہے اور غور کیجئے کہ اس انتقام کے لئے آلۂ کار کن لوگوں کو بنایا جاتا ہے۔ (۱۹۵۳ء)

۵

معاشرتی اور عائلی مسائل

نکاح کا طریقہ

لاہور سے طلوع اسلام کے ایک بزرگ کرم فرما تحریر فرماتے ہیں کہ ہمارے ملک میں عام طور پہ نکاح کے موقعہ پہ لڑکی کی طرف سے دو وکلاء کے ذریعہ ایجاب وقبول کرایا جاتا ہے۔ حالانکہ خود لڑکی مکان کے دوسرے کمرہ میں موجود ہوتی ہے۔ نکاح کا دوسرا نام اقرار نامہ یا عہد نامہ ہے۔ دنیا کے تمام معاملات میں معاہدہ کے وقت گواہوں کے روبرو فریقین کا موجود ہونا ضروری ہوتا ہے۔ بجز اس کے کہ کسی خاص وجہ سے کوئی ایک فریق خود حاضر نہ ہو سکے۔ اور یہ کام (BY - PROXY) طے پا جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ نکاح کے معاملہ میں فریقین خود کیوں نہ شامل ہوں۔ براہ کرم مطلع فرمائیں کہ قرآنی تعلیم کے مطابق نکاح کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

جواب

قرآن کریم نے نکاح کا کوئی طریقہ تجویز نہیں کیا۔ حتیٰ کہ نکاح خواں کی ضرورت بھی نہیں بتائی۔ نکاح ایک معاشرتی رسم ہے۔ اس میں قرآنی حصہ اتنا ہی ہے کہ عاقل اور بالغ مرد اور عورت ان تمام حقوق و فرائض کو قبول کرتے ہوئے جو اللہ تعالیٰ نے اس باب میں عائد کئے ہیں، ازدواجی زندگی بسر کرنے کا باہمی معاہدہ کریں۔ اس میں گواہوں کی ضرورت کسی بعد میں پیدا ہونے والی پیچیدگی کے لئے احتیاطی تدبیر ہے۔ ہمارا موجودہ طریقۂ نکاح ہمارے اس غیر قرآنی تصور کی یادگار ہے کہ نکاح کے معاملہ میں لڑکی کچھ دخل نہیں دے سکتی۔ یہ فیصلہ اس کے ولی کا ہے اور اسے ولی بشمولیت وکیل طے کرتے ہیں۔

اس میں شبہ نہیں کہ نکاح کے موقعہ پہ لڑکی میں ایک خاص جھجک ہوتی ہے جس کی وجہ سے وہ (اسلامی پردہ ہی میں سہی) عام مجمع میں اس قسم کی موجودگی میں تامل کرے گی لیکن اس کے لئے اس کا عام مجمع میں آنا کیا ضروری ہے۔ اپنے چند قریبی رشتہ داروں کی موجودگی میں لڑکے اور لڑکی کو ایک دوسرے کے بالمواجہہ اس عہد نامہ کا اقرار کر لینا چاہیئے۔ اس کے لئے نہ کسی حاجب و دربان کی ضرورت ہے نہ ولی اور وکیل کی۔ (۱۹۵۶ء)

نکاحِ نابالغاں | ایک محترمہ خاتون راولپنڈی کے ایک صاحب کے توسط سے دریافت فرماتی ہیں:-

آج سے تقریباً انیس سال قبل جبکہ میری عمر تقریباً ایک سال تھی۔ میرے والد . . . . نے مسمی . . . . نابالغ کے ساتھ جس کی عمر اس وقت تقریباً دو سال کی تھی میرا نکاح کر دیا۔ نکاح کی قبولیت . . . . مذکور کے لئے اس کے بڑے بھائی . . . . . نے کی۔

اب جبکہ میری عمر تقریباً بیس سال ہو چکی ہے اور لڑکا تقریباً اکیس سال کا ہے تو ہمارے آپس کے حالات اس قسم کے ہیں کہ میں کسی شکل میں بھی . . . . مذکور کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے لئے تیار نہیں۔ کیونکہ میں اُسے مطلق طور پر پسند نہیں کرتی۔ میری اور اس کی طبیعت اور خیالات بالکل متضاد ہیں۔

چنانچہ میرے والدین نے میری نارضامندی کو دیکھتے ہوئے کوشش کی ہے کہ یہ نکاح فسخ ہو جائے۔ مگر فریق ثانی . . . . ہزار روپے کی رقم بعوض طلاق طلب کرتے ہیں۔ اور یہاں حالت یہ ہے کہ . . . . ہزار تو بجائے خود رہے . . . . روپے کی ادائیگی بھی مشکل ہے۔

مجھے بالغ ہوئے تقریباً سات آٹھ سال گذر گئے ہیں اور میری زندگی برباد ہو رہی ہے۔ میں نے اس سلسلہ میں اپنے چند ایک خیر خواہوں کی معرفت علاقے کے مولویوں سے مسئلہ پوچھا۔ بعض کے نزدیک چونکہ یہ نکاح والد کا کیا ہوا ہے، اور والد اولاد کے لئے شفیق ہوتا ہے۔ لہٰذا یہ نکاح تادمِ حیات بلا طلاق کے فسخ نہیں ہو سکتا۔ چاہے میں ساری عمر گھُٹ گھُٹ کر بالآخر جان دے دوں۔

لیکن کچھ علماء ایسے بھی ہیں جو اس بنا پر اس مجوزہ نکاح کو نکاح ہی تسلیم نہیں کرتے کہ وہ بغیر

میرے ایجاب و قبول اور عدم علمیت میں کیا گیا ہے۔ چنانچہ ان کے فیصلہ کے مطابق میں جب چاہوں، نکاح ثانی کر سکتی ہوں۔

میں نہیں سمجھ سکتی کہ ہر دو میں سے کون سا فیصلہ درست ہے جو احکامِ خداوندی کے مطابق ہو۔ اس صورت میں مجھے مشورہ دیا گیا ہے کہ آپ کی طرف رجوع کروں۔ براہِ کرم آپ میری حالتِ زار پر رحم فرماتے ہوئے میری مشکلات کا حل تجویز فرمائیں، اور عنداللہ ماجور ہوں۔

(یہ امر قابلِ ذکر ہے کہ میرا ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ کے ساتھ سوائے شناسائی کے قطعی طور پر کوئی تعلق یا واسطہ نہیں ہوا۔ نہ ہی میں اس کے گھر گئی۔ اور نہ ہی وہ کبھی ہمارے گھر آیا۔)

جواب

یہ خط ویسے تو صرف ایک خاتون کی طرف سے ہے لیکن ترجمانی کر رہا ہے ان لاکھوں مظلوم عورتوں کی جو بھیڑ بکریوں کی طرح قصابوں کے سپرد کر دی جاتی ہیں۔ اور جہاں پھر ان کی یہ حالت ہو جاتی ہے کہ

نہ تڑپنے کی اجازت ہے نہ فریاد کی ہے
گھُٹ کے مر جاؤں یہ مرضی مرے صیاد کی ہے

قرآن نے نکاح کو ایک معاہدہ قرار دیا ہے۔ جو تراضئ مابین (فریقین کی مرضی) سے طے پاتا ہے۔ وَاَخَذْنَ مِنْكُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا (۴/۲۱) دنیا کے ہر قانون میں معاہدہ (CONTRACT) کے لئے بالغ ہونا شرط ہے۔ قرآن کا اعجاز ملاحظہ فرمایئے کہ اس نے بلوغت کو نکاح سے تعبیر کیا ہے یعنی بلوغت اُسے کہتے ہیں جب لڑکا یا لڑکی نکاح کی عمر کو پہنچ جائے۔ سورۃ النسأ کے شروع میں مذکور ہے کہ جب کوئی بچے یتیم رہ جائیں تو تم ان کے اموال وجائیداد کی حفاظت کرو اور ان کی دیکھ بھال کرتے رہو۔ حَتّٰٓى اِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (۴/۶) یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں۔ اُس وقت اُن کے اموال وجائیداد ان کے سپرد کر دو۔ (بشرطیکہ وہ فاترالعقل نہ ہوں) یہاں یہ حقیقت بلاشک وشبہ سامنے آگئی کہ قرآن کی رُو سے نکاح کی عمر بلوغت کی عمر ہے۔ بلوغت سے پہلے نکاح ہو نہیں سکتا۔ پھر دوسری جگہ اس کی بھی صراحت فرما دی کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک نہیں بن سکتے۔ لَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَرِثُوا النِّسَآءَ كَرْهًا (۴/۱۹) یہ قطعاً جائز نہیں کہ تم عورتوں کے زبردستی مالک بن جاؤ۔ یعنی مرد اس عورت سے شادی کرے جو اُسے پسند ہو۔ (مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ (۴/۳)

لیکن عورت کی مرضی کے خلاف زبردستی اس سے نکاح نہیں کیا جاسکتا۔ ان تصریحات سے واضح ہے کہ بلوغت سے قبل نہ لڑکے کا نکاح نکاح ہے اور نہ لڑکی کا عقدِ عقد۔ اور یہ تلاعب بالدین (دین سے مذاق) ہے اور دُنیا و آخرت میں رسوائی کا موجب۔ نکاح کے لئے ایجاب و قبول ایک لاینفک شرط ہے۔ اور ظاہر ہے کہ کسی بچہ کا ایجاب و قبول کچھ معنی ہی نہیں رکھتا۔ "ایجاب و قبول" کی رسم اب بھی ہمارے ہاں رائج ہے۔ لیکن جس طرح آج کل اس کی مٹی پلید ہو رہی ہے (بالخصوص لڑکیوں کے معاملہ میں) وہ ظاہر ہے۔ ہمارے ہاں نابالغ تو ایک طرف بالغ لڑکیوں سے بھی کون پوچھتا ہے کہ تمہارا نکاح کہاں کیا جائے۔ منوسمرتی (ہندوؤں کی معاشرت) میں لڑکی کے متعلق لکھا ہے کہ اُسے ساری عمر دوسروں کی مرضی کے تابع رہنا ہوگا۔ لڑکی ہے تو ماں باپ کی، بیوی ہے تو مرد کی، بیوہ ہے تو لڑکے کے رحم و کرم پر۔ وہ دُنیا میں کچھ بھی اپنی مرضی سے نہیں کر سکتی۔ یہی کچھ ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔

عام طور پر کہا جاتا ہے کہ حبیب رسول اللہؐ نے حضرت عائشہؓ سے شادی کی تو ان کی عمر چھ برس کی تھی۔ اس لئے بچپن کی شادی جائز ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ تحقیق سے ثابت ہو چکا ہے کہ شادی کے وقت حضرت عائشہ کی عمر سترہ اور انیس برس کے درمیان تھی۔

بہرحال جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے۔ قرآن کی رُو سے بلوغت سے پہلے نکاح ہو نہیں سکتا۔ اور نکاح کے لئے بہرحال فریقین کی رضامندی ضروری ہے۔ لیکن ہماری بدبختی کہ ہمارے ہاں نکاحِ نابالغ نہ کہ مروج ہی ہے، بلکہ اُسے "عین دین" سمجھا جاتا ہے۔ ہمیں یاد پڑتا ہے کہ جب ہندوستان میں سارد ابل پیش ہوا ہے جس کی رُو سے نکاح نابالغاں ناجائز قرار دیئے جانے کی تجویز تھی تو اُس بل کی مخالفت میں سناتنی ہندوؤں کی ہم نوائی میں مسلمان بھی نہایت شد و مد سے شریک ہوئے اور اس انداز سے شریک کہ گویا وہ بل ان کے دین کے کسی بنیادی رکن کو منہدم کر رہا تھا۔ ہمارے اربابِ شریعت کبھی کسی مسئلہ پر متفق نہیں ہوئے۔ مختلف فرقے، مختلف مسائل میں اپنے اپنے مسلک کے پابند رہتے ہیں اور آپس میں ہمیشہ مصروف جدل و پیکار۔ لیکن یہ ہماری سوختہ بختی کی انتہا تھی کہ سارد ابل کی مخالفت میں مسلمانوں کے تمام فرقے متحد اللسان تھے، اور اس باب میں جو وفدِ عظیم وائسرائے کے پاس پہنچا تھا۔ اس میں قریب قریب ہر فرقے کے نمائندے موجود تھے۔ یہ تمام اربابِ شریعت ایک عیسائی حکمران کے حضور یہ کہنے کے لئے جا رہے تھے کہ اس ہندو کے بل کو پاس نہ کیا جائے جو نابالغوں کا

نکاح ناجائز قرار دے رہا ہے۔ ان کا وقدیہ کہنے جارہا تھا اور آسمان ان کی اس حرکت پر روتا تھا اور دُنیا ہنستی تھی۔

بہرحال یہ ہے نکاح نابالغاں سے متعلق قرآن کا فیصلہ۔ ہمیں تفصیلاً معلوم نہیں کہ ملک کا حالیہ قانون اس باب میں کیا کہتا ہے[1] اور ہمارے ہاں جو شادیاں بچپن میں کر دی جاتی ہیں۔ وہ انہیں از خود فسخ کرنے کی اجازت دیتا ہے یا اس کے لئے کسی عدالت کے فیصلہ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس باب میں کسی وکیل سے پوچھ لینا ضروری ہے۔ (۱۹۵۳ء)

تعدّد ازدواج

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں :-

ایک شخص کی بیوی موجود ہے، بچے موجود ہیں۔ گھر میں امن چین سے رہتے ہیں۔ لیکن وہ یکایک اُٹھتے ہیں تو کسی نوجوان لڑکی سے شادی کر لیتے ہیں۔ سارا گھر جہنم بن جاتا ہے۔ جب پوچھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ شریعت نے چار تک کی اجازت دی ہے تو اس پر اعتراض کرنے والا کون ہے۔ چونکہ اس میں "شریعت کی اجازت" کا بھی سوال آجاتا ہے اسی لئے شاید وہ لوگ جو شریعت کے زیادہ پابند ہوتے ہیں۔ دو تین، چار بیویاں دھڑا دھڑ گھر میں لے آتے ہیں۔ کیا اسلام نے واقعی اس کو یوں کھلا چھوڑ دیا ہے کہ جس کا جی چاہے بیویاں کرتا جائے۔

جواب

تعدد ازدواج کا رواج مسلمانوں میں اس عمومیت سے چلا آرہا ہے کہ اسے اسلام کے مسلّمات میں سے سمجھ لیا گیا ہے۔ مخالفین اس پر اعتراض کرتے ہیں تو اور مسلمان اس کی مدافعت کرتے ہیں تو۔ دونوں صورتوں میں اسے ایسا مسلّمہ سمجھ لیا جاتا ہے جس پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی۔

قرآن کریم میں صرف ایک مقام پر ایک سے زیادہ بیوی کا ذکر آتا ہے اور وہ ہے سورۂ نساء کی تیسری آیت۔ اس سورہ کی دوسری آیت میں ہے :-

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰٓى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ

---

[1] :- ہم نے یہ ۱۹۵۳ء سے پہلے لکھا تھا۔ اب عائلی قوانین کی رُو سے نکاح کے لئے بلوغت کی عمر مقرر کر دی گئی ہے۔ (۱۹۶۴ء)

وَلَا تَأْكُلُوْا اَمْوَالَهُمْ اِلٰى اَمْوَالِكُمْ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ۔ (۴/۲)

اور یتیموں کو ان کے مال دے دو۔ اور اچھی چیز کو ردی سے نہ بدلو، اور ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر مت کھاؤ۔ کیونکہ یہ بڑا گناہ ہے۔

یہ ہے ان یتیموں کے بارے میں حکم جو صاحب مال و جائیداد ہوں۔ ان کے متعلق فرمایا کہ ان کے اموال کو بطور امانت رکھو اور ان میں تصرف بیجا نہ کرو۔

اب دوسری صورت یہ ہے کہ قوم میں ایسی حالت پیدا ہو جائے کہ بہت سے یتیم رہ جائیں۔ مثلاً جنگ میں مرد ضائع ہو جائیں اور بیوہ عورتیں اور ان کے ساتھ یتیم بچے رہ جائیں تو قوم کے سامنے ان کی حفاظت اور پرورش کا سوال بہت اہمیت رکھے گا۔ ایسی حالت میں جو قوم ان بیواؤں اور یتیموں کا مناسب انتظام نہیں کرتی وہ اپنے نظامِ معیشت اور معاشرے میں ایسی خرابیوں کی ذمہ دار بن جاتی ہیں جس سے تمام معاشرے میں فساد و دنما ہو جانے کا اندیشہ ہو سکتا ہے۔ اگر نوجوان بیوہ عورتوں کو بلا سرپرستی چھوڑ دیا جائے تو اس سے بہت سی خرابیوں کے جراثیم پھیل جانے کا احتمال ہوتا ہے اگر یتیم بچوں کی کفالت کا مناسب انتظام نہ کیا جائے تو وہ یا تو بھکاری بن جائیں گے یا عادی جرائم پیشہ۔ جب کسی قوم میں بعض ہنگامی حوادث کی وجہ سے ایسے حالات پیدا ہو جائیں تو اس صورتِ حالات کا کیا علاج کیا جائے۔ قرآن نے اس کے متعلق فرمایا ہے کہ :

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۔ (۴/۳)

اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ایسی عورتوں سے جو تمہیں پسند ہوں، نکاح کر لو۔ دو، تین، چار تک۔

سارے قرآن میں یہی ایک آیت ہے جس میں تعدد ازدواج کا ذکر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ یہ اجازت غیر مشروط و غیر مقید نہیں۔ بلکہ اس آیت کی ابتداء ہی ایک شرط سے ہوتی ہے۔ یعنی وَاِنْ خِفْتُمْ (اگر تمہیں اندیشہ ہو) اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى ۔ (کہ یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے) تو تمہیں اس امر کی اجازت ہے کہ چار کی حد تک بیویاں کر لو۔ اور اس طرح معاشرہ کو ان تمام خرابیوں سے بچا لو جوان بیوگان کو

بلاسرپرست اوران کے یتیم بچوں کو بلاوارث چھوڑنے سے پیدا ہوجاتی ہیں۔ ان سے نکاح کرلینے کی شکل میں یہ "محصنات" (قلعہ کے اندر محفوظ ہوگئیں) اوران کے بچے بمنزلہ تمہاری اولاد کے ہوگئے۔ اب وہ اپنے آپ کو "یتیم خانے" کی غیرت کش فضا میں نہیں بلکہ اپنے باپ کے گھر میں خیال کریں گے۔ قرآن نے اس مصیبت کا یہ حل تجویز کیا ہے۔ چونکہ یہ ایک قومی مسئلہ کا حل ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اس امر کا فیصلہ بھی قوم ہی کرسکتی ہے کہ اس قسم کے ہنگامی حالات پیدا ہوگئے ہیں یا نہیں جن میں ایک مرد کی کفالت میں ایک سے زیادہ عورتیں دیدینے کی ضرورت لاحق ہوگئی ہے۔ اگر اسلامی نظام سمجھ لے کہ ایسا وقت آگیا ہے تو وہ اس قسم کا قانون نافذ کردے گا اور اس وقت ایک ملی ضرورت کے پیش نظر تعدد ازواج جائز ہوجائے گا۔ جب وہ ہنگامی ضرورت ختم ہوجائے گی تو پھر وہی عام حالات عود کر آئیں گے۔ جن میں اصولی طور پر ایک ہی بیوی کی اجازت ہوگی۔

اِن ہنگامی حالات میں بھی ہر شخص کو اجازت نہیں ہوگی کہ وہ ایک سے زیادہ بیویاں اپنے نکاح میں لائے۔ یہ اجازت صرف اُسے دی جائے گی جو اس کا اہل ہوگا کہ سب بیویوں کی ضروریاتِ زندگی کا منصفانہ بوجھ اٹھا سکے۔ چنانچہ آیت مذکورہ کا اگلا ٹکڑہ یہ ہے۔ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً۔ (۴/۳) اور اگر تم کو ڈر ہو کہ انصاف نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بیوی رہے گی۔ اب سوال یہ ہے کہ اس عدل سے مفہوم کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ بیوی سے لگاؤ کا تعلق جذبات سے ہے اور یہ مشکل ہے کہ انسان "جذبات کی تقسیم" بھی مساویانہ کرسکے۔ چنانچہ خلاقِ فطرت نے خود اس کی شہادت دی کہ:۔

وَلَن تَسْتَطِيعُوا أَن تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ ۔(۴/۱۲۹)

"تم اپنی طرف سے کتنے ہی خواہش مند کیوں نہ ہو۔ یہ بات تمہاری طاقت سے باہر ہے کہ تم عورتوں میں (ہر معاملہ میں) عدل کرسکو گے۔"

اَب یہاں ایک الجھاؤ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن نے ہنگامی حالات میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت اس شرط کے ساتھ دی ہے کہ تم ان میں عدل کرسکو اور ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ تم عدل کر ہی نہیں سکو گے۔ یہ تو عجیب بات ہوئی۔ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ ایک طرف تو اجازت دی اور دوسری طرف اس اجازت کو ایک ناممکن شرط سے مشروط کردیا۔ بھلا اس اجازت سے فائدہ کیا جو ناممکن العمل ہو؟ لیکن قرآن نے

اِسے خود ہی واضح کر دیا ہے کہ جس عدل سے تعدد ازواج مشروط ہے اس عدل سے مفہوم کیا ہے ؟ اس نے کہا ہے کہ یہ تو تمہارے بس کی بات نہیں کہ تم قلبی لگاؤ میں بھی میزان کے دونوں پلڑے برابر رکھ سکو۔ اس لئے تم سے جس عدل کا تقاضا ہے وہ یہ ہے کہ :۔

فلا تمیلوا کل المیل فتذروھا کالمعلقۃ (۴/۱۲۹)

پس ایسا نہ کرو کہ ایک طرف ایسا جھک جاؤ کہ دوسری "معلقہ" بن کر رہ جائے۔

"معلقہ" اس عورت کو کہتے ہیں کہ جو نہ تو بیوہ ہو، نہ مطلقہ ، نہ اپنا ٹھکانہ کہیں اور کر سکے اور نہ ہی اُس کا خاوند اس کا حق ادا کرے۔ اور اس طرح بین بین لٹکی رہے یعنی جن امور پر تم قدرت رکھتے ہو اُن میں سب کے ساتھ مساویانہ سلوک کرو۔ اور اگر تمہیں ڈر ہو کہ تمہارا طبعی میلان تمہیں اس مساویانہ سلوک پر قادر نہ رکھ سکے گا تو پھر ایک سے زیادہ بیوی کو اپنے نکاح میں مت لاؤ۔

یہ ہیں تعدد ازواج سے متعلقہ قرآنی احکام۔ ان سے واضح ہے کہ :۔

۱۔ اسلام میں تعدد ازواج۔ اصولِ معاشرت نہیں بلکہ ایک استثناء ہے۔

۲۔ یہ استثناء ایسے ہنگامی حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے ہے۔ جن میں عورتوں اور لاوارث یتیموں کی تعداد بڑھ جائے اور وہ عام معاشرے کے لئے ایک مشکل بن جائے۔

۳۔ ایسے حالات میں اسلامی نظام فیصلہ کرے گا کہ ان لوگوں کو جو ایک سے زیادہ خاندانوں کی کفالت کی استطاعت رکھتے ہوں، ایک سے زیادہ بیویوں سے نکاح کرنے کی اجازت دے دی جائے تاکہ معاشرہ کا یہ مشکل مسئلہ حل ہو جائے۔

۴۔ یہ اجازت بھی اس شرط سے مشروط ہوگی کہ (قلبی میلان کے علاوہ) وہ تمام بیویوں سے مساویانہ سلوک کر سکنے کا اہل ہو۔

۵۔ اس صورت میں اس ہنگامی قومی مسئلہ کا حل ہو جائے گا۔

یہ ہے قرآن کی رُو سے ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی اجازت اور وہ ہے مسلمانوں کا عمل۔ اب آپ خود سوچ لیجئے کہ ان کے اس عمل کو جس کی رُو سے جس کا جی چاہے دھڑا دھڑ بیویاں کرتا چلا جائے قرآنی اجازت سے کیا نسبت ہے ؟ ظاہر ہے کہ قرآنی اجازت کو اپنی ہوس رانیوں کی تسکین کے لئے ایک مقدس بہانہ بنا لیا گیا ہے۔ یہاں تک کہ چار کے بعد سب سے بڑی (یعنی پہلی) بیوی کو طلاق دیکر الگ کر دیا جاتا

ہے ، اور اس کی (VACANCY) میں ایک اور دوشیزہ بھرتی کرلی جاتی ہے اور یہ تو محض "بیویوں" کا تذکرہ ہے لونڈیوں پر تو تعداد کی بھی کوئی قید نہیں۔ ایک ایک محل سے ہزاروں کے قافلے برآمد ہو جاتے ہیں اور تماشہ یہ کہ انہیں بھی عین شریعت حقہ کے مطابق قرار دیا جاتا ہے۔ یہ ہے ہمارے دور ملوکیت کی وہ خود ساختہ شریعت جس نے ہمیں کسی کے سامنے منہ دکھانے کے قابل نہیں رکھا اور جسے خیر سے ہمارے "مدعیان شریعت" اب بھی دنیا میں رائج کرنے کے متمنی ہیں۔ تفصیل اس کی کسی دوسرے مقام پر ملے گی۔ جہاں غلاموں اور لونڈیوں کے بارے میں بحث ہوئی ہے۔)

بہرحال اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ قرآن میں ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت صرف سورۂ النساء کی تیسری آیت میں ہے، اور اس آیت کی ابتدا ان الفاظ سے ہوتی ہے کہ:-

وَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى ۔

اگر تمہیں خوف ہو کہ تم یتیموں کے بارے میں انصاف نہ کرسکو گے تو ایک سے زیادہ بیوی کی اجازت ہے۔

جو شخص ایک بیوی کی موجودگی میں اور شادی کرے، اُس سے ذرا پوچھئے کہ اس نے اس شرط کو پورا کرلیا ہے اور پھر ساتھ ہی ذرا جائزہ لیجئے۔ ان "مقدس حرم سراؤں" کا جن میں ہر سال یوں بیویاں بدلتی رہتی ہیں۔ جیسے نئے سال کا کیلنڈر۔ اور پھر سوچئے کہ انہوں نے اپنی کامجوئیوں کے لئے کس طرح "مذہب" کو آڑ بنا رکھا ہے۔

حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

(۱۹۵۳ء)

دُوسری بیوی

ایک محترمہ خاتون لکھتی ہیں کہ تعددِ ازدواج کے سلسلہ میں جو کچھ عام طور پہ لکھا گیا ہے میں نے اس کا مطالعہ کیا ہے۔ مَیں نے عائلی قوانین کو بھی دیکھا ہے۔ طلوعِ اسلام میں اس ضمن میں جو کچھ شائع ہوا ہے وہ بھی میری نظر سے گزرا ہے۔ لیکن مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ایک عورت کے نقطۂ خیال سے اس مسئلہ پر غور کرنے کی زحمت کسی نے نہیں اٹھائی۔ سوال یہ ہے کہ ایک بیوی کی موجودگی میں جب دوسری بیوی لائی جاتی ہے تو پہلی بیوی پر اس سے کیا گزرتی ہے؟ ایک وفا شعار بیوی کے نزدیک دنیا کی سب سے قیمتی متاع اس کا خاوند ہوتا ہے اور وہ اسے برداشت ہی نہیں کر سکتی کہ اس کی اس متاع میں کوئی دوسرا شریک ہو۔ آپ اِسے رقابت کہہ لیجئے، حسد کہہ لیجئے، اس کا نام کچھ ہی رکھ لیجئے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ عورت اُسے قطعاً برداشت نہیں کر سکتی۔ شاید آپ یہ کہہ دیں کہ دوسری بیوی اِسے کس طرح برداشت کر لیتی ہے؟ تو یہ اس لئے کہ وہ یہ سمجھتی ہے کہ مَیں اِس متاع کو اُس پہلی بیوی سے چھین کر اپنے قبضے میں کر رہی ہوں۔ نیز، وہ پہلی بیوی کے سر پر چڑھ کر آتی ہے۔ اِس لئے اس کا جذبۂ برتری بھی اس کے ساتھ شامل ہوتا ہے۔ پہلی بیوی سے اس کی متاع بھی چھنتی ہے اور اس کے جذبۂ برتری کو بھی سخت ٹھیس لگتی ہے۔ اس دوسری بیوی سے اُس وقت پوچھنا چاہیئے جب اُس کے اوپر ایک اور بیوی آجائے۔ اصل یہ ہے کہ دوسری بیوی کے آنے سے پہلی بیوی، اپنے آپ کو دھتکاری ہوئی اور پھینک دی ہوئی شے سمجھنے لگتی ہے اور اس کی پوزیشن بھی ایسی ہی رہ جاتی ہے۔ اس لئے یہ احساس اُسے ایک سیکنڈ کے لئے بھی چین نہیں لینے دیتا۔ وہ اُسے برداشت اس لئے کر لیتی ہے کہ وہ بے حد مجبور اور بے آسرا ہوتی ہے۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ وہ

ایسی صورت میں طلاق لے سکتی ہے۔ لیکن آپ سوچئے تو سہی کہ وہ طلاق لے کر کرے گی کیا اور جائے گی کہاں؟ دوسری بیویاں عام طور پر اس وقت لائی جاتی ہیں جب پہلی بیوی ادھیڑ عمر کی ہو چکی ہو۔ آپ سوچئے کہ اس عمر کی عورت جس کے چار پانچ بچے بھی ہیں، طلاق لے کر کہاں جائے گی؟ اس لئے وہ اس جہنم کی زندگی بسر کرنے پر مجبور ہوتی ہے۔ نیز طلاق کے لئے کوئی معقول وجہ بھی تو ہونی چاہیئے۔ یہ تھوڑا ہے کہ اچھی بھلی بیوی سے یہ کہا جائے کہ یا سوت قبول کرو یا طلاق لو۔

آپ کہتے ہیں کہ نکاح کی بنیادی شرط یہ ہے کہ میاں بیوی میں خیالات اور مزاج کی یکسانی ہو۔ اگر ایسا نہیں ہوگا تو گھر جہنم بن جائے گا۔ میں دریافت کرنا چاہتی ہوں کہ جب ایک مرد، اپنی پہلی بیوی کے باوجود، دوسری بیوی لاتا ہے تو کیا اس پہلی بیوی اور اس کے خاوند میں خیالات اور مزاج کی یکسانی باقی رہ جاتی ہے؟ ظاہر ہے کہ ایسا ناممکن ہے۔ سو اگر نکاح کی بنیادی شرط خیالات وغیرہ کی یکسانی ہے تو اس جوڑے کی باقی زندگی میں یہ شرط کہاں باقی رہ جاتی ہے؟ کیا جس شرط کی ضرورت شادی کی ابتدا میں تھی۔ آگے جا کر اس شرط کی ضرورت باقی نہیں رہتی؟

آپ کہتے ہیں کہ قرآن شریف کا حکم ہے کہ جب تمہیں کسی میاں بیوی میں ناچاقی پیدا ہو جانے کا اندیشہ محسوس ہو تو تم ثالث مقرر کر کے ان میں مصالحت کی کوشش کرو اور اگر دیکھو کہ ان میں مصالحت کا امکان نہیں تو انہیں علیحدہ کر دو۔ سوال یہ ہے کہ جب ایک شخص دوسری بیوی لاتا ہے تو پہلی بیوی کے ساتھ اس کی ناچاقی میں کوئی کسر باقی رہ جاتی ہے؟ ایسی صورت میں، یہ ثالث ان میں مصالحت کی شکل کیا پیدا کر سکتے ہیں۔ بس یہی کہ عورت کو سمجھایا (بلکہ ڈرایا) جائے کہ اپنے خاوند سے لڑائی مول لے کر تم کس طرح گزارہ کر سکتی ہو۔ اور طلاق لے کر کہاں جاؤ گی۔ لہٰذا تمہارے لئے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ تم "آرام و چین" سے اس گھر میں رہو۔ کیا مصالحت اسی کو کہتے ہیں؟ اور کیا اس سے یہ گھر واقعی جنت کا نمونہ بن جائے گا اور اس عورت کی زندگی واقعی آرام و چین سے گزرے گی؟

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ بعض علاقوں میں ایک سے زیادہ بیویوں کا عام طور پر رواج ہوتا ہے۔ وہاں عورتیں اس کا خیال بھی نہیں کرتیں۔ اگر یہی دلیل ہے تو آپ اس کا کیا جواب دیں گے کہ بعض ملکوں میں اس کا رواج ہے کہ ایک عورت کے کئی خاوند ہوتے ہیں، اور مرد اس کا خیال تک بھی نہیں کرتے؟ تو کیا اس رواج سے آپ کے نزدیک یہ چیز درست قرار پا جائے گی؟ یہ بات تو آپ مجھ سے

بہتر جانتے ہیں کہ جو صورت افراد میں پختہ "عادت" کی ہوتی ہے۔ وہی شکل قوموں میں رواج کی ہوتی ہے۔
نہ "عادت" پوری کرنے میں سوچ بچار، عقل و فکر اور جذبات و احساسات کو کوئی دخل ہوتا ہے،
وہ خود بخود سرزد ہوتی جاتی ہے، نہ رواج پر عمل کرنے میں غور و فکر کو کام میں لایا جاتا ہے۔ رواج تو
ایک رَو ہوتی ہے۔ جس میں سب بہے چلے جاتے ہیں۔ لہذا رواج کوئی سند یا دلیل نہیں ہو سکتا۔
میں سمجھتی ہوں کہ اگر پوزیشن یہ اختیار کر لی جائے کہ عورت کی اپنی حیثیت کچھ نہیں اور یہ مرد کی مرضی
کے تابع زندگی بسر کرنے کے لئے پیدا کی گئی ہے۔ اُسے اس کا حق ہی نہیں کہ وہ اپنے احساسات اور
جذبات کی رعایت طلب کرے یا اپنے کچھ حقوق سمجھے تو اس صورت میں مرد خواہ دوسری شادی
کرے اور خواہ اُسے دھکے دے کر نکال باہر کرے۔ یہ سب ٹھیک ہوگا۔ لیکن اگر حقیقت یہ ہے کہ
عورت کی بھی پوزیشن ہے۔ اس کے سینے میں بھی دل ہے اور اس کے دل کا احترام بھی ضروری ہے تو پھر
پہلی بیوی کے سر پہ دوسری بیوی لے آنا، ایک وفا شعار عورت پہ اتنا بڑا ظلم ہے جس کی تلافی
نہیں ہو سکتی۔

یہ میرے دل کی ایک خلش ہے جسے میں نے اس طرح آپ کے سامنے رکھ دیا ہے کیا آپ میرے
اطمینان کی کوئی صورت پیدا کر دیں گے؟ میں آپ کی شکر گذار ہوں گی۔

جواب

عزیزہ بہن! ہمیں عورت کے ان جذبات کا پورا پورا احساس ہے جن کی ترجمانی آپ نے
اس عمدگی سے کی ہے۔ جن حالات میں قرآن کریم نے تعدد ازواج کا ذکر کیا ہے۔ انہیں سمجھ لینے اور
پیش نظر رکھنے کے بعد، اس قسم کے خدشات کا امکان نہیں رہتا۔ یاد رکھئے! جس خدا نے قرآن نازل
کیا ہے وہ مردوں اور عورتوں دونوں کا یکساں خدا ہے۔ اس لئے اس میں (معاذاللہ) ایسی صورت نہیں
ہو سکتی کہ وہ مردوں کی رعایت سے عورتوں کے جذبات کو کچل کر رکھ دے۔ اس نے مردوں اور
عورتوں کو ایک ہی صف میں رکھا ہے۔

ہم لوگ جنگ کے حوادث سے محفوظ رہے ہیں (یہ غنیمت ہے) اس لئے ہمیں اس کا عملی
تجربہ نہیں کہ جنگ میں حالات کس قدر غیر معمولی ہو جاتے ہیں اور ان سے عہدہ برا ہونے کے لئے کس
قسم کی غیر معمولی تدابیر سے کام لینا پڑتا ہے۔ وہ تدابیر ہی غیر معمولی نہیں ہوتیں بلکہ اس دوران میں،

قوم کے جذبات بھی عام جذبات سے ہٹ کر غیر معمولی ہو جاتے ہیں۔ اگر ایک طرف نفرت اور انتقام کے جذبات انتہائی شدت اختیار کر جاتے ہیں تو دوسری طرف ایثار اور ہمدردی کی بھی ایسی ایسی مثالیں سامنے آتی ہیں جو عام حالات میں ناممکنات میں سے تصور کی جائیں۔ یوں نظر آتا ہے جیسے انسانوں کی "فطرت" بدل گئی ہو۔

ایسے ہی تھے وہ حالات جن سے صدر اول کے مسلمانوں (رضی اللہ عنہم) کو مدنی زندگی میں گذرنا پڑا، اور برسوں تک مسلسل اور پیہم گذرنا پڑا۔ مختصر سی جماعت اور پیہم لڑائیاں۔ نتیجہ یہ کہ قوم میں بیوگان اور یتیموں کی کثرت ہو گئی۔ اُدھر مکہ سے مسلمان خواتین نے ہجرت کر کے ادھر آنا شروع کر دیا۔ اس طرح بے شوہر کی عورتیں زیادہ ہو گئیں اور مرد کم رہ گئے۔ یہ عورتیں نہ کفار اور مشرکین کے نکاح میں جا سکتی تھیں نہ اہل کتاب کے۔ یہ مسلمانوں کے گھروں ہی میں جا سکتی تھیں۔ یہ ایک ہنگامی مصیبت تھی جس سے قوم کو دوچار ہونا پڑا۔ یہ بے شوہر کی عورتیں اور بچے قوم کا جزو تھے۔ اس لئے ان کی مصیبت قوم کی مصیبت تھی۔ اس قوم میں جس کی یہ مصیبت تھی مومن مرد اور مومن عورتیں دونوں شامل تھے۔ اس مسئلہ کو حل کرنے کی فکر جس قدر مردوں کو تھی اسی قدر عورتوں کو تھی۔ بلکہ عورتوں کی ہمدردیاں اپنی ان مظلوم اور بے آسرا بہنوں کے ساتھ اور بھی زیادہ ہوں گی۔ اس کا حل اس کے سوا اور کیا ہو سکتا تھا کہ ان عورتوں اور بچوں کو مختلف خاندانوں کا جزو بنا دیا جائے۔ ان حالات میں قرآن کریم نے "ایک بیوی" (MONOGAMY) کے اصول میں، استثناء کی اجازت دی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ ان حالات میں اکثر تو ایسا ہوا ہوگا کہ مومن عورتیں اپنی ان مظلوم بہنوں کو خود اپنے گھروں میں لے آئی ہوں گی اور جن گھروں کی عورتیں اس پر رضامند نہیں ہوئی ہوں گی وہاں ان کے آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا ہوگا۔ اس لئے کہ جب قرآن نے یہ کہہ دیا کہ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً (۴/۳) اگر تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ تم عدل نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی بیوی رکھو ـــــ تو پہلی بیوی کی مرضی اور منشاء کے خلاف دوسری بیوی لانے میں عدل کہاں باقی رہ سکتا ہے؟ دوسری طرف یہ بھی ظاہر ہے کہ ان حالات میں جو عورتیں ان گھروں میں آئی ہوں گی ان کے دل میں بھی ان خیالات کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا جنہیں لے کر آج کل ہمارے ہاں دوسری بیوی آتی ہے۔ نہ ہی پہلی بیوی کے دل میں حسد و رقابت کے جذبات بیدار ہو سکتے ہیں یا احساسِ کمتری پیدا ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم نے دوسری جگہ کہا ہے کہ یہ تو ممکن نہیں کہ تم عورتوں میں

قلبی یکسانیت (کے عدل) کا سلوک کر سکو۔ لیکن ایسا نہ کرنا کہ ایک بیوی کی طرف اتنا جھک جاؤ کہ دوسری (اُدھر) لٹکی رہ جائے (۴/۱۲۹) ہمارے ہاں تو، دوسری بیوی کی صورت میں پہلی بیوی کی یہ حالت ہو جاتی ہے۔ لیکن جن حالات کا اوپر ذکر کیا گیا ہے، ان میں اس تاکید کی ضرورت اس لئے پیش آئی ہو گی کہ مبادا دوسری بیوی کی یہ حالت نہ ہو جائے۔

قرآن کریم نے ان حالات میں "ایک بیوی" کے قانون میں استثناء کی اجازت دی ہے۔ کہہ دیا جا سکتا ہے کہ ہم نے جو یہ کہا ہے کہ ان خصوصی اور ہنگامی حالات میں، نہ پہلی بیوی کے دل میں جذبات حسد و رقابت پیدا ہو سکتے ہیں نہ دوسروں کے دل میں احساسِ برتری پیدا ہو سکتا ہے۔ تو یہ خوش فہمی ہے۔ لیکن یہ خوش فہمی نہیں۔ قرآن کریم، مومنین کی جو صفات بیان کرتا ہے آج ان میں سے ہمیں ایک ایک چیز اجنبھا نظر آتی ہے اور کہنے والا کہہ سکتا ہے کہ اس قسم کا معاشرہ محض شاعر کا خواب (UTOPIA) ہے انسانوں میں اس قسم کی قلبی ماہیئت ہو نہیں سکتی۔ لیکن قرآن کریم حقائق بیان کیا کرتا ہے، شاعروں کے خواب بیان نہیں کیا کرتا۔ ہمیں وہ باتیں اس لئے اجنبھا نظر آتی ہیں کہ ہم اس قلبی تبدیلی سے آشنا نہیں، جو ایمان کی رُو سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً قرآن کریم مومنین کی یہ صفت بتاتا ہے کہ وہ خود تنگی میں گذارہ کرتے ہیں اور دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں۔ ہم یہ سُن کر فوراً کہہ اٹھیں گے (اور اگر ایسا کہنے کی جرأت نہ بھی کر سکے تو دل میں ضرور کہیں گے) کہ ایسا ہونا عملاً ناممکن ہے۔ یہ انسان کی "فطرت" کے خلاف ہے۔ لیکن قرآن، ناممکنات کا مطالبہ نہیں کرتا۔ اس لئے یہ بالکل ممکن ہے یا (مثلاً) وہ کہتا ہے کہ تم ہمیشہ سچی گواہی دو، خواہ وہ خود تمہارے اپنے خلاف ہی کیوں نہ جائے۔ ہمیں یہ بات ناممکن سی دکھائی دیتی ہے ہم باور ہی نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص خود اپنے خلاف بھی گواہی دے سکتا ہے۔ لیکن ایمان، انسان کے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کر سکتا ہے۔ اندریں حالات جب ہم کہتے ہیں کہ ان مومن عورتوں نے، ایسے ہنگامی حالات میں اپنی مظلوم اور بے آسرا بہنوں کی باعزت حفاظت کا سامان خود کیا ہو گا اور اس سے گھروں میں کوئی تلخی پیدا نہیں ہوئی ہو گی۔ تو یہ محض "خوش فہمی" نہیں۔ ایمان ایسا کچھ کر سکتا ہے اگر ایسی صورت نہ ہوتی تو کیا آپ باور کر سکتی ہیں کہ قرآن ایسی شکل پیدا کرنے کی اجازت دے دیتا جس میں بے آسرا عورتوں کی پناہ دہی کے لئے بستے رستے گھروں کو اجاڑ دیا جائے؟ اور یہ ظاہر ہے کہ (خواہ ہنگامی حالات کیسے ہی کیوں نہ نمودار ہو جائیں) جس دوسری شادی میں پہلی بیوی کی دل آزاری ہوتی ہو، اُس

سے گھر کے اُجڑ جانے میں کوئی شُبہ نہیں رہتا۔

ایسی شادی جس میں پہلی بیوی کا دل دُکھے، کیا حیثیت رکھتی ہے، اس کا اندازہ اس واقعہ سے لگ سکتا ہے کہ:

ایک دفعہ حضرت علیؓ نے ایک دوسرا نکاح کرنا چاہا۔ آں حضرت (صلعم) کو معلوم ہوا تو سخت برہم ہوئے۔ آپ نے مسجد میں خطبہ دیا۔ اس میں اپنی ناراضی ظاہر کی "میری لڑکی میرا جگر گوشہ ہے جس سے اُسے دکھ پہنچے گا۔ مجھے بھی اذیت ہوگی۔ چنانچہ حضرت علیؓ اس ارادہ سے باز آگئے اور حضرت فاطمہؓ کی زندگی تک پھر کبھی دوسرا نکاح نہ کیا۔ (سیرۃ النبیؐ۔ مولانا شبلیؒ

جلد دوم۔ صفحہ ۶۲۷۔ بحوالہ بخاری)

امید ہے ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ آپ کے دل کی خلش ہمارے ہاں کے غلط رواج کی پیدا کردہ ہے جس کا ذمہ دار اسلام نہیں۔ قرآن کریم کی تعلیم (اور رسول اللہ کا مندرجہ بالا عمل) حقیقت کی وضاحت کے لئے کافی ہے۔ (۱۹۶۱ء)

مہر اور متعلقاتِ مہر

ایک صاحب صدر کراچی سے لکھتے ہیں:۔

۱۔ کیا نکاح کے لئے مہر ضروری چیز ہے؟

۲۔ کیا اس کی کوئی مقدار قرآن شریف یا حدیث کی رُو سے مقرر ہے؟

۳۔ اگر کوئی مقدار مقرر نہیں ہے تو کس بناء پر مقرر کیا جائے؟

۴۔ کیا یہ لڑکے یا لڑکی کی حیثیت پر مقرر کیا جاتا ہے؟

۵۔ مہر کا مقرر کرنا لڑکی یا لڑکی کے وارثوں کا حق ہے یا اس میں لڑکے یا لڑکے کے وارثوں کا بھی دخل ہے؟

۶۔ عام طور پر دیہات میں ملّا یہ کہتا ہے کہ بتیس روپے چار آنے شرعی مہر ہے۔ یہ کہاں تک درست ہے؟

۷۔ کیا نکاح کے وقت مہر مقرر کرنے کے بعد کم و بیش ہوسکتا ہے اور اس صورت میں نکاح قائم رہتا ہے یا نہیں، جبکہ نکاح (معاہدہ) کی یہ شرط توڑ دی جائے اور مہر مقرر کیا جائے۔ مہربانی فرما کر قرآن شریف کی رُو سے ارشاد فرمائیں۔ اگر کوئی حدیث اس کے موافق یا مخالف ہو تو اس کا بھی ذکر کریں۔

جواب

قرآن کریم کی رُو سے مہر نکاح کے لئے ضروری شرط ہے۔ مہر کا لفظ تو قرآن میں نہیں آیا۔ لیکن اُس نے اس کے لئے دوسرے الفاظ استعمال کئے ہیں مثلاً اجور، صدقۃ اور متاعٌ اور اسے مال سے تعبیر کیا ہے۔ مثلاً سورۂ نسآء میں جہاں نکاح کے احکام آئے ہیں وہاں کہا۔

وَ اُحِلَّ لَكُمْ مَا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ۔ (۴/۲۴)

تمہارے لئے ان عورتوں کے علاوہ (جن کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے) اور عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ بشرطیکہ تم انہیں اپنے مال سے مطلب کرو اور اس سے مقصد نکاح کی پابندیاں ہوں نہ کہ محض شہوت رانی۔

لیکن قرآن کریم کی ایک آیت سے مستنبط ہوتا ہے کہ اگر کسی وجہ سے مہر متعین نہ کیا جا سکا ہو تو اس سے نکاح میں خلل واقع نہیں ہوگا۔ یعنی نکاح بلا تعین مہر بھی ہوسکتا ہے۔ یہ آیت سورۂ بقرہ کی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ:۔

۱۔ جن عورتوں کو تم نے چھوا نہیں اور نہ ہی ان کا مہر مقرر کیا ہے انہیں طلاق دو تو کچھ سامان دے دو۔ (۲/۲۳۶)

۲۔ یہ مہر کسی چیز کا معاوضہ نہیں ہوتا بلکہ ایک تحفہ ہوتا ہے جسے خاوند بیوی کو پیش کرتا ہے۔ چنانچہ اسی سورۂ نسآء کے شروع میں ہے۔

وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً (۴/۴) تم عورتوں کو ان کے مہر تحفۃً ادا کر دو۔ جس طرح شہد کی مکھی بلا کسی معاوضہ کے خیال کے چھتے میں شہد جمع کر دیتی ہے۔

۳- مہر کی کوئی مقدار قرآن نے متعیّن نہیں کی۔ جو رقم بھی لڑکے اور لڑکی کی باہمی رضامندی سے طے پاجائے وُہی مہر ہے۔ لیکن چونکہ یہ رقم وہ ہے جس کا ادا کرنا ضروری ہے اس لئے یہ لامحالہ علیٰ قدرِ وسعت ہی ہو سکتی ہے اور وسعت کے لحاظ سے یہ دولت کا ڈھیر بھی ہو سکتا ہے۔

وَ اٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰھُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡہُ شَیۡئًا۔ (۴/۲۰)

اگر تم نے اِسے ایک ڈھیر بھی دے دیا ہو تو اُس سے وہ بھی واپس نہ لو۔

۴- مہر کی ادائیگی نکاح کے ساتھ ہی ہو جانی چاہیئے۔ لیکن قرآن کی ایک آیت سے یہ مستنبط ہوتا ہے کہ اس میں توقف ہو سکتا ہے۔ لیکن توقف کے معنی یہ ہیں کہ جب بھی عورت مطالبہ کرے اس کو ادا کرنا ہوگا۔ یہ آیت سورۂ بقرہ کی ہے جس میں یہ آیا ہے کہ اگر تم عورتوں کو طلاق دے دو، قبل اس کے تم نے انہیں ہاتھ لگایا ہو تو اس صورت میں مقررہ شدہ مہر کا نصف دینا ہوگا۔ (۲/۲۳۷)

۵- مہر عورت کی ملکیت ہوتا ہے اور کسی کو حق نہیں کہ وہ اُسے اس ملکیت سے محروم کر دے۔ البتہ باہمی رضامندی سے اس میں کمی بیشی بھی کی جا سکتی ہے اور چھوڑا بھی جا سکتا ہے۔ مثلاً سورۂ نساء میں ہے۔

وَ اٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِہِنَّ نِحۡلَۃً ؕ فَاِنۡ طِبۡنَ لَکُمۡ عَنۡ شَیۡءٍ مِّنۡہُ نَفۡسًا فَکُلُوۡہُ ہَنِیۡٓـئًا مَّرِیۡٓـئًا۔ (۴/۴)

اور عورتوں کو اُن کے مہر بطور تحفہ ادا کر دیا کرو۔ لیکن اگر وہ بطیب خاطر اپنی طرف سے تمہیں کچھ چھوڑ دیں تو تم اُسے ہنسی خوشی لے سکتے ہو۔

اسی طرح (۴/۲۴) میں بھی باہمی رضامندی سے کمی بیشی کا ذکر ہے اور (۲/۲۳۷) میں معاف کر دینے کا بھی۔ لیکن یاد رہے کہ یہ کچھ عورت کے دل کی رضامندی سے ہوگا۔ کسی قسم کے جبر و اکراہ سے نہیں ہو سکتا۔

۶- اگر کوئی شاذ صورت ایسی پیش آجائے جس میں مہر مقرر نہ کیا جا سکا ہو تو اُسے بعد میں لڑکے کی وسعت اور معاشرہ کے عام رواج کے مطابق مقرر کر لینا چاہیئے۔ اس کیلئے آیت (۲/۲۳۶) میں تصریح موجود ہے۔

۷۔ جسے آج کل شرعی مہر (یعنی بتیس روپے کہا جاتا ہے) وہ محض ایک رواجی چیز ہے۔ بعض علاقوں میں اسے فاطمی مہر بھی کہا جاتا ہے۔ لیکن تاریخ کی رُو سے یہ بھی غلط ہے۔ تاریخی شہادت کے مطابق حضرت فاطمہؓ کا مہر قریب چار سو اسی درہم کے تھا جو بتیس ۳۲ روپے سے کہیں زیادہ بیٹھتا ہے۔

بہرحال جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، قرآن نے اس کی کوئی مقدار متعین نہیں کی۔ باقی رہے وُہ لوگ جو نہایت فخر سے لاکھ روپے کا مہر باندھتے ہیں اور یہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ کہ اُسے دینا تو ہے ہی نہیں تو وہ لوگ خدائی حکم سے مذاق کرتے ہیں اور رسولؐ اللہ (صلعم) کی ایک حدیث ہے کہ جو شخص مہر باندھے اور نیت یہ رکھے کہ اُسے ادا نہیں کرنا تو وہ زانی ہے۔ (۱۹۵۵ء)

طلاق

سوال

طلاق کے قرآنی احکام کیا ہیں۔ براہ مہربانی تفصیل سے بیان فرمایئے یہ جو ہمارے ہاں طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہہ کر عورت کو میکے بھیج دیا جاتا ہے، اس کی اصلیت کیا ہے۔

جواب

طلاق کے معنی ہیں نکاح کے معاہدہ سے آزادہ ہو جانا۔ چونکہ یہ معاہدہ فریقین (مرد و عورت) نے باہمی رضامندی سے استوار کیا تھا، اس لئے ان میں سے کسی ایک کو اس کا حق نہیں پہنچ سکتا کہ وہ جب جی چاہے اپنی مرضی سے طلاق، طلاق، طلاق کہہ کر اس معاہدہ کو منسوخ کر دے۔ اس میں دوسرے فریق کے حقوق کا تحفظ ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اسے انفرادی فیصلہ پر نہیں چھوڑا۔ بلکہ معاشرہ کو حکم دیا ہے کہ وہ اس معاملہ کو اپنے ہاتھ میں لے۔ (معاشرہ سے مراد وہ نظام ہے جو مابہ النزاع معاملات میں تصفیہ کے لئے قائم ہو۔ اُسے حکومت یا عدالت کہا جاتا ہے) چنانچہ اس باب میں اس نے کہا ہے کہ:-

> اگر تم میاں بیوی میں باہمی اختلاف۔ جھگڑے۔ یا مخالفت و عداوت (شقاق) کا خدشہ محسوس کرو تو ایک ثالثی بورڈ بٹھاؤ جس میں ایک ممبر مرد کے خاندان کا اور ایک عورت کے خاندان کا ہو۔ اس بورڈ کی کوشش یہ ہونی چاہیئے کہ وہ ان دونوں میں مصالحت کرائیں۔ اگر انہوں نے ایسا کیا تو امید ہے کہ میاں بیوی میں موافقت کی صورت پیدا ہو جائے گی۔ ($\frac{۴}{۳۵}$)

اگر ثالثوں کی کوشش سے ان میں موافقت کی صورت نکل آئے تو بہت اچھا ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی کوشش میں ناکام رہیں تو ظاہر ہے کہ انہیں اس معاملہ کی رپورٹ اس نظام یا عدالت کے پاس بھیجنی ہو گی جس نے انہیں ثالث مقرر کیا تھا۔ وہ عدالت اس امر کا فیصلہ کرے گی کہ فریقین میں طلاق ہو جانی چاہیئے اور اس کی شرائط کیا ہوں گی (ان شرائط کا ذکر آگے آتا ہے) چنانچہ سورۂ طلاق کی پہلی آیت یوں ہے۔

يَآيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَآءَ فَطَلِّقُوهُنَّ .... (۶۵/۱)

اے نبی! جب تم عورتوں کو طلاق دو تو ....

یہاں طلاق دینے کا حکم نبی کو دیا گیا ہے اور طَلَّقْتُمُ میں صیغہ جمع کا ہے اس سے ظاہر ہے کہ یہ حکم مسلمانوں کے طلاق کے مقدمات میں فیصلہ دینے کا ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کو حکم تھا کہ وہ اپنے ہر متنازعہ فیہ معاملہ میں حضور کو حاکم بنائیں (۴/۶۵) مرکز میں یہ فیصلے رسول اللہ خود کرتے تھے اور بیرونی مقدمات میں افسران ماتحت جنہیں قرآن نے اولوالامر منکم کہا ہے (۴/۵۹) رسول اللہ کی وفات کے بعد یہی فریضہ حضور کے جانشین (خلفاء) سرانجام دیتے تھے۔ لہذا طلاق کا فیصلہ کرنا عدالت کا کام ہے۔ خاوند یا بیوی کا اپنے اپنے طور پر نہیں۔ عدالت کو یہ فیصلہ اس وقت دینا چاہیئے جب عورت ایام حیض سے فارغ ہو چکی ہو۔ کیونکہ اس وقت سے عدت کا شمار ہو گا (۶۵/۱) اور عدت عام حالات میں تین حیض تک ہوتی ہے (۲/۲۲۸)۔ (عدت کی تفصیل آگے چل کر آئے گی)

جب ان دونوں میں اس طرح طلاق واقع ہو جائے تو عدت کے دوران میں عورت کسی اور مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ البتہ اگر یہ دونوں باہمی صلح کا ارادہ کر لیں تو سابقہ مرد اس مدت کے اندر بھی اس سے نکاح کر سکتا ہے۔ (۲/۲۲۸)۔ آپ نے دیکھا ہو گا کہ عدت کے دوران میں عورت پر تو اس کی پابندی ہے کہ وہ کسی اور مرد سے شادی نہیں کر سکتی۔ لیکن مرد پر اس کی پابندی نہیں۔ وہ چاہے تو طلاق کے دوسرے ہی دن کسی اور عورت سے شادی کر لے۔ یہ ہے مطلب اس آیت کا کہ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ۔ وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ۔ (۲/۲۲۸) کہ اور تمام باتوں میں عورتوں کے حقوق ان کے واجبات کے مطابق ہیں۔ البتہ اس ایک معاملہ میں مردوں کو ایک فوقیت حاصل ہے۔

اگر اس عدت کے دوران میں یہ آپس میں شادی نہ کریں تو عدت کی مدت گذرنے پر اس کا

اعلان کرنا ہوگا اور اس پر دو عادل گواہ بھی رکھنے ہوں گے (۶۵/۲) تاکہ عورت کسی دوسرے مرد سے نکاح کرنے میں آزاد ہو جائے۔ واضح رہے کہ عدت کے بعد بھی یہ میاں بیوی چاہیں تو آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔

اگر اس میاں بیوی نے اس طلاق کے بعد پھر نکاح کر لیا تو یہ پہلی طلاق شمار ہوگی۔ اگر اُن کی اس نئی ازدواجی زندگی میں پھر طلاق تک نوبت پہنچ جائے تو اُسے دوسری طلاق کہا جائے گا۔ اس دوسری طلاق کے بعد بھی انہیں اجازت ہوگی کہ یہ چاہیں تو پھر آپس میں نکاح کر لیں۔ اگر انہوں نے نکاح کر لیا۔ لیکن پھر طلاق تک نوبت پہنچ گئی۔ تو یہ تیسری طلاق ہوگی۔ یعنی ایک میاں بیوی کی ازدواجی زندگی میں تیسری مرتبہ طلاق کی نوبت آگئی۔ اس طلاق کے بعد یہ (نہ عدت کے دوران میں، نہ ہی اس کے بعد) آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ یہ مطلب ہے۔ اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ فَاِمْسَاكٌ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌ بِاِحْسَانٍ (۲/۲۲۹) طلاق دو مرتبہ کی ایسی ہے جس کے بعد تم قاعدے کے مطابق عورت کو (نکاح میں) روک سکتے ہو۔ یا حسن کارانہ انداز سے اُسے رخصت کر سکتے ہو۔ لیکن تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد اس کی اجازت نہیں ہوگی۔

البتہ اگر تیسری مرتبہ کی طلاق کے بعد یہ عورت کسی اور مرد سے شادی کر لے اور ان میں بھی طلاق کی نوبت آجائے تو پھر یہ پہلے میاں بیوی آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ (۲/۲۳۰)

یاد رہے کہ اگر مرد طلاق کے بعد اپنی بیوی سے دوبارہ نکاح کرنا چاہے تو دل میں یہ نیت نہ رکھے کہ اس طرح اس عورت کو پھانس کر اُسے تنگ کروں گا۔ (۲/۲۳۰) اگر یہ عورت اپنے سابقہ خاوند سے نکاح کرنا چاہے تو دوسروں کو کبھی نہیں چاہیئے کہ اُسے اس سے روکیں۔ (۲/۲۳۲) اسے اس کی آزادی ہے کہ وہ اپنی رضامندی سے چاہے تو پھر سے اُس مرد سے نکاح کر لے۔

یہاں تک کشیدگئ تعلقات کی اس قسم کا ذکر آیا ہے جس میں شکایت خاوند کو پیدا ہو۔ اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ جب شکایت بیوی کو پیدا ہو تو پھر کیا صورت پیدا ہوگی۔ سورۂ نسآء میں ہے کہ اگر کسی عورت کو اپنے خاوند کی طرف سے سرکشی یا بےتعلقی کا خدشہ ہو تو اس کے لئے پہلا قدم باہمی مصالحت کا ہونا چاہیئے۔ (۴/۱۲۸) ظاہر ہے کہ مصالحت کے لئے وہی طریق اختیار کرنا ہوگا جو بیوی کی طرف سے سرکشی کی صورت میں بیان کیا گیا ہے۔ (۴/۳۴) یعنی مصالحتی بورڈ کا تقرر۔

اگر ثالثوں کی یہ کوشش ناکام رہے تو پھر ان دونوں میں مفارقت (طلاق) کی شکل پیدا ہو جائے گی۔ (۴/۱۳۰) جس کی تفصیلات پہلے گزر چکی ہیں اگر عدالت یہ دیکھے کہ مرد تو نباہ چاہتا ہے لیکن عورت کی طرف سے زیادتی ہو رہی ہے تو اس صورت میں عورت کو کچھ ہرجانہ ادا کرنا ہوگا۔ اس کی تصریح (۲/۲۲۹) میں کی گئی ہے۔

پہلے لکھا جا چکا ہے کہ مہر اس مال کا نام ہے جسے مرد، بغیر کسی معاوضہ کے خیال کئے عورت کو تحفۃً دیتا ہے۔ اسے عام طور پر نکاح کے وقت ہی ادا ہو جانا چاہیئے۔ لیکن اگر عورت چاہے تو اس کی وصولی کو ملتوی بھی کر سکتی ہے۔ طلاق کے ساتھ چونکہ ازدواجی تعلقات منقطع ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اگر مہر پہلے ادا نہ کیا گیا ہو تو اس کا فیصلہ اس مقام پر ہونا ضروری ہے۔ اس کے لئے قرآن کا حکم یہ ہے کہ،

ا۔ اگر عورت نباہ کرنا چاہتی ہے لیکن مرد طلاق پر مُصر ہے تو عورت کے مہر میں سے کچھ واپس نہیں لیا جا سکتا۔ (۴/۲۰)

ب۔ اگر طلاق عورت کو ہاتھ لگانے سے قبل دی گئی ہے تو مقررہ مہر کا نصف دینا ہوگا۔ یہ الگ بات ہے کہ عورت یا اس کا مختار کار اس میں سے کچھ چھوڑ دے، مرد پورا مہر ہی دے دے۔ (دیکھئے۔ ۲/۲۳۷)

ج۔ اگر طلاق "عورت کو ہاتھ لگانے سے قبل" دی گئی ہے اور (کسی طرح) مہر مقرر نہیں ہو سکا تھا تو مرد کی وسعت کے مطابق مہر دلا دینا ہوگا۔ (۲/۲۳۶)

د۔ اگر مرد اس بناء پر طلاق دینا چاہے کہ عورت کسی بے حیائی کے کام کی مرتکب ہوئی ہے تو مہر کا کچھ حصہ روکا جا سکتا ہے (۴/۱۹) ظاہر ہے کہ یہ فیصلہ عدالت کے کرنے کا ہوگا۔

ہ۔ (جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے) اگر مرد نباہ کرنا چاہتا ہے لیکن عورت علیحدگی پر مُصر ہے تو اُسے اپنے مہر میں سے کچھ رقم بطور ہرجانہ دینی ہوگی۔ (۲/۲۲۹)

عِدّت

سوال

عورت کے لئے عدّت کیا ہوتی ہے۔ اس کی بابت قرآنی احکام سے مطلع فرمائیں۔

جواب

عِدّت اس مدّت کا نام ہے جس میں مطلقہ عورت یا بیوہ شادی نہیں کرسکتی۔ (جیسا کہ پہلے لکھا جاچکا ہے) پہلی اور دوسری مرتبہ طلاق کی صورت میں عورت اپنے پہلے خاوند سے عدّت کے اندر بھی شادی کرسکتی ہے۔ یہ میعاد حسب ذیل ہے۔

۱۔ مطلقہ عورت کی عدّت تین حیض (ثَلٰثَۃَ قُرُوْءٍ ۲/۲۲۸) ہے۔ یہی وجہ ہے کہ طلاق کا فیصلہ اس وقت کرنا چاہیئے، جب عورت حیض سے فارغ ہوچکی ہو تاکہ عِدّت کے شمار میں دِقت نہ ہو۔ (دیکھئے ۶۵/۱)

ب۔ جو عورتیں اتنی سن رسیدہ ہوچکی ہوں کہ وہ حیض کی طرف سے نا امید ہوں یا جنہیں کسی بیماری وغیرہ کی وجہ سے حیض نہ آتا ہو، اُن کی عدّت (تین حیض کے بجائے) تین مہینے ہوگی۔ (۶۵/۴)

ج۔ جو عورت حمل سے ہو اس کی عدت وضع حمل (بچے کی پیدائش) تک ہے (۶۵/۴)۔ انہیں چاہیئے کہ وہ طلاق کے وقت یہ بتادیں کہ وہ حمل سے ہیں۔ (۲/۲۲۸)

د۔ جس عورت کو "ہاتھ لگانے سے قبل" طلاق دی گئی اس کے لئے کوئی مدّت نہیں (۳۳/۴۹)۔

۲۔ بیوہ عورت کی عدّت چار مہینے اور دس دن کی ہے (۲/۲۳۴) اگرچہ بیوہ عورت کے لئے حمل کی صورت میں الگ حکم نہیں۔ لیکن چونکہ مطلقہ کے لئے عدت وضع حمل تک ہے (۶۵/۴) اس لئے

اس سے مستنبط کیا جا سکتا ہے کہ بیوہ عورت کے لئے جو حاملہ ہو، عدت وضع حمل تک ہوگی۔

۳۔ عدت کے دوران میں مطلقہ عورت کے رہنے سہنے اور خورد و نوش وغیرہ کی ذمہ داری مرد پہ ہوگی اور اس کا معیار وہی ہوگا جو ازدواجی حالت میں تھا، (۲/۲۴۱ ، ۶۵/۱ ، ۶۵/۶-۷) لیکن اگر یہ کسی بے حیائی کے کام کی مرتکب ہو تو پھر اس کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ (۶۵)

۴۔ بیوہ عورت کے لئے ایک سال تک کی رہائش اور خورد و نوش کا انتظام ضروری ہے۔ جس کے لئے چاہیئے کہ مرد وصیت کر جائے (۲/۲۴۰) اگر وہ اس سے پہلے اپنی مرضی سے دوسری جگہ چلی جائے اور اپنا کچھ اور انتظام کر لے تو پھر یہ ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔ (۲/۲۴۰)

۵۔ عدت کے دوران میں نکاح تو نہیں کیا جا سکتا لیکن نکاح کے لئے سلسلہ جنبانی کی ممانعت نہیں۔ (۲/۲۳۵)

رضاعت

(دُودھ پلانا)

سوال

بچے کو کتنی مدت تک دودھ پلانا ضروری ہے۔ طلاق وغیرہ کی صورت میں بچے کس کے پاس رہنے چاہئیں؟

جواب

قرآن نے اس کے متعلق حکم نہیں دیا کہ بچوں کو اتنی مدت تک ضرور دودھ پلایا جائے۔ اس کا فیصلہ حالات کے مطابق کیا جائے گا۔ اس نے سورۂ احقاف میں ضمنی طور پر کہا ہے کہ بچے کی ماں پہلے اسے اپنے پیٹ میں رکھتی ہے اور پھر دُودھ پلاتی ہے۔ جس میں اڑھائی سال کا عرصہ لگ جاتا ہے (۴۶/۱۵) لیکن بعض صورتیں ایسی بھی پیدا ہو جاتی ہیں جن میں دودھ کی مدت کا تعلق قانونی طور پر ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً ایک شخص اپنی بیوی کو طلاق دیتا ہے اور اس کی گود میں شیر خوار بچہ ہے۔ قرآن کی رُو سے اس بچے کی پرورش کی ذمہ داری باپ پر عائد ہوتی ہے (اگر اس کا باپ مر جائے تو اس کے وارثوں پر (۲/۲۳۳) وہ کہتا ہے کہ اگر وہ باہمی رضامندی سے چاہیں کہ بچے کی ماں ہی اسے دُودھ پلائے تو اُسے اس کا معاوضہ دینا ہوگا اور یہ مُدت دو سال تک کی ہو سکتی ہے۔ (۲/۲۳۳) لیکن اگر وہ باہمی رضامندی سے اس سے قبل ہی دُودھ چھڑا دینا چاہیں تو ایسا بھی کر سکتے ہیں۔ (۲/۲۳۳) اور ایسا بھی کہ وہ اس کی ماں کے بجائے کسی اور سے دُودھ پلانے کا انتظام کرلے (۲/۲۳۳) نیز (۳۱/۱۴، ۶۵/۶)۔ (قانونی ضرورت کی مثال یوں سمجھئے کہ ایک شخص مر جائے اور اس کی بیوہ بچے کو دودھ پلاتی رہے تو وہ اس کے وارثوں سے اس کا

معاوضہ بذریعہ عدالت لے سکتی ہے لیکن صرف بچے کی دو سال کی عمر تک۔ اس سے زیادہ نہیں)۔

باقی رہا یہ کہ میاں بیوی کی علیحدگی کی صورت میں بچے کس کے پاس رہنے چاہئیں۔ اس کی بابت قرآن نے کوئی حکم نہیں دیا۔ اس کا فیصلہ حالات کے مطابق ہر انفرادی کیس میں عدالت دے گی۔ جس میں اصول یہ پیشِ نظر رکھا جائے گا کہ بچوں کی صحیح پرورش اور تعلیم کس کے پاس ہو سکتی ہے۔ نیز اس میں ماں باپ کے جذبات کا بھی لحاظ رکھنا ہو گا۔ کیونکہ میاں بیوی کے تعلقات کے منقطع ہو جانے سے اولاد کے ساتھ قلبی لگاؤ تو منقطع نہیں ہو جاتا۔

عورت سے غیر فطری مجامعت

ایک صاحب پوچھتے ہیں کہ یہ کہاں تک درست ہے کہ بعض محدثین کے نزدیک عورت سے غیر فطری مجامعت بھی جائز ہے؟ کیا کسی جگہ اس کی تصریح مل سکتی ہے، یا یہ لغو بات ہے۔

یہ بات لغو نہیں، صحیح ہے۔ بخاری کی ایک حدیث ہے جس کی شرح بیان کرتے ہوئے علامہ بدرالدین عینی اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ بہتر ہے کہ وہ بحث بجنسہٖ نقل کر دی جائے۔ بخاری میں ہے:-

باب قولہ تعالیٰ نساؤکم حرث لکم فاتوا حرثکم انی شئتم وقدموا لانفسکم۔ الآیۃ[1]

حدثنا اسحٰق قال اخبرنا النضر بن شمیل قال اخبرنا ابن عون عن نافع قال کان ابن عمر اذا قرأ القرآن لم یتکلم حتی یفرغ منہ فاخذت علیہ یوما فقرأ سورۃ البقرۃ حتی انتھی الی مکان قال تدری فیما انزلت قلت لا قال نزلت فی کذا وکذا ثم مضی وعن عبد الصمد قال حدثنی ابی قال حدثنی ایوب عن نافع عن ابن فاتوا حرثکم انی شئتم قال یاتیھا فی ...... رواہ محمد بن یحیٰی ابن سعید عن ابیہ عن عبید اللہ عن نافع عن ابن عمر :-

(بخاری کتاب التفسیر ج ۲ ص ۶۴۹ مطبوعہ مجتبائی)

---

[1] اس آیت کا ترجمہ عام طور پر یہ کیا جاتا ہے کہ "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں پس تم اپنی کھیتی میں جس طرح چاہے آؤ" لیکن اس کا صحیح ترجمہ یہ ہے کہ "تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی ہیں تم اپنی کھیتی میں جب چاہو آؤ۔"

حق تعالےٰ کے اس قول کا باب کہ ـــــ نسآءُکم حرث لکم فأتوا حرثکم انی شئتم وقدموا لانفسکم۔ الآیۃ

ہم سے اسحٰق نے بیان کیا کہ ہمیں نضر بن شمیل نے خبر دی کہ ہمیں ابن عون نے نافع سے خبر دی کہ ابن عمرؓ جب قرآن پڑھا کرتے تھے تو فارغ ہونے تک بولتے نہیں تھے۔ میں ایک روز قرآن کریم ہاتھ میں لے کر ان کے سامنے بیٹھا اور انہوں نے سورۂ بقرہ پڑھی حتیٰ کہ کسی مقام تک پہنچے اور پوچھنے لگے "جانتے بھی ہو کس بارہ میں نازل ہوئی تھی؟" میں نے جواب دیا کہ نہیں تو ابن عمرؓ نے فرمایا کہ فلاں فلاں بارہ میں نازل ہوئی تھی۔ پھر آگے چل دیئے اور عبدالصمد سے مروی ہے کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا کہ مجھ سے ایوب (اسختیانی) نے بیان کیا کہ نافع سے انہوں نے ابن عمرؓ سے کہ فأتوا حرثکم انی شئتم کی تفسیر ابن عمرؓ نے بیان کی کہ اپنی بیوی سے ..... میں جماع کرے۔ اس کو محمد بن یحییٰ ابن سعید نے بھی بیان کیا ہے۔ اپنے باپ سے انہوں نے نافع سے انہوں نے ابن عمرؓ سے۔

آپ نے دیکھا ہے کہ حدیث کے متن اور ترجمہ دونوں میں اُس مقام پر (نقطے) دیئے گئے ہیں جہاں سے اصل بات واضح ہونی تھی۔ بخاری میں اس مقام پر جگہ خالی چھوٹی ہوئی ہے اور یہیں سے اس بحث کا آغاز ہوتا ہے۔ چنانچہ اس باب میں علامہ بدرالدین عینی شرح بخاری میں لکھتے ہیں:۔

یہاں اصل کتاب (بخاری) میں خالی جگہ چھوٹی ہوئی ہے۔ یعنی فی کے بعد۔ حمیدی نے الجمع بین الصحیحین میں کہا ہے فی قبلھا یعنی اپنی بیوی کی شرمگاہ میں۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اس روایت کو ابن جریر نے اپنی تفسیر میں ابوقلابۃ الرقاشی سے انہوں نے عبدالصمد بن عبدالوارث سے نقل کیا ہے کہ مجھ سے میرے باپ نے بیان کیا اور وہاں انہوں نے یاتیھا فی الدبر (اپنی بیوی سے دُبر میں جماع کرے) کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ (عمدۃ القاری)

اسی ضمن میں حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں:۔

ابن العربی نے سراج المریدین میں نقل کیا ہے کہ بخاری نے اس حدیث کو تفسیر میں نقل کیا

ہے اور کہا ہے یا تیھا ق........ اور خالی جگہ چھوڑ دی ہے اور یہ مسئلہ مشہور ہے۔ اس موضوع پر محمد بن شعبان نے ایک پوری کتاب تصنیف کی ہے اور محمد بن سحنون نے ایک جزو لکھا ہے اور ثابت کیا ہے کہ ابن عمرؓ کی حدیث عورت سے دُبر میں مجامعت کرنے ہی کے بارہ میں ہے۔ مازری نے کہا ہے کہ اس مسئلہ میں علماء کے اندر اختلاف ہے جو لوگ اس کے حلال ہونے کے قائل ہیں۔ انہوں نے اسی آیت سے استدلال کیا ہے اور جو لوگ اس کے حرام ہونے کے قائل ہیں۔ وہ یہ کہہ کر اس سے الگ ہو گئے ہیں کہ یہ آیت اس سبب کے بارہ میں نازل ہوئی تھی۔ جو جابر کی حدیث میں آ رہا ہے۔ یعنی یہودیوں پر رد کرنے کے لئے جیسا کہ دوسری حدیث میں آ رہا ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ عموم جب کسی خاص سبب پر وارد ہوتا ہے تو بعض اصولیوں کے نزدیک وہ اسی پر محصور رہتا ہے۔ اگرچہ اکثر اصولیوں کے نزدیک عموم لفظ کا اعتبار ہوا کرتا ہے نہ کہ خصوص سبب کا۔ یہ اصول اس بات کو مقتضی ہے کہ یہ آیت جواز میں حجت ہو۔ لیکن بہت سی حدیثیں اس کی ممانعت کے بارہ میں وارد ہوئی ہیں۔ لہذا وہ حدیثیں آیت کے عموم کے لئے مختص ہو جائیں گی۔ اگرچہ عموم آیت کی کسی خبر واحد سے تخصیص کرنے کے بارہ میں بھی علماء کے اندر اختلاف ہے اور آئمہ حدیث میں سے ایک بڑی جماعت اس طرف گئی ہے جیسے امام بخاریؒ، ذہلیؒ، بزارؒ، نسائیؒ اور ابو علی نیشا پوری وغیرہ کہ اس بارہ میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہوتی۔ (فتح الباری)

یہاں سے آپ نے دیکھ لیا کہ حافظ ابن حجرؒ کے نزدیک اس مسئلہ میں علماء میں اختلاف ہے۔ بعض اس کو حرام قرار دیتے ہیں اور بعض اس کے حلال ہونے کے قائل ہیں۔ اب علامہ عینی کی مزید تشریح ملاحظہ کیجئے۔

ابن العربی نے اپنی کتاب احکام القرآن میں کہا ہے کہ اس کو بہت بڑی جماعت نے جائز کہا ہے۔ ان سب اقوال کو ابن شعبانؒ نے اپنی کتاب "جماع النسواں" میں جمع کر دیا ہے اور اس کے جواز کو صحابہ اور تابعین کی ایک بڑی جماعت کی طرف

منسوب کیا ہے اور بہت سی روایتوں سے امام مالکؒ کی طرف بھی نسبت کی ہے۔
اور ابوبکر الجصاص نے اپنی کتاب احکام القرآن میں کہا ہے کہ امام مالکؒ سے اس
کی اباحت مشہور ہے اور امام مالکؒ کے اصحاب اس کا انکار محض اس کی
شناعت اور قبح کی وجہ سے کر دیتے ہیں۔ مگر امام مالکؒ کی یہ بات اس قدر مشہور
ہے کہ ان لوگوں کے انکار سے اس کی نفی نہیں ہو سکتی۔

محمد بن سعد نے ابوسلیمان جوزجانی سے نقل کیا ہے کہ میں امام مالکؒ بن انس کی
خدمت میں حاضر تھا۔ ان سے مجامعت فی الدبر کے بارہ میں کہا گیا تو انہوں نے اپنا
ہاتھ اپنے سر پہ مارا اور فرمایا کہ ابھی ابھی تو میں اس سے غسل کر کے آرہا ہوں۔ ایسے
ابن القاسم نے ان سے نقل کیا ہے کہ امام مالکؒ فرماتے ہیں۔ میں نے کسی آدمی کو
نہیں پایا جس کی میں دین کے بارہ میں پیروی اور اقتدار کر سکوں اور وہ اس کے
حلال ہونے میں شک کرتا ہو۔ یعنی عورت سے اس کے دُبر میں جماع کرنے کے
بارہ میں۔ اس کے بعد امام مالکؒ نے یہ آیت پڑھی۔ نساءکم حرث لکم فأتوا
حرثکم انّٰی شئتم۔ امام مالکؒ نے فرمایا کہ اس سے بڑھ کر اور کون سی چیز
واضح ہوگی اور میں ذرا بھی شک نہیں کرتا۔ رہا امام شافعیؒ کا مذہب اس بارہ
میں تو امام طحاویؒ نے فرمایا ہے۔ ہم سے محمد بن الحکم نے بیان کیا کہ انہوں نے امام
شافعیؒ کو کہتے ہوئے سُنا ہے کہ وہ فرماتے تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
سے اس کے حلال یا حرام ہونے کے بارہ میں کوئی حدیث ثابت نہیں ہے اور
قیاس یہ ہے کہ وہ حلال ہے۔ (عینی)

یعنی امام مالکؒ تو یقینی طور پہ اس کے حلال ہونے کے قائل اور اس پر کاربند بھی تھے اور امام شافعیؒ
کا قیاس تھا کہ یہ حلال ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجرؒ نے اس باب میں امام شافعیؒ کا ایک مناظرہ بھی نقل
کیا ہے جو انہوں نے امام محمدؒ (شاگرد امام اعظمؒ) سے کیا تھا۔ وہ لکھتے ہیں۔

امام حاکم نے مناقب شافعیؒ میں ابن الحکم کے طریق سے نقل کیا ہے کہ امام شافعیؒ کا
ایک مناظرہ مشہور ہے جو اسی مسئلہ کے بارہ میں امام شافعیؒ اور امام محمد بن الحسن

کے درمیان ہوا۔ ابن الحسنؒ نے امام شافعیؒ کے خلاف اس امر سے استدلال کیا کہ کھیتی تو فرج ہی میں ہو سکتی ہے تو امام شافعیؒ نے جواب میں کہا کہ اس کا مطلب یہ ہوا کہ فرج کے علاوہ باقی سب کچھ حرام ہے۔ امام محمدؒ بن الحسنؒ نے اس کو مان لیا کہ ہاں فرج کے علاوہ دوسرے مواقع حرام ہیں۔ اس پر امام شافعیؒ نے پوچھا مجھے بتاؤ اگر کوئی شخص اپنی بیوی کی پنڈلیوں کے درمیان یا اس کی کہنیوں وغیرہ کے درمیان مجامعت کرے تو کیا یہاں کھیتی ہوگی؟ امام محمدؒ نے کہا کہ نہیں ان جگہوں پر کھیتی نہیں ہوگی۔ امام شافعیؒ نے پوچھا کہ کیا یہ حرام ہوگا؟ امام محمدؒ نے کہا کہ نہیں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ پھر تم جس بات کے خود بھی قائل نہیں اس سے کس طرح استدلال کرتے ہو۔ امام حکم نے کہا ہے کہ شاید امام شافعیؒ اپنے قولِ قدیم میں اس کے حلال ہونے کے قائل ہوں۔ کیونکہ اپنے قولِ جدید میں اس کے حرام ہونے کی انہوں نے تصریح کی ہے۔

(فتح الباری)

یہ ہے وہ بحث جو اس باب میں شروحِ بخاری میں وارد ہوئی ہے اور جسے ہم نے بادلِ ناخواستہ نقل کیا ہے۔ اس لئے کہ اگر یہ باتیں سچ مچ ان بزرگوں کی ہیں جن کی طرف انہیں منسوب کیا گیا ہے تو دنیا اُن کے متعلق کیا کہے گی اور اگر یہ چیزیں ان کی طرف غلط منسوب کی گئی ہیں تو ان کتابوں کو کیا کیا جائے جن میں یہ مذکور چلی آتی ہیں اور جن کے متعلق ہمارے "علمائے کرام" کا ارشاد ہے کہ ان کا علم حاصل کئے بغیر دین سمجھ میں نہیں آسکتا۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن کو چھوڑ دینے سے قوم کہاں جا پہنچی ہے۔ سچ کہا ہے کہنے والے نے کہ

حقیقت خرافات میں کھو گئی! (۱۹۵۳ء)

عورتیں اور اکتسابِ رزق

سوال

کیا قرآن کی رُو سے عورتیں اکتسابِ رزق کر سکتی ہیں۔ یعنی (EARN) کر سکتی ہیں۔ یا یہ کام صرف

مردوں کے لئے مخصوص ہے؟

جواب

کیوں نہیں کر سکتیں۔ قرآن کریم کا فیصلہ اس باب میں واضح ہے۔ سورۂ نساء میں ہے۔ لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوا ۖ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۚ (۴/۳۲)۔ مرد جو کچھ کمائیں وہ ان کا حصہ ہے اور عورتیں جو کچھ کمائیں وہ اُن کا حصہ۔ علاوہ بریں، جو کچھ عورت کو ورثہ میں ملے، وہ اس کی ذاتی ملکیت ہوتا ہے۔ اس باب میں قرآن کریم کا ارشاد ہے:۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ ۚ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ○ (۴/۷)

مردوں کے لئے اس میں سے حصہ ہے جو ان کے والدین اور اقربا چھوڑیں اور عورتوں کے لئے اس میں سے حصہ ہے جو اُن کے والدین اور اقربا چھوڑیں۔ خواہ تھوڑا ہو یا بہت۔ یہ حصہ مقرر ہے۔

اسی طرح مہر بھی عورت کی ذاتی ملکیت ہوتا ہے۔

اصل یہ ہے کہ میاں بیوی کے باہمی تعاون اور رفاقت کی بات اور ہے ورنہ قرآن کریم عورت کو مرد کا معاشی محتاج نہیں بنانا چاہتا۔ (۱۹۶۱ء)

عورتوں کا حقِ مشاورت

سوال

اسلامی حکومت باہمی مشورے سے قائم ہوگی۔ لیکن اگر یہ مشورہ مردوں تک ہی محدود ہو تو ملک کی آدھی آبادی حقِ مشاورت سے محروم ہو جائے گی۔ کیا اسلام میں جمہوریت کا یہی تصور ہے؟

جواب

اسلامی حکومت میں عورتیں حقِ مشاورت سے محروم نہیں قرار دی جاسکتیں۔ قرآن کریم نے جہاں کہا ہے

کہ وَ اَمْرُھُمْ شُوْرٰی بَیْنَھُمْ (۴۲/۳۹) اُن کی حکومت مشاورت پر مبنی ہوگی۔ تو وہاں اس مشاورت کو مردوں تک ہی محدود نہیں رکھا گیا۔ وہاں تمام مومنوں کا ذکر ہے جن میں مرد اور عورت سب شامل ہوتے ہیں۔ اسی طرح جہاں قرآن نے تمکّن فی الارض۔ یا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فرائض کا ذکر کیا ہے، وہاں بھی یہ تخصیص نہیں کی کہ یہ جماعت مومنین میں سے صرف مردوں کا حق ہے۔ عورت کو اس میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ (۲۲/۴۱ — ۹/۷۱) (۱۹۶۳ء)

ماں باپ کی اِطاعت

ایک نوجوان رقمطراز ہے :-

, میرے ماں باپ نے میری شادی اپنی مرضی کے مطابق کی۔ اب وہ میری بیوی سے ناراض ہیں اور مجھے مجبور کرتے ہیں کہ میں طلاق دے دوں۔ یا اس سے ناروا سلوک کروں حالانکہ میری بیوی سے میرے تعلقات بہت خوشگوار ہیں۔ میں اس پر آمادہ نہیں ہوتا تو وہ مجھے کہتے ہیں کہ تو ماں باپ کا فرمانبردار نہیں، اس لیے تو خدا کے عذاب میں ماخوذ ہو جائے گا۔ براہِ کرم مطلع فرمایئے کہ قرآن کی رُو سے اس باب میں کیا علم ہے۔

جواب

انسان کی حالت یہ ہے کہ خود ہی پتھر کے نیچے اپنا ہاتھ دے لیتا ہے اور پھر خود ہی چلّاتا ہے۔ قرآن نے ماں باپ کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا ہے۔ وہ کہتا ہے انہوں نے تمہاری اس وقت پرورش کی تھی۔ جب تم دوسروں کے محتاج تھے۔ اب یہ کبرسنی کی وجہ سے تمہارے محتاج ہیں۔ اس لئے تم ان کی پرورش کرو۔ بڑھاپے کی وجہ سے ان کا مزاج چڑچڑا ہو جاتا ہے۔ لیکن تم انہیں جھڑکو نہیں بلکہ ان سے نرمی سے پیش آؤ۔ بس یہ ہے ماں باپ کے متعلق قرآن کا ارشاد۔ کیا آپ سمجھ سکتے ہیں کہ قرآن جو ہر نئی نسل کو آزاد پیدا کرتا ہے اور انہیں اختیار دیتا ہے کہ وہ اپنے لئے اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق آپ راہیں تلاش کرے اور اپنے مقدرات کے ستارے کو ترلشے، وہ ابھرنے اور بڑھنے والی نسلوں کو ان کے فیصلوں کا متبع قرار دے گا جن کا زمانہ بدل چکا ہے؟ قرآن جو انسانیت کو حریتِ فکر و عمل کا درس دینے کے لئے آیا ہے۔ انسان کو کبھی گذرے ہوئے زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ وابستہ نہیں کرتا۔ اس نے خود کہا ہے کہ عمر کی زیادتی سے انسان کی عقل معکوس (اوندھی) ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد کیا وہ یہ حکم دے گا کہ

یصح الدّماغ نوجوان اُن کے فیصلوں کے مطابق چلے جن کی عقل اندھی ہوچکی ہے؟ یقیناً یہ قرآن کے متعلق بڑا غلط اندازہ ہے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ اگر قرآنی تعلیم کا اسی ایک مسئلہ میں باقی مذاہب اور مکاتب اخلاق سے مقابلہ کیا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ قرآنی تعلیم کس قدر شرفِ انسانی کے مطابق اور ارتقائے آدمیت کے لئے مؤیّد ہے۔ دُنیا کے تمام مذاہب اور اخلاق کے دبستانوں میں یہ چیز ایک ایسے مسلّمہ کی حیثیت رکھتی ہے جسے جو کسی غور و فکر یا تنقید و تبصرہ کا محتاج ہی نہیں سمجھا جاتا۔ ان کے ہاں کبھی کسی نے اتنا خیال کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی کہ یہ بھی کوئی ایسی بات ہے جس میں دو رائیں ہوسکتی ہیں! لیکن قرآن کو دیکھئے کہ اس نے دنیا میں پہلی مرتبہ یہ آواز بلند کی ہے کہ جو لوگ عقل کے انحطاط کے دَور میں پہنچ چکے ہوں ان کے فیصلے واجب الاتباع نہیں ہوا کرتے۔ ماں باپ حسن سلوک اور نرم برتاؤ کے مستحق ہیں اور بس۔ جب تک بچہ بچہ ہے، وہ اس کے نگران اور کفیل ہیں۔ جب وہ عقل کی پختگی کو پہنچ جاتا ہے تو اپنے لئے آپ فیصلے کرنے کا مجاز ہو جاتا ہے۔ وہ دوسروں کے تجربوں سے مشورۃً فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ لیکن اسے ان کے فیصلوں کا پابند نہیں بنایا جاسکتا۔ وہ وحی کی حدود کے اندر نظامِ ملّت کے متعین کردہ طرق و اسالیب کی ہم آہنگی میں اپنے لئے آپ فیصلے کرے گا۔

یہ تھی قرآن کی تعلیم۔ لیکن جب ملوکیت کے استبداد نے انسانی حریّت و آزادی کا گلا گھونٹا تھا تو ہر "زیر دست" کو "بالادست" کے فیصلوں کا پابند قرار دے دیا گیا۔ سیاسی زندگی میں بادشاہ کے فیصلوں کا "روحانی زندگی" میں احبار و رہبان (علماء و مشائخ) کے فیصلوں کا اور معاشرتی زندگی میں بزرگوں کے فیصلے کا۔ اب اگر ایک طرف یہ تعلیم بطور اخلاقی اساس انسانوں کے رگ و پے میں پیوست کردی گئی کہ

اگر شہ روز را گوید شب ایں است

بباید گفت اینک ماہ و پرویں

تو دوسری طرف اُن کی گھٹّی میں یہ افیون بھی ڈال دی گئی کہ:

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است

یہی وہ دَور تھا کہ ماں باپ نے بھی اپنی "بزرگی" سے فائدہ اٹھایا۔ اور یہ عقیدہ عام کردیا کہ "ماں باپ کی اطاعت فرض ہے"! یعنی جب تک ماں باپ زندہ ہیں ان کا لڑکا خواہ خود ساٹھ ستّر برس کا بھی کیوں نہ ہو جائے، اُسے کوئی حق حاصل نہیں کہ اپنے معاملات کے فیصلے اپنی صوابدید کے مطابق کرے۔ اُسے اُن

کے فیصلوں کی تعمیل کرنی ہوگی جن کی عقل کے متعلق اس کے خدا کا فیصلہ ہے کہ وہ اس عمر میں اوندھی ہو جاتی ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ ماں باپ کی اطاعت کو فرض سمجھنے والے، ساری عمر عقلی طور پر اپاہج اور ذہنی طور پر بچے کے بچے رہ جاتے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ہماری موجودہ معاشرت میں (جس میں خاندانوں میں مشترکہ زندگی بسر ہوتی ہے) عائلی زندگی کا تقاضا ہے کہ افرادِ خاندان متفقہ فیصلوں کے ماتحت زندگی کی منازل طے کریں اور خودسر اور سرکش نہ بن جائیں۔ لیکن خودسری اور سرکشی اور شے ہے، اصابتِ رائے اور شے [1]۔

آپ غور کیجئے کہ قرآن ہمیں کہاں لے جانا چاہتا ہے اور ہم اپنے وضع کردہ یا دوسروں سے مستعار اصولاتِ اخلاق اور تصوراتِ نیکوکاری کے ماتحت کہاں جا چکے ہیں اور کدھر چلے جا رہے ہیں۔ اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ تمام غیر قرآنی تصوراتِ حیات سے کٹ کر ایک مرتبہ پھر خالص قرآنی نظریۂ زندگی سے اپنے آپ کو پیوست کریں۔

اگر بشاخِ گل آویزد و آب و نم درکش
پریدہ رنگ ز بادِ صبا چہ می جوئی! (۱۹۵۳ء)

اِحترام

.... صاحب کا ایک مقالہ جو عنوان "احترام" (REVERENCE) معاصر ڈان کی اشاعت بابت ۱۸، ۱۸ فروری ۱۹۵۳ء میں شائع ہوا ہے جس میں انہوں نے کارلائل اور گوئٹے وغیرہ کی اسناد، اور سقراط کی مثال سے بتایا ہے کہ نوجوانوں کا حقیقی جوہر یہ ہے کہ وہ اپنے اندر احترام کا جذبہ پیدا کریں۔ بغاوت اور سرکشی کوئی قابلِ قدر جذبہ نہیں۔ تعلیم و تربیت کا ماحصل تعظیم و تکریم اور احترام و سپردگی کے جذبات ہیں۔ اس کے بعد انہوں نے بتایا ہے کہ ہمارے زمانے میں تعلیم کا سب سے بڑا نقص یہ ہے

---

[1] یاد رکھیئے خود فیصلے کرنے کے لئے عقل کی پختگی اور رائے کی اصابت لاینفک شرط ہے۔ اس لئے جب تک بچہ اس منزل تک نہ پہنچ پائے۔ اس وقت تک اُسے لامحالہ بڑوں کے فیصلوں کے مطابق چلنا چاہیئے۔

کہ اس سے طالب علموں کے دل میں احترام و تعظیم کے جذبات پیدا نہیں ہوتے۔ وہ سرکشی اور بغاوت میں فخر محسوس کرتے ہیں اور

یہ مسلک ہمارے معاشرہ کے لئے بڑا خطرناک ہے اگر اس کی جلدی اصلاح نہ کی گئی تو اس کے نقصانات کی تلافی ناممکن ہو جائے گی۔

ہم...... صاحب سے حرفاً حرفاً متفق ہیں کہ احترام و تعظیم کے جذبات شرفِ انسانیت کے آئینہ دار ہیں اور جس معاشرہ کے نوجوانوں کے دل ان جذباتِ عالیہ سے عاری ہوں گے وہ معاشرہ کبھی مہذب و متمدن نہیں کہلا سکے گا۔ ہم اس سے بھی متفق ہیں کہ خود معاشرہ کے قیام و بقا کے لئے ضروری ہے کہ افرادِ معاشرہ کے دل میں احترام و تکریم کے جذبات موجزن رہیں۔ بغاوت اور سرکشی کی بنیادوں پر کوئی معاشرہ قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ آج ہماری قوم کے نوجوانوں کے دل سے احترام و تعظیم کے جذبات اٹھتے چلے جا رہے ہیں اور ان کی جگہ بغاوت و سرکشی کے جراثیم پرورش پا رہے ہیں، جن کے مظاہرے آئے دن ہمارے اجتماعات میں ہوتے رہتے ہیں۔

لیکن سوال یہ ہے کہ احترام کس کا کیا جائے، تعظیم کا مستحق کون ہے؟ جذباتِ سپردگی کی عقیدت کس کی بارگاہ میں پیش کی جائے؟ کس شخص کو واجب التکریم اور کون سے حکم کو واجب التعمیل سمجھا جائے؟ اس ضمن میں...... صاحب فرماتے ہیں کہ

ماں باپ کے حکم کا احترام۔ استاد کے حکم کا احترام، معاشرہ کے احکام کا احترام جو اس کی اقدار و روایات و قوانین کی شکل میں سامنے آتے ہیں۔

ہمیں اس سے اختلاف ہے کہ ماں باپ، استاد، اسلاف کا ہر حکم (بلا مشروط) واجب الاحترام ہے۔ اور معاشرہ کی تمام اقدار، روایات اور ضوابط بلا استثناء واجب التعمیل۔ اگر...... صاحب کے نزدیک اسی کا نام جذباتِ احترام و تکریم ہے۔ تو ان جذبات سے دنیا کی کوئی قوم ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکتی۔ اس سے انسانیت کا ارتقاء رُک جاتا ہے اور شرفِ آدمیت پر جمود و خمود طاری ہو جاتا ہے۔ اگر کسی قوم کے نوجوانوں کو یہ سبق دیا جائے کہ جو کچھ ماں باپ اور اساتذہ کہیں اسے بلا چون و چرا تسلیم کئے جاؤ۔ جو کچھ اسلاف سے منتقل ہوتا چلا آ رہا ہے اُسے کبھی تنقیدی نگاہ سے نہ پرکھو۔ اپنے معاشرہ کی روایات و ضوابط کی شدّت سے پابندی کرو اور ان کا کبھی جائزہ نہ لو۔ تو اس قوم میں کبھی ایسے انسان

پیدا نہیں ہوں گے جو اپنی ذہنی بالیدگی سے قوم کی سطح کو بلند کرسکیں اور کاروانِ انسانیت کو ایک قدم بھی آگے لے جاسکیں یہ وہی کورانہ تقلید ہوگی جس کا نتیجہ انسان کو حیوان بنا دینا ہوتا ہے (بلکہ قرآن کے مطابق حیوان سے بھی بدتر۔ اولئک کالانعام بل ھم اضل) اس میں شبہ نہیں کہ بادی النظر میں اس قسم کی تعلیم بڑی خوش آئند دکھائی دیتی ہے کہ ہر ایک کی تعظیم کرو، جو اپنے سے بڑا ہو اس کا حکم مانو۔ ماں باپ کی اطاعت کرو۔ استاد کی فرمانبرداری کرو۔ اسلاف کے طریقے سے ایک قدم اِدھر اُدھر نہ ہٹو۔ اپنے معاشرہ کی روایات کا احترام کرو اور اس کے ضوابط کی تعمیل۔ لیکن اگر بنگاہِ تعمق دیکھا جائے تو صاف نظر آجائے گا کہ یہ تمام حسین وجمیل جذبات، پیدا کردہ ہیں اُس دورِ استبداد کے جس میں سکھایا یہ جاتا تھا کہ

اگر شہ روز را گوید شب است ایں
بباید گفت اینک ماہ و پرویں[1]

اور پڑھایا یہ جاتا تھا کہ

خطائے بزرگاں گرفتن خطا است[2]

یہی وہ "اخلاقی ضوابط" تھے جن کی رُو سے "ہر بڑے" کا حکم واجب التعمیل قرار پاجاتا تھا۔ اس تعلیم کا آغاز "ماں باپ کی اطاعت" سے ہوتا تھا۔ اس سے آگے استاد کی اطاعت تھی۔ یہ استاد، پاٹھ شالاؤں میں برہمن اور مسجدوں اور مکتبوں میں ملّا ہوتے تھے۔ انہی سے پیشوائیت (PRIEST HOOD) کی اطاعت مسلّم ہوجاتی تھی۔ اس کے بعد اسلاف کی اطاعت مُردوں کی پرستش (ANCESTORAL WORSHIP) پر منتج ہوتی تھی۔ اور اس سیڑھی کے ذریعے، آخر الامر بادشاہ کی اطاعت، جو ایشور کا اوتار یا ظلّ اللہ (خدا کا سایہ) بن جاتا تھا۔ "بزرگوں کی تعظیم" اور "روایات کے احترام" کے یہی وہ جذبات ہیں جنہیں (ROBERT BRIFFAULT) رابرٹ برفا، (CUSTOM THOUGHT) اور (POWER THOUGHT) کی اصطلاحات سے تعبیر کرتا ہے اور جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ

اس سے عقل و شعور کے صرافے میں جعلی سکوں کی بھرمار ہوجاتی ہے اور انسان اُن افکار

---

[1] اگر بادشاہ دن کو رات کہہ دے تو اس کے جواب میں کہنا چاہیئے کہ ہاں حضور! وہ دیکھئے آسمان پر چاند اور ستارے چمک رہے ہیں۔

[2] بزرگوں کی غلطی پکڑنا بہت بڑا جرم ہے۔

کی رُو سے سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے جن پر جعلی اقدار کی مہریں ثبت کر دی جاتی ہیں اور اس طرح وہ ہر گوشے کو رنگین چشمے سے دیکھتا ہے۔ ؎

جیسا کہ اوپر لکھا جا چکا ہے، یہ اخلاقی ضوابط "بڑے خوش آئند دکھائی دیتے ہیں (جس طرح سینٹ پال کی یہ غلامانہ تعلیم کہ "دشمن سے بھی پیار کرو" اور "ایک گال پر طمانچہ کھا کر دوسرا گال سامنے کر دو")۔ لیکن قرآن اس قسم کے غلط جذبات کی کوئی رعایت نہیں کرتا۔ وہ حقائق کو بے نقاب پیش کر دیتا ہے خواہ انہیں (FACE) کرنا بعض طبائع پر کتنا ہی گراں کیوں نہ گزرتا ہو۔ وہ کہتا ہے کہ واجب الاحترام صرف وہ حکم ہے جو حق پر مبنی ہے اور واجب التکریم وہ ہستی جو حق کا حکم دیتی ہے۔ جو حق کا حکم نہیں دیتا وہ قطعاً واجب الاحترام نہیں خواہ وہ باپ ہو یا استاد، اسلاف ہوں یا اخلاف، معاشرہ ہو یا حکومت، روایات ہوں یا "مسلمات"۔ نہ صرف یہ کہ ایسا فیصلہ واجب الاحترام نہیں بلکہ اس کی مخالفت فرض ہے۔ قرآن کریم نے قصۂ حضرت ابراہیمؑ میں اس حقیقت کے مختلف گوشوں کو نہایت واضح انداز میں بے نقاب کیا ہے۔ وہ سب سے پہلے اپنے باپ کو دیکھتے ہیں کہ وہ بتوں کے سامنے جھکتا ہے۔ بیٹے کی نگہ حق شناس، باپ کی اس روش میں کھلی ہوئی گمراہی دیکھتی ہے۔ وہ باپ سے برملا کہتے ہیں کہ:

يَا أَبَتِ لِمَ تَعْبُدُ مَا لَا يَسْمَعُ وَلَا يُبْصِرُ وَلَا يُغْنِي عَنْكَ شَيْئًا۔ (۱۹/۴۲)

اے میرے باپ! تو ان پتھروں کی پوجا کیوں کرتا ہے جو نہ سنتے ہیں، نہ دیکھتے ہیں اور نہ ہی تیرے کسی کام آ سکتے ہیں۔

ایسا کہنے میں نہ تو باپ کا احترام ان کے عناں گیر ہوتا ہے اور نہ ہی ان کے معبودوں کی تعظیم دامن کش۔ وہ گھر سے باہر نکلتے ہیں تو قوم کے بڑے بوڑھوں سے خطاب کرتے ہیں کہ

مَا هٰذِهِ التَّمَاثِيلُ الَّتِي أَنْتُمْ لَهَا عَاكِفُونَ۔ (۲۱/۵۲)

یہ کیا مورتیاں ہیں جن کی پرستش پر تم اس طرح جم کر بیٹھ رہے ہو؟

"بزرگوں کا احترام" یہاں بھی (حضرت) ابراہیمؑ کے گلوگیر نہیں ہوتا۔ اس کے جواب میں قوم اسلاف کی تعظیم کے جذبے کو اُبھارتی ہے اور ابراہیمؑ سے کہتی ہے کہ:

؎ (THE MAKING OF HUMANITY)

قَالُوْا وَجَدْنَا اٰبَآءَنَا لَهَا عٰبِدِيْنَ ۝ (۲۱/۵۳)

ہم نے اپنے آباء و اجداد کو ان کی پرستش کرتے دیکھا ہے۔

انہی کے اتباع میں ایسا کرتے ہیں۔ اسلاف کا احترام، بزرگوں کی عظمت، معاشرہ کی روایات کا یہی تقاضا ہے کہ ہم وہی کچھ کریں جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس کے خلاف دل میں خیال تک لانا بھی جرم ہے۔ غور کیجئے! قوم کے بڑے بوڑھوں نے کس طرح اسلاف کی عظمت اور روایات کے احترام کو بطور دلیل پیش کیا ہے لیکن حضرت ابراہیمؑ پر اس کا کیا اثر ہوا؟ کیا وہ "بڑوں کے احترام" اور معاشرہ کی روایات کی تعظیم سے مرعوب ہو گئے؟ نہیں۔ ایسا نہیں ہوا۔ انہوں نے پوری جرأت اور بے باکی سے کہا کہ:

لَقَدْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمْ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۔ (۲۱/۵۴)

یقین کرو تم خود بھی اور تمہارے اسلاف بھی صریح گمراہی میں رہے۔

یہ کہا اور اس کے ساتھ ہی فرمایا کہ تم معاشرہ کی روایات اور اسلاف کی روش کو بطور دلیل پیش کرتے ہو میں پوچھتا ہوں کہ:

اَفَرَاَيْتُمْ مَّا كُنْتُمْ تَعْبُدُوْنَ ۔ اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُكُمُ الْاَقْدَمُوْنَ ۔ (۲۶/۷۵)

کیا تم نے کبھی اس پر غور بھی کیا ہے کہ تم اور تمہارے اسلاف جس روش کے پابند ہو، اس کی حقیقت کیا ہے؟

آپ نے دیکھا کہ حضرت ابراہیمؑ نے اس مقام پر کتنی بڑی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ کوئی روش محض اس لئے صحیح نہیں ہو سکتی کہ وہ اسلاف سے چلی آتی ہے۔ نہ ہی کوئی دلیل اس لئے دلیلِ محکم بن سکتی ہے کہ اُسے متقدمین کی سند حاصل ہے۔ تمہیں خود غور کرنا چاہیئے کہ اسلاف کی جو روش ہم تک منتقل ہو کر آئی ہے، وہ صحیح ہے یا غلط۔ اگر وہ صحیح ہے تو اسے جاری رکھو اور اگر غلط ہے تو اُسے ترک کر دو۔ یہ ہے صحیح مسلک۔

باپ اور عوام سے آگے بڑھ کر، حضرت ابراہیمؑ معبد کے پوجاریوں تک پہنچے۔ یہی لوگ اُس زمانے میں اُستاد، مرشد اور "خدا کے نمائندے" ہوتے تھے۔ (اور آج بھی ان کی یہی پوزیشن ہے) حضرت ابراہیمؑ نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا اس کی تفصیل قرآن کے متعدد مقامات میں موجود ہے۔ ماحصل اس کا یہ ہے کہ انہوں نے اِس نوجوان کی اس "بغاوت و سرکشی" کی بنا پر فیصلہ کیا کہ:۔

قَالُوا حَرِّقُوهُ وَانْصُرُوا اٰلِهَتَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ فٰعِلِيْنَ۔ (۲۱/۶۸)

انہوں نے آپس میں کہا کہ اگر ہم میں کچھ بھی ہمت ہے تو آؤ اس نوجوان کو آگ میں ڈال کر جلادیں، اور اپنے معبودوں کا بول بالا کریں۔

یہاں تک، باپ، قوم کے حام بڑے بوڑھے، اسلاف، معاشرہ کی روایات، حتیٰ کہ اساتذہ، علماء، مرشدانِ طریقت، سب آگئے۔ لیکن ابھی اس سلسلۂ استبداد کی آخری کڑی باقی ہے۔ یعنی بادشاہ۔ حضرت ابراہیمؑ کی حق پرستی اور حق گوئی نے اس کے احترام کو بھی بالائے طاق رکھ دیا اور اسے ایسی کھری کھری سنائیں کہ وہ (قرآن کے الفاظ میں) اپنا سامنہ لے کر رہ گیا۔ فَبُهِتَ الَّذِيْ كَفَرَ۔ (۲/۲۵۸)

یہ ہے وہ روشِ ابراہیمیؑ جس کے متعلق قرآن نے ہم سے کہا ہے کہ

قَدْ كَانَتْ لَكُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ (۶۰/۴)

تمہارے لئے ابراہیمؑ اور ان کے رفقاء (کی روش) ایک عمدہ نمونہ کی حیثیت رکھتی ہے۔

آپ نے غور فرمایا کہ جس روش کو قرآن نے "اسوۂ حسنہ" قرار دیا ہے، وہ روش یہ نہیں کہ ماں باپ، اساتذہ، مذہبی راہنماؤں، اسلاف، معاشرہ کی روایات اور اربابِ اقتدار کے ہر حکم کا احترام اور ہر فرمان کی تعمیل کرتے جاؤ۔ "اسوۂ حسنہ" یہ ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہو وہ کہیں بھی ہو اور کسی کی طرف سے بھی ہو، اُس کے خلاف صدائے احتجاج بلند کرو۔

حضرت ابراہیمؑ کے علاوہ قرآن کریم نے نبی اکرمؐ کی روشِ حیات کو بطور "اسوۂ حسنہ" پیش کیا ہے۔ (لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ ۳۳/۲۱) حضورؐ کی روش کیا تھی؟ آپ کی پیدائش بھی حضرت ابراہیمؑ کی طرح ایسے ہی معاشرہ میں ہوئی جہاں ہر طرف گمراہی پھیلی ہوئی تھی۔ آپ نے اس مروجہ مسلک کی مخالفت اس شدت سے کی کہ قوم کے بڑے بوڑھے، کعبے کے متولی تمام بزرگ، اکٹھے ہو کر آپ کے چچا[1] کے پاس آئے کہ اس نوجوان کو ان حرکات سے روکا جائے۔ خود چچا نے بھی ان کی ہمنوائی میں آپ سے کہا کہ بزرگوں کا احترام اور اسلاف کی تعظیم بڑی ضروری ہے۔ اس لئے آپ اُن کی مخالفت سے باز

---

[1]: حضورؐ کے والد تو آپ کی پیدائش سے بھی پہلے فوت ہو چکے تھے۔ یہی چچا بمنزلہ والد کے تھے۔

آجائیں۔ اس کے جواب میں حضورؐ نے بھی وہی کچھ کہا جو حضرت ابراہیمؑ نے کہا تھا۔ آپؐ نے فرمایا۔ "اگر میرے دائیں ہاتھ پر سورج اور بائیں ہاتھ پر چاند رکھ دیا جائے تو میں پھر بھی غلط بات کی مخالفت سے باز نہیں آؤں گا۔" اور اس مخالفت کی انتہا یہ تھی کہ میدانِ جنگ میں ایک طرف نبی اکرمؐ اور ان کے ساتھی تھے اور دوسری طرف حضورؐ کے بھی بزرگ (چچے وغیرہ) اور ان کی اولاد۔ حقیقت یہ ہے کہ حضورؐ کی ساری زندگی ایک مسلسل جہاد تھی؛ اپنے معاشرہ کے مسلمات کے خلاف ایک انقلاب آفریں دعوت تھی، ان روایات کے خلاف جو ان کے اسلاف سے متوارث چلی آرہی تھیں اور اس نقطۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو حضرت ابراہیمؑ اور نبی اکرمؐ ہی پر موقوف نہیں، تمام انبیاء کرام کا مشن اُن روایات و تصورات کے خلاف مسلسل پیکار تھا جو اس معاشرہ میں عام ہوتے تھے جن میں وہ مبعوث ہوتے تھے۔ اس میں نہ کسی زندہ کا احترام ان کی راہ میں حائل ہوتا تھا، نہ مردہ کا تقدس۔ یہ ہے اس باب میں قرآن کی تعلیم اور حضرات انبیاء کرامؑ کا اسوہ۔

ہم نے کہا یہ ہے کہ قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ جو بات حق کے خلاف ہو اُس کی مخالفت عین فریضۂ زندگی ہو جاتی ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ حق کسے کہتے ہیں .... صاحب نے گوئٹے کا اقتباس دیا ہے اس میں وہ کہتا ہے کہ:

احترام کیا جائے ان کا جو ہم سے بڑے (GREATER) اور بہتر (BETTER) ہیں۔

اور خود .... صاحب نے لکھا ہے کہ:

زندگی میں جو کچھ بھلا (GOOD) اور (GREAT) ہے اس کا احترام کیا جائے۔

"بھلا اور بڑا" (GOOD AND GREAT) کے الفاظ ایسے ہیں جن کا مفہوم متعین نہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک ان الفاظ کا مفہوم متعین نہ ہو، ان کا واضح تصور سامنے نہیں آسکتا۔ فلسفہ اور اخلاقیات آج تک خیر و شر (GOOD AND EVIL) کے متعلق کوئی حرفِ آخر نہیں کہہ سکے۔ اس لئے ایسے الفاظ کو احترام اور عدمِ احترام کا معیار قرار دینا، قوم کو نظری بحث سے آگے نہیں لے جا سکتا۔ ہمارا تخاطب مسلمانوں سے ہے (اور ظاہر ہے کہ .... صاحب کے مخاطب بھی اسی قوم کے نوجوان ہیں) اور مسلمانوں کے لئے خیر و شر اور حق و باطل کا امتیاز بالکل واضح ہے۔ حق وہ ہے جس کا حکم قرآن دیتا ہے اور باطل وہ جس سے وہ روکتا ہے۔ لہٰذا، ایک مسلمان کے لئے احترام قرآنی احکام کا ہے اور اسی بناء پر ان گوشوں کا جہاں سے قرآنی احکام صادر ہوں۔ ماں باپ ہوں یا اُستاد، اسلاف ہوں یا اخلاف، بزرگ

ہوں یا خود معاشرہ ہو یا حکومت۔ احترام صرف اس کا ہے جو قرآن کے مطابق حکم دے۔ جو اس کے خلاف حکم دے، اس کی مخالفت ایک مسلم کا فریضۂ زندگی ہے اور اتباعِ اسوۂ رسول اللہؐ۔ لہذا صحیح مسلک یہ ہے کہ:

> ماں باپ، اساتذہ، اسلاف کی روایات، معاشرہ کے ضوابط و قوانین کا احترام نہایت ضروری ہے بشرطیکہ وہ حق، یعنی قرآن کے مطابق ہوں۔

یہی وہ تعلیم ہے جس سے ذہنوں میں جلا، قلوب میں پاکیزگی، فکر میں بلندی، معاشرہ میں ہمواری، انفرادی اور اجتماعی زندگی میں حسنِ توازن اور انسانیت میں ارتقاء پیدا ہو گا۔ یہی چیزیں اس احترام و تعظیم کا موجب بنتی ہیں۔ جس کی سوتیں دل کی گہرائیوں سے پھوٹتی، احترام کے جذبات دل کے چشموں سے اُبھر کر باہر نکلتے ہیں۔ انہیں باہر سے داخل نہیں کیا جا سکتا۔ احترام پیدا ہوتا ہے عظمت کے احساس سے۔ آپ قوم کے نوجوانوں کو قرآن کی تعلیم دیجیئے۔ جب قرآن کی عظمت ان کے سامنے بے نقاب ہو گی تو ان کی نگہ عقیدت خود بخود قرآن کی بارگاہ میں جھک جائے گی۔ آپ اپنے ہاں قرآنی معاشرہ پیدا کیجئے۔ جب اس کے درخشندہ نتائج قوم کے سامنے آئیں گے تو اس معاشرہ کی تعظیم و تکریم کے جذبات خود بخود قوم کے دل سے اُبھریں گے۔ آپ ان نوجوانوں کے سامنے ایسے افراد پیش کیجئے جو قرآنی سیرت کے پیکر ہوں پھر دیکھیئے کہ انہی نوجوانوں کی یہ حالت ہو جاتی ہے یا نہیں کہ

> مری نگاہ نے جھک جھک کے کر دیئے سجدے
> جہاں جہاں سے تقاضائے حسنِ یار ہوا

آپ ان نوجوانوں کو تعلیم تو یہ دیتے ہیں کہ

> جب حضرت ابراہیمؑ کو آگ میں ڈالا گیا تو گرگٹ نے اس آگ کو پھونکنے کی کوشش کی۔ (ترجمان القرآن۔ اکتوبر۔ نومبر ۱۹۵۲ء صفحہ ۱۱۵)

اور ان سے پھر توقع یہ رکھتے ہیں کہ وہ آپ کے اس قسم کے مذہب اور روایات کا احترام کریں؟ آپ ان کے سامنے معاشرہ ایسا پیش کرتے ہیں جس کے متعلق افرادِ معاشرہ کی کیفیت یہ ہو چکی ہے کہ وہ اُسے "چار سو بیس" سے تعبیر کر کے بھی مطمئن نہیں ہوتے کہ ان الفاظ نے ان کے جذبات کا کماحقہٗ اظہار کر دیا ہے۔

اور اس کے بعد ان نوجوانوں سے اس معاشرہ اور اس کے لزوم وتضمنات کی تعظیم چاہتے ہیں؟ آپ ان کے سامنے افراد ایسے پیش کرتے ہیں جن کے تصور سے انسان کو ہنسی آجائے اور ان نوجوانوں کو کہنیاں مار مار کر مجبور کرنا چاہتے ہیں کہ وہ انہیں سعادت مآب کہہ کر پکاریں۔ احترام، اعترافِ عظمت کا نام ہے۔ جہاں عظمت نہ ہو وہاں احترام کس طرح پیدا ہو جائے۔ احترام از خود پیدا ہوتا ہے، پیدا کیا نہیں جاسکتا۔

حقیقت خود کو منواتی ہے، منوائی نہیں جاتی

جو افراد، زمانے سے اپنا احترام کراتے ہیں ان کی حالت تو یہ ہوتی ہے کہ وہ سارے زمانے سے لڑائی مول لیتے ہیں، مخالفین کا ہجوم ان سے پوچھتا ہے کہ تمہاری صداقت کی دلیل کیا ہے۔ وہ انہی مخالفین سے کہتے ہیں کہ:

فَقَدْ لَبِثْتُ فِيكُمْ عُمُرًا مِّن قَبْلِهِ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۔ ۱۰/۱۶

میں نے اس سے پہلے تمہارے اندر عمر بسر کی ہے۔ کیا تم اس سے اندازہ نہیں لگا سکتے کہ ایسی زندگی سچے کی ہوتی ہے یا جھوٹے کی؟

وہ یہ کہتے ہیں اور مخالفین میں سے ایک فرد بھی ایسا نہیں اٹھتا جو کہنے والے کے کیریکٹر کے متعلق ایک حرف بھی مخالفت میں کہہ سکے۔ یہی نہیں کہ ان کے سامنے ایسا نہ کہہ سکے بلکہ یہ کہ اہل مکہ نے ابو سفیان کو اپنا نمائندہ بنا کر ہرقل کے پاس بھیجا کہ وہ اس سے مدد مانگے تاکہ اس تحریک (نبی اکرمؐ کی دعوت) کا خاتمہ کیا جائے۔ ہرقل نے ابو سفیان سے پوچھا کہ اس داعیٔ انقلابؐ کے کیریکٹر کا کیا حال ہے؟ کیا وہ جھوٹ بولتا ہے؟ کیریکٹر کے احترام کی یہ کیفیت ہے کہ ابو سفیان نے وہاں بھی اعتراف کیا کہ اس داعیٔ انقلاب نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ کبھی بد دیانتی نہیں کی۔ نگاہوں کے سجدے وقف ہوتے ہیں ان افراد کے لئے، نہ ان کے لئے جن کی کیفیت یہ ہو کہ

کی جس سے بات اس نے شکایت ضرور کی

احترام ہوتا ہے اس معاشرے کا جس کی حالت یہ ہو کہ جب ایک نومسلم اپنے ٹیکس کا روپیہ خزانے میں داخل کرانے کے لئے لایا تو حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ اس نئے (اسلامی) معاشرہ نے تمہارے لئے کچھ کیا بھی ہے یا نہیں۔ اس نے کہا کہ ابھی تک تو اس کا موقع نہیں آیا۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ پھر تم اپنا روپیہ واپس لے جاؤ۔ جب تک کوئی معاشرہ فرد کی ربوبیت کے لئے کچھ نہیں کرتا۔ اُسے حق حاصل

نہیں ہوتا کہ وہ اس فرد کی کمائی سے کچھ لے۔ اُس معاشرے کا احترام کس طرح ہو سکتا ہے جس کا عالم یہ ہو کہ:

دانہ ایں می کارد، آں حاصل بُرد

معاشرہ تو ایک طرف، اس باپ کا احترام اولاد کے دل میں نہیں رہتا جو خود تو مُرغ پلاؤ اڑالے اور بچے بھوکے مریں۔

ہمارے نوجوانوں میں البتہ ایک بات ایسی پیدا ہو رہی ہے جو بڑی معیوب ہے اور جسے کسی صورت میں بھی روا نہیں رکھا جا سکتا اور وہ ہے بدتمیزی۔ ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں جب ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارا نوجوان طبقہ بدتمیز ہوتا جا رہا ہے۔ بدتمیزی کی اجازت کسی حالت میں بھی نہیں دی جا سکتی۔ آپ نے غور نہیں کیا کہ وہی قرآن جو بت پرستی کی اس شدت سے مخالفت کرتا ہے، اس کی قطعاً اجازت نہیں دیتا کہ ان بتوں کو یا مشرکین کے دیگر معبودانِ باطل کو گالی دی جائے۔

وَلَا تَسُبُّوا الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًاۢ بِغَيْرِ عِلْمٍ (۶/۱۰۸)

جو لوگ خدا کے سوا دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں تم ان کے معبودوں کو گالیاں مت دو کہ پھر وہ بھی حد سے تجاوز کر کے خدا کو بُرا بھلا کہنے لگیں۔

حقیقت یہ ہے کہ بدتمیزی پہ اُتر آنا اپنی کمزوری کا اعتراف اور شکست کا اظہار ہے، اور وہ بھی بڑی کم ظرفی اور کمینگی کے ساتھ۔ جو بات حق کے خلاف ہے اس کی کھلے بندوں مخالفت کیجئے۔ لیکن بدتمیزی پہ کبھی نہ اُتریئے۔ تقدیرِ اُمم کے مطالعہ سے کچھ ایسا مترشح ہوتا ہے کہ جس قوم میں قوت باقی نہیں رہتی اُس کا عمر رسیدہ طبقہ شکوہ سنجی اور مرثیہ خوانی شروع کر دیتا ہے اور اس کا نوجوان طبقہ بدتمیزی پہ اُتر آتا ہے۔ اس وقت پاکستان میں یہی کچھ ہو رہا ہے اور اسی صورتِ حالات کا احساس ہے جو سنجیدہ طبقے کو یہ کہنے پر مجبور کر رہا ہے کہ:

یوں خدا کی خدائی برحق ہے — پہ اثر کی ہمیں تو آس نہیں

(۱۹۵۳ء)

مختلف معاشرتی مسائل

ایک صاحب حسب ذیل امور کے متعلق دریافت فرماتے ہیں کہ قرآن کی رُو سے ان کی پوزیشن کیا ہے:۔

۱۔ بچہ پیدا ہونے پہ اس کے کان میں اذان دینا ؟

۲۔ عقیقہ کرنا ؟

۳۔ ختنہ کرنا ؟

۴۔ مُردہ کو غسل دینا۔ کفن پہنانا۔

جواب

یہ امور معاشرتی ہیں نہ کہ دینی۔ کسی معاشرہ میں اگر بعض باتیں اس قسم کی رائج ہوں جو دین کے کسی حکم یا اس کی عام تعلیم کے خلاف نہ جاتی ہوں تو انہیں معاشرتی تقریبات کے طور پہ منا لینے میں کوئی حرج نہیں۔ ایسی تقریبات معاشرتی یک جہتی کے لئے مفید ہوتی ہیں اور خوشی کی تقریبات سے نو زندگی میں لوچ پیدا ہوتی ہے جو گداز حیات کے لئے بڑی ضروری چیز ہے۔ لیکن جو قوم روٹی تک کو محتاج ہو رہی ہو اس میں زندگی کی لوچ اور گداز حیات کا تصور ہی کہاں پیدا ہو سکتا ہے ؟

۵۔ نابالغ یا بالغ لڑکے لڑکی کی منگنی کرنا ؟

ج۔ نابالغ لڑکے یا لڑکی کی منگنی کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ نکاح کے لئے زوجین کی رضامندی شرط ہے اور رضامندی کے لئے سنّ بلوغت ضروری ہے۔ باقی رہا بالغ لڑکے یا لڑکی کی منگنی۔ سو اگر بالغ لڑکا اور لڑکی اپنے نکاح پہ رضامند ہو گئے ہیں لیکن کسی وجہ سے نکاح میں کچھ تاخیر ہے تو ان کا باہمی وعدہ منگنی کہلا سکتا ہے۔ لیکن یہ کسی شکل میں بھی نکاح کا قائمقام نہیں ہو سکتا۔ اس لئے اس کی قانونی حیثیت کچھ نہیں ہو گی۔ قرآن صرف نکاح کا ذکر کرتا ہے۔ اس لئے اس قسم کے وعدوں سے احتراز اچھا ہے کیونکہ اس سے بعض اوقات بڑی معاشرتی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور یہ جو ہمارے ہاں آج کل عام رواج ہو رہا ہے کہ جوان لڑکے اور لڑکی کا نکاح کر دیا اور پھر "رخصتی" کے لئے برسوں کی تاریخ ڈال دی تو یہ چیز قرآن کے

منشاءِ نکاح کے خلاف اور نفسیاتی نقطۂ نگاہ سے بڑی خرابیوں کی موجب ہے۔ قرآن کی رُو سے نکاح کے بعد میاں اور بیوی کو آپس میں ازدواجی تعلقات پیدا کرنے سے کوئی نہیں روک سکتا۔ اس لئے نکاح کے بعد لڑکے اور لڑکی کو آپس میں ملنے نہ دینا نکاح سے مذاق کرنا ہے۔

۶۔ کیا یہ ضروری ہے کہ نکاح مُلّا ہی پڑھائے؟

ج۔ جب قرآن نازل ہوا ہے تو مُلّا کا وجود ہی نہیں تھا۔ یہ حضرت بہت بعد کی پیداوار ہیں۔ لہٰذا نہ صرف نکاح میں بلکہ دوسرے معاملات میں بھی مُلّا کی ضرورت غیر قرآنی ہے، یہ کام مسلمانوں کو خود کرنے چاہئیں۔

۷۔ ہمارے ہاں ایک رسم ہے کہ قبر کے اردگرد مُلّاؤں کا ایک دائرہ بیٹھ جاتا ہے اور وہ ایک دوسرے کی طرف قرآن کریم کو منتقل کرتا جاتا ہے اور پھر آخری مُلّا اُسے کچھ روپے کے عوض میت کے وارث کو دے دیتا ہے۔ اور اس کے عوض سمجھا جاتا ہے کہ میت کے گناہ ساقط ہو گئے۔ اسی طرح قرآن ختم کرا کر یا درود شریف پڑھوا کر میت کو ایصالِ ثواب کرایا جاتا ہے۔

ج۔ جب آپ ایسا گروہ پیدا کر دیں گے جس کا ذریعۂ معاش کچھ نہ ہو تو وہ اپنی روٹی کے لئے کوئی نہ کوئی صورت تو پیدا کرے گا ہی۔ یہ سب رسومات اسی بے کار گروہ کے حصولِ معاش کی صورتیں ہیں جن کے تصور سے دین کانپ اٹھتا ہے۔

اور "ایصالِ ثواب" کے غیر قرآنی عقیدہ میں تو بڑے بڑے لوگ پھنسے چلے آرہے ہیں۔ یہ عقیدہ قانونِ مکافاتِ عمل کی جڑ کاٹ دیتا ہے۔ جو قرآنی تعلیم کا اصل الاصول ہے۔ (۱۹۵۴ء)

رواج کی پابندی

سوال :۔ ہمارے ہاں عام طور پر رواج ہے کہ مختلف تہواروں یا قومی یادگاروں کے دنوں میں کاروبار بند کر دیتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مسلمان کو کاروبار کبھی بند نہیں کرنا چاہیئے۔ دین کی رُو سے اس کی پوزیشن کیا ہے؟

جواب :- بعض امور، دین کی حد میں نہیں آتے ۔ معاشرہ کے رسم و رواج سے متعلق ہوتے ہیں (اسے عُرف کہا جاتا ہے)۔ اگر عُرف، دین کے کسی اصول سے نہ ٹکرائے تو اُس کے حسن و قبح کا فیصلہ اس کے مطابق کرنا چاہیئے کہ وہ معاشرہ کے لئے مفید ہے یا مُضر ۔ مختلف تقاریب پر کاروبار بند کرنا، معاشرہ میں رواج سا ہو گیا ہے ۔ یہ رواج، دین کے کسی اصول سے تو ٹکراتا نہیں ۔ اس لئے اسے معاشرتی مصالح کی روشنی میں دیکھنا چاہیئے ۔ اس وقت پاکستان جن حالات سے دوچار ہے، اُن کے پیشِ نظر، ہمارے نزدیک، ہمیں دن کے علاوہ رات کو بھی کام کاج جاری رکھنا چاہیئے ۔ لیکن کچھ وقت تفریح کے لئے نکالنا خود کاروبار کے لئے مفید ہوتا ہے ۔ اِس سے صَرف شدہ توانائیاں عَود کر آتی ہیں ۔ بشرطیکہ تفریح صحت مندانہ ہو ۔ ہمارے ہاں اس وقت جو کچھ ہو رہا ہے ہنگامی طور پر ... (HAPHAZARDLY) ہو رہا ہے ۔ یہاں نہ کاروبار کسی طے شدہ قومی پروگرام کے مطابق ہوتا ہے ۔ نہ تفریح ہی کسی اجتماعی نظام کے تابع ۔ اِس افراتفری، نفسانفسی، اور بے ہنگامی کا نتیجہ ظاہر ہے ۔

اِس ضمن میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ جس رواج کو کوئی معاشرہ اختیار کرلے (بشرطیکہ وہ دین کے خلاف نہ ہو) تو افراد کو معاشرہ کا ساتھ دینا چاہیئے ۔ اِس سے معاشرتی ہم آہنگی پیدا ہوتی ہے ۔ اگر اس میں کسی اصلاح کی ضرورت ہو تو اُس کے لئے مناسب جدوجہد کرنی چاہیئے ۔ معاشرہ کے مسلمہ رواج کی (جو دین کے خلاف نہ ہوں) خلاف ورزی مستحسن نہیں ہوتی ۔ قرآن کریم نے "سبت" کے تابعے کی خلاف ورزی کرنے والوں کا جو قصّہ بیان کیا ہے وہ اسی حقیقت کو سامنے لانے کے لئے ہے (۱۹۶۱ء)

غلط معاشرہ میں اصُول پرستی

لاہور سے ایک صاحب نے اپنے خط میں ایک اہم سوال اٹھایا ہے ۔ انہوں نے لکھا ہے کہ آج کل ہمارے معاشرہ کی حالت یہ ہو چکی ہے کہ اس میں سچ بولنا اور دیانتداری سے کام کرنا عام طور پر نقصان کا موجب ہوتا ہے ۔ اور جھوٹ اور بددیانتی سے بڑی کامیابی ہوتی ہے ۔ کیا ایسی حالت میں یہی بہتر نہیں کہ انسان وہی کچھ کرے جو باقی دنیا کر رہی ہے اور اس طرح ناکامیوں سے پیچھا چھڑا لے ۔

جواب:۔ یہ وہ سوال ہے جو آج کل قریب قریب ہر ایک دماغ کو پریشان کئے ہوئے ہے۔ بعض جرأت کر کے اُسے زبان تک لے آتے ہیں۔ باقی اسے اپنے دل میں دہراتے رہتے ہیں۔

قرآن یہ بتاتا ہے کہ کچھ مستقل اقدار ہیں جن میں کسی زمانہ اور کسی حالت میں بھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ اور انسان کے لئے ضروری ہے کہ کسی صورت میں بھی ان کا ساتھ نہ چھوڑے۔ مثلاً معاملات میں دیانتداری۔ اگر ہم دیانتداری کو اسی حد تک اپنے ساتھ رکھیں جس حد تک اس کے ساتھ رکھنے سے فائدہ ہو اور جب ایسا کرنے سے نقصان ہو تو اسے چھوڑ دیا جائے تو کھلے الفاظ میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم اُسے مستقل قدر نہیں سمجھتے۔ لہٰذا پہلے یہ فیصلہ کرنا چاہیئے کہ ہم ان چیزوں کو مستقل اقدار مانتے ہیں یا نہیں۔ اگر ہم ایسا مانتے ہیں (اور اسی کو ایمان کہتے ہیں) تو پھر یہ سوال ہی نہیں پیدا ہوتا کہ انہیں کس وقت ساتھ رکھا جائے اور کس وقت چھوڑ دیا جائے۔ انہیں بہرحال ساتھ رکھنا ہو گا۔ اور ہم اگر انہیں مستقل اقدار ہی نہیں سمجھتے تو پھر یہ پوچھنا اور سوچنا ہی بے کار ہے کہ نقصان کی صورت میں ہم کیا کریں۔

لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ تمہارا فریضہ اتنا ہی نہیں کہ تم نامساعد حالات میں اپنے طور پر ان اقدار سے متمسک رہتے ہوئے نقصان اٹھاتے چلے جاؤ، ان حالات کے خلاف اعلانِ جنگ کر کے ان کی جگہ مستقل اقدار کے مطابق معاشرہ کا قیام بجائے خویش ایک مستقل قدر ہے جسے کسی صورت میں بھی ہاتھ سے نہیں دینا چاہیئے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ ان افراد کی رفاقت تلاش کی جائے، جو مستقل اقدار پر اپنا ایمان رکھتے ہوں۔ ان رفقار کی ہم مرکزی سے ان کی قوت بہت بڑھ جائے گی۔ اور اس سے صحیح معاشرہ کے قیام میں ان کا قدم آگے بڑھتا جائے گا۔ یاد رکھیئے! قرآن کی رُو سے ایک فرد کا اپنا ذاتی اطمینان، جنّتی زندگی نہیں کہلاتا۔ جنّتی زندگی کے لئے ضروری ہے کہ وہ اسی قسم کے افراد کے زمرہ میں داخل ہو جائے۔ قرآن نے نفسِ مطمئنّہ کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ فَادْخُلِيْ فِيْ عِبَادِيْ وَادْخُلِيْ جَنَّتِيْ۔ (۸۹-۳۰-۲۹) کہ "تو خدا کے بندوں کی جماعت میں شامل ہو اور اس طرح سے جنت میں داخل ہو"۔ لہٰذا جو شخص غلط معاشرہ میں مستقل اقدار کا ساتھ نہیں چھوڑتا وہ بڑی ہمت کا ثبوت دیتا ہے۔ لیکن جو اتنے ہی پر مطمئن ہو جاتا ہے وہ اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں کوتاہی کرتا ہے۔ جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے، یہ ضروری ہے کہ وہ اپنے جیسے افراد کے ساتھ مل کر غیر خداوندی معاشرہ کی جگہ قرآنی معاشرے کے قیام کی کوشش کرے۔ (سنہ ۱۹۵۴ء)

۶

حلال وحرام

سوال

لاہور سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ مذہب میں حرام اور حلال کے سوال کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ اتنی اہمیت کہ اکثر اوقات ایک شے کا حرام ہونا ہی ایک مذہب اور دوسرے مذہب میں امتیازی نشان بن جاتا ہے۔ اس اہمیت کا تقاضا ہے کہ واضح طور پر معلوم ہو کہ فلاں فلاں چیز حرام ہے لیکن ہمارے ہاں حالت یہ ہے کہ ایک مولوی صاحب ایک چیز کو حرام بتاتے ہیں تو دوسرے اُسے حلال قرار دیتے ہیں۔ ہم عامی مصیبت میں پھنس جاتے ہیں کہ کس کی مانیں اور کس کی نہ مانیں۔

براہِ کرم واضح طور پر بتائیں کہ قرآن کی رُو سے کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار کسے حاصل ہے؟

جواب

اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزاد پیدا کیا ہے۔ اس کے ارشاد کے مطابق ہر ابنِ آدم، ہر انسان محض اپنے انسان ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ (وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ۔ ہم نے بنی آدم کو تکریم عطا کی ہے۔ ۱۷/۷۰) اس لئے اس نے واضح الفاظ میں کہہ دیا کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ وہ کسی دوسرے انسان کو اپنا محکوم بنائے۔ اس پر اپنی مرضی چلائے، اسے اپنے احکام کے تابع رکھے۔ مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ...... (۳/۷۹) کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں خواہ اللہ نے اسے ضابطۂ قوانین۔ یا حکومت یا نبوّت ہی کیوں نہ دی ہو کہ وہ دوسرے انسانوں سے کہے کہ تم اللہ سے ورے میری محکومیت اختیار کرو۔"

لہٰذا قرآن کی رُو سے کسی انسان کو اس کا اختیار نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی پر کسی قسم کی پابندی لگائے۔

۲۔ لیکن زندگی میں بعض پابندیوں کی بھی ضرورت ہوتی ہے۔ ان پابندیوں کی مختلف قسمیں ہوتی

ہیں۔ مثلاً۔

ا۔ ڈاکٹر مریض سے کہہ دیتا ہے کہ تم اتنے دنوں تک گوشت نہیں کھانا۔ ظاہر ہے کہ ڈاکٹر کے اس فیصلہ کی پابندی کسی کے حکم کی اطاعت نہیں۔
اُس کا ایک فنی مشورہ اور مشفقانہ ہدایت ہے جسے ماننا نہ ماننا ہمارے اپنے اختیار کی بات ہے۔ اسے ماننے سے ہمارا بھلا ہوگا۔ نہ ماننے سے نقصان ہوگا۔ ہم اسے بطیبِ خاطر مانتے ہیں۔ اس سے ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

ب۔ ہمارے ملک کی مجلس قانون ساز ایک قانون بناتی ہے اور حکومت اُسے نافذ کرتی ہے۔ (مثلاً یہ قانون کہ سڑک پر بائیں ہاتھ چلو) اس قانون کی پابندی بھی درحقیقت کسی دوسرے کے حکم کی پابندی نہیں — ہمارے اپنے ہی فیصلہ کی پابندی ہے۔ لہذا اس سے بھی ہماری آزادی سلب نہیں ہوتی۔

لیکن اس کے برعکس ایک شخص کہتا ہے کہ اسلام کی رُو سے فلاں چیز کا استعمال حرام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ شخص نہ صرف اپنے زمانے کے کروڑہا مسلمانوں پر ایک سخت پابندی لگاتا ہے بلکہ قیامت تک آنے والی اُمّتِ مسلمہ کو اس حکم کی زنجیر میں اس طرح جکڑتا ہے کہ جو شخص اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وُہ دُنیا اور آخرت دونوں میں مجرم قرار پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کی شدید پابندی کے لئے واضح اور متعین سند (AUTHORITY) ہونی چاہیئے۔ سوال یہ ہے کہ قرآن کی رُو سے یہ اتھارٹی کیا ہے؟

۳۔ قرآن نے اس قسم کی پابندی کے لئے "حرام" کا لفظ استعمال کیا ہے جو "حلال" کی ضد ہے۔ حلال کے معنی ہیں، رسیاں کھول کر آزاد کر دینا۔ اس لئے حرام کے بنیادی معنی ہوئے کسی کو کسی بات سے روک دینا۔ منع کر دینا، اس پر پابندی لگا دینا۔ قرآن نے حرام اور حلال کے بارے میں واضح احکام دیئے ہیں۔

بنیادی اصول

اُس نے سب سے پہلے اصول یہ بیان کیا ہے کہ خوشگوار سامانِ رزق کی ہر شے حلال ہے بجز ان کے جنہیں اللہ نے حرام قرار دیا ہو۔ سورۂ بقرہ میں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَاشْكُرُوا لِلّٰهِ إِنْ كُنْتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ۔ إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ۔۔۔ (۲/۱۷۲-۱۷۳)

اے ایمان والو! جو کچھ اللہ نے بطور رزق دیا ہے اس میں سے طیبات (خوشگوار چیزوں)

کو کھاؤ۔ اور اللہ کا شکر کرو۔ اگر تم صرف اسی کی محکومی اختیار کرتے ہو۔

اس نے تم پر صرف مردار اور خون اور سؤر کا گوشت اور جسے اللہ کے سوا کسی دوسرے کے لیے پکارا جائے۔ حرام کیا ہے۔

یہاں صرف کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے۔ سورۂ اعراف میں ان کے ساتھ اشیائے مستعملہ کا بھی اضافہ کیا گیا ہے۔ فرمایا۔

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ...... (۷/۳۲)

(ان سے) کہو کہ وہ کون ہے جس نے زینت کی چیزوں کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور خوشگوار سامانِ زیست کو حرام قرار دیا ہے؟

اس سے آگے ہے۔

قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ..... (۷/۳۳)

ان سے کہو کہ میرے رب نے بے حیائی کی باتوں کو حرام قرار دیا ہے۔ خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔

ان آیات سے ظاہر ہے کہ

(i) ۔ کسی شے کو حرام قرار دینے کا اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔

(ii) ۔ خدا کے علاوہ اس کا حق کسی اور کو حاصل نہیں۔

(iii) ۔ اس نے زینت کی کسی چیز کو حرام قرار نہیں دیا۔

(iv) ۔ اشیائے رزق میں سے جنہیں حرام قرار دیا ہے ان کی خود ہی تصریح کر دی ہے۔

۴ ۔ ہم نے دیکھ لیا کہ انسانوں پر کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ لیکن خدا ہر شخص

قرآن ہی قولِ فیصل ہے۔

سے براہِ راست کلام نہیں کرتا۔ اس لئے اس نے حرام و حلال کے متعلق اپنے فیصلے وحی کی رو سے دیئے جو رسول اللہ پر نازل ہوئی تھی۔

سورۂ انعام میں ہے۔

---

[1] ۔ سورۂ انعام میں دَمًا مَّسْفُوْحًا کہہ کر اس کی تصریح کر دی کہ صرف بہتا ہوا خون حرام ہے۔ (۶/۱۴۵)

قُلْ لَّا اَجِدُ فِیْ مَا اُوْحِیَ اِلَیَّ مُحَرَّمًا عَلٰی طَاعِمٍ یَّطْعَمُہٗ اِلَّا ..... (۶/۱۴۶)

اے رسول (ان سے) کہہ دو کہ جو کچھ میری طرف وحی کیا گیا ہے۔ میں اس میں کسی چیز کو جو کھانے والا کھائے، حرام نہیں پاتا۔ سوائے مردار۔ بہتے ہوئے خون لحم خنزیر اور اس کے جو اللہ کے سوا کسی دوسرے کے نام سے پکارا گیا ہو۔

اس سے ظاہر ہے کہ خدا نے حرام وحلال کا فیصلہ اس وحی کی رُو سے کر دیا ہے جو نبی اکرمؐ کی طرف نازل ہوئی تھی۔ یہ وہ وحی ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے۔ سورۂ حج میں ہے۔

وَ اُحِلَّتْ لَکُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا یُتْلٰی عَلَیْکُمْ ...... (۲۲/۳۰)

اور تمہارے لئے چوپائے حلال ہیں۔ بجز ان کے جن کے متعلق تمہیں اس وحی کی رُو سے بتا دیا گیا ہے جو تمہیں پڑھ کر (سنایا) جاتا ہے۔

یہ "مَا یُتْلٰی" وہ وحی تھی جو "اَلْکِتَاب" (۲۹/۴۵) "اسے پڑھ جو تیری طرف کتاب میں سے وحی کیا گیا ہے" یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق سورۂ آلِ عمران کی آیت میں جس کا پہلا حصہ سابقہ صفحات میں درج کیا گیا ہے، کہہ دیا کہ خدا کی محکومی اس کے ذریعے اختیار کی جاتی ہے۔ بِمَا کُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْکِتَابَ وَ بِمَا کُنْتُمْ تَدْرُسُوْنَ (۳/۷۹) اس کتاب کے ذریعے جس کی تم تعلیم و تدریس کرتے ہو۔" سورۂ نمل میں واضح الفاظ میں بتا دیا کہ اس سے مراد قرآن ہے۔ اِنَّمَا اُمِرْتُ ..... اَنْ اَتْلُوَا الْقُرْاٰنَ (۲۷/۹۱-۹۲) "مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں قرآن تلاوت[1] کروں"

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے

(i)۔ کسی شے کو حرام قرار دینے کا حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اور

(ii)۔ اس نے جو کچھ حرام قرار دینا تھا اسے قرآن میں بتا دیا ہے۔

یہ تو رہا اس موضوع کا مثبت پہلو۔ یعنی کسی شے کو حرام قرار دینے کی اتھارٹی کون ہے؟ اب یہ دیکھئے کہ قرآن کریم نے اس حقیقت کو کس طرح واضح کیا ہے کہ یہ اتھارٹی خدا کے سوا اور کسی کو حاصل نہیں۔

ہم سورۂ اعراف کی وہ آیت پہلے درج کر چکے ہیں۔ جس میں پوری تحدّی سے کہا گیا ہے کہ قُلْ مَنْ

---

[1] ۔ تلاوت کے معنی پیروی کرنے کے بھی ہیں۔

حَرَّمَ زِیْنَةَ اللّٰهِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ (۷/۳۲) "ان سے کہو کہ وُہ

کسی اور کو حق حاصل نہیں

کون ہے جو زینت کی اشیاء کو جنہیں اللہ نے اپنے بندوں کے لئے پیدا کیا ہے اور خوشگوار سامانِ رزق کو حرام قرار دیتا ہے!" اس سے ظاہر ہے کہ خدا کے علاوہ اور کسی کو اس کا اختیار نہیں دیا گیا کہ وہ کسی شے کو حرام قرار دے دے۔ اس بارے میں، اور تو اور، خود نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ

یٰٓاَیُّهَا النَّبِیُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ ..... (۶۶/۱)

اے نبی! جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال قرار دیا، تو اُسے حرام کیوں قرار دیتا ہے۔

اس وقت ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ وہ کیا چیز (یا بات) تھی جسے نبی اکرمؐ نے اپنے اوپر ممنوع قرار دے لیا تھا۔ (اس لئے کہ یہ گوشہ ہمارے زیرِ نظر موضوع سے خارج ہے)۔ ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں، کہ اللہ تعالیٰ نے یہ حق نبی اکرمؐ کو بھی نہیں دیا کہ دوسرے انسانوں پر کسی چیز کو حرام قرار دینا تو ایک طرف خود اپنی ذات پر بھی کسی ایسی شے کو ممنوع قرار دے لیں جسے اللہ نے حلال قرار دیا تھا۔

حلال وطیب سے مفہوم

اس مقام پر ضمناً ایک نکتہ کی وضاحت ضروری معلوم ہوتی ہے۔ قرآن میں حلال اشیاء کے ساتھ طَیِّبًا کا اضافہ کیا گیا ہے۔ مثلاً سورۂ بقرہ میں ہے۔ یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِی الْاَرْضِ حَلٰلًا طَیِّبًا ...... (۲/۱۶۸) ۔ "اے نوعِ انسان! زمین کی پیداوار کو جسے ہم نے حلال قرار دیا ہے، طیّب انداز سے کھاؤ۔" طیّب کے معنی ہیں خوشگوار۔ پاکیزہ۔ مفید۔ نفیس۔ یعنی یہ نہیں کہ ہر حلال شے کا کھانا تم پر فرض قرار دیا گیا ہے۔ ان میں سے تم اپنے ذوق اور پسند کے مطابق جسے اچھا سمجھو کھاؤ۔ جو ناپسند ہوں انہیں مت کھاؤ۔ اس میں انفرادی ذوق۔ میلانِ طبع۔ طبّی ضرورت اور دیگر تضمنات کی رعایت رکھ دی گئی ہے۔

لیکن نبی اکرمؐ کے بارے میں اس رعایت میں بھی خاص احتیاط ملحوظ رکھی گئی ہے۔ یہ اس لئے کہ (مثلاً) زید کسی ایسی چیز کو چھوڑ دیتا ہے جو اُسے ناپسند ہے۔ اس کے فیصلے کا اثر اس کی اپنی ذات تک محدود رہتا ہے۔ لیکن اگر نبی کسی ناپسندیدہ چیز کو چھوڑ دیتا ہے اور اس طرح چھوڑ دیتا ہے، گویا اس نے اُسے اپنے اوپر ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے لیا ہے، تو اس کے نتائج بہت دور رس ہو سکتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ حقیقت سے ناواقف یا عقیدت مندی میں افراط کی طرف چلے جانے والے، یہ سمجھ کر کہ اُس چیز میں

کوئی دینی قباحت ہوگی، اسے اپنے اوپر مستقلاً حرام قرار دے لیں اور اس طرح بالواسطہ (INDIRECTLY) ہی سہی، خدا کی حلال کردہ شے، لوگوں پر حرام قرار پا جائے۔ ایسا ہو چکا تھا اس لئے نبی اکرمؐ کی توجہ اس طرف خاص طور پر مبذول کرائی گئی۔ قرآن میں ہے کہ حضرت یعقوبؑ نے کسی شے کو اپنے لئے ممنوع قرار دے لیا۔

نبی کا ذاتی فیصلہ

ان کا یہ فیصلہ محض انفرادی تھا۔ لیکن بنی اسرائیل نے اسے خدائی حکم سمجھ کر اس شے کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے حرام قرار دے لیا۔ حتیٰ کہ جب انہوں نے دیکھا کہ قرآن میں جن چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے ان میں اس شے کا ذکر نہیں تو انہوں نے اس پر اعتراض کیا کہ جس چیز کو پہلے (ان کے غلط خیال کے مطابق) "خدا نے حرام قرار دیا تھا" اسے اب قرآن میں کیوں حلال قرار دیا گیا ہے۔ اس کے جواب میں قرآن نے کہا کہ۔ كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيلُ عَلَىٰ نَفْسِهِۦ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَاةُ۔ (۳/۹۲) "یہ تمام کھانے (جو اب مسلمانوں کے لئے حلال قرار دیئے گئے ہیں) بنی اسرائیل کے لئے بھی حلال تھے۔ سوائے اس کے جسے، تورات نازل ہونے سے پہلے، اسرائیل (یعقوبؑ) نے اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا۔" وہ چیز خدا کی طرف سے حرام قرار نہیں دی گئی تھی۔ حضرت یعقوبؑ نے اسے (کسی وجہ سے) از خود اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا یہودی یہ سمجھ بیٹھے کہ خدا کے نبی نے جو اسے اپنے آپ پر ممنوع قرار دے لیا تھا تو وہ خدا کی طرف سے حرام کی گئی ہوگی۔ اس واقعہ کے پیشِ نظر، اللہ تعالےٰ نے نبی اکرمؐ سے خاص طور پر کہہ دیا کہ آپ نے اس چیز کو محض ذاتی بے رغبتی یا کسی اور وجہ سے چھوڑ دیا اور اسے ایک معمولی بات سمجھا (عام حالات میں یہ بات ہے بھی معمولی سی) لیکن ہو سکتا ہے کہ (یہودیوں کی طرح) آپ کی اُمت کے افراط پسند لوگ اسے حرام کی فہرست میں داخل کرلیں۔ اس لئے آپ کے لئے ان معاملات میں خاص طور پر محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ اگر نبی، اپنے ذاتی میلان یا مصلحت کی بنا پر کسی حلال شے سے مجتنب رہے تو اس کے اتباع میں اس شے کو حرام سمجھ لینا، صحیح نہیں۔ حرام وہی ہے جسے اللہ تعالےٰ نے اپنی کتاب میں حرام قرار دیا ہو۔

یہ بحث ناتمام رہ جائے گی اگر ہم اس کے ساتھ سورۂ اعراف کی اس آیت کو بھی سامنے نہ لائیں جس

سورۂ اعراف کی ایک آیت

کا صحیح مفہوم سامنے نہ ہونے کی وجہ سے انسان ایک بنیادی غلطی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اُس آیت میں نبی اکرمؐ کی خصوصیاتِ کبریٰ کے

ضمن میں فرمایا کہ وَ یُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ - (۷/۱۵۷) "وہ ان کے لئے طیبات کو حلال قرار دے گا اور خبائث کو حرام ٹھہرائے گا۔"

اس آیت سے یہ استنباط کیا جاتا ہے کہ حلال و حرام قرار دینے کا اختیار نبی اکرمؐ کو بھی حاصل تھا۔

سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ جب

(۱)۔ اللہ تعالیٰ قرآن کے متعدد مقامات میں یہ کہتا ہے کہ حلت و حرمت کا حق صرف خدا کو ہے اور

(۲)۔ خود نبی اکرمؐ سے بہ نصِ صریح کہتا ہے کہ لِمَ تُحَرِّمُ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكَ - (۶۶/۱) "جس چیز کو اللہ نے تیرے لئے حلال قرار دیا ہے تو اُسے حرام کیوں قرار دیتا ہے۔"

تو اس کے بعد یہ سمجھنا بُنیادی طور پہ غلط ہے کہ حلت و حرمت کا اختیار نبی اکرمؐ کو بھی تھا۔ اصل یہ ہے کہ جو امور وحی کی رُو سے بیان ہوئے ہیں۔ قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ انہیں کبھی اللہ کی طرف منسوب کرتا ہے اور کبھی رسولؐ کی طرف (کیونکہ لوگوں تک وہ احکام رسول ہی کی وساطت سے پہنچتے تھے) اور مراد دونوں جگہ خدا کی وحی (یعنی قرآن کریم) ہوتا ہے۔ سورۂ بقرہ میں اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے جہاں ایک جگہ کہا ہے کہ وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ.... (۲/۸۹) جب ان کی طرف اللہ کے ہاں سے ایک کتاب آئی جو ان باتوں کو سچ کر دکھانے والی تھی جو ان کے پاس تھیں۔" اور دوسری جگہ ہے۔ وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ (۲/۱۰۱) دیکھئے۔ الفاظ دونوں آیتوں میں وہی ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک جگہ کتاب ہے اور دوسری جگہ رسول۔ اس سے ظاہر ہے کہ جہاں تک احکام و ہدایات کا تعلق ہے۔ خدا، وحی، کتاب، رسول، ایک ہی حقیقت کے مختلف گوشے ہیں۔ الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔

اس بنیادی اصول کے بعد اب آیت زیرِ نظر کو دیکھئے جہاں رسول کے متعلق کہا گیا ہے کہ وَیُحِلُّ لَهُمُ الطَّیِّبٰتِ وَیُحَرِّمُ عَلَیْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ - (۷/۱۵۷)۔ یعنی رسول ان کے لئے طیبات کو حلال کرتا ہے، اور خبائث کو حرام قرار دیتا ہے۔ لیکن سورۂ مائدہ میں ہے۔ یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ - (۵/۸۷) اے ایمان والو! جن طیبات کو اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے، انہیں حرام مت کرو۔" یہاں واضح طور پہ کہا گیا ہے کہ طیبات کو اللہ نے حلال قرار

دیا ہے۔ (اسی) سورۂ اعراف میں ہے۔ قُلْ اِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّیَ الْفَوَاحِشَ ...... (۷/۳۳) "اے رسول! ان سے کہہ دو کہ حقیقت یہ ہے کہ میرے رب نے ان پر فواحش حرام کئے ہیں"۔ یہاں خود رسول اللہ کی زبان مبارک سے کہلوایا گیا ہے کہ کسی شے کو حرام قرار دینا خدا کا کام ہے۔ اسی طرح سورۂ بقرہ میں ہے۔ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰو۔ (۲/۲۷۵)۔ اللہ نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربٰو کو حرام"۔

لہٰذا، قرآن نے جہاں حلت و حرمت کو رسول اللہ کی طرف منسوب کیا ہے اس سے بھی مراد خدا کی وحی ہے جو قرآن میں محفوظ ہے۔ اس سلسلہ میں سورۂ توبہ کی اس آیت کا صحیح مفہوم سمجھ لینا بھی ضروری ہے جس میں کہا گیا ہے۔

مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ کا مفہوم

قَاتِلُوا الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَلَا يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ...... (۹/۲۹)

(اہلِ کتاب میں سے) جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے اور اللہ اور اس کے رسول نے جسے حرام ٹھہرایا ہے اسے حرام نہیں سمجھتے، ان سے جنگ کرو۔"

اس آیت سے بھی یہ مستنبط کیا جاتا ہے کہ حرام قرار دینے کا اختیار اللہ اور اس کے رسول دونوں کو ہے۔ ہم اس وقت اس تفصیل میں نہیں جانا چاہتے کہ قرآن میں جہاں "اللہ اور رسول" کے الفاظ اکٹھے آتے ہیں۔ وہاں اس سے مراد کیا ہوتی ہے۔ (اس حقیقت کو متعدد مقامات میں واضح کیا جا چکا ہے[۱])۔ اس آیت میں يُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ سے مراد حرام قرار دینا نہیں۔ عربی زبان میں اور قرآن کریم میں حَرَّمَ کا لفظ کسی بات کو واجب اور لازم قرار دینے کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ انعام میں ہے۔

قُلْ تَعَالَوْا اَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ اَلَّا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْئًا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا وَلَا تَقْتُلُوْا اَوْلَادَكُمْ مِّنْ اِمْلَاقٍ .... وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ..... (۶/۱۵۲)

اس آیت میں حَرَّمَ کے معنی "حرام قرار دیا" کرنے سے سارا مطلب ہی الٹ جاتا ہے۔ (مثلاً یہ کہنا کہ

---

[۱] اس سے مراد اسلامی نظامِ حکومت ہے جو خدا کے احکام نافذ کرنے کے لئے متشکل ہوتا ہے اور جسے سب سے پہلے نبی اکرم نے قائم فرمایا تھا۔

اللہ نے والدین پر احسان کرنا حرام قرار دیا ہے، بالکل غلط ہے) یہاں حَرَّمَ کے معنی واجب ٹھہرانے کے ہیں۔
اس اعتبار سے آیت کا ترجمہ یہ ہے کہ

'ان سے کہو کہ آؤ، میں تمہیں پڑھ کر سناؤں کہ تمہارے رب نے تم پر کیا کیا واجب قرار دیا ہے۔ یہ کہ تم اس کے ساتھ کسی کو شریک مت ٹھہراؤ۔ اور والدین کے ساتھ احسان کرو اور یہ کہ اولاد کو مفلسی کی وجہ سے تباہ نہ کرو۔ اور فواحش کے قریب مت جاؤ۔''

لہٰذا سورۂ توبہ کی (مندرجہ بالا) آیت (وَلَا یُحَرِّمُوْنَ مَا حَرَّمَ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ) کے معنی یہ ہیں کہ جن باتوں کو اللہ اور اس کا رسولؐ واجب قرار دیتے ہیں (ان کے کرنے کا حکم دیتے ہیں) یہ انہیں اپنے اوپر واجب نہیں قرار دیتے۔ یہ لوگ اسلامی نظام کے اندر رہتے ہوئے اس کے قوانین سے انحراف کرتے ہیں۔ ان سے جنگ کی جائے گی تاآنکہ یہ اپنی اس روش کو چھوڑ کر، اسلامی حکومت کی رعایا کی حیثیت سے رہنے پر رضامند ہو جائیں۔

ان تصریحات سے واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے

(۱)۔ حرام و حلال کا اختیار صرف خدا کو ہے۔

(۲)۔ جن چیزوں کو یا امور کو خدا نے حرام قرار دینا تھا۔ ان کی تصریح قرآن میں کر دی گئی ہے۔

(۳)۔ خدا کے علاوہ یہ اختیار کسی اور کو نہیں۔

سنگین جرم

قرآن کریم نے اس بات کو سنگین جرم قرار دیا ہے کہ جن چیزوں کو اس نے حلال قرار دیا ہے (یعنی حرام نہیں ٹھہرایا) انہیں حرام قرار دے دیا جائے۔ اس نے تاکیداً کہہ دیا کہ:

یَاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَیِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰہُ لَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۔ (۵/۸۷)

اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں جنہیں اللہ نے تمہارے لئے حلال قرار دیا ہے انہیں حرام مت ٹھہراؤ۔ اور (اس طرح) حد سے نہ بڑھو۔ اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

یعنی حلال کو حرام قرار دینا، انسان کے اپنے اختیارات کی حد سے آگے بڑھ جانا ہے اس لئے کہ جیسا کہ شروع میں

کہا جا چکا ہے کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے انسانوں کی آزادی کو سلب کرے۔ دوسری جگہ اس سے بھی زیادہ تاکید کے ساتھ کہا کہ

وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُکُمُ الْکَذِبَ ھٰذَا حَلٰلٌ وَّ ھٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰہِ الْکَذِبَ ..... (۱۶/۱۱۶)

اور جو تمہاری زبانیں یونہی بیان کر دیتی ہیں کہ یہ حلال ہے اور یہ حرام تاکہ اللہ پہ محض بہتان باندھو۔ ایسی بات مت کیا کرو۔

یہاں قرآن نے بتایا کہ جو مذہبی پیشوا حرام و حلال کی فہرستیں تیار کرنے بیٹھ جاتے ہیں۔ دل سے وہ بھی جانتے ہیں کہ یہ اختیار خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں (لیکن وہ سمجھتے ہیں کہ اگر ہم نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے اسے حرام قرار دیا ہے تو لوگ اسے مانیں گے نہیں، اس لئے وہ یہ نہیں کہتے کہ ان چیزوں کو ہم نے حرام یا حلال ٹھہرایا ہے۔ وہ

اِفْتَرٰی عَلَی اللّٰہ

کہتے ہیں کہ یہ سب "شریعتِ خداوندی" کے مطابق ہے) اس طرح یہ لوگ خدا کی طرف ایسی باتیں منسوب کرتے ہیں جو اس نے کبھی نہیں کہیں۔ یہ افترا ہے۔ کذب ہے۔ بہتانِ عظیم ہے۔ ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ

قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا اَنْزَلَ اللّٰہُ لَکُمْ مِّنْ رِّزْقٍ فَجَعَلْتُمْ مِّنْہُ حَرَامًا وَّحَلٰلًا ؕ قُلْ آٰللّٰہُ اَذِنَ لَکُمْ اَمْ عَلَى اللّٰہِ تَفْتَرُوْنَ۔ (۱۰/۵۹)

ان سے کہو کہ کیا تم اس پہ غور کرتے ہو کہ اللہ نے جو کچھ تمہارے لئے بطور رزق نازل کیا ہے۔ تم اس میں سے کسی کو حرام قرار دیتے ہو کسی کو حلال۔ ان سے پوچھو کہ کیا اللہ نے تمہیں اس کی اجازت دے رکھی ہے۔ (کہ جسے چاہو حرام قرار دے دو اور جسے چاہو حلال کر دو۔) یا تم اللہ پہ افترا باندھتے ہو۔

قرآن کا کہنا یہ ہے کہ اللہ نے کسی انسان کو اس کی اجازت نہیں دی کہ وہ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ خدا پہ افترا باندھتا ہے۔

یہودیوں کو سزا

قرآن یہ بھی بتاتا ہے کہ بعض (حلال) چیزیں یہودیوں پہ بطور سزا حرام قرار دے دی گئی تھیں۔ سورۂ انعام میں ہے۔

وَعَلَى الَّذِیْنَ ھَادُوْا حَرَّمْنَا کُلَّ ذِیْ ظُفُرٍ ..... ذٰلِکَ جَزَیْنٰھُمْ

بِبَغْيِهِمْ .... (۶/۱۴۷)

اور ہم نے یہودیوں پر سب ناخن والے جانور (پرندے) حرام قرار دے دیئے تھے اور گائے اور بکریوں کی چربی بھی حرام کر دی تھی۔ بجز اس کے جو ان کی پیٹھ کے ساتھ یا انتڑیوں کے ساتھ یا ہڈی کے ساتھ لگی ہوئی ہو۔ یہ ہم نے انہیں ان کی بغاوت کی سزا دی تھی۔ (۶/۱۴۷)

سورۂ نساء میں ہے:

فَبِظُلْمٍ مِنَ الَّذِينَ هَادُوا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ أُحِلَّتْ لَهُمْ .... (۴/۱۶۰)

یہودیوں کی زیادتی کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ خوشگوار چیزیں جو ان کے لئے حلال تھیں حرام قرار دے دیں۔

(اس کے بعد ان کی ان زیادتیوں کی تفصیل دی گئی ہے جن کی سزا کے طور پر ان پر حلال چیزیں حرام قرار دی گئی تھیں) سورۂ نحل میں کہا ہے کہ یہ حکم خدا کی طرف سے ظلم نہیں تھا۔ انہوں نے خود اپنے آپ پر ظلم کیا تھا جو اس سزا کے مستوجب قرار پا گئے (۱۶/۱۱۸) اس سے ظاہر ہے کہ جن چیزوں کو خدا نے حرام قرار نہیں دیا انہیں حرام قرار دے دینا؟ لوگوں کو سزا دینا ہے۔ یہودیوں کو اس سزا سے نجات دلانے کے لئے حضرت عیسیٰؑ تشریف لائے۔ چنانچہ آپؑ نے ان سے کہا کہ میری بعثت کا مقصد یہ ہے۔

وَلِأُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ الَّذِي حُرِّمَ عَلَيْكُمْ ..... (۳/۵۰)

تاکہ جو چیزیں تم پر حرام قرار دے دی گئی ہیں۔ ان میں سے بعض کو حلال قرار دوں۔

یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کی مخالفت کی اور اس طرح اپنی سزا کی زنجیروں کو خود اپنے ہاتھوں سے مضبوط کر لیا۔ آپ کے بعد نبی اکرمؐ تشریف لائے اور اللہ تعالیٰ نے آپ کی بعثت کا مقصد یہی بتایا کہ:

وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبٰتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ الْخَبٰٓئِثَ ..... (۷/۱۵۷)

وہ ان کے لئے پاکیزہ چیزیں حلال کرے گا۔ اور خبیث چیزوں کو حرام قرار دے گا۔

لیکن انہوں نے قرآن کی مخالفت کی اور اس طرح اپنی خود ساختہ زنجیروں میں جکڑے رہنا پسند کیا۔ جن میں وہ اب تک ماخوذ ہیں۔

توہم پرستی

اہلِ کتاب نے علماء اور مشائخ (احبار و رہبان) کے فتاویٰ کے مطابق حرام وحلال کی فہرستیں مرتب کر رکھی تھیں۔ جن کے لئے خدا کی کوئی سند ان کے پاس نہیں تھی۔ باقی رہے مشرکینِ عرب۔ سو ان کے ہاں حرام وحلال کے متعلق کچھ باتیں وراثتاً چلی آتی تھیں۔ جو محض توہم پرستی پر مبنی تھیں۔ قرآن نے ان کی بھی مخالفت کی۔ مویشیوں میں سے فُلاں حرام ہے۔ کھیتی میں سے یہ منع ہے، سواری کے جانوروں میں سے فلاں فلاں پر چڑھنا ناجائز ہے (۶/۱۳۸) فلاں چیز مردوں کے لئے حلال ہے اور عورتوں کے لئے حرام (۶/۱۳۹) اونٹنی اس قسم کا بچہ دے تو وہ حرام ہے۔ گائے کے فلاں فلاں بچے حرام ہیں۔ (۶/۱۴۴) ان سے کہا گیا کہ یہ سب فہرستیں تمہاری یا تمہارے آباؤ واجداد کی مرتب کردہ ہیں۔ (۶/۱۴۸) تم اللہ کی طرف ان کی نسبت یونہی کرتے ہو۔ (۶/۱۴۱) اس کے لئے انہیں چیلنج دیا گیا۔ کہ اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ یہ خدا کی طرف سے حرام کردہ ہیں تو اس دعوے کے ثبوت میں گواہ لاؤ۔ (۶/۱۵۰)

سند صرف قرآن کی ہے

اِن تصریحات سے بھی واضح ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے حرام وحلال کے لئے سند صرف حکمِ خداوندی کی ہے۔ اس کے علاوہ کچھ اور سند اور کوئی اور اتھارٹی نہیں۔

کھانے پینے کے علاوہ، قرآن نے رشتے ناطے کے متعلق بھی بالتصریح بتا دیا ہے کہ کونسا حلال ہے اور کونسا حرام۔ سورۂ نساء کی آیات ۲۴-۲۲ میں ان کی فہرست دی ہوئی ہے۔

یہ ہے قرآن کی رُو سے حِلّت و حُرمت کی پوزیشن۔ جس سے واضح ہے کہ کسی چیز کے متعلق یہ کہنے کے لئے کہ وہ حرام ہے قرآن کی سند پیش کی جانی ضروری ہے۔

ہنگامی تقاضے

آخر میں اتنا اور کہہ دینا بھی ضروری ہے کہ ہو سکتا ہے کہ اسلامی نظام، کسی ہنگامی مصلحت یا ضرورت کے ماتحت، کسی شے کا استعمال عارضی طور پر ممنوع قرار دے دے۔ مثلاً برسات (یا ہیضے) کے زمانہ میں ہیلتھ آفیسر حکم دے دیتا ہے کہ شہر میں امرود یا کھیرے کا استعمال ممنوع ہے، یا جنگ کے زمانے میں حکومت فیصلہ کر دیتی ہے کہ سول آبادی کے لئے فلاں چیز کا استعمال ممنوع ہے۔ کیونکہ فوجی ضرورت شدید ہے، وقس علیٰ ذالک۔ ہو سکتا ہے کہ سب سے پہلے اسلامی نظام نے (نبی اکرمؐ اور خلافتِ راشدہ کے زمانے میں) بعض چیزوں کے استعمال کو اسی طرح ممنوع قرار دیا ہو۔ لیکن ظاہر ہے کہ اس طرح کسی شے کے استعمال کو ممنوع قرار دینے اور کسی شے کو ابدی طور پر

حرام قرار دینے میں بنیادی فرق ہے۔ کسی شے کو ابدی طور پر حرام قرار دینے کا اختیار خدا کے سوا کسی کو نہیں۔ لٰہذا وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَا تَصِفُ اَلْسِنَتُكُمُ الْكَذِبَ هٰذَا حَلٰلٌ وَّ هٰذَا حَرَامٌ لِّتَفْتَرُوْا عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ اِنَّ الَّذِيْنَ يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا يُفْلِحُوْنَ ۔ (۱۱۶/۱۶) (۱۹۵۹ء)

۳۔ حُرمتِ شراب

کینیڈا سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ قرآن کریم نے شراب کو حرام قرار نہیں دیا ہے۔ اس لئے اس کے استعمال میں کیا ہرج ہے؟

جواب: قرآن کریم نے خمر (شراب) کے متعلق کہا ہے۔ کہ وہ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ ہے۔ یعنی ناپاک ہے اور شیطانی کام۔ اس کے بعد ہے فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۵/۹۰) اس سے اجتناب کرو تاکہ تم کامیاب ہو۔ اس کے بعد ہے کہ شیطان چاہتا ہے کہ خمر (اور میسر) سے تمہارے اندر عداوت اور بغض پیدا کر دے اور تمہیں اللہ کے ذکر اور صلوٰۃ سے روک دے۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝ (۵/۹۱) سو بتاؤ کہ تم ان سے باز رہتے ہو یا نہیں؟

ہم پوچھنا یہ چاہتے ہیں کہ خمر کے بارے میں خدا کا منشاء اور حکم معلوم کرنے کے لئے اس سے زیادہ وضاحت کی بھی ضرورت ہے؟ قرآن کریم کی ان تصریحات کی موجودگی میں جو شخص اس کا استعمال کرتا ہے وہ خدا کے حکم کی خلاف ورزی نہیں کرتا تو اور کیا کرتا ہے؟

قرآن کریم نے بعض چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ بعض کے متعلق کہا ہے کہ وہ اِثْمٌ ہیں۔ عدوان ہیں۔ کہیں کہا ہے کہ ان چیزوں سے مجتنب رہو۔ ان کے قریب تک نہ جاؤ۔ ظاہر ہے کہ قانون کی رُو سے مختلف جرموں کی سزائیں مختلف ہوتی ہیں۔ یہ امتیازات قانونی سزاؤں کے متعلق ہیں۔ جب اسلامی ضابطہ قوانین مرتب کیا جائے۔ تو اس وقت یہ دیکھنا ہوگا کہ فلاں جرم کو قرآن کریم نے کس درجہ میں رکھا ہے، اس کے مطابق اس کی سزا مقرر کی جائے گی۔

لہٰذا اگر قرآن کریم نے خمر کے لئے حرام کا لفظ استعمال نہیں کیا تو اس سے یہ جائز نہیں قرار پا جاتی۔ یہ ممنوع ہے، اور جس چیز کو خدا نے ممنوع قرار دیا ہے اس کا استعمال حکم خداوندی کی خلاف ورزی ہے اور اسے جائز سمجھنا قرآن سے انکار کے مترادف ہے۔

(۱۹۶۱ء)

شراب کا استعمال بطور دوائی

پچھلے دسمبر میں ہم نے بابُ المرسلات کے تحت امتناعِ شراب کے قرآنی حکم کی توضیح کی تھی۔ اس سلسلہ میں مقامی میڈیکل کالج کے ایک طالب علم نے لکھا ہے کہ شراب کئی دواؤں کا جزُو ہے، اور وہ دوائیں کئی امراض میں مُفید اور مجرّب ثابت ہوئی ہیں۔ چنانچہ وہ پوچھتے ہیں کہ کیا شراب کا یہ استعمال جائز ہے یا نہیں؟

جواب:۔ اس قسم کے استفسارات ہمارے پاس اکثر و بیشتر آتے رہتے ہیں اور ہم اُن کا جواب دینے میں تامّل برتتے ہیں۔ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ ہمارے تصوّر کے مطابق دین کوئی ذاتی شے نہیں، یہ ایک اجتماعی نظام ہے، اور اجتماعی نظام سے متعلق امور کا فیصلہ مفتیانہ حیثیت سے نہیں کیا جاتا۔ قانونی حیثیت سے کیا جاتا ہے۔ مثلاً قرآن نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے، اسلامی حکومت میں ان کا استعمال قانونی جرم بھی ہوتا ہے۔ جب وہ حکومت اس کے متعلق قانون مرتب کرے گی تو وہ اس جرم سے متعلق تمام تفاصیل۔ اس کے تضمنات، اس کے عواقب اور مخصوص حالات میں مستثنیات وغیرہ سب کا ذکر کرے گی۔ اس کے بعد اس جرم کے متعلق ان تمام امور کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جائے گا۔ قرآن نے اضطراری حالت میں حرام اشیاء کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔ اضطراری حالت کسے کہتے ہیں؟ اس حالت میں ممنوع اشیاء کا استعمال کس حد تک جائز ہوگا؟ وغیرہ۔ یہ تمام امور بھی قانون سے متعلق ہیں۔ اور قانون ہی اس کا صحیح صحیح تعین کرے گا۔ اس میں نہ کسی فرد سے فتوے مانگنے کی ضرورت ہوگی اور نہ کسی کو فتوے دینے کا حق ہی ہوگا۔ بجز ان ذمہ دار لوگوں کے جن کو خود حکومت نے ان کاموں کے لئے مامور کیا ہوگا۔ اس اصول کی روشنی میں زیرِ نظر استفسار کا جواب خود بخود مل جاتا ہے۔ البتہ اس کے بعد سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی جگہ اسلامی قانون رائج نہ ہو تو انفرادی طور پر ان احکام کی پابندی کس طرح کی جائے۔ شراب کی ممانعت کے متعلق ہم گذشتہ صفحات میں تفصیل سے لکھ چکے ہیں۔ اس کی اجازت اضطراری حالت ہی میں دی جا سکتی ہے۔ بیماری کی حالت، اضطراری حالت ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کا فیصلہ کہ کس بیماری اور بیماری کی کس حالت میں شراب کا یا کسی ایسی دوائی کا جس میں شراب کی آمیزش ہو، استعمال ناگزیر ہو جاتا ہے۔ صرف ایک ڈاکٹر ہی کر سکتا ہے۔

(۱۹۵۳ء)

الکحل کا استعمال دوا سازی میں

کراچی سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ :-

میں انگریزی دوا سازی کی صنعت قائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں۔ مگر درمیان میں ایک بزرگ نے یہ کہہ کر روک دیا ہے کہ ان ادویات میں الکحل استعمال ہوتی ہے۔ لہذا ان کا بنانا اور بیچنا ناجائز ہے۔ کیا آپ بتائیں گے کہ کیا الکحل (جبکہ اس کو نشہ کے علاوہ کسی دیگر ضرورت کے لئے استعمال کیا جائے) کا تیار کرنا۔ خریدنا اور بیچنا ناجائز ہے؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں اور جائز ہے تو کیوں؟

۲- اگر الکحل کی تجارت ناجائز ہے تو کیا جن چیزوں میں الکحل شامل ہے ان کی تجارت بھی ناجائز ہے؟ اگر ناجائز ہے تو کیوں؟ حالانکہ سرکہ میں بھی الکحل کے اجزاء موجود ہیں اور شریعت میں وہ متفقہ طور پر حلال ہے۔

۳- اگر ان ادویات کا تیار کرنا جن میں الکحل شامل ہے، ناجائز ہے، تو کیا ان کا استعمال جائز ہے؟ اگر جائز ہے تو کیوں، اور اگر جائز نہیں تو کیوں؟

طلوعِ اسلام قرآن نے جن چیزوں سے منع کیا ہے۔ ان کے متعلق ضمنی قوانین مرتب کرنا قرآنی نظام کا کام ہوگا۔ وہی یہ متعین کرے گا۔ کہ اضطراری حالات کونسے ہیں۔ اور ان حالات میں ان چیزوں کے استعمال کی اجازت کس حد تک دی جا سکتی ہے۔ اس نظام کی عدم موجودگی میں افراد کے فتاویٰ کوئی حیثیت نہیں رکھتے۔

قرآن نے خمر کے استعمال کو ناجائز قرار دیا ہے۔ اس نے کہا ہے۔ کہ اس میں فائدے بھی ہیں اور نقصان بھی۔ لیکن اس کے نقصانات اس کے فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔ لہذا (بجز ان اضطراری حالات کے جن میں قرآن نے حرام چیزوں کے کھانے پینے کی اجازت دی ہے) شراب پینا قطعاً ناجائز ہوگا۔ اب سوال یہ ہے کہ دوا سازی کے کام میں الکحل کے استعمال کے متعلق کیا سمجھنا چاہیئے۔ سو ظاہر ہے۔ کہ اگر ان دوائیوں کا استعمال جن میں الکحل پڑی ہو۔ جائز قرار پائے تو دوا سازی کے لئے اس کا استعمال بھی جائز ہوگا۔ ایلوپیتھی اور ہومیوپیتھی کی بیشتر دوائیاں الکحل میں بنتی ہیں، اور ان دوائیوں کا استعمال عام ہو رہا ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ اسلامی نظام ان دوائیوں کے استعمال کو ناجائز قرار نہیں دے گا۔

بہر حال جیسا کہ ہم نے شروع میں لکھا ہے یہ ایسے سوالات ہیں ۔ جن کے متعلق قرآنی نظام ہی فیصلہ کُن حکم دے سکتا ہے ۔ افراد کی آرا، شرعی فیصلہ کی حیثیت اختیار نہیں کر سکتیں ۔ (۱۹۵۵ء)

میسرہ

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ گھوڑ دوڑ (RACES) میں جو لوگ بازی لگاتے ہیں ۔ اس کی بابت کیا حکم ہے ؟ ۔ ایک دوسرے صاحب پوچھتے ہیں کہ آج کل یہ عام رواج ہوتا جارہا ہے کہ انعامی طریق کے ٹکٹ پر لاٹری ڈالتے ہیں ۔ اور پھر کسی بڑے معزز لیڈر سے لاٹری نکلوا کر اشیائے متعلقہ تقسیم کرتے ہیں ۔ اس کے متعلق قرآن کا کیا حکم ہے ؟

جواب :۔ بازی لگانا ۔ خواہ وہ گھوڑ دوڑ کے میدان میں ہو، خواہ کھانے کی میز پر برج (BRIDGE) کے نام سے قمار بازی میں داخل ہیں ۔ جسے قرآن میسرہ کہتا ہے اور (رجس من عمل الشیطان) قرار دے کر اس سے اجتناب کا حکم دیتا ہے (۵/۹۰) باقی رہا قرعہ اندازی کے ذریعہ لاٹری نکالنا ۔ سو یہ بعینہٖ وہ شکل ہے، جسے ایامِ جاہلیت میں میسرہ کہتے تھے ۔ ان کے ہاں رواج تھا کہ اونٹ ذبح کر کے اس کے گوشت کے حصے کر لیتے ۔ پھر دس تیر لے کر انہیں اسی طرح مخلوط کر دیتے، جس طرح لاٹری کے ٹکٹوں کو باہم گڈمڈ کر دیتے ہیں ۔ پھر ایک حکم کے ذریعہ تیروں سے نمبر نکالتے، اور اس کے مطابق گوشت کی تقسیم کرتے ۔ جس کا نمبر خالی نکلتا اُسے تمام گوشت کی قیمت ادا کرنی پڑتی ۔ سو یہ چیز نہ صرف اپنی اصل کے اعتبار سے، بلکہ ٹکنیک کی رُو سے بھی بالکل وہی ہے، جسے آج کل قرعہ اندازی سے لاٹری نکالنا کہتے ہیں ۔ اسی قسم کے اور تیر، یا پانسے ہوتے تھے جنہیں ازلام کہا جاتا تھا، ان سے بھی چیزوں کی تقسیم کیا کرتے یا فال لیا کرتے تھے (دیکھئے ۵/۳ اور ۵/۹۰) لیکن آج کل ہماری حالت یہ ہے کہ پانسوں سے پیسوں کا جوا کھیلنے والے سوسائٹی میں جواری کہلاتے ہیں، اور آئے دن پولیس ان کے جوئے خانوں پر چھاپے مارتی رہتی ہے لیکن گھوڑ دوڑ کے میدانوں میں یا برج کی میز پر ہزاروں روپوں سے وہی کچھ کرتے والے سوسائٹی میں سب سے معتبر شمار کئے جاتے ہیں، اور قرعہ اندازی سے لاٹریاں نکالنا تو ایسا "مقدس" طریق قرار پاگیا ہے کہ شاید ہی کوئی ایسا "اسلامی" اجتماع ہوتا ہوگا جس میں لاٹری کے ذریعہ جاذبیت نہ پیدا کی جائے ۔ اور یہ متبرک رسم مبارک ہاتھوں سے سرانجام نہ دلائی جائے، قمار بازی کے یہ تمام انداز ہماری مہذب سوسائٹی کے فیشن میں داخل ہیں، اور ان کے خلاف لب کشائی کرنے والا "دقیانوسی" ۔ لیکن ان مہذب جواریوں کو یہ کون بتائے

نام بدل دینے سے اشیاء کی حقیقت نہیں بدل جایا کرتی۔ شراب، شراب ہی رہتی ہے۔ خواہ اُسے (DRINKS) کہہ کر ہی کیوں نہ پکارا جائے اور جوا، جوا ہی ہوتا ہے خواہ اسے برج یا لاٹری کے نام کیوں نہ دے دیئے جائیں۔

پھر اس پر بھی غور کیجئے کہ جس طرح قرآن نے شراب کے لئے خمر کا لفظ استعمال کر کے ہر اس چیز سے اجتناب کا حکم دے دیا۔ جس سے عقل پہ پردہ پڑ جائے (خمر کے معنی ڈھانپنے کا کپڑا یا اوڑھنی ہے) اسی طرح اس نے میسر کے لفظ سے ایک بہت بڑے اصول کی طرف اشارہ کیا ہے۔ میسر کا مادہ یُسر ہے اور یُسر کے معنی آسانی ہیں، لہٰذا میسر ہر وہ مال ہے جو آسانی سے ہاتھ آ جائے۔ قمار بازی تو اس کی ایک شکل ہے، باقی تفصیل آپ خود سمجھ لیجئے۔ (۱۹۵۳ء)

سینما دیکھنا کیسا ہے؟

ایک صاحب دریافت کرتے ہیں۔ کہ سینما دیکھنا جائز ہے یا ناجائز۔ اور اسے بہتر کس طرح بنایا جا سکتا ہے۔

جواباً عرض ہے کہ سینما بجائے خویش نہ جائز ہے نہ ناجائز۔ سینما معلومات میں اضافہ کرنے، خیالات پھیلانے یا جذبات کو اُبھارنے کا ذریعہ ہے۔ اگر وہ معلومات مفید، خیالات نیک اور جذبات صالح ہوں تو سینما جائز ہی نہیں۔ بلکہ تعلیم و تربیت کا ایک عمدہ ذریعہ بن سکتا ہے۔ لیکن اگر یہ چیزیں ایسی ہوں۔ جن سے قلبی اور ذہنی صلاحیتیں بگڑتی اور اخلاق خراب ہوتے ہوں، تو سینما بے حد مذموم اور مسموم ہے۔ اور یہ چیز سینما تک ہی محدود نہیں۔ جتنی چیزیں مقصود بالذات نہیں، بلکہ کسی مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں، ان سب کی یہی کیفیت ہے۔ مثلاً دولت یا قوت، اگر تعمیرِ انسانیت کے کاموں میں صرف ہوتی ہے، تو بڑی مستحسن ہے۔ اگر اس کا نتیجہ تخریب ہے تو سخت معیوب ہے۔

جس قوم کے سامنے زندگی کا بلند مقصد ہو، وہاں سینما یا اس قسم کے نشر و اشاعت کے اور ذرائع، اس مقصد کے حصول کے لئے استعمال کئے جاتے ہیں۔ لیکن جہاں یہ شکل نہ ہو۔ وہاں یہ صرف کاروباری (کمرشل) جنس بن جاتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ جب کوئی چیز کاروباری سطح پہ آ جائے، تو اس میں کسی بلند مقصد کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لئے کہ کاروبار چلانے والے کے سامنے اپنے مفاد کے علاوہ کوئی اور مقصد ہو نہیں سکتا۔ وہ وہی مال منڈی میں لائے گا۔ جس کے زیادہ خریدار ہوں۔ اس طرح سینما، عوام کے ذوق یا جذبات کی تسکین فراہم کرنے کا ذریعہ بن جائے گا۔ یہی حالت پریس کی ہے جو سینما سے بھی زیادہ مؤثر ذریعہ نشر و اشاعت ہے، قوم کے سامنے مقصد ہوگا تو پریس عوام کے ذہن کی سطح بلند کرتے ہوئے، انہیں اس مقصد کی طرف لے جائے گا۔ اگر اس کی حیثیت کاروباری

ہوگی۔ تو وہ عوام کے رجحانات کا ساتھ دے گا اور انہی کے جذبات کی ترجمانی کرے گا۔ خواہ وہ رجحانات و جذبات کیسے ہی کیوں نہ ہوں۔ جو شخص اس مقصد کو لے کر میدان میں آئے گا۔ کہ وہ عوام کے غلط رجحانات و جذبات کی اصلاح کرے ان میں صحیح تبدیلی پیدا کرے، اور ان کی قلبی و ذہنی سطح بلند کرے، ان میں صحیح اور غلط کے پرکھنے کی صلاحیت پیدا کر دے، اسے قدم قدم پر سخت موانع درپیش ہوں گے۔ اسے ساتھی بہت کم ملیں گے اور مخالفت بڑی شدید ہوگی۔ اس لئے اکثر و بیشتر ہوگا یہ کہ وہ ہمت ہار کر بیٹھ جائے گا۔

لہٰذا سینما ہو یا اسی قسم کے نشر و اشاعت کے دیگر ذرائع۔ انہیں انفرادی کاروباری سطح پر نہیں ہونا چاہیئے۔ اصل یہ ہے کہ ایک نومولود بچے کی پرورش کی طرح ایک نومولود قوم کی تربیت کے سلسلے میں کاروباری ذہنیت تباہ کن ہوتی ہے، اس میں لاگت اور بازیافت (RETURN) کا حساب ہی نہیں ہونا چاہیئے۔ اس میں خرچ برابر کیا جائے گا۔ اور "آمدن" کے لئے یہ دیکھا جائے گا کہ اس بچے کی کس قدر پرورش اور اس قوم کی کس حد تک تربیت ہو رہی ہے، اس کے لئے ذہنیت مادرانہ ہونی چاہیئے۔ نہ کہ تاجرانہ، مادرانہ ذہنیت معاوضہ کے خیال کے بغیر، ایثار کی حامل ہوتی ہے۔ قرآن ایسا نظام (دین) تجویز کرتا ہے، جس میں معاشرہ کا افراد کے ساتھ اسی قسم کا تعلق ہوتا ہے۔ وہ جس طرح افراد کی طبیعی پرورش کا بلا معاوضہ کفیل ہوتا ہے، اسی طرح ان کی تعلیم و تربیت کا بھی ذمہ دار ہوتا ہے۔ وہ ذرائع رزق اور ذرائع تربیتِ قلب و دماغ کو تعمیرِ افراد کے لئے استعمال کرتا ہے۔ اور چونکہ اس کے سامنے زندگی کا نصب العین خدا کا مقرر کردہ ہوتا ہے، اس لئے اس کی تمام جدوجہد کا رُخ اُسی نصب العین کی طرف ہوتا ہے، اس کا یہی نصب العین ہے جو اُسے دنیا کے دوسرے نظاموں سے منفرد اور الگ کرتا ہے۔ غیر خداوندی نظاموں میں جب ذرائع رزق، اور اسبابِ نشر و اشاعت معاشرہ کے کنٹرول میں ہوں۔ تو افراد کی آزادی کا گلا گھٹ جاتا ہے، لیکن اسلامی نظام کے نصب العین کی بلندی انہی ذرائع کو افراد کی فکر و نظر کی صلاحیتوں کی نشو و نما کا ضامن بنا دیتی ہے۔ اسے نظامِ ربوبیت کہتے ہیں۔ یعنی عالمگیر انسانیت کی طبیعی، اور انسانی صلاحیتوں کی نشو و نما کا ذمہ دار نظام۔ ان تمام خرابیوں کی اصلاح کا یہی واحد طریق ہے جو آج کل دُنیا میں ذرائع نشر و اشاعت کے غلط استعمال سے پیدا ہوئی ہیں۔ (۱۹۶۱ء)

موسیقی کے متعلق فتوے

ہفتہ وار "صدقِ جدید"، (لکھنؤ) کی ۲۷ر فروری ۱۹۵۹ء کی اشاعت (کے باب المرسلات) میں ایک صاحب نے موسیقی اور مزامیر کے جواز اور عدمِ جواز کے متعلق چند سوالات کئے ہیں۔ جن کے جواب میں صدق نے حسب ذیل نوٹ لکھا ہے:۔

"مراسلہ نگار بالآخر جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہی صحیح ہے، افراط و تفریط سے پاک یگانا جیسا کہ وہ مروّج ہے شریعت اسلامی کے مزاج میں کوئی دخل نہیں رکھتا، وہ صرف محرّب اخلاق قسم کے لہو ولعب میں آتا ہے، اور بطور پیشہ اور فن کے اس کو استعمال کرنا تو بالکل ہی ناجائز ہے۔

البتہ جہاں مقصود محض اپنی تفریح اور دل بہلاؤ ہو۔ اور جو اخلاقی خرابیوں سے خالی ہو، یا شادی وغیرہ کے موقع پر محض وقتی طور پر ہو ایسی صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں، بہ قول مراسلہ نگار صاحب کے یہ مواقع توسّع اور چشم پوشی کے ہیں۔

باجوں (مزامیر) میں دف کے مستثنیٰ کرنے کے کوئی معنی نہیں، ملک کا ہر سادہ مروّج باجا اس کے ذیل میں آسکتا ہے۔ البتہ باجوں میں بھی وہی احتیاط چاہیئے، جو باجہ جتنا زیادہ سادہ ہوگا۔ اباحت کے قریب ہوگا اور جتنا زیادہ مقتضیات فن وصناعت کے لحاظ سے آراستہ و پیراستہ ہوا اتنا ہی حدود اباحت سے دور ہوتا جائے گا۔"

طلوعِ اسلام

اس ضمن میں دو ایک باتیں غور طلب ہیں۔ سب سے پہلے یہ کہ پوچھنے والے ان حضرات سے پوچھتے ہیں کہ فلاں بات کے متعلق اسلام کا کیا حکم ہے؟ اس کے جواب میں کہنا یہ چاہیئے کہ اس باب میں خدا کا یہ حکم ہے۔ لیکن آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات اپنے جوابات میں کہیں خدا کے حکم کا ذکر نہیں کریں گے، ہمیشہ یہ کہیں گے کہ فلاں چیز جائز ہے اور فلاں ناجائز ہے، سوال یہ ہے کہ کسی انسان کو اس کا کیا حق حاصل ہے کہ وہ اشیاء کے جائز و ناجائز ہونے کے فیصلے کرے، اور اس طرح لوگوں کو اپنے فیصلوں کا پابند بنائے؟ نہ صرف یہ بلکہ اپنے فیصلوں کو اسلام کا فیصلہ اور دین کا حکم قرار دے۔ جس خدا نے انسانوں کے لئے اسلام کو بطور دین تجویز کیا تھا۔ اُسی نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ وَمَا اخْتَلَفْتُمْ فِيهِ مِنْ شَيْءٍ فَحُكْمُهُ إِلَى اللَّهِ (۴۲/۱۰) "جس بات میں تمہیں اختلاف ہو اس میں فیصلہ کن حکم خدا کا ہوگا۔"

دوسری چیز خود اس "فتویٰ" سے متعلق ہے جسے محترم مدیرِ صدق نے صادر فرمایا ہے۔ یعنی یہ کہ

جو باجہ جتنا زیادہ سادہ ہوگا۔ اباحت کے قریب ہوگا۔ اور جو جتنا زیادہ مقتضیات

فن و صناعت کے لحاظ سے آراستہ و پیراستہ اتنا ہی حدودِ اباحت سے دور ہوتا جائے گا۔

ہماری سمجھ میں بالکل نہیں آتا کہ اس مجتہدانہ بلندیٔ فکر و نظر کی داد کن الفاظ میں دی جائے۔ یعنی اس اجتہادی اصول کی داد کہ اگر کوئی شے سادہ شکل میں ہو تو اس کا استعمال جائز ہوگا۔ اور اگر اس میں فنی باریکیاں پیدا ہو جائیں، تو وہ ناجائز ہو جائے گی۔ مثال کے طور پر، اِکے کی سواری جائز ہوگی اور ہوائی جہاز کی ناجائز۔ دودھ میں شکر ملا کر پی لیا جائے تو جائز اور ان دونوں کے امتزاج سے قلاقند بنا لیا جائے تو ناجائز۔ لٹھے کا تہبند باندھ لیا جائے تو جائز اور اگر تھوڑی سی صناعی سے اس کا پاجامہ بنا لیا جائے تو ناجائز۔ اور پتلون یکسر حرام۔ کیونکہ اس میں صنعت کاریٔ پاجامہ سے بھی آگے بڑھ جاتی ہے!

اس سے آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا۔ کہ ان حضرات کے نزدیک فقہ کے اصول کس طرح متعین ہوتے ہیں۔ اور ان اصولوں کی روشنی میں جائز و ناجائز کے فیصلے کس طرح! اسے بھی پیشِ نظر رکھئے کہ یہی حضرات ہماری آنے والی نسلوں کے لئے اسلاف بن جائیں گے، اور ان کے فیصلوں کو فقہائے سلف کے فیصلے قرار دے کر شریعت میں بطور سند پیش کیا جائے گا۔

اس کے بعد اصل سوال کی طرف آیئے۔ قرآن کریم میں موسیقی کو کہیں حرام، یا ناجائز قرار نہیں دیا گیا، غور کیجئے کہ موسیقی کہتے کسے ہیں؟ گلے سے آواز نکالئے یا کسی ساز میں پھونک مار کر، یا مضراب سے چھیڑ کر، اگر وہ آواز بے ہنگم ہوگی۔ تو اسے شور کہیں گے' (اسے کوئی حرام قرار نہیں دے گا) لیکن اگر اس میں توازن ہوگا۔ تو اسے موسیقی کہیں گے (جسے یہ حضرات حرام قرار دیتے ہیں) اس سے ظاہر ہے کہ یہ دراصل آواز کا توازن ہے جو ان لوگوں کے نزدیک حرام ہے، اب جو مذہبیت محض توازن کو حرام قرار دے۔ اس کے متعلق کیا کہا جائے۔

اب رہا یہ کہ اسے اخلاقی خرابیوں سے پاک ہونا چاہیئے تو مجرّد آواز سے تو نہ اخلاقی خرابی پیدا ہو سکتی ہے نہ اخلاقی حسن، یہ تو ان اشعار یا ابیات پر مبنی ہوگا۔ جنہیں گایا جائے، اگر وہ اشعار مخربِ اخلاق ہیں تو ان کا لکھنا، پڑھنا، سننا، (بغیر گانے کے بھی) ناجائز ہوگا۔ اس میں موسیقی بےچاری کا کیا قصور ہے! اور اشعار پر ہی کیا موقوف ہے، مخربِ اخلاق نثر بھی ناجائز ہوگی (حالانکہ اسے کوئی نہیں گاتا)۔

اچھے لفظ، اچھے شعر، اچھی تصویر، فطرت کے کسی حسین شاہکار وغیرہ کی طرح اچھی موسیقی میں ایک اثر ہوتا ہے۔ لیکن اس سے وہی لوگ متاثر ہو سکتے ہیں، جو حسنِ ذوق رکھتے ہوں ۔۔ بےحس انسان

اس سے اثر اندوز نہیں ہو سکتا۔ اس کے اثر کا تعلق انسان کے اعصاب سے ہے، جو لوگ دیکھیں کہ اس سے ان کے اعصاب پر خوشگوار اثر ہوتا ہے انہیں اس سے مستفید ہونا چاہیئے۔ جو دیکھیں کہ ان کے اعصاب پر اس کا اثر اچھا نہیں پڑتا، انہیں اس سے محتاط رہنا چاہیئے۔ جن لوگوں پر موسیقی سے وجد یا حال طاری ہو جاتا ہے ان کے اعصاب کمزور ہوتے ہیں۔ انہیں اس سے محتاط رہنا چاہیئے۔

تصویر

شائد ہی کوئی ماہ ایسا گذرتا ہو۔ جس میں یہ استفسار موصول نہ ہوتا ہو کہ شریعت کی رُو سے تصویر کھینچوانا یا اس کا اپنے پاس رکھنا کیسا ہے، طلوع اسلام میں اس کے متعلق ایک دو مرتبہ لکھا جا چکا ہے، اب اسے پھر دہرایا جاتا ہے۔

قرآن میں تصویر کی ممانعت کہیں نہیں۔ بلکہ حضرت سلیمانؑ کے تذکارِ جلیلہ کے سلسلہ میں مذکور ہے کہ ان کے پاس دور دراز ملکوں کے اجنبی صناع جمع تھے۔ یعملون لہٗ ما یشاء من محاریب و تماثیل (۳۴/۱۳)۔ جو اُن کی منشاء کے مطابق بڑی بڑی محراب اور عمارتیں اور تماثیل تیار کرتے تھے۔ "تماثیل" تمثال کی جمع ہے۔ اور تمثال میں تصاویر اور مجسّمے دونوں شامل ہیں۔ اب ظاہر ہے کہ جب (ا)۔ خدا کا ایک اولوالعزم رسول تصاویر اور مجسّمے تیار کراتا ہو، اور (ii) قرآن اس کا ذکر کر رہا ہو اور (iii) اس کی ممانعت کہیں نہیں آئی ہو۔ تو پھر از روئے قرآن تصویر کی ممانعت کیسے ہو سکتی ہے؟ کہا یہ جاتا ہے کہ چونکہ تصویروں سے انسان دوسروں کی پرستش شروع کر دیتا ہے، اس لئے یہ ناجائز ہیں، اس میں شبہ نہیں کہ ازمنہ مظلمہ (زمانہ جہالت) میں انسان۔ مظاہر پرست اور انسان پرست واقع ہوا تھا۔ اس لئے وہ مجسّمات اور تصاویر کی پرستش شروع کر دیتا تھا۔ لیکن ہر مجسمہ اور ہر تصویر کی نہیں۔ بلکہ صرف انہی کے مجسموں اور تصویروں کی جن کی اسے پرستش مقصود تھی، اگر اس دلیل کو محکم تسلیم کر لیا جائے کہ انسان (اللہ کے سوا) جن چیزوں کی پرستش کرتا ہے۔ انہیں باقی نہیں رہنے دینا چاہیئے۔ تاکہ دنیا سے شرک مٹ جائے تو غور فرمایئے کہ اس سلسلۂ کائنات میں کس کس چیز کو مٹانا نہیں پڑے گا۔ انسان پہاڑوں اور دریاؤں کی پرستش کرتا ہے۔

درختوں اور حیوانوں کی پرستش کرتا ہے۔ زمین کی اور اجرامِ سماوی (چاند، سورج، ستاروں) کی پرستش کرتا ہے، وہ ان چیزوں کی تصاویر کی پرستش نہیں کرتا۔ بلکہ خود ان چیزوں کی پرستش کرتا ہے۔ تو کیا اس شرک کو مٹانے کے لئے ان تمام چیزوں کو مٹا دیا جائے گا جن کی یہ پرستش کرتا ہے۔ کیا ان کا مٹانا ممکن بھی ہے۔ انسان پرستی میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسانوں کی تصاویر یا ان کے مجسّمے مٹا دینے سے ان کی پرستش نہیں ہوگی۔ لیکن ذرا گہرائیوں میں جاکر دیکھئے کہ کیا ان کے مٹانے سے واقعی شرک مٹ جاتا ہے۔ اگر آپ ان تصاویر کو مٹا بھی دیں گے تو ان تصاویر کو کیا کریں گے جو انسان نے اپنے قلب کے چوکھٹوں میں محفوظ کر رکھی ہیں۔ اگر آپ "شیخ" کی تصویر کو سامنے نہیں رکھنے دیتے تو وہ مراقبہ میں "تصویرِ شیخ" سے اپنے سینے کو بت کدہ بنالیتا ہے۔ سو اصل شے انسان کے دل و دماغ کے بت کدوں کو معبودا ورباطل سے پاک کرنا ہے۔ اگر ان کی تطہیر ہو جائے تو خارجی معبود (تصاویر اور مجسّمے بلکہ زندہ انسان) از خود فنا ہو جاتے ہیں۔ لیکن اگر ان میں یہ بُت موجود ہوں تو محسوس و مشہود بتوں (تصویروں اور مجسّموں) کے استیصال سے بھی کچھ نہیں بنتا۔ کتنے مسلمان ہیں جو تصویر کشی، مجسّمہ سازی، قبر پرستی کو حرام سمجھتے ہیں۔ لیکن ان کے سینوں کو ٹٹول کر دیکھئے اور پھر غور کیجئے کہ ان میں کتنے کتنے بڑے لات و منات اور ہبل و عزّیٰ چھپے بیٹھے ہیں۔

رہ مدہ اقبالؔ را در کعبہ اے شیخِ حرم

ہر زماں در آستیں دارد خداوندے دگر

لہٰذا اصل شے تو غیر اللہ کی عبودیت ہے۔ جس سے روکنا مقصود ہے نہ کہ نفسِ تصویر۔۔۔۔ "آغاخانیوں" میں چونکہ سرآغاخان کی پرستش کی جاتی ہے۔ لہٰذا ان کی ہر تصویر معبود کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور اس فرقہ کا جاہل اور سمجھ دار ہر شخص اس تصویر کی پرستش کرتا ہے۔ اس کے برعکس، قائدِ اعظمؒ مرحوم کی تصویر مسلمانوں کے قریب قریب ہر گھر میں موجود ہے۔ لیکن سمجھدار طبقہ تو ایک طرف جہلاء میں سے بھی شاید ہی کوئی ایسا ہو جو اس کی پرستش کرے۔ معہٰذا چونکہ قبر پرستی مسلمانوں میں عام ہے۔ اس لئے انہی قائدِ اعظمؒ کی قبر کی پرستش کے آثار آہستہ آہستہ ابھرتے چلے آ رہے ہیں[1]۔ لہٰذا تصویر بجائے خویش کوئی ایسی چیز نہیں جسے شجرِ ممنوعہ قرار دے دیا جائے۔

شگفتگی سے نفرت

لیکن اگر آپ تاریخِ اسلام (مسلمانوں کی تاریخ نہیں بلکہ اسلام کی تاریخ) کا بہ تعمق نگاہ مطالعہ کریں گے تو یہ حقیقت آپ پر واضح ہو جائے گی، کہ مسلمانوں کے دلوں میں تصاویر کے متعلق جو نفرت پائی جاتی ہے اس کی وجہ وہ نہیں جو عام طور پر بیان کی جاتی ہے۔ بلکہ

---

[1] ؎ معلوم ہوا ہے کہ اب یہ رجحان باقی نہیں رہا (۱۹۶۳ء)

اس کی تہہ میں کچھ اور ہے، ہو سکتا ہے یہ چیز شعوری طور پر مسلمان کے سامنے نہ ہو لیکن اس کا تحت الشعور اس سے متأثر ہے اور اس تأثر کو اس نے مذہب کا سہارا دے کر قائم رکھا ہے۔

یہ تو ظاہر ہے کہ جو اسلام ہمارے ہاں مروّج ہے وہ عام طور پر وہ اسلام نہیں۔ جسے اللہ نے بوساطت نبی اکرمؐ ملّت کو دیا تھا۔ ہمارا اسلام مجموعہ ہے ان غیر اسلامی نظریات و تصوّرات کا جو رفتہ رفتہ غیر شعوری طور پر اسلام کے اجزا بنائے جاتے رہے۔ ان تصوّرات میں عیسائیت کی رہبانیت کو خاص دخل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ہمارے موجودہ اسلام کا بیشتر حصہ اسی رہبانیت پر مشتمل ہے۔ عیسائی خانقاہیت میں اس دنیا کی ہر حسین شے سے نفرت سکھائی جاتی تھی۔ ان کے اولیاء (SAINTS) کے حالات پڑھیئے۔ وہ اس قدر گھناؤنی زندگی بسر کرتے تھے کہ اس کے تصوّر سے روحِ لطافت میں جھرجھری آجاتی ہے۔ ان میں سے جو وئی سب سے زیادہ کریہہ المنظر اور نفرت آگیں حالات میں رہتا تھا وہی سب سے بڑا قطب تصوّر کیا جاتا تھا۔ اگر کسی کو ساری عمر میں ایک مرتبہ ہنسی آگئی (یا تبسم سے لب کشائی ہوگئی ہے) تو اُسے سالہا سال تک اس کا کفارہ دینا پڑتا تھا۔ جب حسنِ فطرت سے متعلق ان کا زاویۂ نگاہ یہ تھا تو انسانی حسن کے متعلق ان کا جو تصوّر ہوگا وہ ظاہر ہے۔ چونکہ تجرّد کی زندگی اُن کے نزدیک "منہاجِ نبوت" کی زندگی تھی۔ اس لئے ان کے عقیدہ میں عورت دنیا کی بدترین جنس تھی، یہ تھی وُہ روحِ خانقاہیت جو آہستہ آہستہ غیر شعوری طور پر اسلام کا جزو یا مذہب بن گئی۔ اس تاریخی پس منظر کے ساتھ آپ اس زندگی کی تصویر کا مطالعہ کیجئے، جسے ہمارے ہاں ایک متقی، پرہیزگار، دیندار، مزکّی و مقدّس انسان کی زندگی کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ فلاں بزرگ چالیس سال تک متواتر روتے رہے۔ حتیٰ کہ ان کے رخساروں کا گوشت بھی گل سڑ گیا۔ فلاں بزرگ بیس سال تک سوئے نہیں۔ فلاں نے عمر بھر گیہوں کی روٹی نہیں کھائی۔ فلاں صاحب کے جسم میں کیڑے پڑ گئے۔ جونہی کوئی کیڑا زخموں سے نیچے گر جاتا تھا۔ وہ اسے اُٹھا کر پھر زخم پر رکھ لیتے تھے۔ فلاں بزرگ کی جوئیں "مگر مچھوں" جتنی بڑی تھیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ اس سے آگے بڑھے تو اس "مقدّس تصویرِ زندگی" کو خود ذاتِ رسالت مآبؐ اور صحابہؓ کبار کی طرف منسوب کر دیا۔ کتب سیر و آثار کو دیکھئے۔ ان میں مقدّس زندگیوں کی تصویریں اسی قسم کی ملیں گی۔ حضورؐ ساری عمر اس طرح متبسّم نہیں ہوئے کہ کسی نے دانت مبارک دیکھ لیا ہو۔ گھر میں چالیس چالیس دن تک آگ نہیں جلتی تھی۔ گیہوں کا آٹا کبھی دیکھا تک نہ تھا۔ چھلنی کی کبھی ضرورت ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ کپڑوں پر بیسیوں پیوند لگے رہتے تھے۔ ان کی مجالس و محافل میں کبھی شگفتگی و شادابی نے بار نہیں پایا تھا۔ زندگی کے لطیف و خوشگوار پہلوؤں سے وہ ہمیشہ مجتنب رہتے تھے۔ تزئین و آرائش ان کے ہاں حرام تھی۔ دولت و ثروت

شجرِ ممنوعہ تھی۔ جس کے چھونے سے انسان جنت سے نکالا گیا تھا۔[1] عورت وہ ٹیڑھی کمان ہے جس کو سیدھا کرنے کی کوشش کیجئے تو وہ ٹوٹ جاتی ہے۔ وقس علی ہذا۔

اس قسم کی زندگی کو مقدس ترین زندگی بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ اور ہر منبر و محراب سے یہ آواز سنائی دیتی ہے کہ "دُنیا مردار ہے اور اس کا طالب کُتّا"۔ عیسائی خانقاہیت کا اثر اس حد تک ہو چکا ہے کہ آپ دیکھیں گے، کہ ہمارے ہاں کے اچھے اچھے سمجھدار لوگ جب جنت کا ذکر کریں گے تو وہ اس تصویر سے جھینپے جھینپے سے دکھائی دیں گے کہ اس میں ازواج کا ذکر کیوں آتا ہے۔ وہ اپنی انتہائی کوشش کریں گے، یہ ثابت کرنے کے لئے کہ ہرچند وہاں ازواج ہوں گی۔ لیکن ان سے جنسی تعلقات قائم نہیں ہوں گے۔[2] یعنی ان کے نزدیک جنسی تعلق ایک

جنسی تعلق

ایسی چیز ہے۔ جسے اس دنیا کی آلودگیوں میں تو گوارا کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس بلند و بالا "روحانیت" کی زندگی میں اس کا بالکل دخل نہیں ہو سکتا۔ ان کے خیال میں اگر جنت میں بھی جنسی تعلق باقی رہا تو ساری جنت پلید ہو جائے گی۔ آپ نے غور فرمایا کہ جنسی تعلق کو روحانیت کی زندگی کے نقیض تصور کرنے کا خیال کہاں سے آیا؛ یہ اسی عیسائیت کا اثر ہے جس میں تجرد کی زندگی کو روحانیت کی بلند ترین زندگی بتایا گیا ہے اور یہی اثرات ہمارے ہاں عین دین بن چکے ہیں۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے "دین" میں احساسِ حسن کہاں بار پا سکتا ہے، اور ظاہر ہے جہاں حسن (BEAUTY) کو اس درجہ قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہو وہاں حسن کے مظاہر (فطری ہوں یا انسانی کوششوں کے نتائج) کس طرح قابلِ ستائش قرار پا سکتے ہیں۔ یہ ہے اصل وجہ تصویر (اور دیگر فنونِ لطیفہ) کی مزعومہ "حرمت" کی۔ "اسلام اور آرٹ" ایک وسیع موضوع ہے جس پر اس وقت تفصیلی گفتگو نہیں کی جا سکتی۔ اس وقت ہم صرف ان اِشارات پہ اکتفا کرتے ہیں۔ حسن کے متعلق یہ اس قوم کا زاویۂ نگاہ ہے۔ جس کے خدا نے نیکی کے لئے بھی حسن کا

حسن کیا ہے

لفظ استعمال کیا ہے اور جنت کے لئے بھی حسنِ مآب۔ یعنی جس عمل میں حسن نہیں، (یعنی زندگی کا جو کام حسین نہیں)۔ وہ اس کی میزان میں کوئی وزن نہیں رکھتا۔ حسن

---

[1] واضح رہے کہ بنا بہ استغناء، سادہ زندگی بسر کرنا اور شئے ہے اور دولت و ثروت اور زیبائش و آرائش کو قابلِ نفرت سمجھنا اور شئے۔ ہمارے ہاں کے تصورِ دین میں ان چیزوں کو قابلِ نفرت سمجھا جاتا ہے۔

[2] ہم اس وقت جنت اور اس سے متعلق قرآنی تصریحات سے بحث نہیں کر رہے۔ بتانا صرف یہ مقصود ہے کہ "جنسی تعلق" کو ہمارے ہاں کس طرح روحانی زندگی کے منافی سمجھا جاتا ہے۔

کیا ہے؟ توازن وتناسب، جونہی کسی کا توازن (EQUILIBRIUM) بگڑا، اس میں فساد رونما ہوگیا۔ کائنات کا یہ تمام سلسلہ اسی حسن (توازن) پر قائم ہے۔ تخلیق کے ساتھ تحسین یہاں کا آئینِ محکم ہے۔ اشیائے کائنات صرف پیدا ہی نہیں کی جاتیں، بلکہ انہیں حسین ترین انداز میں پیدا کیا جاتا ہے۔ الذی احسن کل شیئ خلقہ (۳۲/۷) اللہ وہ ہے کہ اس نے جو چیز بنائی حسین ترین (احسن) انداز میں بنائی (وانبتنا فیھا من کل شیئ موزون (۱۵/۱۹) ہم نے زمین میں ہر چیز توازن وتناسب کو لئے ہوئے اگائی" خود انسانی صورت میں بھی اُس اعتدال وتناسب کو ملحوظ رکھا، جس پر حُسن کا مدار ہے۔ الذی خلقک فسواک فعدلک (۸۲/۷) وہ خدا جس نے تمہیں پیدا کیا۔ پھر ٹھیک ٹھیک درست کیا۔ پھر تمہارے قویٰ اور صورت میں تناسب و اعتدال ملحوظ رکھا۔

جمالی پہلو

پھر اس حقیقت کو بھی بے نقاب کر دیا گیا کہ موزونیت وتناسب اور تحسین وتزئین کا یہ انداز سلسلۂ تخلیق ہی کا ایک جزو نہیں کہ اس کے سوا کچھ اور مقصد نہ ہو۔ بلکہ آرائش و جمال کی یہ تمام آئینہ گری انسان کی نظر افروزی اور ذوقِ لطیف کی تسکین کے لئے ہے۔ غور کیجئے! یہ تمام اجرامِ فلکی اس سلسلۂ کائنات میں جذب وکشش کے ثقیل الجثہ مظاہرے ہیں۔ لیکن ان کے متعلق بھی فرمایا کہ سقفِ سماوی کی یہ مرصّع کاری تمہاری نگاہوں کے لئے سامانِ زینت ہے۔ افلم ینظروا الی السماء فوقھم کیف بنینھا وزینھا (۵۰/۶) کیا ان لوگوں نے کبھی آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھا کہ ہم نے اُسے کس طرح بنایا ہے اور کس طرح اس کے منظر میں خوشنمائی پیدا کر دی ہے۔ دوسری جگہ ہے۔ ولقد جعلنا فی السماء بروجا وزینھا للنظرین۔ (۱۵/۱۶) اور ہم نے (گردشِ سیارگان کے لئے) بروج بنائے اور انہیں دیکھنے والوں کے لئے باعثِ زینت بنا دیا۔ آسمان سے نیچے اتر کر زمین کی طرف دیکھیئے۔ انبتنا فیھا من کل زوج بھیج (۵۰/۷) اس میں قسم قسم کی خوبصورت نباتات پیدا کر دی۔ حتیٰ کہ تمہارے مویشی جن سے تم نے باربرداری کا کام لینا تھا۔ ان کی یہ کیفیت ہے کہ ولکم فیھا جمال حین تریحون وحین تسرحون (۱۶/۶) جب تم انہیں شام کے وقت چراگاہوں سے واپس لاتے ہو اور صبح کے وقت لے جاتے ہو۔ تو تمہارے ان مویشیوں میں تمہارے لئے حسن وجمال کا سامان ہوتا ہے۔

آپ قرآن کے مختلف مقامات پر نگاہ ڈالیئے۔ تخلیق وتعمیر کے ساتھ ساتھ تحسین وتزئین کی یہ تمام جمال آرائیاں آپ کے سامنے آجائیں گی، جن کی طرف آپ کو بار بار دعوتِ نظارہ دی گئی ہے اور وہ دعوت

بھی اس انداز سے کہ

مَا تَرٰی فِیْ خَلْقِ الرَّحْمٰنِ مِنْ تَفٰوُتٍ ط فَارْجِعِ الْبَصَرَ لا ھَلْ تَرٰی مِنْ فُطُوْرٍ ۵ ثُمَّ ارْجِعِ الْبَصَرَ کَرَّتَیْنِ یَنْقَلِبْ اِلَیْکَ الْبَصَرُ خَاسِئًا وَّھُوَ حَسِیْرٌ ۵ (۶۷/۳)

تم خدائے رحمٰن کی تخلیق میں کوئی اونچ نیچ نہیں پاؤ گے ایک بار نہیں، بار بار دیکھو کیا تمہیں کوئی سلوٹ نظر آتی ہے۔ تم اسی طرح بار بار دیکھتے رہو۔ تمہاری نگاہ اٹھے گی اور اسی طرح خاسر و درماندہ کاشانۂ چشم میں واپس آجائے گی، لیکن صنعت گاہِ کائنات میں کوئی جھول نہ پا سکے گی۔

جس خدائے کائنات کی جمال آفرینیوں کا یہ عالم ہو کیا وہ آرائش و زیبائش اور حسن و جمال کی تمام راہیں اپنے بندوں پر حرام قرار دے دے گا۔ سُبْحَانَ اللّٰہِ تَعَالٰی عَمَّا تَصِفُوْنَ ۔

قرآن اس نمائش گاہِ حسن و تزئین کی طرف بار بار دعوتِ نظارہ دے رہا ہے اس لئے اس کی طرف سے آنکھیں بند کر لینا گویا اس کے صانع پر یہ تہمت دھرنا ہے کہ تم نے معاذ اللہ یہ سامانِ زیبائش و تحسین یونہی بے کار پیدا کیا۔ اور پھر جب یہ تمام جمال آفرینی بھی مقصدِ تخلیقِ کائنات میں سے ہے تو ظاہر ہے کہ خود انسانی ذات کی تعمیر و ارتقاء میں اس کا کتنا بڑا حصہ ہو گا؟ حقیقت یہ ہے کہ جو آنکھ حسن و جمال کی نیرنگیوں سے کیف اندوز نہیں ہو سکتی وہ انسان کا دیدۂ بصیرت نہیں، حیوان کا آلۂ بینائی ہے اور جو قوم ذوقِ حسن و زیبائی سے بے بہرہ ہو جاتی ہے۔ اس پر رموزِ کائنات کی گرہ کشائیاں حرام ہو جاتی ہیں۔

ذوقِ حسن

کائنات جمالیاتی (AESTHETIC) اور افادی (UTILITARIAN) گوشوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ انسان چونکہ ہمیشہ افراط و تفریط کے جھولے جھولتا چلا آیا ہے۔ اس لئے اس کا یہ مسلک رہا ہے کہ کبھی محض جمالیاتی رنگ میں ڈوب گیا اور کائنات کے افادی پہلو سے کنارہ کش ہو گیا۔ یہ یکسر جذباتی دنیا تھی، جس نے انسان کو دنیائے ممکنات میں بے کار کر کے رکھ دیا۔ اور کبھی یہ تفریط کی طرف آیا تو یکسر افادی پہلو کو مسلکِ حیات قرار دے لیا۔ اس سے یہ کائنات محض تجارت گاہ

حمدیت اور ربوبیت

بن گئی۔ اسلام نے آکر بتایا کہ کائنات کے ان دونوں گوشوں کا سرچشمہ ایک ہی ہے اور وہ خدا کی ذات ہے۔ الحمد للہ رب العالمین۔ یعنی حمدیت (APPRECIATIVE) اور

ربوبیّت (UTILITARIAN) دونوں کا منبع اس کی ذات ہے۔ حتیٰ کہ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ لہُ الملک ولہُ الحمد (۶۴/۱) غلبہ اور قوت۔ اور دوسری طرف حمدیت دونوں کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ یہ ہے وہ خدا جس کے رنگ میں مسلمان کو رنگا جانا تھا۔ لیکن آج اس کی کیفیت یہ ہے کہ قوت اور غلبہ میں یہ سب سے پست۔ جہاں تک ربوبیت کا تعلق ہے۔ یہ روٹی تک کے لئے دوسروں کا محتاج اور حمدیت (ذوقِ حسن) کا ہر گوشہ اس پر حرام! یہ ہے قرآن کو چھوڑ دینے کا نتیجہ!

خسر الدنیا والآخرۃ وذالک الخسران المبین۔ (۱۹۵۳ء)

شبِ بارات

شبِ بارات کس واقعہ کی یاد میں منائی جاتی ہے؟ یہ کیا تقریب ہے؟ اسے لیلۃ القدر کہا جاتا ہے کیا یہ ٹھیک ہے؟

جواب:۔ یہ تقریب کسی واقعہ کی یاد میں نہیں منائی جاتی۔ بعض روایات میں اس رات کی فضیلتوں کا ذکر ہے۔ بس یہی اس کی سند ہے۔ لیکن مولوی صاحبان سے پوچھئے تو وہ اسے لیلۃ القدر بیان کرتے ہیں۔ ایک دفعہ ایک بہت بڑے مولانا ریڈیو پر اپنی تقریر میں شبِ بارات کے متعلق قرآنی سند بیان فرما رہے تھے اور وہ سند تھی۔ سورۂ دخان کی یہ آیت فیھا یفرق کل امر حکیم (۴۴/۴) اس رات میں ہر ایک حکمت والا معاملہ فیصل کر دیا گیا۔ اس "قرآنی سند" کے بعد انہوں نے تفصیلاً بتایا کہ اس رات کس طرح آنے والے سال کے لئے لوگوں کی قسمتوں کا فیصلہ کر دیا جاتا ہے۔ حالانکہ سورۂ دخان میں یہ آیات یوں ہیں:۔

اِنَّا اَنزَلنٰهُ فِی لَیلَةٍ مُّبٰرَکَةٍ اِنَّا کُنَّا مُنذِرِینَ ۝ فِیهَا یُفرَقُ کُلُّ اَمرٍ حَکِیمٍ ۝ (۴۴/۳-۴)

لہ:۔ ان روایات کے متعلق تحقیق یہ ہے کہ وہ وضعی یا ضعیف ہیں۔

ہم نے قرآن کو ایک بابرکت رات میں اُتارا ہے۔ ہم ہمیشہ (وحی کے ذریعہ قوموں کو)
اس سے آگاہ کرتے رہے ہیں کہ ان کی غلط روش ان کی تباہی کا موجب بن جائے گی۔
(وہ بابرکت رات) جس میں ہر ایک حکمت والا معاملہ فیصل کر دیا گیا۔

اب ظاہر ہے کہ یہ اس رات کا ذکر ہے جس میں قرآن نازل ہوا ہے۔ اسی کو دوسری جگہ لیلۃ القدر کہا گیا ہے۔ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِیْ لَیْلَةِ الْقَدْرِ ۔ اور قرآن کے نزول کی ابتداء رمضان میں ہوئی تھی ۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْهِ الْقُرْاٰنُ ۔ لہٰذا اس سے واضح ہے کہ لیلۃ القدر رمضان کے مہینے میں آئے گی اور اس کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں نزولِ قرآن کی ابتداء ہوئی تھی۔ لیکن ہم ہیں کہ پہلے شعبان کے مہینے میں لیلۃ القدر (شب بارات) مناتے ہیں اور پھر رمضان کے آخری عشرہ میں اس کی تلاش شروع کر دیتے ہیں۔ غور کیجئے، ایک رسم کی گرفت کس قدر سخت ہوتی ہے۔ ہر سال کروڑوں روپے اس رسم کے ضمن میں صرف ہو جاتے ہیں۔ اور کوئی اللہ کا بندہ اتنا سوچنے کی زحمت گوارا نہیں کرتا کہ یا للآخر یہ کچھ کیوں کیا جاتا ہے۔ البتہ اس سے اس حقیقت کی کھلی ہوئی شہادت ملتی ہے کہ اسلام کے خلاف عجمی سازشیں کس قدر کامیاب رہیں اور پروپیگنڈا اگر منظم طریق پر کیا جائے تو وہ کیا سے کیا بنا دیتا ہے۔

عجمی سازش۔ اساورہ

جب ایرانیوں کو مسلمانوں سے شکست ہوئی تو وہ دانت پیس کر رہ گئے۔ وہ مسلمانوں سے میدانِ جنگ میں شکست تو کھا گئے لیکن انہوں نے یہ فیصلہ کر لیا کہ اس شکست کا انتقام اس طریق سے لیا جائے گا کہ اس کی نظیر کہیں نہ مل سکے۔ ایرانی فوجوں میں شاہی جیش کو بڑا مرتبہ حاصل تھا۔ اس جیش کا نام اساورہ تھا۔ اپنی شکست کے بعد اس جیش نے حضرت سعدؓ سے درخواست کی کہ اگر انہیں وہی مراعات دی جائیں جو مسلمانوں کو حاصل ہیں تو وہ مسلمان ہو کر اسلامی آبادیوں میں بس جانا چاہتے ہیں۔ ان کی یہ شرط منظور کر لی گئی اور وہ اس طرح بصرہ اور کوفہ وغیرہ بلادِ اسلامیہ میں آبسے۔ یہاں آنے کے بعد انہوں نے اس انتقام کی سازش شروع کی، جس کی آگ اُن کے دلوں میں سلگ رہی تھی۔ اس وقت اسلام اپنی اصلی شکل میں سیدھے سادھے ضابطۂ حیات کی حیثیت سے موجود تھا۔ مسلمان اس ضابطۂ حیات پر ایمان رکھتے تھے اور اُسے دنیا میں عملاً نافذ کرنا اپنا

فریضہ سمجھتے تھے۔ کام کرنے والی قومیں باتیں کرنا نہیں جانتیں۔ اس لئے اس وقت تک مسلمان "باتوں" میں اُلجھے نہیں تھے۔

اکنوں کرا دماغ کہ پُرسد ز باغباں
بُلبل چہ گفت و گل چہ شنید و صبا چہ کرد

ان اساورہ نے یہی سوچا کہ اس "زندہ" قوم سے عمل چھڑانے کا طریقہ یہ ہے کہ انہیں باتوں میں الجھاؤ۔ خیر و شر کا مسئلہ مجوسیت (ایران کا مذہب) کا بنیادی مسئلہ تھا۔ اسی مسئلہ پر تقدیر کے نظریہ کی عمارت متفرع ہوتی ہے۔ انہوں نے سب سے پہلے اسی سوال کو چھیڑا۔ وہ جن مسلمانوں سے اسلام سیکھتے تھے۔ ان سے پوچھتے تھے کہ "اگر کائنات کا کوئی ذرہ بھی خدا کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا، تو انسان کے تمام اعمال بھی خدا کے حکم کے ماتحت ہی سرزد ہوں گے۔ اور اگر یہ سب کچھ خدا کے حکم کے مطابق ہوتا ہے تو پھر جزاء اور سزا کا کیا سوال؟" مسلمانوں کی عملی قوم نے اس قسم کے سوالات کو درخورِ اعتناء ہی نہیں سمجھا تھا[۵] اور یہ

تقدیر کا مسئلہ

مجوسی معترضین اس فن میں طاق تھے۔ انہیں مجبوراً ان باتوں کے متعلق سوچنا پڑا، اور ان کے اعتراضات کے منطقی جوابات تلاش کرنے پڑے۔ ان سوالات اور جوابات نے عقائد کی صورت اختیار کر لی اور اس طرح اسلام میں سب سے پہلے قدری فرقہ پیدا ہوا۔ چنانچہ اس فرقہ کے بانی معبد بن خالد جہنی کا اپنا اعتراف ہے کہ اس نے اس مسئلہ کو اساورہ کے ایک شخص ابو یونس سے اخذ کیا تھا۔ قدریہ کا ردِّ عمل جبریہ کی صورت میں رونما ہوا۔ اس طرح جب ایک مرتبہ فرقہ بندی کی ابتداء ہو گئی تو اس کے بعد پھر چل سو چل۔ مجوسی اساورہ نے یہ سب کچھ اس خاموشی سے کیا کہ کوئی بھانپ ہی نہ سکا کہ اسلام کی گاڑی کس طرح دوسری پٹڑی پر جا پڑی۔ انہوں نے تقدیر کے مسئلہ کو اتنی اہمیت دی کہ اسے مسلمانوں میں جزوِ ایمان بنا دیا۔ چنانچہ ہمارے ایمان میں (وَالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰی) کا چھٹا جزوِ انہی کا داخل کیا ہوا ہے۔ اسی عقیدہ کو زیادہ گرہ گیر بنانے کے لئے انہوں نے یہ عقیدہ پھیلایا کہ ہر سال ایک رات ایسی آتی ہے جس میں آنے والے تمام سال کے معاملات طے کر کے رکھ دیئے جاتے ہیں۔ فلاں شخص مرے گا اور فلاں کے ہاں بچہ پیدا ہو گا۔ فلاں کا رزق کھُلے گا، فلاں کا بند ہو گا۔ یعنی محکمہ قضا و قدر ہر ایک کے حصے مقرر کر دے گا۔ اس رات کا نام "شبِ برات" رکھا گیا۔ برات کے معنی حصہ کے ہیں۔ یعنی "حصے بٹنے کی رات"۔ اب رہا اس کی سند کا سوال۔ سو اس کے لئے غلط

روایات وضع کرلی گئیں۔ چنانچہ تذکرۃ الموضوعات (شیخ محمد طاہر) میں ہے کہ بعض صوفیانہ کتابوں مثلاً

مجوسیوں کی تقلید

ابوطالب مکی کی قوت القلوب یا ثعلبی وغیرہ کی تفسیروں سے جنہوں نے غلط فہمی سے نصف شعبان کی رات کو شب قدر کردیا۔ لوگوں نے صلوٰۃ الفیہ جاری کی اور دس دس کی ٹولیوں میں سو سو رکعتیں پڑھنی شروع کردیں۔ اور عید سے بھی

لہ:- اس سے یہ مطلب نہیں کہ قرآن اوّل کے مسلمانوں نے قرآن کریم پر غور نہیں کیا تھا۔ مطلب صرف یہ ہے کہ وہ ان بے کار منطقی مباحث میں نہیں اُلجھے تھے۔

لہ:- پرویز صاحب کی تازہ تصنیف "کتاب التقدیر" میں اب اس مشکل ترین مسئلہ (تقدیر) کو نہایت عمدگی سے حل کردیا گیا ہے۔ (۱۹۷۰ء)

زیادہ شب برات کا اہتمام کرنے لگے۔ یہاں تک کہ اس نے میلہ کی شکل اختیار کرلی جس میں اس قدر فسق فجور ہونے لگا کہ اولیاء اللہ بیابانوں میں نکل جاتے تھے۔ اس خوف سے کہ کہیں اللہ کا قہر نہ نازل ہوجائے۔ سب سے پہلے اس کا رواج بیت المقدس میں (۴۴۸ھ میں) ہوا پھر سارے شام و مصر میں پھیل گیا۔ آخر میں علماء مصلحین نے توجہ کی جن کی کوششوں سے یہ بدعت مٹ گئی۔ تاہم اس کا سلسلہ کچھ نہ کچھ آٹھویں صدی ہجری تک رہا۔ شیخ علی بن ابراہیم نے ایک رسالہ میں لکھا ہے کہ شب برات میں روشنی کی ابتداء برامکہ سے ہوئی جو مجوسیت چھوڑ کر اسلام لائے تھے۔ انہوں نے دین اسلام کی راہ سے اپنی آتش پرستی کی رسم تازہ کی۔ اس نے رفتہ رفتہ آتش بازی کی شکل اختیار کرلی۔ جو مغرب سے مشرق تک پھیل گئی۔ یوں شب برات وجود میں آگئی۔ اب مسلمان ہزار برس سے مجوسیوں کے "نوروز" کے اس مثنیٰ کو عین اسلام سمجھ کر سینے سے لگائے لگائے پھر رہا ہے اور اس کے بچے آتش بازی سے اُن کی آتش پرستی کی یاد تازہ کرا دیتے ہیں اور اگر کوئی اللہ کا بندہ اتنا کہہ دے کہ خدا کے لئے ذرا سیلاب کی اس رَو سے ہٹ کر سوچو تو سہی کہ بالآخر اس کی دینی حیثیت ہے کیا؟ تو اس کے خلاف کفر کے فتاوے شائع کرائے جاتے ہیں۔

خدا ایں سخت جاں را یار باد!
کہ اُفتادہ است از بام بلندے

(۱۹۵۳ء)

۷

خدا اور انسانی ذات

۱۔ خدا کا قانون

لاہور سے ایک صاحب رقمطراز ہیں کہ آج کل یہ شبہات عام کئے جا رہے ہیں کہ:۔

۱۔ طلوعِ اسلام خدا کے قانون کا جو تصور پیش کرتا ہے اس میں خدا گم ہوتا جا رہا ہے یعنی اشتراکیت میں خدا کا کھلا انکار ہے۔ یہاں ذرا سلیقہ سے انکار کی طرف اقدام ہے۔ مسٹر سل ازم کو آیاتِ قرآنی کا لباس پہنایا جا رہا ہے۔ ذکر و دعا جس سے تسکین حاصل ہوتی تھی، ختم ہو رہی ہے۔" دامانِ خیالِ یار" ہاتھ سے چھوٹا جا رہا ہے۔"سعی بے حاصل" کی لذت چھن رہی ہے اور وہ قانون و نظام جس کے لئے یہ قربانی دی وہ بھی حاصل ہونے کی اُمید نہیں۔ مسئلہ ختم ہوا۔

جواب:۔ جہاں تک خدا کے قانون کا تعلق ہے، طلوعِ اسلام کو قرآن کے ایک ایک صفحہ اور اس کی ایک ایک آیت میں اس کا وہ عظیم القدر قانون جلوہ بار نظر آ رہا ہے۔ جس کی محکم زنجیر میں یہ تمام محیر العقول سلسلۂ کائنات جکڑا ہوا ہے۔ قرآن، انسان سے بھی اسی قانونِ خداوندی کی اطاعت چاہتا ہے۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ قانونِ خداوندی کے اس تصور سے انسانوں کا وہ خود ساختہ "خدا" ختم ہو جاتا ہے جو یہ بتاتا ہے کہ تم ہاتھ پہ ہاتھ دھرے بیٹھے رہو، مصلے پر بیٹھ کر دعا مانگتے رہو اور تسبیح کے دانوں پر خدا کے نام کا وِرد کرتے رہو۔ باقی سب کچھ تمہارے لئے خود بخود ہو جائے گا لیکن اس سے اس خدائے حکیم و قدیر کا تصور نکھر کر سامنے آ جاتا ہے جو یہ کہتا ہے کہ لیس للانسان الا ما سعی۔ "انسان کو وہی کچھ مل سکتا ہے جس کے لئے وہ کوشش کرے۔" اس سے بے شک موہوم امیدوں کی جھوٹی لذت اور سعیٔ بے حاصل کا دل فریب کیف چھن جاتا ہے لیکن اس سے خدا کے غیر متبدل وعدوں کا وہ محکم سر رشتہ ہاتھ میں آ جاتا ہے جس کے لئے اس نے

خود کہا ہے کہ لا انفصام لہا۔ یعنی وہ کبھی نہیں ٹوٹے گا۔ کتنا جاندار ہے یہ بھروسہ اور کیسا قوت بخش ہے یہ اعتماد! جس "دامن" کے متعلق، بعد از مرگ آنکھیں کھلنے پر نظر آئے کہ وہ "دامنِ یار" نہیں تھا بلکہ "اپنا ہی گریباں" [1] تھا، اس کی حقیقت اگر ابھی آنکھوں کے سامنے آجائے تو زیادہ اچھا ہے۔ اس لئے کہ ابھی تو وقت ہے کہ ہم خواب کی دنیا کے جھوٹے دامنوں کو چھوڑ کر، یار کے سچے دامن کو تھامنے کا سامان کر لیں۔ یہ وقت گذر جانے کے بعد اگر پتہ چلا تو اس سے کیا حاصل ہو گا؟

باقی رہا مٹیریل ازم کا شبہ، سو اصل یہ ہے کہ لوگوں کو یہ بھی معلوم نہیں کہ مٹیریل ازم کہتے کسے ہیں۔ ان کے خیال میں مٹیریل ازم کے معنی ہیں دنیاوی خوشگواریوں کا حصول۔ اگر مٹیریل ازم کے یہی معنی ہیں تو قرآن کی تعلیم خود مٹیریل ازم کی تعلیم ہے۔ وہ استخلاف فی الارض کو ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ قرار دیتا ہے۔ اس کے نزدیک مال و دولت، ازواج و بنون، جاہ و حشمت خدا کی نعمتیں ہیں۔ وہ بھوک کو خدا کا عذاب اور مرفہ الحالی کو اس کا انعام قرار دیتا ہے۔ کہئے کہ یہ (مندرجہ بالا مفہوم کے اعتبار سے) "مٹیریل ازم" نہیں تو اور کیا ہے؟

مٹیریل ازم کے اصلی معنی یہ ہیں کہ انسانی رہنمائی کے لئے تنہا انسانی عقل کافی ہے اور زندگی بس اسی جسم کی زندگی ہے۔ اس کے بعد حیات کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ طلوعِ اسلام کا ایک ایک لفظ اس باطل تصور کی تردید اور تکذیب کے لئے وقف ہے۔ طلوعِ اسلام کی دعوت کا نقطۂ ماسکہ یہ ہے کہ ایمان اور اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ اس دنیا کی خوشحالیاں اور اس کے بعد کی زندگی کی خوشگواریاں ہیں۔ اور یہ چیز صرف قرآن کے پروگرام پر عمل پیرا ہونے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ نہ تنہا عقل کی رُو سے، اور نہ ہی انسانوں کے خودساختہ مذاہب کے ذریعہ —— طلوعِ اسلام کی کوشش یہ ہے کہ پاکستان کے خطۂ زمین میں قرآن کا قانون نافذ ہو اور اس کے خدا کا نظامِ ربوبیت متشکل ہو۔ اس کی اس کوشش کی کامیابی کا انحصار آپ حضرات کی تائید اور رفاقت میں مضمر ہے۔

قوانینِ فطرت

اور اگر مٹیریل ازم سے آپ کی مراد ہے قوانینِ فطرت کا اتباع، تو قوانینِ فطرت بھی خدا ہی کے قوانین ہیں۔ کسی انسان کے بنائے ہوئے قوانین نہیں، ان کا

---

[1] سو بار ترا دامن ہاتھوں میں مرے آیا　　جب آنکھ کھلی دیکھا اپنا ہی گریباں تھا

اتباع طبعی زندگی کی خوشگواریاں عطا کرتا ہے اور ان کی خلاف ورزی سے انسان، فطرت کی قوتوں سے محروم رہ جاتا ہے۔ لہٰذا قوانینِ فطرت کا اتباع بھی جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے۔ قرآن کریم نے جو کہا ہے کہ تمام ملائکہ آدم کے سامنے جھک گئے تو اس سے مفہوم یہ ہے کہ انسان میں یہ صلاحیت رکھ دی گئی ہے کہ وہ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر لے۔

لہٰذا:۔

۱۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کرنا مقامِ آدم ہے۔ اور

۲۔ فطرت کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں قرآنی راہنمائی کے مطابق صرف کرنا، مقامِ مومن۔

جو قوم فطرت کی قوتوں کو مسخر نہیں کرتی اُسے مقامِ آدمی بھی نصیب نہیں، چہ جائیکہ مقامِ مومن حاصل ہو۔ (۱۹۵۳ء)

۲۔ (معاذاللہ) بھینٹ لینے والا خُدا

عبدالماجد صاحب دریابادی کے اخبار "صدق جدید" لکھنؤ، کی، ۱۲ر مارچ ۱۹۵۹ء کی اشاعت کے صفحہ اول پر "ایک مؤثر حکایت" کے عنوان سے حسب ذیل کہانی شائع ہوئی ہے۔

فتح پور (یو۔ پی) کے مولوی حاجی حکیم ظہور الاسلام کو گذرے ہوئے کچھ ایسا زمانہ نہیں گزرا ہے۔ ابھی ممدوح کے سینکڑوں دیکھنے والے موجود ہوں گے۔ ندوہ کے ایک اجلاس کے موقعہ پر ان سطور کے راقم کو بھی اپنے لڑکپن میں زیارت نصیب ہوئی تھی۔ بڑے صاحب علم ہونے کے ساتھ ساتھ بڑے صاحب دل بھی تھے۔ اور تقوےٰ اور خوف خدا کے ایک پیکرِ مجسّم۔ شہر میں ایک بار ہیضہ پھیلا اور لوگ چٹ پٹ ہونا شروع ہوگئے۔ مدرسہ سے متعلق ایک دارالاقامہ بھی تھا۔ اس کا ایک غریب پردیسی لڑکا، دور دراز بنگالہ دیس کا رہنے والا بھی اس میں مبتلا ہوا، اور مولانا کو اس کی خبر ہوئی۔ بے قرار ہوگئے۔ اسپتال بھجوانے کے بجائے خود جا مریض کو چٹ اپنے گھر اٹھا لائے۔ ہیضہ کا مریض، اور وہ بھی کوئی اپنا عزیز نہیں۔ اُسے اپنے گھر اٹھا لانا کوئی معمولی بات نہ تھی! موت و ہلاکت کو اپنے ہاں دعوت دینا تھی!

اور اب خدمت و تیمارداری مولانا نے خود شروع کی ۔ ہیضہ کے مریض کی جو گندی حالتیں ہوسکتی ہیں، ان سب کو تصور میں لے آیئے اور پھر سوچیئے کہ مولانا اپنے ہاتھ سے اُسے دوا پلا رہے ہیں اور اس کی ایک ایک خدمت کرتے جاتے ہیں ۔ گھر والے ایسے موقعہ پر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں اور اچھے اچھے عزیز دوست منہ چرا جاتے ہیں ۔ یہ مولانا کیا بشر نہ تھے، کوئی فرشتہ تھے ؟

مریض کی حالت گرتی گئی، بگڑتی گئی ۔ اور ادھر مولانا کی گریہ زاری بھی بڑھتی گئی ۔ بار بار دعائیں اپنے رب اور زندگی و موت دونوں کے خالق سے کیں کہ " اے اللہ ! اس پر رحم کر ۔ غریب پردیسی ہے ۔ اپنے باپ کا اکلوتا ہے ۔" ساری رات دوسرے تیماردار کہاں تک ساتھ دیتے ۔ ایک ایک کر کے رخصت ہو گئے ۔ اب تنہا، دنیا کا مالک و مولیٰ تھا اور اس کا یہ وفا شعار غلام اُس سے راز و نیاز میں مصروف ۔ راوی کا بیان ہے کہ پچھلے پہر میری آنکھ کھل گئی ۔ دیکھتا کیا ہوں کہ مولانا جانماز پر بیٹھے زار و قطار رو رہے ہیں ۔ اور اپنے ناز بردار خالق کے آگے مچل رہے ہیں ۔ سرگوشی کے لہجہ میں، رات کے سنّاٹے میں، دعا کے الفاظ کچھ اس طرح سنائی دیئے ۔

" مالک ہو، جو چاہو سو کرو ۔ قادرِ مطلق ہو جو چاہو کر ڈالو ۔ قانونِ قدرت تمہارا اپنا بنایا ہوا ہے جب چاہو اسے توڑ سکتے ہو ۔ آخر مجھے تو سرخرو کرنا ۔ یہ بچہ پردیسی ہے ۔ میرے بھروسے پر آیا تھا ۔ ماں باپ کا کیا حال ہوگا .... خیر اگر یوں مجھ گنہگار کی دعا قبول نہیں کرتے تو میری نذر ہی قبول فرما لو ۔ جان کے بدلے جان حاضر ہے ۔ ایک میرا اپنا بچہ ہے اُسے اس کے عوض میں قبول فرماؤ ۔ وہ بھی تمہارا، مَیں بھی تمہارا ۔"

اور یہ بھی سن لیجئے ۔ مولانا کے کئی بچے نہ تھے ۔ کئی بچوں کے گذر جانے کے بعد یہی ایک سال کی عمر کا زندہ تھا ۔ ماں باپ ہی نہیں، گھر بھر کے ارمانوں کا مرکز ——— ایک محض اجنبی کی خاطر نذر اسی جگر کے ٹکڑے کی پیش ہو رہی تھی !

امتحان ۔ ابراہیمؑ کا نہیں، ایک ابراہیمی کے ظرف و تحمل کا در پیش تھا ۔ اللہ اللہ ! سحر ہو رہی تھی کہ اچانک مکان کے اندر سے کنڈی کھٹکی ۔ معلوم ہوا کہ بچہ پر وبا کا حملہ ہوگیا ۔ مولانا اطمینان سے اُٹھ کر اندر گئے ۔ دوا پلائی، نفع خاک نہ ہوا ۔ مولیٰ نے بندہ کی نذر قبول کر لی تھی ۔ عبدیت کی کمان سے چُھٹا ہوا

نیز نشان پر پہنچ چکا تھا۔ اُدھر وہ پہ دیسی اچھا ہوتا گیا، اِدھر یہ نازوں کا پالا، اپنا بیٹا گرتا گیا۔ یہاں تک کہ مولانا اپنے ہاتھوں جاکر اکلوتے جگر گوشہ کو پیوندِ خاک کر آئے۔

طلوعِ اسلام

غور کیجئے کہ یہ حضرات خدا کے متعلق کس قسم کا تصور دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہیں، اس خدا کا تصور جس کا غیر متبدل قانون یہ ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۱۶۵/۶) "کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا"۔ لیکن مولوی کی غرض تو اپنے وعظ کو دلچسپ بنانا ہوتی ہے۔ اسے اس سے کیا مطلب کہ اس زیب داستان سے خدا کا کیا تصور قائم ہوتا ہے۔ اور دین کی حیثیت کیا رہ جاتی ہے ؟

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے،
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

۳۔ خدا کی معرفت

ایک صاحب ملتان سے لکھتے ہیں کہ میں نے ماہ نامہ۔۔۔۔۔ طلوعِ اسلام کے تعارف سے دیکھا۔ اس کی مارچ کی اشاعت میں دو چار باتیں ایسی نظر آئی ہیں جن کی وضاحت آپ سے کرنی ضروری سمجھی ہے۔ آپ شاید کہہ دیں گے کہ۔۔۔۔۔ کے نکات کی وضاحت انہی سے کرانی چاہیئے۔ لیکن باتیں ایسی ہیں کہ جن کی وضاحت آپ سے ہی کرائی جا سکتی ہے۔ وہ نکات یہ ہیں:۔

۱۔۔۔۔۔۔۔۔۔ صاحب نے" رومی کے تصورِ قوم" کے عنوان سے جو مضمون لکھا ہے، اس میں وہ فرماتے ہیں کہ انسان کے لئے اہم ترین علم اپنی حقیقت کا عرفان ہے۔ اور دین کا مقصود آخری اور غایت، خدا کا عرفان ہے۔ لیکن خدا کا عرفان خود اپنے نفس کے ساتھ اس طرح وابستہ ہے کہ عارفوں کا مقولہ ہے۔

مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ ۔

کیا یہ بات قرآن کے مطابق ہے ؟

طلوعِ اسلام

یہ خالص تصوف کی تعلیم ہے جس کا قرآن سے کوئی تعلق نہیں۔ خدا کا عرفان تو خیر بہت بڑی بات ہے۔ قرآن تو نفسِ انسانی کے عرفان کا بھی کہیں مطالبہ نہیں کرتا۔ وہ نفسِ انسانی پہ غور و فکر کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ (جس طرح وہ کائناتی شواہد پہ تدبّر و تفکّر کی دعوت دیتا ہے) لیکن "معرفت" اور غور و فکر کے بعد کسی شے کے متعلق علم حاصل کرنے میں جو فرق ہے وہ بالکل واضح ہے۔ باقی رہی خدا کی ذات، سو قرآن اس پہ ایمان کا مطالبہ کرتا ہے۔ اس کے عرفان کا نہیں۔ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ انسان اس کی ذات کی حقیقت و ماہیت جان اور پہچان سکے۔ لہٰذا، دین کا مقصود "خدا کا عرفان" نہیں۔ (۱۹۵۵ء)

---

۴ - مستِ الست

گجرات سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ:۔

جو شخص نماز روزہ ترک کر دے۔ گالیاں دے اور ناجائز حرکات کرے، کیا وہ ولی اللہ ہو سکتا ہے ؟ نیز مست لوگوں کے متعلق آپ کی کیا رائے ہے، وہ کس طرح مست ہو جاتے ہیں اور وہ ناجائز حرکات کیوں کرتے ہیں ؟

جواب:۔ ولی اللہ کسی خاص شخص کو نہیں کہتے، اور نہ ہی اولیاء اللہ کا کوئی خاص گروہ ہوتا ہے۔ قرآن کی رُو سے ہر مومن ولی اللہ ہوتا ہے۔ یعنی وہ اللہ کو دوست رکھتا ہے اور اللہ اس کا دوست اور کارساز ہوتا ہے۔ اللہ کی دوستی کے معنی ہیں اس کے قانون کی پوری پوری اطاعت۔ ہمارے ہاں جو اولیاء اللہ کا الگ گروہ سمجھا جاتا ہے، یہ عقیدہ عیسائیوں کی خانقاہیت سے لیا گیا ہے

جہاں (SAINTS) ہوتے ہیں۔

باقی رہے مست، سواس کی صورت یہ ہے کہ قرآن علم وعقل، فہم وبصیرت، تدبر وتفکر، براہان ودانش کی تعلیم دینے آیا تھا۔ لہذا کوئی شخص جس قدر زیادہ علم وعقل سے کام لیتا تھا اسی قدر واجب العزت قرار پاتا تھا۔ لیکن جب مسلمانوں نے قرآن چھوڑا تو عزت اور تقرب خداوندی کے معیار بھی اُلٹے ہو گئے اور یہ سمجھا جانے لگا کہ کوئی شخص جس قدر جاہل اور بیوقوف ہوگا، اتنا ہی زیادہ خدا کا مقرب ہوگا۔ حتیٰ کہ اهل الجنة بُلهٌ کی حدیث بھی وضع کر لی گئی، جس کے معنی یہ ہیں کہ جنتی لوگ بیوقوف ہوتے ہیں۔ لہذا جب خدا کے مقرب ہونے کا معیار عقل کی کمی قرار پا گیا تو جو شخص بالکل فاترالعقل ہو جائے وہ سب سے بڑا مقرب ہوگا۔ انہی کو ہمارے ہاں مست یا مجذوب کہتے ہیں۔ یعنی بالکل پہنچا ہوا۔ جس کے متعلق سعدیؔ نے کہا تھا کہ:-

کانرا کہ خبر شد، خبرش باز نیاید

باقی رہا یہ کہ لوگ مست کیسے ہو جاتے ہیں تو یہ سوال کسی ڈاکٹر سے پوچھنا چاہیئے۔ جو بتا سکے گا کہ لوگ پاگل کس طرح ہو جاتے ہیں ؟

لیکن آپ کو یہ نہیں پوچھنا چاہیئے تھا کہ وہ پاگل کس طرح ہو جاتا ہے۔ پوچھنا یہ چاہیئے تھا کہ جو لوگ اس پاگل کے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ انہیں کیا ہو جاتا ہے ؟۔ (۱۹۵۴ء)

۵۔ اِنسانی ذات کیا ہے ؟

کراچی سے ایک صاحب لکھتے ہیں :-

" آپ جو قرآنی فکر پیش کرتے ہیں اس میں انسانی نفس یا انسانی ذات کو بڑی اہمیت دی جاتی ہے "نفس " کے متعلق کچھ دھندلے سے تصورات تو ہمارے ذہن میں آ گئے ہیں۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ جس طرح آپ نے اپنی لغات میں قرآن مجید کے اور تصورات سے تفصیلی بحث کی ہے۔ اسی طرح " نفس " کی بحث بھی سامنے آجاتی۔ غالباً یہ بحث لغات کی چوتھی جلد میں آئے گی۔ لیکن اس میں شاید ابھی

دیر لگ جائے اور میں اس کے معلوم کرنے کیلئے بہت بیقرار ہوں۔ اس لئے شکرگذار ہوں گا۔ اگر آپ اس کے متعلق طلوعِ اسلام کی آئندہ اشاعت میں تفصیل سے لکھ دیں۔"

جواب:۔ "نفس" سے متعلق تفصیلی بحث لغات القرآن کی چوتھی (اور آخری) جلد میں آگئی ہے۔ ذیل میں وہ عنوان درج کیا جاتا ہے۔ اس میں پہلے اس مادہ کی لغوی بحث ہے اور آخر میں نفسِ انسانی کے متعلق تصریحات۔ واضح رہے کہ اُخروی زندگی میں یقین، قرآن کی رُو سے اجزائے ایمان میں سے ہے اور اُس زندگی پر ایمان کی عمارت اس بنیاد پر استوار ہوتی ہے کہ انسان صرف اس کے طبعی جسم سے عبارت نہیں۔ جس کا موت کے ساتھ خاتمہ ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس میں جسم کے علاوہ کچھ اور بھی ہے، جو اس کے جملہ اعمال کی ذمہ دار اور ان کے نتائج کی حامل ہے اور جو طبعی موت سے فنا نہیں ہو جاتی اسی کو انسانی ذات یا (نفس) کہتے ہیں۔ قرآن نے اس کے لئے "ذات" کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اسے "نفس" سے تعبیر کیا ہے۔ یہ لفظ قرآن میں اور بھی بہت سے معانی کے لئے استعمال ہوا ہے۔ متعلقہ عنوان حسبِ ذیل ہے۔

(ن ۔ ف ۔ س) صاحب تاج العروس نے لکھا ہے کہ نفس کے بہت سے معنی ہیں۔ منجملہ ان کے یہ لفظ انسانی شخصیت کے ظاہری اور باطنی پہلوؤں کے مجموعہ پر بولا جاتا ہے۔ نیز وُہ توانائی جس سے تمیز کی صلاحیت (شعور اور احساس کی قوت) پیدا ہوتی ہے۔ عقل، علم اور قلب کے معنوں میں بھی آتا ہے اور عَینُ الشَّیئِ کے معنوں میں بھی۔ جیسے جَآءَ نِیَ الْمَلِکُ بِنَفْسِہٖ۔ بادشاہ میرے پاس بنفسِ نفیس آیا۔ نیز عظمت اور بڑائی، ہمت، غیرت، ارادہ اور عقوبت (سزا) کے معنوں میں بھی۔ نیز نَفْسٌ کے معنی بھائی بند کے بھی ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ خون کے معنوں میں بھی استعمال ہوتا ہے۔ چنانچہ نِفَاس اُس خون کو کہتے ہیں جو ولادت کے بعد عورتوں کو آتا ہے۔ خود ولادت (عورت کے بچہ جننے) کے معنوں میں بھی یہ لفظ آتا ہے۔ نَفَسٌ سانس کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع اَنْفَاس آتی ہے۔ ابنِ فارس نے کہا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی ہلکی اور نرم ہوا کے نکلنے کے ہیں۔ نَفَسٌ کے معنی وسعت اور کشادگی کے بھی ہیں۔ ایک کش اور گھونٹ کو بھی کہتے ہیں اور طویل چیز کو بھی۔ نَفِیْسٌ مالِ کثیر کو کہتے ہیں اور شَیْئٌ نَفِیْسٌ۔ وہ عمدہ چیز جس کی طرف انسان لپک کر جائے۔ تَنَفَّسَ کے معنی ہیں سانس لینا۔ نیز تَنَفَّسَ الصُّبْحُ کے معنی ہیں صبح کا

واضح اور روشن ہوجانا۔ (۸/۱۴) نَافَسَ اور تَنَافَسَ کے معنی کسی اچھے کام میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی کوشش کرنا ہیں۔ (۸۳/۲۶)

نیز اس کے معنی عِنْدِیْ (میرے پاس) کے بھی ہوتے ہیں۔ تاج العروس نے اس کی مثال کے لئے سورۂ مائدہ کی آیت تَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِیْ وَلَآ اَعْلَمُ مَا فِیْ نَفْسِكَ (۵/۱۱۶) لکھی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ (اے میرے رب) جو کچھ میرے دل میں ہے تو اسے جانتا ہے لیکن جو کچھ تیرے ہاں (یا پاس) ہے میں اُسے نہیں جانتا۔

اس کے علاوہ اس کے معنی عقوبت (یا سزائے اعمال) کے بھی ہیں۔ مثلاً وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ (۳/۲۸) اس کا مطلب یہ نہیں کہ خدا تمہیں اپنے آپ سے یا اپنی ذات سے ڈراتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تمہیں اپنے قانونِ مکافات کی رُو سے مرتب ہونے والے تباہ کن نتائج سے محتاط رہنے کی تاکید کرتا ہے۔

اَنْفُسٌ کے معنی بھائی بند بھی ہیں۔ (۲/۸۴) اور خود اپنا آپ بھی (۲/۴۴) اس قسم کے مقامات میں یہ ان معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ جن معنی میں انگریزی زبان میں مثلاً (MYSELF) یا (YOURSELF) یا (HIMSELF) وغیرہ استعمال ہوتے ہیں۔

علاوہ بریں اس لفظ (نَفْس) کو قرآن کریم نے اس "شے" کے لئے بھی استعمال کیا ہے۔ جسے ہم انسانی ذات (HUMAN PERSONALITY) یا (اقبالؒ کی اصطلاح میں) خودی (SELF) یا اَنَا (I AM-NESS) کہتے ہیں۔ یہ مفہوم وضاحت طلب ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ دین کی اصل و بنیاد انسانی ذات کے اقرار پہ استوار ہے تو اس میں قطعاً مبالغہ نہیں ہوگا۔ دنیا میں اصولی طور پر دو قسم کے تصوّراتِ حیات پائے جاتے ہیں۔ ایک تصورِ حیات یہ ہے کہ انسانی زندگی محض طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے۔ انسان طبیعی قوانین کے مطابق زندہ رہتا ہے۔ انہی قوانین کے ماتحت اس کے جسم کی پرورش ہوتی ہے اور انہی قوانین کی رُو سے یہ آخر الامر مرجاتا ہے اور جب اس کے تنفس (سانس) کی آمد و رفت کا سلسلہ ختم ہوجاتا ہے تو اس کے ساتھ ہی اس فرد کا بھی خاتمہ ہوجاتا ہے۔ عصرِ حاضر کی زبان میں اسے مادی نظریۂ حیات ——— (MECHANISTIC CONCEPT OF LIFE) کہتے ہیں۔ جسے عام طور پر "مغربی

تہذیب" کہا جاتا ہے۔ وہ اسی نظریۂ حیات کی مظہر ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی رُو سے انسان کو نہ خدا پر ایمان لانے کی ضرورت پڑتی ہے، نہ وحی کو تسلیم کرنے کی حاجت۔ اس نظریہ کے قائل اگر خدا کی ہستی کا اقرار بھی کریں گے تو (زیادہ سے زیادہ) اس حد تک کہ کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور وہ اس کے قوانین کے مطابق سرگرمِ عمل ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ خدا پر اس قسم کے ایمان سے انسانی زندگی پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اگر ایک شخص کہتا ہے کہ اس کائنات کو خدا نے پیدا کیا ہے اور دوسرا کہتا ہے کہ نہیں، یہ یونہی اتفاقیہ طور پر وجود میں آگئی ہے، تو اس اقرار اور انکار سے ان کی زندگی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم اس کے ایمان کو ایمان ہی تسلیم نہیں کرتا۔ (دیکھئے مثلاً ۲۹/۶۱-۶۴ ، ۲۳/۸۴-۸۸ ؛ ۳۹/۳۵ ؛ ۳۹/۳۸ ؛ ۴۳/۹) - اسی طرح جو شخص یہ کہتا ہے کہ زندگی بس اس طبیعی زندگی کا نام ہے۔ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے تو اس کے نزدیک خیر اور شر کا معیار بھی خود ساختہ ہو جاتا ہے۔ خیر وہ جس سے اسے فائدہ پہنچے، یا زیادہ سے زیادہ، جسے معاشرہ (سوسائٹی) اچھا کہہ دے۔ اور شر وہ جس سے اُسے نقصان پہنچے، یا جسے سوسائٹی معیوب سمجھے۔ اس کے نزدیک اس کے اپنے فیصلوں یا معاشرہ کے متعین کردہ قوانین و ضوابط سے بالا کوئی قانون نہیں ہو سکتا۔ اس کی زندگی کا مقصد اپنے جذبات کی تسکین ہوتا ہے اور بس۔

قرآن کریم اُسے کفر کی زندگی قرار دیتا ہے۔ سورۂ الجاثیہ میں ہے۔ أَفَرَءَيْتَ مَنِ اتَّخَذَ إِلَـٰهَهُ هَوَاهُ۔ کیا تم نے اس شخص کی حالت پر بھی غور کیا جو اپنے جذبات ہی کو اپنا الٰہ بنا لیتا ہے۔ اس کا نتیجہ ہوتا ہے کہ وَأَضَلَّهُ اللَّهُ عَلَىٰ عِلْمٍ۔ وہ قانونِ خداوندی کے مطابق، اپنے علم کے باوجود غلط روشِ زندگی پر چلتا ہے۔ وَخَتَمَ عَلَىٰ سَمْعِهِ وَقَلْبِهِ وَجَعَلَ عَلَىٰ بَصَرِهِ غِشَاوَةً۔ اور جذبات پرستی کا طوفان اس کے کان اور دل پر مہر لگا دیتا ہے اور اُس کی آنکھوں پر پردے پڑ جاتے ہیں۔ فَمَن يَهْدِيهِ مِن بَعْدِ اللَّهِ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ۔ (۴۵/۲۳) اور یہ ظاہر ہے کہ جو شخص خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق اس حالت تک پہنچ جائے۔ اس کی صحیح راستے کی طرف بجز خدا کے قانون کے اور کون راہ نمائی کر سکتا ہے۔ سو کیا تم ایسے شخص کی حالت دیکھ کر نصیحت حاصل نہیں کر سکتے۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ وَقَالُوا مَا هِيَ إِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا نَمُوتُ وَنَحْيَا وَمَا يُهْلِكُنَا إِلَّا الدَّهْرُ۔ جو کہتے ہیں کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے۔ ہم (قوانین طبیعی کے مطابق) مرتے ہیں اور جیتے ہیں۔ اور مرورِ زمانہ (وقت) ہمیں ہلاک کر دیتا ہے۔

وَمَا لَهُمْ بِذَالِكَ مِنْ عِلْمٍ - إِنْ هُمْ إِلاَّ يَظُنُّوْنَ - (۴۵/۲۴)۔ انہیں حقیقتِ حال کا کچھ علم نہیں ہوتا۔ یہ محض ظن و قیاس سے کام لے کر اس قسم کا تصور قائم کر لیتے ہیں۔

قرآنِ کریم اس زندگی کو حیوانی سطح زندگی قرار دیتا ہے۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاكُلُوْنَ كَمَا تَاكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) جو لوگ اس (بلند سطح زندگی) سے انکار کرتے ہیں، وہ حیوانوں کی طرح کھاتے، پیتے اور سامانِ زیست سے فائدے اٹھاتے (اور پھر مر جاتے) ہیں۔

اس کے برعکس، دوسرا تصورِ زندگی یہ ہے کہ انسانی زندگی صرف اس کے جسم کی زندگی نہیں۔ جسم کے علاوہ انسان میں ایک اور "شے" بھی ہے جسے اس کی ذات، یا نفس کہتے ہیں۔ یہ قوانینِ طبیعی کے ماتحت نہیں ہوتی۔ نہ ہی جسم کی موت سے اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اس سے انسان مرنے کے بعد بھی زندہ رہتا ہے۔ اگر اس کی مناسب نشو و نما کی جائے تو انسان کی موجودہ زندگی بھی خوشگوار اور سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔ اور مرنے کے بعد، وہ زندگی کے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ انسانی ذات کی نشو و نما ان قوانین کی رو سے ہوتی ہے جو خدا کی طرف سے، حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے بذریعہ وحی ملتے ہیں (اور جو اب قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہیں) اس سے آپ نے دیکھ لیا کہ انسانی ذات پر "ایمان" اور خدا، وحی، نبوت، اور آخرت پر ایمان کس طرح لازم و ملزوم ہیں۔

"انسانی ذات کیا ہے؟" یہ نہ بتایا جا سکتا ہے نہ سمجھا جا سکتا ہے۔ اس لئے کہ یہ کوئی مادی شے نہیں۔ انسانی ذات کا مظاہرہ اس کے اختیار و ارادہ سے ہوتا ہے۔ اس لئے ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ یہ ایک ایسی غیر مادی "شے" ہے جو اختیار و ارادہ کی استعداد کی حامل ہے۔ اختیار و ارادہ (بصورتِ مطلق اور کلی طور پر) خدا کو حاصل ہے اور اس کا عطا کردہ (محدود شکل میں) انسان کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کائنات میں کسی اور کو اختیار و ارادہ حاصل نہیں۔ اسی لئے اسے خدا نے "روحنا" کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی الوہیاتی توانائی (DIVINE ENERGY)۔ (دیکھئے عنوان (ر۔ و۔ ح) اگر انسان، قوانینِ خداوندی کا اتباع کرے، تو اس کی ذات میں (حدِ بشریت کے اندر) صفاتِ خداوندی منعکس ہوتی جاتی ہیں۔ اسی کو اس کی ذات کی نشو و نما کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ انسانی ذات، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں۔ ذات (وہ خدا کی ہو یا انسان کی) ایک غیر منقسم وحدت (INDIVISIBLE WHOLE) ہوتی ہے جس کے حصے بخرے ہو نہیں سکتے۔

چونکہ انسان کے ہر عمل کی بنیاد اس کے ارادہ پر ہوتی ہے۔ اس لئے اس کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ اس کے دل میں گذرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانت تک کا بھی (۴۰/۱۹) یہی اس کا "اعمال نامہ" ہے جو اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے۔ (۱۷/۱۳) اسی کو وہ ظہور نتائج کے وقت پڑھے گا۔ اِقْرَاْ كِتَابَكَ كَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔ (۱۷/۱۴) "تو آج اپنی کتاب پڑھ آج تیرا نفس خود تیرا حساب لینے کے لئے کافی ہے۔ (نیز ۶۵/۱۴—۱۵) اسی سے انسانی ذات کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) ثابت ہوتی ہے۔ (۶/۹۴ ، ۱۹/۹۵) یعنی ہر انسانی ذات منفرد (UNIQUE) ہوتی ہے اور اس کے ہر عمل کا اثر اس کے اپنے اوپر ہوتا ہے۔ کوئی دوسرا اس میں شریک نہیں ہو سکتا۔ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى۔ (۶/۱۶۴) ہر نفس کو اپنے اعمال کا خمیازہ خود بھگتنا پڑتا ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھا سکتا۔ (اس ضمن میں حسب ذیل آیات بھی دیکھئے۔ (۶/۱۰۴ ، ۱۰/۱۰۸ ، ۱۷/۷ ، ۱۷/۱۵ ، ۲۷/۹۲ ، ۲۹/۶ ، ۳۰/۴۴ ، ۳۱/۱۲ ، ۳۵/۱۸ ، ۳۹/۴۱ ، ۴۱/۴۶ ، ۴۵/۱۵ ، نیز ۳۹/۷ ، ۵۳/۳۸) جب اتباعِ قوانینِ خداوندی سے انسانی ذات کی نشوونما ہوتی ہے تو (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) اس میں زندگی کے مزید ارتقائی منازل طے کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اسے مرنے کے بعد جنت کی زندگی کہتے ہیں۔ لیکن جس ذات کی نشوونما نہیں ہوتی۔ وہ آگے بڑھنے سے رُک جاتی ہے۔ یہ جہنم یا جحیم کی زندگی ہے۔ (دیکھئے عنوانات[1] (ج، ن - ن) ، (ج - ح - م) ، (جہنم) یوں تو انسانی ذات کی نشوونما کے لئے پورے کے پورے ضابطۂ قرآنی کا اتباع ضروری ہے (اور یہ اتباع قرآنی معاشرہ کا جزو بن کر ہی کیا جا سکتا ہے) لیکن قرآن کریم نے اس باب میں ایک بنیادی نکتہ بیان کیا ہے جو بڑا اہم ہے۔ انسانی جسم کی پرورش ہر اس شے سے ہوتی ہے جسے وہ فرد خود کھاتا (یا لیتا) ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ میں کھاتا جاؤں اور آپ کے جسم کی پرورش ہوتی جائے۔ اس کے برعکس انسانی ذات کی نشوونما ہر اس چیز سے ہوتی ہے جسے ہم دوسروں کی نشوونما کے لئے دیں۔ وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى الَّذِىْ يُؤْتِىْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى۔ (۹۲/۱۷-۱۸) جہنم سے اُسے بچایا جاتا ہے جو اپنے مال کو (یا جو کچھ اس کے پاس ہے اسے) دوسروں کی نشوونما کے لئے دیتا ہے۔ تقویٰ شعار بھی وہی ہوتا ہے جو "دیتا" ہے۔ مَنْ اَعْطٰى وَاتَّقٰى (۹۲/۵) "جو دیتا ہے اور (اس طرح) تقویٰ اختیار کرتا ہے۔" (مزید دیکھئے۔ ۵۹/۹ ، ۶۴/۱۶) ۔

---

[1] لغات القرآن - از پرویزؔ میں

یاد رہے کہ انسانی ذات، ایک ملکہ، صلاحیت، استعداد یا امکانی قوت ہے جو بجائے خویش نہ خیر ہے نہ شر۔ دوسری ہر قوت کی طرح، اس کا استعمال اسے خیر یا شر بنا دیتا ہے۔ جب انسان اسے انسانیت کی بلند اقدار (HIGHER VALUES) کے تحفظ اور استحکام کے لئے عمل میں لاتا ہے۔ تو یہ خیر کا موجب بن جاتی ہے۔ (اسی سے اس کی نشوونما ہوتی ہے) اور جب انسان اپنے اختیار و ارادہ کو پست مفادِ خویش کی خاطر استعمال کرتا ہے۔ (جس میں بلند اقدار کو پس پشت ڈال دیا جاتا ہے) تو یہ شر کا مظہر بن جاتی ہے۔ اس صورت میں (محض تمیز کی خاطر) ہم انسانی ذات کو ایغو (EGO) سے تعبیر کرتے ہیں۔ ایغو، حیوانی سطحِ زندگی پر ہوتا ہے اور ذات، انسانی سطحِ زندگی پہ۔ جب انسانی جذبات (EMOTIONS) ایغو کے تابع چلتے ہیں تو قرآن کریم انہیں "ھَوٰی" کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ (اس مادہ میں "پستی" کا مفہوم ہوتا ہے۔ دیکھئے عنوان ھ۔ و۔ ی) اور جب عقل (INTELLECT) ایغو کی خادمہ بنتی ہے تو مکر و فن کہلاتی ہے۔ اس کے برعکس جب جذباتِ انسانی انسانی ذات کے تابع رہتے ہیں تو بلند ترین جوہر انسانیت بن جاتے ہیں اور جب عقل، انسانی ذات کے تابع فرمان رہتی ہے تو انسانی زندگی اور معاشرہ جنت بداماں ہو جاتا ہے (اقبالؔ، اول الذکر عقل کو عقل خود بیں اور ثانی الذکر کو عقلِ جہاں بیں، یا خرد "ادب خوردہ دل" کہہ کر پکارتا ہے۔)

جب ایغو، کسی مستقل قدر کو پس پشت ڈال کر، پست مفاد کی طرف جاتا ہے تو اُسے عام طور پر "نفسِ امارہ" کہا جاتا ہے۔ یہ اصطلاح قرآن کریم کی اس آیت سے لی گئی ہے۔ جس میں اس نے عزیز مصر کی بیوی کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَۃٌ بِالسُّوْٓءِ۔ (۱۲/۵۳) یقیناً نفس، برائی کا حکم دیتا رہتا ہے۔ اس کے معنی یہ نہیں کہ نفسِ انسانی ہے ہی برائی کا حکم دینے والا۔ بالکل نہیں۔ یہ ایغو کے متعلق کہا گیا ہے۔ چنانچہ اس کے بعد ہے۔ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ۔ (۱۲/۵۳) بجز اس کے جس پہ خدا کی رحمت ہو۔ یہ نفس کی وہ سطح ہو گی جسے ہم نے "انسانی ذات" سے تعبیر کیا ہے۔

بعض اوقات نفسِ انسانی کی یہ کیفیت بھی ہوتی ہے کہ جب اس سے کوئی برائی سرزد ہو جائے تو اس کے بعد اس میں احساسِ ندامت بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ درحقیقت ایغو اور ذات میں ایک قسم کی کشمکش..... کی حالت ہوتی ہے۔ اسے قرآن کریم نے نفسِ لوّامہ کہا ہے۔ (۷۵/۲) یعنی "ملامت کرنے

والانفس "۔ اس سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ انسانی ذات میں اس کی استعداد نہیں کہ وہ خیر اور شر میں خود تمیز کرسکے۔ خیر اور شر کی تمیز صرف وحی کی رُو سے ہوسکتی ہے۔ نفسِ لوّامہ اسی بات پہ ملامت کرے گا جسے وہ معیوب سمجھتا ہے۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ جس بات کو وہ معیوب سمجھتا ہے۔ وہ درحقیقت معیوب ہو اور جسے وہ محمود قرار دیتا ہے، وہ درحقیقت ممدوح ہو۔ (تفصیل اس اجمال کی (ل۔ھ۔م) اور (ف۔ ط۔ ر) کے عنوانات میں ملے گی۔)

جب انسان خالص قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتا ہے، تو ایغو اور ذات کی کشمکش ختم ہوجاتی ہے۔ ذات پست جاذبیتوں پر غالب آجاتی ہے۔ اِسے قرآن کریم نے نفس مطمئنہ سے تعبیر کیا ہے (۸۹/۲۷) جس کی زندگی جنت کی زندگی ہے۔ (۸۹/۲۹) اسے عصرِ حاضر کے علم النفس کی زبان میں (INTEGRATED PERSONALITY) کہا جائے گا۔ اس کے برعکس (DISINTEG-RATED PERSONALITY) ہوگی۔ قرآن کریم نے نفس کی ان دونوں کیفیتوں کو فُجُوْرَھَا وَ تَقْوٰھَا۔ (۹۱/۸) سے تعبیر کیا ہے۔ (تفصیل کے لئے دیکھئے عنوان (ل۔ ھ۔ م) اور ذات کی نشوونما (DEVELOPMENT) کو انسانی زندگی کا مقصود اور کامیابی و کامرانی بتایا ہے۔ (۹۱/۱)۔

چونکہ انسانی ذات، امکانی شکل (REALISABLE FORM) میں ہر انسانی بچہ کو پیدائش کے ساتھ یکساں طور پر ملتی ہے، اس لئے اس کی بناء پر ہر فرزند آدم، محض آدمی ہونے کی جہت سے واجب التکریم ہے۔ وَلَقَدْ کَرَّمْنَا بَنِیْٓ اٰدَمَ ۔ (۱۷/۷۰) "ہم نے تمام فرزندانِ آدم کو واجب التکریم بنایا ہے" ذات کی تکریم کے معنی یہ ہیں کہ کسی شخص کو حق حاصل نہیں کہ وہ دوسرے شخص کو اپنا محکوم بنائے۔ انسانی اختیار و ارادہ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اس لئے کسی کے اختیار و ارادہ کو سلب کرلینا، اس سے اپنے فیصلے منوانا (اسی کو محکومی کہتے ہیں) اُسے شرفِ انسانیت سے محروم کردینا ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے اطاعت یا محکومی، صرف قوانینِ خداوندی کی ہوسکتی ہے۔ (اسی کو عبادت کہتے ہیں۔ دیکھئے عنوان (ع۔ ب۔ د) یہ اطاعت کسی مستبد حاکم کی عائد کردہ پابندیوں کا نام نہیں ہوتا۔ انسان ان پابندیوں کو اپنے اوپر خود عائد کرتا ہے۔ (اطاعت کے معنی ہی بطیبِ خاطر، برضا و رغبت، اپنے اوپر کسی پابندی کا عائد کرنا ہے) اور اس لئے عائد کرتا ہے کہ اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَھَا۔ (۲/۲۸۶) سے یہی مراد ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی انسان پر جو پابندیاں عاید کرتے ہیں تو اس سے مقصد، خود انسانی ذات

میں وسعت پیدا کرنا ہوتا ہے نہ کہ اس کی آزادی کو سلب کرنا۔ (دیکھئے عنوان ث۔ ل۔ ف) قرآنی معاشرہ اس قسم کی فضا پیدا کرتا ہے جس میں کوئی کسی کا محکوم نہیں ہوتا اور اسی طرح انسانی ذات کی وسعتیں حدود فراموش ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اس سے انسان کو اس دنیا میں بھی جنتی زندگی حاصل ہو جاتی ہے، اور آخرت میں بھی جنتی زندگی، خانقاہیت کی تجرد گاہوں میں انسانی ذات کی نشو و نما کبھی نہیں ہو سکتی۔ جنت کے لئے فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ (۸۹/۲۹) پہلی شرط ہے۔

سورۂ زمر میں ایک آیت ہے اَللّٰہُ یَتَوَفَّی الْاَنْفُسَ حِیْنَ مَوْتِھَا وَالَّتِیْ لَمْ تَمُتْ فِیْ مَنَامِھَا فَیُمْسِكُ الَّتِیْ قَضٰی عَلَیْھَا الْمَوْتَ وَیُرْسِلُ الْاُخْرٰٓی اِلٰٓی اَجَلٍ مُّسَمًّی۔ (۳۹/۴۲) اللہ موت کے وقت نفوس کو موقوف کر دیتا ہے اور جو مرتے نہیں ان کی نیند کی حالت میں ایسا کر دیتا ہے۔ پھر جن پر موت کا حکم ہو جاتا ہے تو انہیں روک لیتا ہے۔ اور دوسروں کو ایک وقت مقرر تک واپس بھیج دیتا ہے۔" سوال یہ ہے کہ اس آیت میں "نفس" سے کیا مطلب ہے جسے موت اور نیند دونوں حالتوں میں موقوف کر دیا جاتا ہے۔ اور جب انسان جاگ اٹھتا ہے تو اُسے واپس کر دیا جاتا ہے۔ لیکن بصورتِ موت اُسے واپس نہیں کیا جاتا۔ جہاں تک نیند کا تعلق ہے، ہم جانتے ہیں کہ اس میں انسان کا سب کچھ موجود ہوتا ہے، بجز شعور (CONSCIOUSNESS) کے۔ (حتیٰ کہ اس میں تحت الشعور بھی باقی ہوتا ہے) اس لئے ظاہر ہے کہ اس آیت میں "نفس" سے مراد اس کی شعوری حالت ہے۔ یعنی نیند اور موت دونوں حالتوں میں اس کا شعور باقی نہیں رہتا۔ سونے والا جب جاگ اُٹھتا ہے تو اس کا شعور پھر روبہ عمل ہو جاتا ہے۔ لیکن موت کی صورت میں شعور کا تعلق اس جسم کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے۔ موت کے بعد، شعور کیسے روبہ عمل ہوتا ہے، ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر اُسے نہیں سمجھ سکتے۔ اس لئے کہ اس وقت ہمارے شعور کے روبہ عمل ہونے کا ایک ہی ذریعہ ہے اور وہ ہے ہمارا مادی جسم۔ ہم اس وقت جسم کے توسط کے بغیر، شعور کی کارفرمائی کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ قرآن کریم نے یہ نہیں بتایا کہ حیات بعد الممات میں شعور کی کارفرمائی کا ذریعہ کیا ہوگا۔ نہ ہی اس کے بتانے سے کوئی فائدہ تھا۔ اس لئے کہ جس بات کو ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر سمجھ ہی نہیں سکتے، اس کے بتانے سے کیا حاصل ہو سکتا ہے۔ لیکن مرنے کے بعد نفس کی کارفرمائی کو قرآن کریم ایک حقیقت ثابتہ کے طور پر بیان کرتا ہے۔ اس پر ہمارا ایمان ہے اور یہی دین کی اصل و بنیاد ہے۔

(۱۹۶۱ء)

۶۔ الُوہیاتی توانائی

ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ آپ انسانی ذات کے لئے ""الُوہیاتی توانائی" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ اس کا صحیح مفہوم کیا ہے؟ کیا یہ "توانائی" ذاتِ خداوندی کا جزو ہے؟

جواب:۔ کائنات میں ہر جگہ توانائی پائی جاتی ہے۔ جانداروں میں اس کا اظہار زیادہ نمایاں اور محسوس طریق پر ہوتا ہے۔ یہ توانائی مادی اسباب وعلل کا نتیجہ ہوتی ہے (یا یوں کہیئے کہ طبیعی قوانین کے مطابق سامنے آتی ہے) اس لئے اسے "مادی توانائی" کہتے ہیں۔ انسانی جسم کی توانائی بھی اسی زمرہ میں آتی ہے۔ لیکن انسان کے اندر ایک اور توانائی بھی ہے جس کا مظاہرہ اس کے اختیار وارادہ کی شکل میں ہوتا ہے۔ یہ توانائی جسمِ انسانی کی طبیعی توانائی سے زیادہ قوی ہوتی ہے۔ اس لئے کہ طبیعی توانائی، اِس خاص توانائی کے تابع کام کرتی ہے۔ اس "توانائی" کو خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے (اسے اس نے "روحنا" کہہ کر پکارا ہے۔ (یعنی خدا کی روح یا توانائی) اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہ توانائی، مادی قوانین سے متعلق نہیں، خدا کی طرف سے براہِ راست ملی ہے۔ یہ "انسانی ذات" ہے۔ اسی کو میں "الوہیاتی توانائی" سے تعبیر کرتا ہوں۔ "الوہیاتی" ہمارے ہاں کی ایک قدیم اصطلاح ہے اور اس کے معنی ہیں "اللہ کی طرف منسوب"۔ لہذا "الوہیاتی توانائی" سے مراد ہے ایسی توانائی جو مادہ کی پیداوار نہیں بلکہ براہِ راست خدا کی طرف منسُوب ہے۔ واضح رہے کہ خود مادی توانائی بھی "غیر از خدا" کی پیدا کردہ نہیں ہوتی۔ وُہ اُن قوانین کے ماتحت پیدا ہوتی ہے جو خدا نے مادہ سے متعلق متعین کر رکھے ہیں۔ "انسانی توانائی" کو اس نے خاص طور پر اپنی طرف اس لئے منسوب کیا ہے کہ یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ یہ "مادی توانائی" سے الگ اور ممتاز ہے۔

یہ توانائی خدا کی ذات کا حصہ نہیں۔ "ذات" کے حصے بخرے ہو نہیں سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ مَیں انسانی ذات یا الوہیاتی توانائی کے ساتھ یہ لکھ دیا کرتا ہوں کہ یہ خدا کی عطا کردہ ہے، ذاتِ خداوندی کا جزو نہیں۔ اسے ذاتِ خداوندی سے جدا شدہ حصہ سمجھنا، ہندوؤں کے فلسفۂ ویدانت کا پیدا کردہ تصور ہے۔ انسانی ذات، اللہ تعالےٰ کی عطا کردہ "توانائی" ہے جو نہ اس کی ذات کا حصہ ہے، نہ

اس کا منتہیٰ - اس کی ذات سے جا کر مل جاتا ہے - یہ توانائی ، غیر نشوونما یافتہ شکل (UNDEVELOPED FORM) میں ملتی ہے اور اسے نشوونما دینا ، انسانی زندگی کا مقصود ہے - اسی لئے قرآنی معاشرہ قائم کیا جاتا ہے - انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے اور اُس کی ذات اس کے طبیعی جسم کی موت کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتی -

(سنہ ۱۹۶۰)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

باب دوم

رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم

۱۔ رحمۃ للعالمین

(محترم پرویز صاحب کی تقریر جو ۱۲ دسمبر کی شام، بتقریب عید میلادالنبیؐ ریڈیو اسٹیشن کراچی سے نشر ہوئی اور جسے ریڈیو پاکستان کی اجازت اور شکریہ کے ساتھ شائع کیا جاتا ہے۔ طلوع اسلام)

یہ قرآن کا ارشاد ہے اور ہمارا ایمان کہ حضور نبی اکرم (علیہ الصلوٰۃ والسلام) تمام اقوام عالم کے لئے رحمت بنا کر بھیجے گئے تھے۔ وما ارسلنٰک الا رحمۃً للعالمین (۲۱/۱۰۷) غیر مسلم اقوام بجا طور پر یہ سوال کر سکتی ہیں کہ مسلمان اپنے پیغمبرؐ کے متعلق جو عقیدہ چاہیں رکھیں، لیکن وہ یہ دعوے کس طرح کر سکتے ہیں کہ ان کے پیغمبرؐ کا ظہور دوسری اقوام کے لئے بھی رحمت ہے؟ یہ سوال غور طلب ہے اور اس کے جواب کی ذمہ داری مسلمانوں پر عائد ہوتی ہے۔ ذمہ داری کے علاوہ یہ دعوے اتنا بڑا ہے کہ خود اس کی اہمیت اس کے ثبوت کی متقاضی ہے۔

قرآن کریم میں نبی اکرمؐ کی رسالت کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (۷/۱۵۷)۔ وہ ان تمام بندشوں کو توڑ دے گا جو نوع انسان کی حریت و آزادی کی راہ میں حائل تھیں اور تمام زنجیروں کو کاٹ ڈالے گا جن میں انسانیت جکڑی چلی آ رہی تھی۔

ہمیں دیکھنا یہ ہوگا کہ وہ کونسی زنجیریں تھیں جن میں انسانیت جکڑی ہوئی تھی اور نبی اکرمؐ نے ان زنجیروں کو کس طرح توڑا۔

سب سے پہلے نظامِ حکومت کو لیجئے۔ انسانوں کو دنیا میں مل جل کر رہنا ہے۔ اس کے سوا ان کی زندگی کی کوئی صورت نہیں۔ مل جل کر رہنے سے باہمی مفاد کا ٹکراؤ ناگزیر ہے۔ اس ٹکراؤ سے نزاع اور اختلاف پیدا ہوتا ہے جس کا نتیجہ فساد ہے۔ لہذا، انسان کے سامنے یہ اہم سوال تھا کہ مل جل کر رہنے کی کون سی شکل پیدا کی جائے جس سے اختلافات اور نزاعات پیدا نہ ہوں۔ اور اگر پیدا ہوں تو ان کا تصفیہ امن اور سلامتی سے ہوجایا کرے۔ اس مسئلہ کے حل کے لئے اس نے جو صورت تجویز کی اُسے نظامِ حکومت کہتے ہیں۔ حکومت کا وجود تو عمل میں آیا اس ضرورت کے ماتحت، لیکن ہوا یہ کہ جن لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار آگیا، انہوں نے اُسے خود اپنے مفاد کی خاطر استعمال کرنا شروع کردیا۔ چونکہ انہیں خدشہ تھا کہ ان کی اس مستبدانہ روش کے خلاف لوگوں کے دل میں بغاوت کے خیالات پیدا ہو جائیں گے، اس لئے انہوں نے آہستہ آہستہ اس قسم کا عقیدہ پیدا کردیا کہ بادشاہ خدائی اختیارات کا مالک ہوتا ہے اور دوسرے انسان اس کی خدمت اور اطاعت کے لئے پیدا ہوتے ہیں۔ ظہور نبی اکرمؐ کے وقت تمام مہذب دُنیا کی یہی حالت تھی۔ ہر ملک اور ہر قوم میں تمام اقتدارات بادشاہ کے ہاتھ میں تھے۔ جسے ایشور کا اوتار اور خدا کا سایہ سمجھا جاتا تھا اور باقی انسان اس کی خدمت گزاری اور فرماں پذیری کے لئے زندہ رکھے جاتے تھے۔ مدتوں کی غلامی سے دنیا اس نظامِ حکومت کی اس درجہ خوگر ہوچکی تھی کہ اس کے علاوہ کوئی اور نظامِ حکومت ان کے تصور میں بھی نہیں آتا تھا۔

نبی اکرمؐ تشریف لائے اور انہوں نے ساری دنیا کو للکار کر کہا کہ یاد رکھو! کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر اپنی مرضی چلائے۔ انسانوں کے باہمی معاملات کا فیصلہ ان کے باہمی مشورے سے ہونا چاہیئے۔ یعنی نظامِ حکومت مشاورتی ہونا چاہیئے نہ کہ شخصی اور استبدادی۔ اس ایک آواز نے غلامی اور محکومی، زیردستی اور فرماں پذیری کی ان تمام زنجیروں کو کاٹ کر الگ پھینک دیا جس میں انسانیت صدیوں سے جکڑی چلی آرہی تھی۔ آج ساری دنیا اس مشاورتی نظام کو بہترین نظامِ اجتماعیہ قرار دے رہی ہے۔ اگر آج سے تیرہ سو سال پہلے صحرائے حجاز سے یہ آواز نہ اٹھتی تو سوچئے کہ آج دنیا کی کیا حالت ہوتی؟ کیا یہ آواز تمام نوعِ انسانی کے لئے نشیدِ رحمت نہیں ثابت ہوئی؟

اب ایک اور سمت دیکھئے ۔ ملوکیت کی غلامی انسان کے جسم کی غلامی تھی ۔لیکن اس سے بدتر ایک اور غلامی تھی جس کے طوق وسلاسل میں انسان کی روح جکڑی ہوئی تھی ۔ یہ غلامی تھی پیشوائیت (PRIESTHOOD) کی غلامی ۔ بادشاہ کے حکم کی خلاف ورزی سے انسان کی یہی دنیا برباد ہوتی تھی ۔لیکن مذہبی پیشواؤں کے ارشاد کی تکمیل میں ذراسی کوتاہی ، دنیا اور آخرت دونوں میں ذلت ورسوائی کا موجب بن جاتی تھی ، اس لئے ان کی حکومت انسان کی روح پر چھائی ہوئی تھی ۔اور ان کی ہیبت اس کے دل کی گہرائیوں میں پیوست اور اس کے خون کے ذرّوں میں حلول کر چکی تھی ۔ نبی اکرمؐ آئے اور آپ نے ساری دنیا کو پکار کر کہہ دیا کہ یاد رکھو ! خدا اور اس کے بندے کے درمیان کوئی طاقت حائل نہیں ہوسکتی ۔اس لئے کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ بارگاہِ خداوندی کا حاجب و دربان بن کر بیٹھ جائے ۔ اطاعت صرف خدا کے قانون کی ہے ، کسی انسان کی نہیں ۔ اس آوازۂ حریت سے باطل کی عقیدت مندیوں کی تمام زنجیریں ٹکڑے ٹکڑے ہوکر گر پڑیں ۔اگرچودہ سو سال پہلے یہ آواز بلند نہ ہوتی تو آج روحِ انسانیت کن زنجیروں میں جکڑی ہوتی ! کیا یہ آواز ساری دنیا کے لئے نویدِ رحمت نہیں بنی ؟

ملوکیت اور پیشوائیت نے اپنے استبداد کی زنجیریں مضبوط کرنے کے لئے یہ عقیدہ وضع کر رکھا تھا کہ کچھ انسان پیدائشی طور پر حکومت اور پرستش کے حقوق لے کر آتے ہیں اور دوسرے انسان جنم ہی نیچ قوموں میں لیتے ہیں ۔انسانوں کی یہ تقسیم خود خدا کی متعین کردہ ہے ، اس لئے اس کے خلاف لب کشائی خدا کے فیصلوں کے خلاف سرکشی ہے ۔ ظہور اسلام کے وقت یہ فریبِ ملوکیت و پیشوائیت ایک مسلّمہ کی حیثیت اختیار کر چکا تھا ۔حضور نبی اکرمؐ احترام آدمیت کا پرچم بلند کرتے ہوئے آگے بڑھے اور ساری دنیا کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یاد رکھو ! پیدائش کے اعتبار سے چھوٹے اور بڑے کی کوئی تمیز نہیں ۔عزت اور تکریم کا معیار انسان کے ذاتی جوہر ہیں نہ کہ خاندان کی نسبتیں ۔ پیدائشی نسبتوں سے معاشرے میں امتیازی خطوط کھینچنے والے ، فسادِ آدمیت کے جرمِ عظیم کے مرتکب ہوتے ہیں ۔اس آواز نے تمام انسانوں کو ایک صف میں لا کھڑا کر دیا اور اس طرح پیدائشی امتیازات کے وہ تمام بندھن ٹوٹ گئے جن میں انسانیت جکڑی چلی آرہی تھی ۔ پوچھئے تاریخ عمرانیت کے مبصرین سے کہ اگر دنیا میں یہ آواز نہ ہوتی تو آج دنیا کس دور سے گذر رہی ہوتی ۔ !

اور آگے بڑھئے ! انسانوں نے مختلف ملکوں اور خطوں میں بسنا شروع کیا اور یہی خطے ان کا وطن

قرار پا گئے ۔ اس سے زیادہ ان جغرافیائی حدود کی کچھ حیثیت نہ تھی۔ لیکن ذہن انسانی کی تنگ نظری سے دریاؤں اور ندیوں کی یہی لکیریں قومی امتیازات کے سانپ بن گئیں اور اس کے بعد ہر خطے کا انسان دوسرے خطے کے انسانوں کے خون کا پیاسا ہو گیا۔ یہی وہ قومیت پرستی (نیشنلزم) ہے جو دنیا میں اس قدر کشت و خون اور تباہی و بربادی کا موجب بن رہی ہے۔ حضور نبی اکرمؐ نے تمام دنیا کو پکار کر کہہ دیا کہ تمہارے وطنوں کی لکیریں خود ساختہ ہیں۔ تمام انسان بلا تمیز رنگ و نسل و زبان و وطن ایک درخت کی شاخیں اور ایک کنبے کے افراد ہیں۔ ان سب کو ایک بن کر رہنا ہوگا۔ کیونکہ ان سب کی حیات کا سرچشمہ ایک ہے۔ ذرا غور کیجئے کہ آج ساری دنیا میں ایک حکومت قائم کرنے کی جو آوازیں اٹھ رہی ہیں کیا وہ اسی پیغام وحدتِ انسانیت کی صدائے بازگشت نہیں ؟ سوچئے کہ اگر فضائے عالم اس آواز سے نا آشنا ہوتی تو کسی ذہن میں یہ خیال بھی پیدا ہو سکتا تھا کہ ساری دنیا کے انسانوں کو ایک برادری کی طرح ایک عالمگیر نظام کے تابع زندگی بسر کرنی چاہیئے ؟

اب انسان کی زندگی کے ایک اور گوشے کو لیجئے ۔ انسان کی حالت یہ تھی کہ مذہبی دنیا میں ہر فرد اپنی اپنی نجات کی فکر میں غلطاں و پیچاں تھا اور معاشی دنیا میں ہر شخص اپنے مفاد کی فکر میں سرگرداں و حیراں یعنی ساری دنیا میں محض افراد (INDIVIDUALS) بستے تھے۔ انسانیت (HUMANITY) کا کہیں وجود نہ تھا۔ سوچئے کہ جس دنیا میں ہر فرد اپنی اپنی فکر میں مضطرب و بے چین پھر رہا ہو ، اس میں کس قدر نفسا نفسی کی قیامت برپا ہو گی ؟ اس تخم انفرادیت کا نتیجہ وہ شجرِ خبیثہ ہے جسے سرمایہ داری کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جس میں ہر انسان دوسرے کا خون پی جانے کی فکر میں رہتا ہے۔ دُنیا اس جہنم سے گذر رہی تھی کہ نوعِ انسانی کا وہ محسنِ اعظمؐ آیا اور اس نے وحدتِ انسانیت کی چھپی ہوئی حقیقت کو اس طرح اجاگر کر کے دکھا دیا کہ ہر فرد کو دوسرے افراد کی پرورش اور تربیت میں خود اپنی ذات کی بالیدگی اور برومندی نظر آنے لگی۔ اس نے کہا کہ جو نظام افراد معاشرہ کی ضروریات زندگی کا کفیل اور ان کی مُضمر صلاحیتوں کی نشو و نما کے اسباب و ذرائع بہم پہنچانے کا ذمہ دار نہیں بنتا۔ اُسے دنیا میں قائم رہنے کا حق نہیں پہنچتا۔ یہ پیغام نہ تھا ، ایک زلزلہ تھا جس سے دنیا کا ہر قارون زمین میں دھنس گیا اور اس کے تمام خزانوں اور دفینوں کے دروازے ہر حاجت مند کے لئے کھل گئے۔ کہئے کہ یہ زلزلہ انگیز پیغامِ انقلاب تمام نوعِ انسانی کے لئے مایۂ رحمت تھا یا نہیں ؟

آپ ان چند اُبھرے ہوئے عنوانات کو دیکھئے اور پھر سوچئے کہ پیغمبرِ اسلام کا ظہور تمام اقوامِ عالم کے لئے رحمت ہے یا نہیں ؟

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی ذاتِ گرامی، علامہ اقبالؒ کے الفاظ میں، دُنیائے قدیم اور دُنیائے جدید کے درمیان ایک حدِ فاصل کے طور پر کھڑی ہے۔ اس مقام سے انسانیت کی تاریخ ایک نیا موڑ مڑتی ہے جس سے اس کے سامنے زندگی کی جدید راہیں کھل گئی ہیں۔ آپ دیکھیں گے کہ اس تیرہ سو سال میں انسان کی داخلی اور خارجی دنیا میں جس قدر ایسے انقلابات آئے ہیں جن کے نتائج تعمیرِ انسانیت کے لئے ممد و معاون ثابت ہوئے ہیں، ان کا سرچشمہ وہی پیغام تھا جو محمد رسول اللہ کی وساطت سے دنیا کو ملا۔ اس پیغام نے انسان کو نئی زندگی اور زندگی کو نئی تعبیر عطا کی جس سے نبضِ کائنات باندازِ نو تپش آمادہ ہوگئی۔ کارلائل کے الفاظ میں،

> نوعِ انسانی خشک نیستاں کی طرح ایک شرارے کے انتظار میں تھی۔
> وہ بجلی کا شرارہ اس بطلِ جلیل کی صورت میں آسمان سے آیا اور ساری دُنیا کو شعلہ صفت بنا گیا۔

لیکن یہ ظاہر ہے کہ سورج کی روشنی اسی کو راستہ دکھا سکتی ہے جو اپنی آنکھوں سے کام لے۔ بارش اسی کسان کی جھولی موتیوں سے بھر سکتی ہے جس نے اپنے کھیت کو سیرابی کے قابل بنا رکھا ہو، اسی طرح رسالتِ محمدیہ بھی اسی قوم کے لئے صحیح معنوں میں رحمت بن سکتی ہے جو اپنے معاشرے کو ان خطوط پر متشکل کرے جو اس پیغامِ خداوندی نے نوعِ انسان کی ربوبیت کے لئے متعین کئے ہیں۔ اسی لئے دوسرے مقام پر ہے کہ و رحمۃ للذین امنوا منکم [۹/۶۱]۔ یہ رحمت ہے ان لوگوں کے لئے جو اس نظامِ خداوندی کو اپنا نصب العین زندگی بنائیں۔ رحمت کہتے ہیں اس قالب (PATTERN) کو جس کے اندر کوئی شے اپنی تکمیل کو پہنچے۔ انسان کی صلاحیتیں صرف اس قالب کے اندر اپنی کامل نشوونما حاصل کر سکتی ہیں جو آئینِ خداوندی کی حدود سے متشکل ہوتا ہے۔ جب انسانی ہیئتِ اجتماعیہ اس نظام کے قالب میں ڈھل جائے گی۔ اس وقت انسان دیکھے گا کہ رسالتِ محمدیہ کس طرح فی الواقعہ رحمۃ للعالمین ہے۔ سے

> موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لئے
> نے کوئی فغفور و خاقاں نے فقیرِ رہ نشیں

(جنوری ۱۹۵۲ء)

۱۔ رحمۃ للعالمین

"طلوع اسلام"، شمارہ جنوری ۱۹۵۲ء میں آپ کا نشریہ بعنوان "رحمۃ للعالمین" شائع ہوا۔ اس میں آپ نے رسول مقبولؐ کو نوعِ انسان کے لئے کماحقہٗ رحمت للعالمین ثابت کیا۔ لیکن "رحمۃ للعالمین" میں "عالمین" کا لفظ صرف نوعِ انسانی تک ہی محدود ہے یا اس کا اطلاق تمام کائنات پر ہوا ہے؟ اگر اس میں انسان کے علاوہ دیگر جملہ موجودات و مخلوقات بھی شامل ہیں تو پھر براہِ کرم مضمون کی افادیت کے پیشِ نظر اس نقطۂ نگاہ سے بھی اس پر روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں۔

جواب

رسولوں کی بعثت ہمیشہ انسانوں کی طرف ہوتی ہے۔ قرآن میں اس کی صراحت (متعدد مقامات پر) موجود ہے۔ خود نبی اکرمؐ کو بھی تمام نوعِ انسانی کے لئے رسول بنا کر بھیجا گیا تھا۔ اندریں حالات، رسالتِ محمدؐ کی رحمت بھی انسانی دنیا کے لئے ہے۔ (۲۵/۱ : ۳/۹۶ - ۲۱/۷۱ - ۲۱/۹۱)

۲۔ کیا حضورؐ کا سایہ نہ تھا؟

سوال

روایت ہے کہ حضورؐ کا سایہ نہ تھا۔ لیکن اس گنہ گار کو اس میں تأمل ہے۔ یعنی بشریت کے ساتھ سایہ نہ ہونا کیونکر ممکن ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو عہدِ نبویؐ میں منکرینِ رسالت کے لئے ایک حجت ہوتا یا پھر اس کی کوئی تاویل ہوگی کہ یہ صحابہ کرامؓ سے غائب اور غیر صحابہ کے سامنے موجود۔ بہرحال آپ کے نزدیک یہ روایت کہاں تک معتبر ہے؟

جواب

ہمارے نزدیک تو معتبر خدا کی کتاب ہے جس میں ایک بار نہیں متعدد بار یہ صراحت موجود ہے کہ رسول اللہؐ کو

قرآن کے سوا کوئی اور معجزہ نہیں دیا گیا۔ لیکن مسلمانوں کے ذوق اعجوبہ پسندی نے اس قسم کے ہزاروں معجزات حضورؐ کی طرف منسوب کر رکھے ہیں اور کتب روایات ان سے بھری پڑی ہیں۔ قرآن کی صراحت کے بعد کسی تاویل کی ضرورت ہی باقی نہیں رہتی۔

۳۔ حضورؐ کی شان میں (معاذاللہ) گستاخی

کراچی سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ آئے دن اخبارات میں کوئی نہ کوئی خبر اس قسم کی شائع ہوتی رہتی ہے کہ فلاں عیسائی یا فلاں ہندو نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں گستاخی کے کلمات لکھے ہیں۔ ایسی خبر کے بعد چند روز کے لئے ہنگامہ ہو جاتا ہے۔ کبھی اس کا بدلہ خود لے لیا جاتا ہے اور کبھی قانون کے ذریعے ایسی کتابوں یا رسالوں کو ضبط کرا دیا جاتا ہے۔ پھر یہ ہنگامہ ختم ہو جاتا ہے اور مسلمان کسی ایسی خبر پر دوبارہ جاگ اٹھتا ہے۔ کیا کوئی ایسی تدبیر نہیں کی جا سکتی کہ اس قسم کی باتیں لکھی ہی نہ جائیں تاکہ آئے دن ہمارے جذبات مجروح نہ ہوں۔

جواب

حضور رسول اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ اقدس کے خلاف دریدہ دہنی ایک ایسی ننگِ انسانیت گستاخی بلکہ شرف و احترام آدمیت کے خلاف جرم ہے جسے ہم عالمِ تصور میں بھی برداشت نہیں کر سکتے۔ لیکن ان باتوں کا سدِ باب ہمارے اور آپ کے جذبات سے نہیں ہو سکتا۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ علاماتِ مرض کی بجائے علتِ مرض کی تشخیص کی جائے۔ اور اس کے بعد اس کا علاج۔

سوال یہ ہے کہ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے خلاف جو کچھ لکھا جاتا ہے اس کا ماخذ کیا ہوتا ہے؟ یعنی کیا یہ لوگ اس قسم کے قصے یونہی از خود وضع کر کے شائع کر دیتے ہیں۔ یا انہیں کہیں سے لیا جاتا ہے۔ یورپ کے مستشرقین کی کتابیں اس قسم کی لغویات سے بھری پڑی ہیں۔ لیکن سوال پھر یہی پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے ان لغویات کو از خود وضع کیا ہے یا کہیں سے نقل کیا ہے۔ آپ کے لئے شاید یہ چیز موجب استعجاب ہو کہ مستثنیات کے سوا اس قسم کی تمام لغویات و خرافات کا ماخذ خود ہمارے اپنے ہاں کی کتابیں ہیں۔ اور وہ کتابیں

بھی بازاری قصے کہانیوں کی نہیں بلکہ وہ کتابیں جنہیں ہم ہزار برس سے سر پہ اٹھائے اٹھائے، سینوں سے لگائے پھر رہے ہیں، یعنی ہمارے ہاں کی احادیث اور تفاسیر کی کتابیں۔ تفاسیر کے متعلق تو پھر بھی یہی سمجھا جاتا ہے کہ وہ کسی نہ کسی عام انسان کے خیالات ہیں۔ لیکن احادیث کے متعلق تو ہمارے ہاں یہ عقیدہ ہے کہ وہ خود رسالت مآب صلعم کے اقوال و افعال کا مجموعہ ہیں۔ اگر آپ ان احادیث کے مجموعوں کو اٹھا کر دیکھیں تو آپ حیران رہ جائیں گے کہ ان میں وہ سب کچھ موجود ہے جنہیں ہم عیسائیوں اور ہندوؤں کی کتابوں اور رسالوں میں نقل شدہ دیکھ کر اس طرح آتش در پیراہن ہو جاتے ہیں۔ ان چیزوں کو دیکھ کر ہمارا خون کھولنا بجا ہے۔ لیکن ہماری بدبختی یہی ہے کہ ہم ان کتابوں کو جن سے یہ خرافات لی جاتی ہیں، اپنے ہاں کے مقدس ترین صحائف بلکہ من جانب اللہ وحی قرار دیتے ہیں، اور جب کوئی انہیں چیزوں کو اپنے ہاں نقل کر دیتا ہے تو اُسے گردن زدنی قرار دیتے ہیں۔ ہم اسے اچھی طرح سمجھتے ہیں کہ ہم جو کچھ لکھ رہے ہیں اُسے آپ کبھی صحیح باور نہیں کریں گے۔ اس لئے کہ آپ اس چیز کا تصور بھی نہیں کر سکتے کہ ہمارے ہاں کی ایسی برگزیدہ کتابوں میں اس قسم کی باتیں بھی لکھی ہوئی ہوں گی۔ اس کے سمجھانے کے دو ہی طریقے ہو سکتے ہیں کہ یا تو ہم اپنے ہاں ان چیزوں کو نقل کر کے دکھا دیں۔ لیکن اوّل تو ہم میں اتنی ہمت نہیں کہ ان چیزوں کو جو حضور سرور کائنات صلعم کی ذات اقدس کے خلاف ایسا کچھ کہہ رہی ہوں طلوعِ اسلام میں شائع کر دیں۔ اور اگر محض اس مقصد کی خاطر ان چیزوں کو پیش بھی کر دیا تو ہمیں خود اندیشہ ہے کہ اس سے عوام کے جذبات نہایت شدت سے مشتعل کر دیئے جائیں گے۔ دوسرا طریقہ ہے کہ ان چیزوں کو آپ از خود پڑھیں۔ ہم آپ سے یہ التماس کرتے ہیں کہ آپ صرف ایک "بخاری شریف" ہی کھولیں۔ جسے اصح الکتب بعد کتاب اللہ کہہ کر پیش کیا جاتا ہے۔ اور پھر دیکھیں کہ اس میں رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی شان کے خلاف کیا کیا کچھ لکھا ہے۔ اس کے بعد آپ خود اندازہ فرمائیں کہ دیگر کتب احادیث اور تفاسیر میں کیا کیا کچھ نہیں ہوگا۔ لہٰذا، اس مرض کا علاج چور کی بجائے چور کی ماں کو مارنا ہے۔ جب تک آپ اپنے ہاں ان کتابوں کو علیٰ حالہ رائج رکھیں گے اور انہیں مستند، صحیح اور مقدس بیان کرتے رہیں گے، غیر مسلم اپنے ہاں ان چیزوں کو درج کر کے اسلام اور حضور رسالت مآب صلعم کے خلاف نفرت پھیلاتے رہیں گے۔ آپ اپنے گھر کو اس لغویت سے پاک کیجئے اور اس کے بعد ہر ایسے مصنف سے، جو اس قسم کی لغویات اپنے ہاں لکھے، پوچھئے کہ اس نے جو کچھ لکھا ہے، اس کا ماخذ کیا ہے۔ جب آپ کے ہاں کا مذہبی لٹریچر پاک اور صاف ہو جائے گا تو پھر ایک آدھ نسل کے بعد

اس قسم کے وریدہ دہن پیدا ہونے خود بخود بند ہو جائیں گے۔ مچھروں سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ اپنے ماحول کی صفائی ہوتا ہے۔ خالی فلٹ چھڑکنا نہیں۔ یہ کام درحقیقت اسلامی حکومتوں کے کرنے کا ہے کہ وہ ہمارے ہاں کی ان کتابوں کو ان خرافات سے پاک کر دیں۔ جو دورِ اوّل کے یہود اور نصاریٰ اور مجوسیوں کی سازش کے ذریعے ہمارے ہاں بار پا چکی ہیں۔ اس کام کے لئے بڑی جرأت کی ضرورت ہے۔ اور یہ جرأت وہی کر سکتا ہے جس کے اندر اتنی قوت ہو کہ وہ مذہبی پیشواؤں کے سہارے کے بغیر اپنے پاؤں پر کھڑا رہ سکے۔ اس باب میں ہم سردست اس کے سوا اور کیا کہہ سکتے ہیں کہ دیکھیں :

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکین دلکم مانده دریں کشمکش اندر

(۱۹۵۳ء)

۴۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور غیب کا علم

ایک اور صاحب لکھتے ہیں کہ آپ نے طلوعِ اسلام میں احادیث کے خلاف جو مہم شروع کر رکھی ہے۔ اس سے آپ نے یہ نہیں سوچا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ عقیدہ پیدا ہو جاتا ہے کہ آپؐ کو غیب کا علم نہیں تھا۔ مثلاً ایک جگہ آپ نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس کوئی مقدمہ آتا اور فریق متعلقہ اس میں غلط بیانی سے کام لیتا تو حضورؐ اس کے بیان کو پیشِ نظر رکھ کر ہی فیصلہ فرما دیتے۔ گویا آپؐ کو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ جھوٹ بول رہا ہے یا سچ۔ اس سے رسول اللہؐ کی شان بہت گر جاتی ہے۔ یہ احادیث کو نہ ماننے کا نتیجہ ہے۔

جواب

ہمارے یہ بھائی اپنے غصے میں یہ بھی بھول گئے ہیں کہ وہ جس بات پر اعتراض کر رہے ہیں وہ خود حدیث ہی میں ہے اور ہم نے اپنی طرف سے نہیں لکھا۔ یعنی یہ حدیث میں موجود ہے کہ رسول اللہؐ نے فرمایا کہ جب تم میرے پاس مقدمات لاتے ہو تو میں تمہارے بیانات کے مطابق ہی فیصلہ دیتا ہوں۔ اگر کوئی شخص

جھوٹ بول کر مجھ سے اپنے حق میں فیصلہ لے لیتا ہے تو وہ جہنم کی آگ ہے۔ یہ حدیث ہمارے نزدیک اس لئے صحیح تسلیم کر لینے کے قابل ہے کہ اس کا مضمون قرآن کے مطابق ہے۔ قرآن میں بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے کہلوایا گیا ہے کہ مجھے غیب کا علم نہیں بجز ان باتوں کے جو قرآن کے اندر درج ہیں[1]۔

باقی رہا یہ کہ رسول اللہ صلعم کی شانِ مبارک، احادیث کو حضورؐ کے ارشادات مان کر بڑھتی ہے یا گر جاتی ہے، اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکتے ہیں جنہوں نے احادیث کا مطالعہ کیا ہے۔ اگر آپ سننے کی تاب رکھیں تو ہم اسی باب (یعنی رسول اللہ کے فیصلوں کے باب میں) صرف ایک حدیث پیش کرتے ہیں۔ اس سے آپ خود جس نتیجہ پر پہنچیں ہمارے لئے وہی کافی ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم باب برأت حرم النبی صلے اللہ علیہ وسلم میں موجود ہے اور اس کا متن یہ ہے۔

مقطوع الذکر والی روایت

ان رجلا کان یتھم بام ولد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
وقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لعلی اذھب
فاضرب عنقہ فاتاہ علی فاذا ھو فی رکیٍّ یتبرد فیھا
فقال لہ علی اخرج فناولہ یدہٗ فاخرجہ فاذا ھو
مجبوبٌ لیس لہ ذکرٌ فکف علیٌّ عنہ ثم اتی النبی صلی اللہ
علیہ وسلم فقال یا رسول اللہ انہ لمجبوبٌ مالہٗ ذکرٌ۔ (عن انس)

ترجمہ اس کا یہ ہے۔

حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ایک شخص پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ام ولد سے زنا کرنے کا الزام لگایا گیا تھا۔ حضورؐ نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ جاؤ اور اس شخص کو قتل کر دو۔ حضرت علیؓ اس کے پاس پہنچے تو وہ کنوئیں میں نہا رہا تھا۔ حضرت علیؓ نے اس سے کہا کہ باہر نکلو۔ اس نے اپنا ہاتھ حضرت علیؓ کے ہاتھ میں دے دیا۔ حضرت علیؓ نے اس کو نکال کر دیکھا تو وہ ہیجڑہ تھا اور اس کا عضوِ مخصوص ہی نہیں تھا۔

ہم نے سینے پر پتھر رکھ کر مسلم شریف کی اس حدیث مقدس کو نقل کیا ہے۔ اگر اس کے بعد بھی ہمارا بھائی یہ سمجھتا رہے کہ احادیث کو دین ماننے سے رسول اللہ صلعم کی شان بڑھتی ہے تو ہمارے پاس اس کا

---

[1]: ۶/۵۰ - ۷/۱۸۸ + ۳/۴۴ - ۱۱/۴۹ - ۱۲/۱۰۲ + ۳/۱۷۹ - ۷۲/۲۶-۲۷

کوئی علاج نہیں۔ یہودیوں اور مجوسیوں کی یہ سازش بڑی گہری تھی۔ اور آج ہمارا مولوی صاحبان کا طبقہ اس سازش کو زندہ، پائندہ اور تابندہ رکھنے میں ہمہ تن مصروف ہے۔ اس کے پاس اسلاف کے نام کی نسبتیں بھی ہیں۔ وضع و قطع کا تقدس بھی ہے، عوام کی نجات کے لئے سرٹیفکیٹ بھی ہیں اور اس لئے ان کے جذبات کے سیلاب کی قوت بھی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ اربابِ دولت و ثروت کی حمایت کی بھی، جو سمجھتے ہیں کہ علماء کی خدمت کرنے سے نجات مل جاتی ہے۔ اُن کے خلاف طلوعِ اسلام کے پاس ان حربوں میں سے کوئی حربہ بھی نہیں۔

گھر میں آپ گھر کے سوا کچھ اور نہیں! (۱۹۵۳ء)

معراجِ نبویؐ

---

۲۵ ستمبر ۱۹۵۹ء کے الاعتصام میں "ایک زبردست دلیل" کے عنوان سے حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے۔

"علم و حکمت کی رُو سے اس سال کا یہ اہم واقعہ ہے کہ روس کا کائناتی راکٹ چاند کی دنیا میں داخل ہو گیا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ زمین اور چاند کا درمیانی فاصلہ ڈھائی لاکھ میل ہے جو روسی راکٹ نے ۳۴ گھنٹے میں طے کیا۔ سائنسدانوں کا خیال ہے کہ راکٹ کے چاند میں اترنے سے قبل ایک کالا دھبہ نمودار ہوا جو بعد میں کئی کالے دھبوں میں بدل گیا۔ یہ دھبے راکٹ کے چاند میں اترنے کے بعد ایک گھنٹہ تک نظر آتے رہے۔

روس کے اس سائنسی کارنامے نے ساری دنیا کو حیرت و استعجاب میں ڈال دیا ہے۔ اور مختلف نقطہ فکر کے لوگوں کے سامنے غور و فکر کے مختلف دروازے کھول دیئے ہیں۔

روس اور اس کے حلیف اس پہ خوشی کا اظہار کر رہے ہیں اور اس کے حریف مثلاً امریکہ، برطانیہ اور فرانس وغیرہ ممالک اس پہ شرما بھی رہے ہیں اور ایک قسم کے احساس کمتری میں مبتلا ہیں۔ لیکن بحیثیت مجموعی پوری دنیا اس سے متاثر ہے اور اس کا اور اس کے نتائج

کا گہری نگاہ سے مطالعہ کر رہی ہے۔

یہ اس دور کا واقعی ایک کارنامہ اور سائنسی فتوحات کا حیرت انگیز واقعہ ہے لیکن اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ سرزمین عرب کی ایک شخصیت چودہ سو برس ہوئے کہ چاند سے بھی آگے نکل گئی تھی اور ایک ہی رات میں مسجد حرام سے لے کر مسجد اقصیٰ اور پھر زمین و آسمان کے درمیانی فاصلوں کو ناپتی ہوئی انتہائی بلندیوں تک پرواز کر گئی تھی اور وہ تھی محمد صلے اللہ علیہ وسلم کی شخصیت ۔ نہ زمین کا قانون کششِ ثقل آپ کے راستہ میں مزاحم ہوسکا اور نہ گرم و سرد کرّے آپ کی رفتارِ پرواز پر اثر انداز ہو سکے۔ سائنس کے اس ترقی یافتہ دور میں روسی راکٹ نے ڈھائی لاکھ میل کا سفر ۳۴ گھنٹے میں طے کیا ہے تو اُس زمانہ میں جب کہ علم و حکمت کی اس اسلوب سے ابھی صبح بھی طلوع نہیں ہوئی تھی۔ اللہ کے اس "عبد" نے صرف ایک رات میں اس سے بھی زیادہ سفر کر لیا تھا۔

سائنس کا یہ موجودہ کارنامہ ہمارے لئے ہرگز باعثِ حیرت و تعجب نہیں ہے بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعہ معراج کی صداقت پر ایک زبردست دلیل ہے۔

اگر انسانی علم اتنی ترقی کر سکتا ہے کہ اس کے ہاتھ کا بنایا ہوا راکٹ، چاند اور سورج کی دنیا میں داخل ہوسکے تو اللہ تعالےٰ کے علم و حکمت میں کیوں اتنی طاقت نہیں ہوسکتی کہ اپنے ایک برگزیدہ پیغمبر کو ایک ہی شب میں ہفت افلاک کی سیر کرادے اور وہاں کے واقعات آپ پر منکشف کر دے۔"

کس قدر مقامِ تأسف ہے کہ یہ حضرات اتنا بھی نہیں سوچتے کہ جس چیز کے متعلق یہ بزعم خویش سمجھتے ہیں کہ وُہ اسلام کی صداقت کی زبردست دلیل ہے۔ اس سے غیروں کی نظروں میں اسلام کیا بن کر رہ جاتا ہے! راکٹ کا چاند تک پہنچ جانا یا اس سے بھی آگے نکل جانا، مادی ذرائع سے ہوتا ہے۔ لیکن جب یہ کہا جاتا ہے کہ نبی اکرمؐ یہ جسدِ مبارک عالم افلاک کی سیر کے لئے تشریف لے گئے تھے تو اس کے متعلق یہ نہیں سمجھا جاتا کہ ایسا مادی ذرائع سے ہوا تھا۔ لہٰذا جو بات مادی ذرائع (اور صرف مادی ذرائع) سے ممکن ہوا اُسے کسی ایسی بات کی "زبردست دلیل" قرار دینا جس میں مادی ذرائع کا کوئی واسطہ نہ ہو۔ علم کی دُنیا میں موجبِ خفت ہوگا۔

اس مقام پر اتنا عرض کر دینا غیر از محل نہ ہوگا کہ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ حضورؐ عالمِ بالا پر بہ جسدِ مبارک تشریف نہیں لے گئے تھے (اور خود صحابہؓ کبار میں ایسے حضرات موجود تھے جو جسمانی معراج کے قائل نہ تھے۔ ابنِ کثیر) انہیں خدا کی قدرت سے انکار نہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ حضورؐ بہ جسدِ عنصری آسمانوں پر تشریف لے جا کر، اللہ تعالیٰ سے ملے تھے تو اس سے یہ ماننا لازم ہو جائے گا کہ خدا کسی خاص مقام پر مقیم ہے جہاں جا کر اس سے ملا جاتا ہے۔ ذاتِ خداوندی کے متعلق ایسا تصوّر قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ خدا مکان اور زمان کی نسبتوں سے بلند ہے، وہ تو ہر انسان سے اس کی رگِ جاں سے بھی زیادہ قریب ہے اور جہاں بھی کوئی ہو، وہیں اُس کے ساتھ ہوتا ہے۔ (۸/۲۴ - ۵۰/۱۶ - ۵۷/۴ - ۵۸/۷)

(۱۹۵۹ء)

۹

قرآن کریم

۱۔ وحی اور الہام

گوجرانوالہ سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ بعض "احمدی" حضرات کہتے ہیں کہ قرآن میں رسولوں کی طرف وحی کے علاوہ الہام کا بھی ذکر ہے اور اس کے لئے وہ سورۂ شوریٰ کی آیت نمبراہ پیش کرتے ہیں۔ اس آیت کی تشریح کر دی جائے۔

طلوعِ اسلام سورۂ شوریٰ کی متعلقہ آیت حسب ذیل ہے۔

وَمَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّكَلِّمَهُ اللّٰهُ اِلَّا وَحْيًا اَوْ مِنْ وَّرَآئِ حِجَابٍ اَوْ يُرْسِلَ رَسُوْلًا فَيُوْحِيَ بِاِذْنِهٖ مَا يَشَآءُ اِنَّهٗ عَلِيٌّ حَكِيْمٌ۔ (۴۲/۵۱)

سادہ زبان میں اس کا ترجمہ یہ ہے کہ "کسی انسان کے لئے یہ ممکن نہیں کہ اللہ اس کے ساتھ کلام کرے بجز اس کے اس کی طرف وحی بھیجے یا پردہ کے پیچھے سے ہو یا کوئی رسول بھیجے اور اس طرح اپنے قانونِ مشیت کے مطابق وحی کر دے۔ یقیناً وہ بلند حکمت والا ہے" اب اس کا مفہوم سمجھئے جو بالکل صاف ہے۔ یہاں انسانوں تک خدا کا کلام پہنچنے کے طریقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ ایک رسول اور دوسرے رسولوں کے علاوہ عام انسان۔ پہلے رسولوں کے

متعلق کہا گیا ہے کہ ان تک خدا کا کلام کس طرح پہنچتا ہے۔ اس کے دو طریقے بتائے گئے ہیں۔ ایک اس وحی کے ذریعہ جو جبریلؑ کی وساطت سے بھیجی جاتی ہے جیسے رسول اللہؐ پر وحی آتی تھی یعنی بذریعہ جبریلؑ، جس کے متعلق کہا گیا ہے کہ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰی قَلْبِكَ (۲/۹۷) اور دوسرا طریقہ فرشتے کے بغیر براہ راست۔ اس طرح کہ آواز سنائی دے لیکن بات کرنے والا (خدا) دکھائی نہ دے۔ جیسے حضرت موسیٰؑ کی طرف وحی (سورۃ طٰہٰ) میں نُوْدِیَ یٰمُوْسٰی کہنے کے بعد فرمایا فَاسْتَمِعْ لِمَا یُوْحٰی (۲۰/۱۱-۱۳)

یہ دونوں طریقے رسولوں کے ساتھ خدا کے کلام کے ہوتے۔ اب رہے وہ بشر جو رسول نہیں ہیں تو ان کے ساتھ خدا نے اپنے کلام کا طریقہ یہ بتایا کہ وہ ان کی طرف اپنے رسول بھیجتا ہے اور ان رسولوں کی وساطت سے اپنا کلام ان تک پہنچاتا ہے۔ کسی غیر رسول سے خدا نہ براہ راست بات کرتا ہے اور نہ ہی اس کی طرف فرشتے کے ذریعے سے اپنی وحی بھیجتا ہے۔ غیر رسول کو خدا کی وحی ہمیشہ رسول کی وساطت سے ملے گی۔

جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے اس کی وضاحت خود اس متصل آیت نے کر دی ہے جہاں رسول اللہؐ سے یہ فرمایا کہ وَكَذٰلِكَ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا۔ کہ ہم نے اس طرح (جس طرح اوپر کہا گیا ہے کہ ہم رسولوں کے ساتھ بذریعہ وحی کلام کرتے ہیں) تیری طرف عالم امر سے اپنے حکم کو وحی کیا۔ یعنی خدا سے یہ ہمکلامی حضرت موسیٰؑ کی طرح مِنْ وَّرَآءِ حِجَابٍ نہیں ہوئی۔ بلکہ جبریلؑ کی لائی وحی کے ذریعے ہوئی۔ اس کے بعد کہا کہ تو اس سے پیشتر نہ یہ جانتا تھا کہ کتاب کیا ہوتی ہے اور نہ یہ کہ ایمان کسے کہتے ہیں۔ لیکن ہم نے اس وحی کو ایک روشنی بنایا ہے جس کے ذریعہ ہم اپنے بندوں میں سے جسے چاہتے ہیں، صحیح راستہ دکھا دیتے ہیں۔

یہاں تک تو خدا کی اس ہمکلامی کا ذکر ہوا جو رسول اللہ صلعم کے ساتھ وحی کے ذریعہ ہوئی۔ اس کے بعد کہا کہ وَاِنَّكَ لَتَهْدِيْٓ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (۴۲/۵۲) اور تو (اے رسولؐ) یقیناً لوگوں کی رہنمائی صراط مستقیم کی طرف کرتا ہے۔ اس طرح غیر رسول انسانوں تک خدا کا کلام پہنچ جاتا ہے۔ یعنی رسول کی وساطت سے۔

آپ نے دیکھ لیا کہ اس آیت میں کسی غیر رسول بشر کے ساتھ خدا کی ہمکلامی کا کوئی ذکر نہیں کیا نہ براہ راست (خواب میں یا الہام کے ذریعے) اور نہ ہی فرشتے کے ذریعے۔ لہٰذا اس

آیت سے غیر رسول کی طرف خدا کی وحی کا امکان ثابت کرنا قرآن کی کھلی ہوئی تحریف ہے۔

قرآن کریم میں الہام یا کشف کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ تصورات، بعد کے پیدا کردہ اور دوسروں سے مستعار لئے ہوئے ہیں۔ ان کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں۔ اسلام کی رُو سے خدا نے انسان سے جو باتیں کرنی تھیں وہ سب قرآن میں آگئیں۔ اس کے بعد وحی (یعنی خدا سے براہ راست علم حاصل کرنے) کا دروازہ بند ہوگیا۔ قرآن محفوظ کر دیا گیا۔ الہام کا تصوّر درحقیقت باب نبوّت کو ازسرنو کھولنے کی نہایت لطیف اور "مقدس" تدبیر تھی جس نے امت کو قرآن سے بیگانہ کر کے، فتنوں کا دروازہ کھول دیا۔

باقی رہا یہ کہنا کہ قرآن کریم میں ہے کہ خدا نے حضرت موسیٰؑ کی والدہ کی طرف وحی کی (اوحینا) یا حضرت عیسیٰؑ کے حواریوں کی طرف وحی کی۔ تو عربی زبان میں " اوحینا " کے معنی یہ بھی ہیں کہ " ہم نے حکم بھیجا " ان مقامات میں مفہوم یہ ہے کہ خدا نے اپنے کسی بندے کی وساطت سے امّ موسیٰؑ کی طرف حکم بھیجا یا حضرت عیسیٰ کی وساطت سے حواریوں کی طرف حکم بھیجا۔ ان مقامات میں خدا کی طرف سے براہ راست وحی پانے کا سوال نہیں۔ وحی صرف حضرات انبیاء کرامؑ کو ملتی تھی۔

(۱۹۵۴ء)

۲۔ وحی متلو اور وحی غیر متلو

کراچی کے قارئین میں سے ایک صاحب نے وحی اور رسالت کے سلسلہ میں متعدد نکات کی وضاحت چاہی ہے انہیں سوال اور جواب کی شکل میں درج ذیل کیا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ اس قسم کے استفسارات وقتاً فوقتاً طلوع اسلام میں آتے رہتے ہیں لیکن چونکہ اس مقام پر یہ سب یکجا سامنے آجائیں گے۔ اس لئے ان کی افادی حیثیت بڑھ جائے گی۔

۱:۔ سوال :۔ قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر نبی کو وحی دی۔ لیکن ہر نبی کو کتاب نہیں ملی۔ اس سے ظاہر ہے کہ وحی کتاب کے ساتھ مختص نہیں۔ لہٰذا ثابت ہوا کہ وحی قرآن کے باہر بھی ہے۔

جواب :۔ یہ خیال یا عقیدہ کہ ہر نبی کو کتاب نہیں ملی، قرآن کریم کے یکسر خلاف ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں کہا ہے کہ تمام انبیاءؑ کو کتاب دی گئی تھی۔ سورۂ بقرہ میں ہے...... فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۔ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ..... (۲/۲۱۳) سو اللہ نے انبیاء کو مبعوث کیا۔ خوشخبری دینے والے اور آگاہ کرنے والے۔ اور ان سب کے ساتھ (معھم) حق کے کتاب نازل کی۔

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کی وحی اور ان کی کتاب ایک ہی چیز ہے۔ خدا کی طرف سے انسانوں کو راہ نمائی (ہدایت) اس وحی کے ذریعے ملتی تھی جسے وہ انبیاء کی طرف بھیجتا تھا۔ یہی ان کی کتاب کہلاتی تھی

چونکہ ہم اپنی اصطلاح میں کتاب اس محسوس چیز کو کہتے ہیں جو (BOOK) کی شکل میں ہمارے ہاتھوں میں ہوتی ہے اس لئے ہم نے سمجھ لیا کہ نبی کی کتاب اس قسم کی کوئی چیز ہو گی جو اسے بنی بنائی آسمان سے ملتی ہو گی۔ اور جس نبی کو اس قسم کی کتاب نہیں ملتی ہو گی۔ اسے خالی وحی ملتی ہو گی۔ یہ تصور بالکل طفلانہ ہے۔ کسی نبی کو اس کی کتاب آسمان سے بنی بنائی نہیں ملتی تھی۔ اسے خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی۔ یہی وحی اس کی کتاب تھی۔ جب وہ وحی ایک کتابی شکل میں لکھ دی جاتی تھی تو وہ ہماری اصطلاح میں کتاب بن جاتی تھی۔ جب قرآن نبی اکرمؐ پر نازل ہوتا تھا تو وہ آپ کی وحی بھی تھا اور آپ کی کتاب بھی۔ جب اس وحی کو حضورؐ نے لکھ کر امت کو دے دیا تو وہ ہماری اصطلاح میں کتاب بن گئی۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ہم بھی جس چیز کو کتاب اللہ کہتے ہیں، وہ گتے اور کاغذ کا مجموعہ نہیں ہوتی۔ کتاب اللہ درحقیقت وہ الفاظ ہوتے ہیں جو ان کاغذوں پر لکھے ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب ایک حافظِ قرآن پڑھتا ہے تو (اگرچہ اس کے سامنے کوئی کتاب نہیں ہوتی) ہم یہی کہتے ہیں کہ وہ کتاب اللہ کی تلاوت کر رہا ہے۔ بہرحال، قرآن کی رُو سے ہر نبی کی وحی اس کی کتاب ہوتی تھی اور کوئی نبی بغیر کتاب کے نہیں آتا تھا۔

اس خیال کو کہ (نبی بغیر کتاب کے آتا ہے) مرزا غلام احمد قادیانی نے بڑی شد و مد سے عام کیا۔ ان کا یہ دعویٰ تھا کہ میں نبی ہوں، رسول نہیں ہوں۔ اور نبی اور رسول میں فرق یہ ہوتا ہے کہ رسول صاحبِ کتاب ہوتا ہے اور نبی بلا کتاب کے آتا ہے۔ اس سے آپ اندازہ

لگا لیجئے کہ مرزا صاحب قرآن سے کس قدر بے بہرہ تھے۔ اور اسی سے اس کا اندازہ کر لیجئے کہ جو لوگ یہ مانتے ہیں کہ نبی بغیر کتاب کے آتا ہے ان کا قرآن کے متعلق علم کس حد تک ہوتا ہے۔

اسی ضمن میں ایک اور دلچسپ بات سامنے آتی ہے۔ جو لوگ (قرآن سے بے بہرہ ہونے کی وجہ سے) یہ سمجھتے ہیں کہ کچھ نبی صاحبِ کتاب ہوتے ہیں اور کچھ بغیر کتاب کے۔ وہ انبیاء کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیتے ہیں۔ ایک وہ گروہ جنہیں کتاب ملی۔ دوسرا وہ جنہیں وحی تو ملی لیکن کتاب نہیں ملی۔ جس گروہ کو کتاب نہیں ملی، ان کی وحی (ان کے خیال کے مطابق) کتاب سے باہر رہی لیکن جن انبیاء کو کتاب مل گئی ان کی وحی کتاب کے اندر آگئی۔ جیسے رسول اللہ کو کتاب ملی۔ لہٰذا ان کی وحی اس کتاب کے اندر آگئی۔ (وَأُوحِيَ إِلَيَّ هَٰذَا الْقُرْآنُ (۶/۱۹))۔ لیکن اس کے باوجود، یہ لوگ (خود اپنی تقسیم کے خلاف) یہ بھی مانتے ہیں کہ جن انبیاء کو کتاب ملی، ان کی وحی کا کچھ حصہ تو کتاب کے اندر آگیا اور کچھ حصہ کتاب کے باہر رکھا گیا! اسی سے وہ یہ دلیل لاتے ہیں کہ رسول اللہ کی وحی کا ایک حصہ قرآن میں ہے اور دوسرا حصہ احادیث میں۔

ایسا کیوں کیا گیا؟ اس کے متعلق مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب نے یہ جواب دیا تھا کہ اگر تمام وحی قرآن کے اندر رکھ دی جاتی تو اس سے اس کی ضخامت بہت بڑھ جاتی۔ اور ان کی جماعت کے ایک اور صاحب نے یہ ارشاد فرمایا تھا کہ اس زمانے میں سامانِ کتابت کی اتنی کمی تھی کہ قرآن کو تو کسی نہ کسی طرح (پتوں اور ہڈیوں وغیرہ پر) لکھ لیا گیا لیکن باقی وحی کے لکھنے کے لئے سامان میسر نہیں آسکتا تھا۔

یا للعجب!

جو لوگ ان جوابات پر تو ہنستے ہیں لیکن اس کے باوجود یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ وحی کا کچھ قرآن کے اندر آگیا ہے اور باقی باہر ہے، وہ بھی اس کا کوئی معقول جواب نہیں دے سکتے کہ ایسی تقسیم کیوں کی گئی اور جو حصہ قرآن سے باہر رکھا گیا تھا۔ اس کی حفاظت کا رسول اللہ نے کیا انتظام فرمایا تھا؟ ظاہر ہے کہ اس دوسرے حصہ کی حفاظت بھی بالکل اسی طرح سے ہونی چاہیئے تھی جس طرح پہلے حصہ (قرآن) کی حفاظت کی گئی تھی۔ اور وہ بھی امت کے پاس حرفاً حرفاً یقینی اور حتمی طور پر محفوظ ہونا چاہیئے تھا۔

(۲) سوال :۔ قرآن میں رسول اللہ کے متعلق ہے وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى۔ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْىٌ يُّوْحٰى (۵۳/۳-۴) اس سے ظاہر ہے کہ رسول اللہ جو کچھ اپنی زبانِ مبارک سے ارشاد فرمایا کرتے تھے وہ سب وحی ہوتا تھا۔ اس لئے اقوال و افعال رسول اللہ میں یہ فرق کرنا کہ اتنا حصہ وحی کی رُو سے تھا، اور باقی حصہ وحی کی رُو سے نہیں تھا، قرآن کے خلاف ہے۔

جواب :۔ یہ صحیح نہیں کہ حضورؐ جو کچھ ارشاد فرماتے تھے وہ خدا کی طرف سے وحی ہوتا تھا۔ خود قرآن کریم میں کئی ایک مقامات ایسے ہیں جن میں رسول اللہ سے کہا گیا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا؟ اب ظاہر ہے کہ جو کچھ حضورؐ نے کیا یا کہا تھا وہ بھی وحی خداوندی تھا تو پھر خدا نے ایسا کیوں کہا کہ آپ نے ایسا کیوں کیا تھا۔ اس باب میں حضرت زیدؓ کا واقعہ بھی ایک واضح دلیل ہے اس امر کی کہ حضورؐ کا ہر ارشاد وحی نہیں ہوتا تھا۔

قرآن کریم میں ہے کہ نبی اکرمؐ نے حضرت زیدؓ سے فرمایا کہ اَمْسِكْ عَلَيْكَ زَوْجَكَ (۳۳/۳۷) اپنی بیوی کو طلاق مت دو۔ اور اس کے بعد ہے کہ حضرت زیدؓ نے اس کے باوجود اپنی بیوی (حضرت زینبؓ) کو طلاق دے دی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر نبی اکرمؐ کا ہر ارشاد وحی کی بنا پر اور رسول کی حیثیت سے تھا تو جو کچھ آپ نے حضرت زیدؓ سے فرمایا تھا وہ بھی بربنائے وحی اور بحیثیت رسول تھا۔ اس صورت میں، اس حکم نبوی کی خلاف ورزی معصیتِ رسول ہو گی اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن کی رو سے معصیتِ رسول کیسا عظیم جُرم ہے تو کیا اس سے یہ سمجھا جائے کہ حضرت زیدؓ (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) معصیتِ رسول کے جرم کے مرتکب ہوئے تھے؟ وہ حضرت زیدؓ جن کے متعلق خدا کا ارشاد ہے۔ کہ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ وَاَنْعَمْتَ عَلَيْهِ (۳۳/۳۷) اس کا تصوّر بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اس سے لامحالہ یہی ماننا پڑے گا کہ حضورؐ کا یہ ارشاد نہ بربنائے وحی تھا اور نہ ہی بحیثیت رسول۔ بلکہ ایک ذاتی مشورہ تھا جسے نہ ماننے کا حق حضرت زیدؓ کو حاصل تھا۔

اس سے یہ بھی واضح ہے کہ حضورؐ کی ہر بات وحی کی رُو سے نہیں ہوتی تھی مَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى کی آیت کے معنی یہ ہیں کہ جس چیز کو وحی کہا جاتا ہے وہ (جیسا کہ عام منکرین کا خیال ہے) نبی کے اپنے خیالات نہیں ہوتے۔ وحی خدا کی طرف سے ملتی تھی جس میں نبی کے اپنے خیالات و جذبات اور تصورات کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہ آیت وحی

کی خارجیّت (OBJECTIVITY) یعنی اس کے منزّل من اللہ ہونے کا اعلان ہے، اس بات کا بیان نہیں کہ نبی اکرمؐ جو بات بھی کرتے تھے وہ وحی ہوتی تھی۔ (۱۹۵۷ء)

۳۔ قرآنِ کریم کی تنزلی ترتیب

گذشتہ دنوں، پشاور میں "پاکستان ہسٹری کانفرنس" کے سالانہ اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے محترم مولانا........ صاحب نے ایک خطبہ ارشاد فرمایا جس میں اس امر پر زور دیا کہ سب سے اہم کرنے کا کام یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات اور سور کے نزول کی تاریخ متعین کی جائے۔ اس ضمن میں انہوں نے فرمایا۔

> تاریخِ قرآن سے میرا منشا یہ ہے کہ اس کلام مقدس کی آیات اور سور کے اَزمنہ و امکنہ نزول کے تعین کی سعی کی جائے۔ اس سے پہلے بھی اس مبحث کے متعلق بعض صاحبانِ علم نے مواد فراہم کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن ان کوششوں کا ماحصل صرف چند انفرادی اور متخالف آرا کی فراہمی تک محدود ہو کر رہ گیا ہے۔ لہٰذا، ان کتابوں کی مدد سے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا ہمارے لئے بہت مشکل بلکہ تقریباً ناممکن ہے، حالانکہ اسلام کے تمام اوامر و نواہی نیز سیاسی اور اخلاقی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے قرآن حکیم کی ترتیبِ نزول کا تعین ازحد ضروری ہے۔ اس لئے کہ
>
> (۱) قرآن مسلمانوں کی حیاتِ ملی کا ایک مکمل نظام ہے۔ تیئس سال کی طویل مدت میں ضرورت اور حالات کے تقاضے کے مطابق اس کا ایک ایک حصہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوتا رہا اور امت کی صلاحیت نیز صالحیت کی بنا پر اس میں تدریجی اضافہ ہوتا رہا۔ اوقاتِ نزول کے تعین سے ہمیں پتہ لگ سکے گا کہ اُس وقت امت کی مذہبی، اخلاقی، سماجی اور معاشرتی حالت کیا تھی اور ہمارے کریم و حکیم ربّ نے ایک بگڑی ہوئی قوم کی تربیّت و اصلاح کے لئے کن کن تعمیری مدارج کی وساطت

سے اسے منازلِ ارتقا کی طرف لے جانا چاہا۔ اس سے غافل رہنے کا نقصان یہ ہوگا کہ اللہ کے بندے اپنے مالک کی عطا کی ہوئی رخصتوں اور رعایتوں سے محروم ہو جائیں گے اور ان کی اصلاح عملاً ناممکن ہو جائے گی۔ عالم اسلامی کے موجودہ مجاہدۂ حیات کے دور میں خداوند کریم کی اس شانِ ربوبیت کی طرف متوجہ ہونے کی اشد ضرورت ہے۔

(۲) قرآن مجید کی پانچ سو آیتوں کو ہمارے متقدمین نے منسوخ قرار دے رکھا تھا۔ اکثر فقہی اور تفسیری مباحث میں اب بھی علی العموم ناسخ و منسوخ کے دعاوی پیش کئے جاتے ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ناسخ حکم سے منسوخ حکم کا پہلے صادر ہونا ضروری ہے لیکن جب تک مختلف سورتوں کے نزول کی تاریخ متعین نہ ہو، اس وقت تک کسی سورۃ کی کسی آیت کو منسوخ قرار دینا درست نہ ہو سکے گا۔ اس لئے سورتوں کی ترتیب نزول کو دریافت کرنا ضروری ہے۔ دوسری طرف منکرین نسخ کے لئے بھی استدلال کے وقت اس تعین کی ضرورت پیش آتی ہے۔ چنانچہ قائلین و منکرین نسخ کے مباحثہ کی ضمن میں ایسی مثالیں اکثر ملتی ہیں جہاں صرف دعوائے نسخ کو برقرار رکھنے کے لئے بعد کی نازل شدہ سورہ کی بعض آیات کو قبل کا نازل شدہ بتایا جاتا ہے۔

خطرناک تجویز

اس تمام احترام کے باوجود جو۔۔۔۔۔۔۔ صاحب کا ہمارے دل میں ہے ہم یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ وہ اس باب میں روشِ عامہ میں بہہ گئے ہیں اور انہوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ انہوں نے کہا ہے، قرآن کے متعلق وہ کیا نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ امت کے دل میں قرآن کی طرف سے شکوک و شبہات پیدا کرنے کی جو مذموم کوششیں کی گئیں ان میں سے ایک یہ بھی تھی کہ اس خیال کو عام کر دیا گیا کہ جب تک قرآن کی آیات کے متعلق یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کب نازل ہوئیں اور ان کا شانِ نزول کیا تھا، قرآن کی تعلیم سمجھ میں نہیں آسکتی۔ اس کے ساتھ ہی اس خیال کو بھی عام کیا گیا کہ رسول اللہ صلعم قرآن کو مرتب کر کے امت کو دے کر نہیں گئے تھے۔ بلکہ یونہی منتشر حالت میں چھوڑ گئے تھے۔ آپ کی وفات

کے بعد قرآن کو مرتب کرنے کی کوشش کی گئی۔ ان کوششوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاتا ہے۔ شیعہ حضرات کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ جب حضرت ابوبکرؓ اور عمرؓ وغیرہ خلافت کے پیچھے پڑے ہوئے تھے۔ تو حضرت علی رضی اللہ عنہ ایک گوشے میں بیٹھے قرآن کی جمع اور تدوین کے اہم کام میں مصروف تھے۔ چنانچہ، کہا یہ جاتا ہے کہ آپ نے نزول کی ترتیب کے مطابق قرآن کو مرتب کیا۔ لیکن اس کے برعکس دوسرے صحابہؓ نے قرآن کو اس شکل میں مرتب کیا جس میں وہ آج ہمارے پاس ہے اور جس میں تنزیلی ترتیب کا کوئی خیال نہیں رکھا گیا۔ چنانچہ شیعہ حضرات کا عقیدہ ہے کہ قرآن حضرت علیؓ کے جمع کردہ صحیفہ ہی سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ یہ صحیفہ کہیں محفوظ ہے اور ایک دن باہر آئے گا، اس وقت صحیح قرآن سمجھ میں آسکے گا۔

اب ذرا سمجھئے کہ بات کیا ہوئی۔

۱:۔ کہا یہ گیا ہے کہ قرآن اسی صورت میں سمجھ آسکتا ہے جب اس کی ترتیبِ نزول ہمارے سامنے ہو۔

۲:۔ موجودہ قرآن، جسے حضرت علیؓ کو چھوڑ کر دوسرے صحابہؓ نے مرتب کیا تھا، ترتیبِ نزول کے مطابق نہیں ہے۔ اور

۳:۔ ترتیبِ نزول کے مطابق وہ قرآن ہے جسے حضرت علیؓ نے مرتب فرمایا تھا۔

ان خیالات سے غیر شیعہ مسلمان کس حد تک متاثر ہوئے اس کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ خود یہ بھی ایک ایک آیت کا زمانہ نزول اور شانِ نزول تلاش کرنے لگ گئے۔ چنانچہ آپ ان کی تفاسیر میں دیکھیں گے کہ ہر آیت کی تفسیر اس کی شانِ نزول کے ماتحت کی جاتی ہے۔ بالفاظِ دیگر انہوں نے اس قرآن کو تو طوعاً وکرہاً تسلیم کر لیا جسے عام صحابہؓ نے مرتب کیا تھا لیکن اس کے قائل رہے کہ قرآن درحقیقت نزولی ترتیب کی روشنی ہی میں سمجھا جاسکتا ہے۔

ہم اس حقیقت کو بدلائل وشواہد بیان کر چکے ہیں کہ یہ عقیدہ یکسر باطل ہے کہ رسول اللہ صلعم قرآن کو ایک مرتب شکل میں نہیں دے گئے تھے۔ جو قرآن اس وقت ہمارے ہاں موجود ہے، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اسے اسی صورت میں مرتب کر کے امت کو دے کر گئے تھے۔ اس حقیقت کے بعد یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر، مولانا........ صاحب کے الفاظ میں۔

اسلام کے تمام اوامر و نواہی نیز سیاسی و اخلاقی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے قرآن حکیم کی ترتیبِ نزول کا تعین از حد ضروری ہے۔

تو خود رسول اللہ صلعم نے قرآن کو نزولی ترتیب کے مطابق مرتب کیوں نہ فرمایا تاکہ قرآن آسانی سے سمجھ میں آسکتا؟ یہ عجیب بات ہوئی کہ رسول اللہ صلعم ایک نئی ترتیب کے مطابق قرآن کو مرتب کر کے دے گئے اور اس کے بعد اُمت کو کاوش کر کے تحقیق کرنا پڑا کہ ان آیات و سور کی ترتیبِ نزول کیا ہے۔ اُمت کی یہ کاوش اور تحقیق بھی جو نتیجہ پیدا کر سکی وہ (مولانا...... صاحب کے الفاظ میں) اس سے زیادہ نہیں کہ

ان کتابوں کی مدد سے کسی صحیح نتیجہ پر پہنچنا ہمارے لئے بہت مشکل ہے بلکہ تقریباً ناممکن ہے۔

یہ کیسے ممکن ہے؟ مولانا صاحب نے اس مشکل کا حل یہ بتایا ہے کہ اب امت کوشش کرے کہ آیات قرآنی کی نزولی ترتیب کا یقینی طور پر تعین ہو جائے۔ ہم دریافت یہ کرنا چاہتے ہیں کہ اُمت کے پاس وہ ذریعہ کون سا ہے جس سے وہ آیات قرآنی کی ترتیب کو یقینی طور پر متعین کر لے گی۔ اس کے پاس لے دے کے متقدمین کی کتابیں ہی تو ہیں جن کے متعلق خود مولانا........ صاحب فرما چکے ہیں کہ ان کے ذریعہ ترتیب کا تعین مشکل ہی نہیں بلکہ ناممکن ہے۔ لہٰذا صورتِ حال یوں ہوئی کہ

(۱) اسلام کے تمام اوامر و نواہی نیز سیاسی و اخلاقی تعلیمات کو سمجھنے کے لئے قرآنِ کریم کی ترتیبِ نزول کا تعین از حد ضروری ہے۔

(۲) یہ تعین ان کتابوں کے ذریعے سے تو ہو نہیں سکتا جو اس موضوع پر متقدمین نے لکھی ہیں۔ اور

(۳) ان کتابوں کے علاوہ اور کوئی ذریعہ ہو ہی نہیں سکتا جس سے ہم آج چودہ سو سال کے بعد یہ طے کر سکیں کہ آیاتِ قرآنی کی نزولی ترتیب کیا تھی۔

لہٰذا نتیجہ یہ نکلا کہ قرآن کی تعلیم اُمت کی سمجھ میں آ ہی نہیں سکتی۔

اس کا نتیجہ حقیقت یہ ہے کہ جب کسی دیوار کی پہلی اینٹ ٹیڑھی رکھ دی جائے تو پھر وہ دیوار ثریا تک ٹیڑھی ہی جاتی ہے۔ قرآن سمجھنے کی بنیادی اینٹ جو ٹیڑھی رکھ دی گئی ہے وہ عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کی آیتیں شانِ نزول کے بغیر سمجھ میں نہیں آسکتیں اس عقیدہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم قرآن کی حقیقتوں کو مکان اور زمان کی حدود میں مقید کر کے رکھ دیتے ہیں یہ ٹھیک ہے کہ قرآن تاریخ کے ایک خاص زمانہ میں، اور زمین کے ایک خاص خطہ میں نازل ہوا۔ لیکن اس کے حقائق زمان اور مکان کی حدود سے بے نیاز ہیں۔ وہ دنیا کی ہر قوم اور ہر زمانہ کے لئے یکساں طور پر راہنمائی کا کام دیتے ہیں۔ اور ان کے سمجھنے کے لئے اس کی کوئی ضرورت نہیں کہ یہ متعین کیا جائے کہ ان کا شانِ نزول کیا تھا۔ ان کا شانِ نزول چودہ سو سال پہلے حجاز میں بسنے والی کسی قوم کے وقائع و حوادث نہیں تھے، بلکہ ان کا شانِ نزول انسانیت کے تقاضے ہیں۔

ناسخ و منسوخ اس بنیاد کی دوسری ٹیڑھی اینٹ وہ ہے جسے مولانا صاحب نے مندرجہ بالا اقتباس کے دوسرے پیراگراف میں بیان فرمایا ہے۔ یعنی قرآن میں ناسخ اور منسوخ کا عقیدہ۔ یہ عقیدہ بھی ان ہی مذموم کوششوں میں سے ہے۔ جو قرآن کی عظمت اور حقیقت کو دلوں سے دور کرنے کے لئے وجود میں لائی گئی تھیں۔ قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں۔ زمانہ کا جس قسم کا تقاضا سامنے آئے اس سے ملتی جلتی آیت قرآنی اس وقت نافذ العمل ہو جائے گی۔ جب اس تقاضا کی جگہ کوئی دوسرا تقاضا سامنے آئے گا تو اس سے ملتا ہوا حکم نافذ العمل ہو جائے گا۔ اس حقیقت کے پیش نظر بھی قرآن فہمی کے لئے ترتیبِ نزول کے تعین کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔

آیاتِ قرآنی کے نزول کے امکنہ و ازمنہ سے متعلق معلومات کا اگر کوئی فائدہ ہے تو محض تاریخی ہے، دینی نہیں۔ اگر حضرت علی رضی اللہ عنہ یا کسی اور نے آیات یا سور قرآنی کی ترتیبِ نزول کے مطابق قرآن کو مرتب کیا تھا تو وہ ایک تاریخی دلچسپی کی چیز ہو سکتا ہے۔ دین پر اس کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔

قرآن اور مسلمان آخر میں ہم صرف اتنا عرض کرنا چاہتے ہیں کہ آپ سوچئے کہ "قرآن مظلوم کے ساتھ مسلمان کیا کچھ کر رہا ہے۔ دعویٰ اس

کا یہ ہے کہ اس آسمان کے نیچے خدا کی آخری وحی اس کے اندر ہے اور یہ قرآن قیامت تک کے لئے تمام نوعِ انسانی کے لئے زندگی کے ہر مسئلہ کا حل پیش کرتا ہے۔ ایسا حل جس کی مثل اور نظیر ساری دُنیا کے انسان مل کر بھی پیش نہیں کر سکتے۔ قرآن کے متعلق اس کا دعویٰ یہ ہے اور اسی قرآن کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ۔

(۱) جب رسول اللہ نے وفات پائی ہے تو قرآن کا کوئی مرتب مجموعہ اُمت کے پاس نہیں تھا۔ قرآن کھجوروں کے پتوں، اونٹوں کی ہڈیوں، پتھروں کے ٹکڑوں وغیرہ پر۔ کچھ کسی کے پاس، کچھ کسی کے پاس بکھرا پڑا تھا۔ ایک کمیٹی بیٹھی اور اس نے محنت کر کے اسے یکجا کیا۔ اس یکجا کردہ قرآن کی صورت یہ تھی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صحابی باصرار کہتے رہے کہ ہم رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں فلاں آیت پڑھا کرتے تھے وہ اس قرآن میں نہیں ہے اور قرآن کا بعض حصہ جو کھجوروں کے پتوں پر لکھا ہوا تھا۔ ان پتوں کو حضرت عائشہؓ کی بکری کھا گئی۔

(۲) اس مجموعہ کے علاوہ اور جلیل القدر صحابہؓ (مثلاً حضرت عبداللہ بن مسعودؓ) کے پاس ایسے قرآن تھے جن میں متعدد مقامات پر اس قرآن سے اختلاف تھا۔ یہ اختلافات حجاج بن یوسف کے زمانے تک جاری رہے اور اس نے جو مجموعہ مرتب کیا (جو اس وقت اُمت کے پاس ہے) وہ بھی متعدد مقامات پر سابقہ مجموعوں سے مختلف تھا۔

(۳) اس مجموعہ میں جو ترتیب ملحوظ رکھی گئی وہ تنزیلی ترتیب سے مختلف ہے اور قرآن سمجھ میں ہی نہیں آسکتا ہے تا وقتیکہ تنزیلی ترتیب معلوم نہ ہو۔ اس تنزیلی ترتیب کے متعین کرنے کا آج کوئی ذریعہ ہی نہیں۔

(۴) وحی وہی نہیں تھی جو قرآن کے اندر آگئی، اس کے ساتھ اس جیسی اور بھی وحی تھی جو رسول اللہ صلعم کی احادیث میں بیان ہوئی۔ اس وحی کے بغیر قرآن کی وحی سمجھ میں ہی نہیں آسکتی۔ اس وحی کو نہ رسولؐ نے کہیں مرتب فرمایا نہ آپؐ کے صحابہؓ نے۔ یہ رسول اللہ صلعم سے قریب اڑھائی سو سال بعد انفرادی کوششوں سے جمع ہوئی اور انسانی کوششوں نے ہی اس کے متعلق فیصلہ کیا کہ اس میں فلاں بات صحیح ہے اور فلاں بات غلط ——— (اور اب یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ فیصلہ کہ ان میں سے کیا صحیح ہے اور کیا غلط، ایک

"مزاج شناس رسول" کی نگاہ کر سکتی ہے)

(۵) قرآن نہ تو خود قرآن سے سمجھ میں آسکتا ہے اور نہ ہی ان احادیث سے۔ اس کے صحیح معنی (جسے معتزدین کہا جاتا ہے) اس کے ظاہری الفاظ میں نہیں بلکہ اس کے باطن میں ہیں اور یہ باطنی علم حضرت علیؓ کی وساطت سے سینہ بسینہ منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔

یہ ہیں قرآن کے سمجھنے کے متعلق مسلمانوں کے عقائد، جن میں سے ہر عقیدہ کی بنیاد ان روایات پر ہے جو معلوم نہیں کب وضع ہوئیں۔ لیکن جن کے متعلق آج اصرار کیا جاتا ہے کہ انہیں رسول اللہ صلعم کے سچے اقوال مانو، جو ایسا نہ مانے وہ منکرِ حدیث ہے، لہذا کافر۔

اس قرآن کو مسلمان ساری دنیا کے سامنے اس دعوے کے ساتھ پیش کرتے ہیں کہ اس میں تمام انسانی مشکلات کا حل موجود ہے۔ اور پھر دنیا سے توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے مذہب ہی کو چھوڑ کر نہیں بلکہ عقل و شعور اور تجربات و شہادات سب کو چھوڑ کر ان کا پیش کردہ اسلام قبول کر لیں گے۔ اس سے بڑی اجتماعی خود فریبی کی مثال شاید ہی کہیں اور مل سکتی ہو۔ لیکن گروہ بندانہ مفاد پرستیاں ہیں کہ وہ قوم کو اس کی خود فریبی سے نکلنے کی اجازت ہی نہیں دیتیں۔ بایں نمط کہ كُلَّمَا اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَآ اُعِيْدُوْا فِيْهَا۔ اگر ان کے اس جہنم سے نکلنے کی کوئی کوشش بھی ہوتی ہے تو انہیں پھر دہیں دھکیل دیا جاتا ہے۔

(سنہ ۱۹۵۴ء)

۴۔ حفاظتِ قرآن کریم

ایک صاحب لکھتے ہیں :۔

روایات و احادیث کے متعلق جو مسلک آپ نے اختیار فرمایا ہے اسے دیکھ کر چند سوالات دل میں پیدا ہو رہے ہیں جو درج ذیل ہیں۔ امید ہے طلوعِ اسلام کے صفحات میں مدلل جوابات سے ممنون و مطمئن فرمائیں گے۔

احادیث و روایات کو ظنی تسلیم کر لینے کے بعد کون سے قطعی ذرائع ہیں جن کی بنا پر

ہم موجودہ قرآن کی قطعیت تسلیم کریں۔ جبکہ یہ قطعی طور پر معلوم ہے کہ :-

(۱) علمارِ حنفیہ وشافعیہ آج تک یہ فیصلہ نہ کر سکے کہ بسم اللہ فاتحہ کا جزء ہے یا نہیں حالانکہ یہ اختلاف انکارِ قرآن پر منتج ہوتا ہے۔

(۲) موجودہ مصحف حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مرتب کردہ ہے اور اعراب، حجاج جیسے خونخوار نے لگائے ہیں۔

(۳) ابن مسعودؓ سے سورۃ واللیل کے الفاظ وما خلق الذکر والانثیٰ کی جگہ دوسری طرح منقول ہیں۔

(۴) تلاوت کے سات مختلف طریقے مروّج ہیں۔ جن میں بسا اوقات مفہوم ومعانی میں اختلاف پڑ جاتا ہے۔

(۵) آیات منسوخ التلاوۃ کو آج تک علمارِ اسلام مانتے چلے آ رہے ہیں۔

ان وجوہات کے پیش نظر ہم کن وجوہ پر مصحفِ عثمانی کو قطعی اور کلام الہٰی تسلیم کرتے ہیں۔ یہ اشکال جس طرح قائلین حدیث پر وارد ہوتا ہے اسی طرح آپ بھی اس الزام سے بری نہیں ہو سکتے۔ محض عقلی دلائل کافی نہیں ہیں۔ ورنہ کل کوئی دوسرا محقق آپ کے نظریات کو عقلی دلائل سے باطل ٹھہرائے گا۔ اور اسی طرح یہ ختم نہ ہونے والا سلسلہ شروع ہو گا۔ امید ہے کہ آپ مجھے کافی حد تک مطمئن کرنے کی کوشش فرمائیں گے۔

جواب

مستفسر صاحب کے اس خط میں چند ایک باتیں وضاحت طلب تھیں۔ اور ہم چاہتے تھے کہ اس کا جواب لکھنے سے پہلے ان باتوں کی وضاحت ان سے کرالی جائے۔ لیکن انہوں نے اپنے خط میں اپنا پتہ نہیں لکھا۔ اس لئے مجبور ہیں کہ ان کے استفسارات سے جو کچھ ہم سمجھ سکے ہیں اسی کے مطابق اس کا جواب لکھ دیا جائے۔

تاریخ کی اہمیت

اصل مقصود پر آنے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کی صحیح پوزیشن کے متعلق مختصراً کچھ عرض کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ تاریخ کسی خاص زمانہ کے احوال وکوائف اور واقعات کا بیان ہوتا ہے۔ تاریخ کو قرآن نے بڑی اہمیت

دی ہے اس لئے کہ اس سے نوعِ انسانی کے فکری اور تمدنی ارتقار کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اور یہ حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے کہ جب کسی قوم نے فلاں نہج کی زندگی اختیار کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ اور آج اگر ہم بھی اسی نہج کی زندگی گزاریں گے تو اسی قسم کا نتیجہ ہمارے سامنے آئے گا۔ لیکن تاریخ کی تدوین مختلف حالات اور اثرات کے ماتحت ہوتی چلی آئی ہے اور یہ حقیقت تاریخ کے طالب علموں سے پوشیدہ نہیں کہ تاریخ صحیح اور غلط دونوں قسم کے واقعات اور تاثرات پر مشتمل ہوتی ہے۔ اربابِ تاریخ نے انسان کی تاریخی یادداشتوں کو پرکھنے کے لئے بڑی محنت کی ہے۔ اور ان کی تحقیقی کاوشوں میں نت نئے اضافے ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن بایں ہمہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود ہے کہ تاریخی یادداشتیں یقین کی حد تک نہیں پہنچ سکتیں۔ اربابِ تحقیق جو کچھ کر سکتے ہیں وہ یہی ہے کہ کسی زمانہ کے متعلق جو دلائل و شواہد (HISTORICAL EVIDENCE) میسر آسکیں ان کی روشنی میں تاریخی یادداشتوں کو پرکھ کر اتنا کہہ سکیں کہ فلاں بات زیادہ قرینِ قیاس ہے۔ ان دلائل و شواہد میں بعض باتیں دوسروں کی نسبت زیادہ قابلِ اعتماد سمجھی جاتی ہیں۔ مثلاً مصریات میں جب کسی بادشاہ کی ممی مل جاتی ہے اور اُس کے ساتھ کچھ تختیاں بھی ہوتی ہیں جن پر اس بادشاہ اور اس کے عہد کے متعلق یادداشتیں منقوش ہوتی ہیں۔ تو اربابِ تاریخ اس عہد کی تاریخی یادداشتوں کو ان تختیوں کے نوشتوں کے ساتھ ملاتے ہیں۔ اور ان تختیوں کو زیادہ قابلِ اعتماد سمجھ کر انہی کو معیارِ تصدیق و تکذیب قرار دیتے ہیں۔

اس باب میں مسلمانوں کی کیفیت کچھ مختلف ہے۔ ہمارے پاس ایک ایسی تختی (لوحِ محفوظ) موجود ہے جس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نازل شدہ ہے۔ اور اپنی محفوظ شکل میں، جس میں کسی ایک لفظ کا بھی رد و بدل نہیں ہوا ہے۔ ہمارے پاس موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ جب ہمارے پاس اس قسم کا یقینی ذریعۂ علم موجود ہے تو تاریخ کا جس قدر حصہ اس یقینی معیار کے مطابق پرکھا جا سکتا ہے اس کے لئے اسے یقینی معیار قرار دینا ہمارے ایمان کا تقاضا ہے ہم جب کہتے ہیں کہ روایات کو (جو ہمارے ایک دور کی تاریخی یادداشتیں ہیں) قرآن کے یقینی معیار پر پرکھنا ضروری ہے تو اس سے مفہوم یہی ہوتا ہے۔

تاریخ اور دین

دین کا معاملہ عام تاریخ سے بالکل مختلف ہے۔ عام تاریخ میں جس چیز کو آج صحیح مانا جاتا ہے وہ کل کو غلط ثابت ہو سکتی ہے۔ لیکن دین کیلئے

ہر وقت یقینی ہونا نہایت ضروری ہے۔ دین کی مشینری اسی صورت میں اپنے صحیح نتائج مرتب کر سکتی ہے جبکہ اس کا ایک ایک پُرزہ اصلی (ORIGINAL) اور یقینی (GENUINE) ہو۔ اگر اس میں کوئی ایک پُرزہ بھی ایسا ہے جس کے متعلق ہم یقین سے نہیں کہہ سکتے کہ یہ اصلی اور حقیقی ہے یا نہیں تو ہم مشینری کے صحیح نتائج پر کبھی پورا اعتماد نہیں کر سکتے۔ دین کی مشینری کے نتائج تو وہ ہیں جو پوری کی پوری جماعت بلکہ تمام نوعِ انسانی کی موجودہ اور آنے والی زندگی، دونوں کو اپنے احاطے میں لئے ہوئے ہیں۔ یہ ہے وہ وجہ جس کے لئے کہا جاتا ہے کہ دین میں حجت (یعنی دلیل واقعی) وہی چیز ہو سکتی ہے جو قطعی اور یقینی ہو۔ جو چیز قطعی اور یقینی نہ ہو اسے ظنی کہا جاتا ہے۔ اور کوئی ظنی شے دین میں حجت قرار نہیں پا سکتی۔

قرآن کے متعلق ہم نے کہا ہے کہ یہ قطعی اور یقینی چیز ہے۔ ہمارے اس دعوے کے دو پہلو ہیں۔ ایک تو یہ کہ بحیثیت مسلمان ہونے کے ہمارا ایمان ہے۔ اور اس ایمان کی بنیاد یہ ہے کہ خود قرآن کریم میں یہ موجود ہے کہ قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا اور صاف لفظوں میں فرمایا ہے اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهُ لَحٰفِظُوْنَ

حفاظتِ قرآن

(۱۵/۹) ہم نے قرآن کو اتارا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں اور اسی تفسیر میں دوسری جگہ ہے لَا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ (۴۱/۴۲) باطل نہ اس کے آگے سے اس کے پاس پھٹکتا ہے نہ پیچھے سے۔" لہٰذا ایک مسلمان کا یہ ایمان ہے کہ قرآن اپنی محفوظ شکل میں چلا آ رہا ہے اور اسی طرح سے محفوظ شکل میں آگے چلا جائے گا۔ اگر کوئی تاریخی یادداشت اس دعویٰ کے خلاف جاتی ہے یا اس میں شک و شبہ پیدا کرنے کا موجب بنتی ہے تو ایک مسلمان بلا ادنیٰ تامل اسے رد کر دے گا۔ کیونکہ قرآن کی محفوظیت خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمے لے رکھی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی اس ذمہ داری پر ہمارا ایمان ہے۔

لیکن ایک غیر مسلم ہمارے اس دعوے سے مطمئن نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے اطمینان کے لئے اور قسم کے دلائل چاہتا ہے۔ اس لئے ہمارے لئے ضروری ہے کہ ہم اپنے اس دعویٰ کے اثبات میں اس قسم کے دلائل بھی پیش کریں جنہیں اربابِ تاریخ اپنے ہاں معیار قرار دیتے ہیں۔ اس باب میں ہم صرف اتنا کہنا چاہتے ہیں کہ یہ کوئی نیا سوال نہیں ہے جو آج ہی سامنے آیا ہو۔ مغرب کے مؤرخین

از خود صدیوں سے اس کی تحقیق کر رہے ہیں کہ جو قرآن اس وقت مسلمانوں کے پاس ہے، اس میں اور اُس قرآن میں جسے رسول اللہ نے مسلمانوں کو دیا تھا، کوئی اختلاف ہے یا نہیں۔ اور وہ اپنی پوری تحقیق کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ "اگر چہ تمام مذہبی صحائف خدا کی طرف سے نازل ہوئے تاہم صرف قرآن کریم ہی ایک ایسا آسمانی صحیفہ ہے جس میں ذرا بھی ردو بدل نہیں ہوا۔ اور وہ اپنی اصلی شکل میں محفوظ ہے۔ (BARONESS M. STEIN)

غیر مسلم مؤرخین کا اعتراف

چنانچہ مسلمان مؤرخین کے علاوہ غیر مسلم مؤرخین نے بھی اس کی تحقیق کی کہ قرآن کے وہ اصلی نسخے جو حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اسلامی مملکت کے مختلف شہروں میں بھیجے گئے تھے، کب تک اور کہاں کہاں موجود تھے۔ اور اب تک موجود ہیں۔ دمشق کے نسخے کے متعلق یہ تحقیق ہے کہ وہ سلطان عبدالحمید کے زمانے تک جامع دمشق میں موجود تھا۔ لیکن جب وہ مسجد جل گئی تو اس میں یہ مصحف بھی جل گیا۔ مدینہ منورہ اور مکہ معظمہ میں اس مصحف کے نسخے آٹھویں صدی ہجری تک موجود تھے۔ بصرہ یا کوفہ کا نسخہ مختلف مقامات میں پھرتا پھراتا ۱۹۲۳ء میں روس کے قدیم پایہ تخت ماسکو میں پہنچا۔ کہتے ہیں کہ یہ نسخہ امیر تیمور کے زمانے میں ابوبکر الشاشی کی طرف سے حضرت شیخ عبداللہ کے مرقد پر رکھ دیا گیا تھا۔ جہاں سے وہ بالشویکوں کے ہاتھ میں آیا۔ خلافت کے ترکی میں منتقل ہوتے وقت سلطان سلیم اول کے حوالے جو تبرکات کئے گئے تھے ان میں قرآن کا ایک نسخہ حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں کا۔ ایک حضرت علیؓ کے ہاتھوں کا اور ایک حضرت زین العابدینؒ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا بھی تھا۔ جو اب تک وہاں موجود ہے۔ حضرت علیؓ کے ہاتھوں کا ایک نسخہ جس پر ان کے دستخط بھی ثبت ہیں، مشہد میں موجود ہے۔ ایران کے عجائب خانہ آثارِ قدیمہ میں ایک نسخہ حضرت ثابتؓ، ایک نسخہ حضرت عثمانؓ، ایک نسخہ حضرت علیؓ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا موجود ہے۔ نیز ایک نسخہ حضرت امام حسنؓ اور ایک نسخہ حضرت سجادؒ کے ہاتھوں کا لکھا ہوا بھی۔

کتابی شکل میں قرآن کے علاوہ، قرآن ہی سے اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ قرآن کو لفظاً لفظاً حفظ کر لیا گیا تھا۔ چنانچہ قرآن میں ہے بَلْ هُوَ اٰيٰتٌۢ بَيِّنٰتٌ فِيْ صُدُوْرِ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ (۲۹/۴۹) بلکہ یہ کھلی کھلی آیتیں ہیں ان لوگوں کے سینوں میں جن کو علم دیا گیا ہے۔ اور تاریخ سے ہمیں

اس کا بھی ثبوت ملتا ہے کہ رسول اللہ حفاظ سے بار بار قرآن کو سنا کرتے تھے۔ اور خود بھی ان کو سناتے تھے۔ مکّہ میں حضرت ارقم مخزومی کا مکان اس مقصد کے لئے متعین تھا اور مدینہ میں مسجد نبوی کا صفہ عام طور پر حفاظ کا مرکز تھا۔ چنانچہ حضور کی وفات کے وقت سینکڑوں حفاظ موجود تھے اور ان میں سے متعدد ایسے تھے جن کے حفظ کی سند خود رسول اللہ نے عطا فرمائی تھی۔

یہ خیال جو عام طور پر مروج ہے کہ موجودہ مصحف حضرت عثمانؓ کا مرتب فرمودہ ہے اور آپ ہی جامع القرآن ہیں، صحیح نہیں ہے۔ قرآن اپنی کتابی شکل میں خود رسول اللہ کے زمانے میں موجود تھا۔ قرآن اپنے آپ کو بار بار کتاب کہتا ہے۔ حتیٰ کہ سورہ بقرہ کی دوسری آیت ہی ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ سے شروع ہوتی ہے اور عرب اس لکھی ہوئی چیز کو کتاب کہتے تھے جو مدون شکل میں سلی ہوئی صورت میں موجود ہوتی تھی (اس دعوے کے تاریخی شواہد کہ قرآن موجودہ کتابی شکل میں خود رسول اللہ کے سامنے موجود تھا۔ تفصیل چاہتے ہیں۔ اور انہیں تفصیلی طور پر کسی دوسرے وقت پیش کیا جائے گا[1])۔ حضرت عثمانؓ نے قرآن کریم کے متعدد نسخے لکھوائے اور انہیں مملکت کے مختلف صوبوں میں بھیجدیا تاکہ اس بارے میں مملکت کے دور دراز گوشوں میں کوئی اختلاف نہ پیدا ہو۔ اور اختلاف کی صورت میں ان مستند نسخوں کی طرف رجوع کر لیا جائے۔ اس لئے حضرت عثمانؓ قرآن کے ناشر تھے نہ کہ جامع القرآن۔

سوال کا جواب

اس تمہیدی پس منظر کی روشنی میں مستفسر کے استفسارات پر غور کیجئے۔ ان کا حل خود بخود مل جائے گا۔ ہم مختصراً ان کا جواب ذیل میں درج کرتے ہیں۔

(۱) "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" خود قرآن کے اندر موجود ہے (دیکھئے سورۂ نمل آیت ۳۰) اب یہ بحث کہ یہ سورۃ فاتحہ کا جزو ہے یا نہیں، ایک فنی بحث رہ جاتی ہے۔

---

[1] اس کے بعد (ستمبر ۱۹۵۰ء کے بعد) طلوع اسلام میں "جمع القرآن" سے متعلق نہایت تفصیلی مضامین شائع ہو چکے ہیں

(۲) ہم یہ بتا چکے ہیں کہ موجودہ مصحف حضرت عثمانؓ کا مرتب کردہ نہیں۔ باقی رہا اعراب کا سوال سو عربوں کے لئے اعراب کی ضرورت نہیں تھی۔ وہ بلا اعراب قرآن کو اس طرح پڑھتے تھے جیسے غیر عرب اعراب کے ساتھ پڑھتے ہیں۔ یہ اعراب غیر عربوں کی سہولت کے لئے لگا دیئے گئے۔ قرآن کی یہ خدمت اگر حجاج کے حق میں جاتی ہے تو اس کی "خونخواری" اس پر اثر انداز نہیں ہوتی۔

(۳) قرآن کی حفاظت پر ایمان رکھنے کے بعد اس قسم کی روائتیں جن میں یہ پایا جاتا ہے کہ فلاں صحابی کی روایت کے مطابق فلاں سورۃ میں مختلف الفاظ منقول ہیں، اس سازش کی کھلی ہوئی غمازی کرتی ہیں جو دین میں فتنہ برپا کرنے کے لئے عمل میں آئی تھی۔ اور جس کے لئے موثر حربہ روایات سازی تھا۔

(۴) "تلاوت" سے غالباً آپ کی مراد قرأت ...... ہے۔ قرأت کے اختلاف کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ عربوں کے مختلف قبیلے بعض حروف کو مختلف طریق سے ادا کرتے تھے۔ مثلاً بعض قبیلے کؔ کو گؔ بولتے تھے۔ اسی طرح جیسے آج لاہور کے اصلی باشندے ڑؔ کو رؔ کہتے ہیں (یعنی بڑی کو بری) اور ہوشیار پور کے رہنے والے واہیات کو باہیات کہتے ہیں۔ حتیٰ کہ حیدر آبادی قرآن کو خرآن بولتے ہیں۔ اس اختلاف کے متعلق ابن خلدون نے لکھا ہے۔

> قرأت کے اختلافات قرآن کے تواتر میں مطلق خلل انداز نہیں ہو سکے۔ کیونکہ ان اختلافات کا مرجع کیفیتِ ادائے حروف تھا۔

تجوید | قرآن کے ان اختلافات کو بھی بعد میں روک دیا گیا۔ اور قاریوں کو اسی قرأت کا پابند کر دیا گیا جو رسول اللہ کی قرأت کے مطابق تھی۔ اس کے علاوہ روایات میں جو کچھ ملتا ہے وہ وضعی ہے اور اگر "تلاوت" سے مستفسر کی مراد فنِ تجوید ہے تو اس سے مراد یہ ہے کہ قرآن کو کس لے سے پڑھا جائے۔ اللہ نے قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھنے کا حکم دیا تھا۔ تجوید کی فنی موشگافیاں زمانہ بعد کی ایجادات ہیں۔ مثلاً ترعید (آواز میں لرزہ پیدا کر کے پڑھنا) ترقیص (جھٹکا دے کر پڑھنا) تحزین (اس طرح پڑھنا کہ معلوم ہو کہ پڑھنے والا روتا ہے) یہ قرآن پڑھنے کی مختلف شکلیں ہیں۔ لیکن ان میں بعض اوقات الفاظ کی صحت کو فن کی پابندیوں پر قربان کر دیا جاتا ہے۔ اور یہ قرآن کی تجوید نہیں تحریف ہے۔

(۵) آیات منسوخ التلاوۃ کا عقیدہ (یعنی یہ عقیدہ کہ قرآن میں آیت تو موجود نہیں لیکن اس کا حکم موجود ہے) اسی سازش کا نتیجہ ہے جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ خدا اس سے بہت بلند ہے کہ وہ ایک ایسی کتاب نازل کرے جس کی کچھ آیتیں اس سے گر کر الگ ہو گئی ہوں اور وہ خدا ان آیتوں کو اس کتاب میں تو داخل نہ کرے۔ لیکن ان کا حکم بحال رکھے۔ علمائے اسلام اگر اس قسم کی باتوں کو تسلیم کرتے چلے آ رہے ہیں تو اس کی ذمہ داری قرآن پر عائد نہیں ہوتی۔

مزید وضاحت اس کے بعد انہی صاحب کی طرف سے حسب ذیل خط موصول ہوا۔

آپ کے موقر مجلہ طلوع اسلام کے ماہ ستمبر کے پرچہ میں حفاظتِ قرآن کے سلسلہ میں اپنے سوالات کے جوابات نظر سے گذرے۔ آپ کی اس ذرہ نوازی کا ممنون ہوں لیکن افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑتا ہے کہ یہ جوابات میرے سوالات سے متعلق ہونے کے باوجود غیر متعلق ہیں شاید آپ نے میری معروضات کو غور سے نہیں دیکھا یا میری تحریر اظہار مدعا کے لئے ناکافی تھی۔ بہرحال جوابات کے متعلق میری معروضات یہ ہیں۔ آپ نے تمہیدی سطور میں تاریخ کے متعلق جو رائے زنی فرمائی ہے اس سے مجھے کلی طور پر اتفاق ہے۔ لیکن حفاظتِ قرآن کے متعلق جن دو پہلو سے آپ نے بحث کی ہے وہ محل نظر ہے۔

میرا مطالبہ قرآن کی قطعیت ثابت کرنے کے لئے کسی خارجی اور قطعی دلیل کا تھا۔ لیکن آپ نے انا نحن نزلنا الذکر و انا لہٗ لحافظون اور لایاتیہ الباطل من بین یدیہ الخ سے استشہاد فرمایا ہے جس چیز کی قطعیت اور ثبوت کے متعلق میں نے آپ سے دریافت کیا ہے اس کو دلیل بنا کر پیش کرنا کیونکر صحیح ہو سکتا ہے؟ آگے چل کر تاریخ کی روشنی میں آپ نے قرآن کی قطعیت ثابت کرنے کی کوشش فرمائی ہے حالانکہ انہی سطور میں تاریخ کے متعلق آپ کا فتویٰ یہ ہے کہ ——— "لیکن بایں ہمہ یہ حقیقت اپنی جگہ پر موجود ہے کہ تاریخی یادداشتیں یقین کی حد تک پہنچ سکتیں" اب آپ ہی فرمائیں کہ جو چیز خود غیر قطعی ہو وہ دوسری

یہ چیز کی قطعیت کی دلیل کیونکر ہو سکتی ہے۔

جواب

ہم اس بحث کو دوبارہ چھیڑنا ضروری نہیں سمجھتے تھے۔ کیونکہ قرآن کے محفوظ ہونے میں کسی کو کلام نہیں۔ مسلم اور غیر مسلم دونوں اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن محترم مستفسر نے اس ضمن میں ایک اور بات کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا جواب ضروری معلوم ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ہم نے قرآنی دعوے کا ثبوت تاریخ سے لیا ہے اور چونکہ تاریخ ایک ظنی چیز ہے اس لئے اس کی رُو سے قرآنی دعوے کو یقینی طور پر ثابت شدہ کیسے مان لیا جائے۔

دعویٰ زیر نظر کا ثبوت طلب کرنے والے یا مسلمان ہو سکتے ہیں یا غیر مسلم۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے، قرآن اور تاریخ کے باہمی تعلق کی پوزیشن یہ ہے کہ

(۱) قرآن کا ہر دعویٰ یقینی ہے اور اس پر ہمارا ایمان ہے۔

(۲) اس ایمان کی بنا پر تاریخ کی وہ شہادتیں جو قرآن کے دعووں کی تائید کرتی ہیں، قابل قبول ہو سکتی ہیں۔

(۳) جو تاریخی شہادتیں قرآن کے خلاف جائیں گی وہ مسترد کر دی جائیں گی۔

مثلاً قرآن کریم میں ہے کہ وہ فرعون جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تعاقب میں غرق ہوا تھا اس کی لاش محفوظ کر لی گئی تھی۔ ایک عرصہ تک تاریخ نہ صرف فرعون کی لاش کے محفوظ رکھے جانے کے ہی خلاف تھی بلکہ اکثر مورخین ساری کی ساری داستان بنی اسرائیل ہی سے انکار کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وہ اسے ماننے کے لئے بھی تیار نہ تھے کہ حضرت یوسفؑ کبھی مصر گئے یا مصر میں قحط پڑا اور اس کا انسداد حضرت یوسفؑ نے فرمایا۔ ہم تاریخ کی ان تمام شہادتوں کو ناقابلِ قبول قرار دیتے تھے۔ اس لئے کہ یہ قرآن کے خلاف تھیں ہم کہتے تھے کہ ہنوز تاریخی انکشافات نا تمام ہیں۔ یقینی انکشافات قرآن کے دعووں کی تصدیق کریں گے۔ بعد میں مصر کی اثری تحقیقات کا زمانہ آیا۔ اور زمین نے اپنے سینہ میں دبی ہوئی یادگاروں کو اس انداز سے اُگلا کہ قرآن کے ایک ایک دعوے کی تصدیق مجسم پیکروں کی شکل میں سامنے آگئی۔ یہی حال ہماری اپنے ہاں کی تاریخ کا ہے۔ مثلاً قرآن میں ہے کہ حضرت ابراہیمؑ

خدا کے سچّے نبی تھے۔ اور کوئی نبی جھُوٹا نہیں ہوتا۔ بخاری میں اس قسم کی حدیثیں ہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے (معاذ اللہ) تین مرتبہ جھُوٹ بولا اور جھُوٹ بھی ایسا کہ جس کے احساس سے وہ خدا کے سامنے جانے سے شرمائیں گے۔ ہم بحیثیت مسلمان ایک ثانیہ کے لئے بھی اسے باور کرنے کے لئے تیار نہیں کہ حضرت ابراہیمؑ نے جھوٹ بولا تھا۔ یا یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا فرمایا تھا۔ ہم بلا تأمل کہہ دیں گے کہ یہ تاریخی شہادت غیر یقینی ہے اور لہذا ناقابلِ قبول۔ اس کے برعکس جن احادیث میں حضرات انبیائے کرامؑ کی صداقت اور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے خلقِ عظیم کے واقعات مندرج ہیں وہ سب قابلِ قبول ہیں اور ہم انہیں سر آنکھوں پر رکھتے ہیں۔ اسی طرح چونکہ قرآن کریم میں یہ دعویٰ ہے کہ قرآن کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے لی لہذا ہر وہ تاریخی شہادت جو حفاظتِ قرآن کی تائید میں ہوگی، ہمارے نزدیک قابل قبول ہوگی۔ اور ہر وہ شہادت جو اس کے خلاف جائے گی مسترد کر دینے کے قابل۔ خواہ اس کی نسبت کسی طرف ہی کیوں نہ کر دی جائے۔ اس لئے قرآن کا دعویٰ حقیقتِ ثابتہ ہے اور تاریخ ظنی۔ محترم مستفسر کے دل میں جو کھٹکا پیدا ہوا ہے کہ چونکہ تاریخ ظنی ہے اس لئے اس کی تائید سے قرآن کے دعووں کی صداقت تسلیم نہیں کی جا سکتی۔ تو یہ کھٹکا ایک غلط فہمی پر مبنی ہے اور وہ یہ کہ انہوں نے یہ سمجھا ہے کہ قرآن کے دعووں کی صحت وسقم کا مدار تاریخی شہادت پر ہے۔ یہ قطعاً غلط ہے۔ قرآن کا ہر دعویٰ اپنی جگہ سچا ہے۔ اور اپنی سچائی کے لئے کسی تاریخی شہادت کا محتاج نہیں۔ اگر تاریخ اس کی شہادت دیتی ہے تو اس سے وہ اپنی سچائی کی دلیل لا سکتی ہے اور اگر اس کے خلاف جاتی ہے تو قرآن کا دعویٰ اپنی جگہ پر سچا رہے گا۔ تاریخی شہادت سے کہا جائے گا کہ اپنے آپ پر نظرثانی کرے۔

ممکن ہے یہ کہہ دیا جائے کہ یہ مسلک تو سائنٹفک اصول کے خلاف ہے کہ جو چیز قرآنی دعوے کے مطابق ہو اسے صحیح سمجھ لیا جائے اور جو اس کے خلاف ہو اسے رد کر دیا جائے۔ لیکن جو چیزیں ایمانیات میں داخل ہیں ان کے لئے یہی اصول سچّا اور سائنٹیفک ہے۔ اس ایمان کی رُو سے تاریخی شہادتوں کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار قرآنی دعوے ہیں۔ جو لوگ اس قسم کا ایمان نہیں رکھتے وہ غیر مسلم ہیں اور ان کا معاملہ ہم سے الگ ہے۔ ان کے پاس چونکہ حق اور باطل کا کوئی بھی مستقل، محکم، غیر متبدل اور خارجی (OBJECTIVE) معیار نہیں اس لئے وہ تاریخی شہادت کو اپنے وضع کردہ اصولوں

کے مطابق ہی پرکھ سکتے ہیں۔ اگر ان کے اصولوں کے مطابق کوئی تاریخی شہادت معتبر سمجھی جاتی ہے اور وہ قرآن سے ٹکراتی ہے تو انہیں حق حاصل ہے کہ وہ اپنی تاریخی شہادت کو معتبر سمجھیں۔ البتہ جب ہم ان سے گفتگو کریں گے تو ہم یا تو یہ ثابت کریں گے کہ ان کے اصولوں میں سقم ہے یا ان کی تحقیقات میں نقص۔

لیکن حفاظتِ قرآن کے بارے میں تو یہ صورت پیش نہیں آرہی۔ اس کی تائید تو ان کے اصولوں کے مطابق مرتب کردہ تاریخی شہادات بھی کر رہی ہیں۔ (سنہ ۱۹۵۰ء)

۵۔ قرآن کریم کے احکام میں تبدیلی

ایک صاحب نے ایک بڑا اہم سوال دریافت کیا ہے۔ سوال ذرا طویل ہے۔ لیکن چونکہ وہ سمجھ میں اسی صورت میں آسکتا ہے جب وہ تفصیلی طور پر سامنے آئے اس لئے ہم اسے اسی شکل میں درج کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ ماہ اگست کے رسالہ ترجمان القرآن میں ایک اہم سوال اور جواب نظر سے گزرا ہے۔ ایک جرمن نومسلم نے دریافت کیا کہ فقہی احکام میں "اجتہاد" کے اصول کے تحت کہاں تک تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ ان صاحب کا خیال ہے کہ اسلام کے بہت سے تفصیلی احکام فقہاء کے اخذ کردہ اور مرتب کردہ ہیں اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد بعض خاص جغرافیائی اور تمدنی حالات کی پیداوار ہیں۔ کئی صدیوں تک تو اجتہاد کا دروازہ کھلا رکھا گیا تھا۔ مگر اس کے بعد اصولاً ضرورتِ اجتہاد کو تسلیم کرنے کے باوجود عملاً اسے بند کر دیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کل کے زمانے میں یورپ کے مسلمانوں کو بعض احکام کی تعمیل میں دشواری پیش آتی ہے۔ مثال کے طور پر وہ وضو کے مسئلے کو لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وضو میں ہر مرتبہ پاؤں دھونا اہل یورپ کو مشکل اور غیر ضروری معلوم ہوتا ہے۔

اس کے جواب میں صاحبِ ترجمان القرآن نے لکھا ہے۔

آپ کے جرمن دوست نے اپنے سوالات کا آغاز تو اس بات سے کیا ہے کہ فقہاء

کے بیان کردہ احکام میں حالات کے لحاظ سے کہاں تک ترمیم کی جا سکتی ہے۔ لیکن آگے
چل کر جہاں وہ ایک متعین مثال پیش کرتے ہیں وہاں فقہا کے بیان کردہ احکام ہی
نہیں بلکہ خود قرآن کی نصوص میں ترمیم کا سوال پیدا ہو جاتا ہے۔ وضو میں منہ، کہنیوں
تک ہاتھ اور ٹخنوں تک پاؤں دھونے اور سر پر مسح کرنے کا حکم تو قرآن میں دیا گیا ہے۔
(المائدہ آیت ۶)

اس سے ظاہر ہے کہ جس بات کا حکم قرآن مجید میں دیا گیا ہو اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لیکن اس کے بعد (وضو کی حکمت بیان کرنے کے بعد) وہ لکھتے ہیں :-

جاڑے کے زمانے میں یا سرد علاقوں میں پاؤں دھونے کی زحمت سے بچنے کے لئے
شریعت نے پہلے ہی سے یہ آسانی رکھ دی ہے کہ آدمی ایک دفعہ وضو میں پاؤں دھونے
کے بعد موزے پہن لے پھر ۲۴ گھنٹے تک مقیم کے لئے اور ۷۲ گھنٹے تک مسافر کے لئے
پاؤں دھونے کی حاجت نہیں بشرطیکہ اس دوران میں وہ موزے نہ اتارے۔

یعنی قرآن کریم نے تو یہ حکم دیا کہ جب نماز کے کھڑے ہو تو منہ ہاتھ، پاؤں دھو لو (وضو کر لو) اس نے کہیں نہیں کہا کہ ایک دفعہ پاؤں دھو کر موزے پہن تو پھر ۲۴ یا ۷۲ گھنٹے کے لئے پاؤں دھونے کی ضرورت نہیں۔ لیکن شریعت نے یہ آسانی رکھ دی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا "شریعت" قرآن مجید سے الگ کوئی اور چیز ہے؟ اور ایسی چیز کہ وہ قرآن مجید کے احکام میں بھی تبدیلی پیدا کر سکتی ہے؟ جب جرمن نومسلم نے اپنی مشکل پیش کی تو اس سے کہا گیا کہ قرآن کی نصوص میں ترمیم کا سوال پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس کے بعد یہ کہا گیا کہ "شریعت" نے قرآن کی نصوص میں ترمیم کر دی ہے۔

آخر میں ترجمان القرآن میں لکھا ہے۔

ان جرمن دوست کو کہئے کہ حالات و ضروریات کے لحاظ سے اسلام کے فروعی احکام
میں ضروری رد و بدل تو ہو سکتا ہے لیکن اس کا رد و بدل کرنے کے لئے شریعت کی
گہری واقفیت درکار ہے۔ ہر شخص کو سطحی طور پر یہ اختیارات نہیں دیئے جا سکتے۔

سوال یہ ہے کہ وہ کون سے فروعی احکام ہیں جن میں رد و بدل ہو سکتا ہے؟ فروعی احکام تو قرآن مجید

میں بھی ہیں۔ کیا ان میں بھی رد و بدل ہو سکتا ہے؟

جواب:۔ سوال آپ نے دیکھ لیا۔ اور امید ہے اس کی اہمیت کا بھی اندازہ لگا لیا ہو گا۔ ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ

(۱) قرآن کریم کے احکام میں ـــــ خواہ وہ اصولی ہوں یا فروعی ـــــ کسی قسم کی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ لا تبدیل لکلمٰت اللّٰہ۔

(۲) قرآن کریم نے جن احکام کو بطور اصول بیان کیا ہے اور ان کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ اسلامی نظامِ حکومت (جسے خلافت علیٰ منہاج نبوت کہا جاتا ہے) ان جزئیات کو متعین کرے گا۔ ان جزئیات میں حالات کے بدلنے سے تبدیلی ہو سکتی ہے۔ یہ تبدیلی بھی اسی نظام کی طرف سے ہو گی۔

لیکن اس کے برعکس ان حضرات کا عقیدہ یہ ہے کہ قرآن کریم کے احکام میں بھی رد و بدل ہو سکتا ہے۔ یہاں تک تو یہ تمام حضرات متفق ہیں۔ اس کے بعد ان میں سے بعض کا عقیدہ ہے کہ

(الف) ان احکام میں رد و بدل، احادیث نے کر دیا ہے (حتیٰ کہ احادیث نے قرآن کریم کی بعض آیات کو منسوخ بھی کر دیا ہے) لیکن جو کچھ احادیث کی رُو سے ہو چکا ہے۔ اس میں اب رد و بدل نہیں ہو سکتا۔

(ب) بعض کا عقیدہ ہے کہ رد و بدل فقہ نے کیا ہے (حتیٰ کہ ائمہ فقہ کے اقوال، قرآن کریم کی آیات کو بھی منسوخ کر سکتے ہیں) لیکن جو رد و بدل فقہ کی رُو سے ہو چکا ہے۔ اس میں اب کوئی تبدیلی نہیں ہو سکتی اور۔

(ج) بعض کا خیال ہے کہ ان فقہی احکام میں رد و بدل ہو سکتا ہے۔ اور یہ "علمائے کرام" کر سکتے ہیں۔ یہ حضرات جب "شریعت" یا "اسلام" کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد (۱) احادیث کی رو سے مرتب شدہ احکام۔ یا (۲) فقہ کی رُو سے مرتب شدہ احکام ہوتے ہیں۔ اور چونکہ احادیث اور فقہ ہر فرقہ کی الگ الگ ہے اس لئے "شریعت" یا "اسلام" بھی ہر فرقہ کا الگ الگ ہے۔

اب رہا وہ تضاد جو آپ نے ترجمان القرآن کے بیان میں دیکھا ہے۔ یعنی ایک طرف یہ

کہا گیا ہے کہ قرآن کی نصوص میں ترمیم نہیں ہو سکتی اور دوسری طرف یہ کہ شریعت نے اس منصوص حکم میں تبدیلی کر دی ہے تو اس کا جواب تو یہی حضرات دے سکیں گے۔ جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے، ان حضرات کا عقیدہ یہی ہے کہ قرآن کے احکام میں تبدیلی ہو سکتی ہے اور اس پر ان کا عمل بھی ہے۔ اس کی ایک مثال تو وضو کے احکام کے سلسلے میں خود انہوں نے اپنے اس جواب میں دی ہے۔ اس کا نام ان کے نزدیک تبدیلی نہیں "تعبیر" ہوتا ہے۔ یہ وہی "تاویل" یا "تعبیر" ہے جس کے متعلق علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

ز من بر صوفی و مُلّا سلامے | کہ پیغام خدا گفتند ما را
ولے تاویل شاں در حیرت انداخت | خدا و جبرئیلؑ و مصطفیٰؐ را

۱۹۶۲ء

۶۔ قرآن کریم کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت

سوال:۔ قرآن شریف کے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت کیا ہے؟

جواب:۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ اِنْ كُنْتُمْ فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ۔ (۲/۲۳) و دیگر مقامات)۔" اگر تمہیں اس کتاب میں جسے ہم نے

قرآن کی صداقت کا ثبوت

اپنے بندے پر نازل کیا ہے کسی قسم شبہ ہو۔ (کہ خدا کی طرف سے نہیں ہے) تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ تم اس کی کسی سورت کی مانند کوئی سورت بنا لاؤ! قرآن کا یہ دعویٰ اس کے یوم نزول سے لے کر آج تک ساری دنیا کے سامنے چلا آرہا ہے۔ اور کسی کو اس چیلنج کے قبول کرنے کی ہمت نہیں پڑی۔ یہ چیلنج اس دور کے متشککین کے لئے بھی کھلا ہے۔

۷۔ قرآن کریم کی سائنٹیفک تعبیر

سوال :۔ اگر قرآن کریم کی تعبیر سائنس کے انکشافات کی رُو سے کی جائے تو اس پر اعتراض یہ وارد ہوتا ہے کہ کل کو اگر سائنس کے موجودہ نظریات غلط ثابت ہو گئے تو اس سے قرآن پر حرف آئے گا۔ اس کی وضاحت کر دیجئے۔

جواب :۔ قرآن کریم کا ایک حصہ اس کے قوانین اور اصولوں پر مشتمل ہے۔ اسے وہ محکمات سے تعبیر کرتا ہے اور یہی ام الکتاب ہیں۔ یعنی وہ انسانوں کو جو راہ نمائی دینا چاہتا ہے اس کی اصل اور جڑ یہی ہے۔ اس حصہ کا مفہوم متعین اور مطالب واضح ہیں، اس لئے اس کی تعبیرات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے متعلق یہ دیکھا جائے گا کہ مختلف زمانوں میں ان قوانین اور اصولات پر عمل کس طرح کیا جائے گا۔ انسانی علم کی وسعت، ان کی رفعت، ہمہ گیریت اور افادیت کے دلائل بہم پہنچائے گی۔

قرآن کا دوسرا حصہ وہ ہے جس میں وہ اپنے دعاوی کی صداقت پر خارجی کائنات سے شہادات پیش کرتا ہے۔ اس کے لئے وہ کارگہِ کائنات کے نظم ونسق، قوانینِ خداوندی کی محکمیت، تخلیق ارض وسماء، تسخیر شمس وقمر، تکویر لیل ونہار، غرضیکہ انفس وآفاق میں آیاتُ اللہ پر غور وفکر کی تاکید کرتا ہے۔ اسی میں وہ امور بھی آجاتے ہیں جن کا تعلق مابعد الطبیعات سے ہے۔ انہیں وہ تشبیہات واستعارات کے انداز میں پیش کرتا ہے۔ یہ وہ حصہ ہے جس میں مختلف زمانوں میں مختلف تعبیرات سامنے آسکتی ہیں۔ اس لئے کہ ان امور پر انسان اسی حد تک غور وفکر کر سکتا ہے جس حد تک اس کے زمانے میں انسانی علم ترقی کر چکا ہے۔ اگر ایک دور کا انسانی علم مشاہدہ یا تجربہ کسی سابقہ دور سے مختلف ہوگا تو اس دور کی تعبیرات بھی سابقہ دور سے مختلف ہوں گی۔ مثلاً قرآن کریم نے فرعونِ (حضرت) موسیٰؑ کی لاش کے متعلق کہا کہ فَالْيَوْمَ نُنَجِّيكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُونَ لِمَنْ خَلْفَكَ آيَةً (۱۰/۹۲) "پس ہم آج تیرے جسم کو (سمندر کی موجوں سے) بچالیں گے تاکہ تو ان لوگوں کے لئے جو تیرے بعد آنے والے ہیں، ایک نشان ہو"۔ اب ظاہر ہے کہ جس زمانے میں مصریات

کے متعلق تحقیق نہیں ہوئی تھی اس آیت کی تعبیر کچھ اور کی جاتی تھی۔ اٹھارویں اور انیسویں صدی میں وہاں کے شاہی مقبروں کی کھدائی ہوئی تو ان سے بے شمار حنوط شدہ لاشیں (ممی) برآمد ہوئیں۔ انہی میں رعمسیس ثانی کی لاش بھی برآمد ہوئی جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ حضرت موسیٰؑ کے زمانے کا فرعون تھا۔ اس انکشاف کے بعد قرآن کریم کی مذکورہ صدر آیت کی تعبیر بھی مختلف ہو گئی۔ اس مثال کا تعلق تاریخی انکشافات سے ہے۔ دوسری مثال فلکیات سے متعلق لیجئے۔ قرآن کریم میں اجرام سماوی کے متعلق ہے۔ كُلٌّ فِي فَلَكٍ يَسْبَحُونَ (۲۱/۳۳) تمام (کُرے) اپنے اپنے مدار میں تیر رہے ہیں۔ جب فلکیات کے متعلق قدیم تصور کارفرما تھا تو اس آیت کی تعبیر کچھ اور کی جاتی تھی۔ جب جدید انکشافات کی رو سے فلکیات کے متعلق نئی آیات" (نشانیاں) سامنے آئیں تو اس آیت کی تعبیر کچھ اور ہو گئی۔ تعبیرات کے ان اختلاف سے قرآنی حقائق پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ اگر ہمارے زمانے کی کوئی علمی تحقیق سابقہ دور کی کسی تعبیر کو غلط ثابت کرتی ہے تو اس کے متعلق یہ کہا جائے گا کہ اس زمانے کا انسانی علم ناقص تھا۔ اور اگر آج کی کوئی تعبیر بعد میں آنے والے زمانے نے غلط ثابت کر دی تو یہی بات آج کے انسانی علم کے متعلق کہی جائے گی۔ لہذا اس باب میں صحیح روش یہ ہے کہ ہم قرآنی حقائق کو علم انسانی کی موجودہ سطح کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کریں۔ لیکن اپنی فہم اور اس پر مبنی تعبیر کو حرفِ آخر قرار نہ دے لیں۔ اس لئے کہ حقائق کی لامتناہیت کا تو یہ عالم ہے کہ قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (۱۸/۱۰۹) " ان سے کہہ دے کہ اگر میرے پروردگار کی باتیں لکھنے کے لئے دنیا کے تمام سمندر سیاہی بن جائیں تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے گا مگر میرے پروردگار کی باتیں ختم نہیں ہوں گی۔ اگر ان سمندروں کا ساتھ دینے کے لئے ایسے ہی سمندر اور پیدا کر دیں، جب بھی وہ کفایت نہ کر سکیں"۔ حقائق کی یہی لامحدودیت ہے جس کی بنا پر ڈاکٹر جیمز آرنلڈ کراتھر نے کہا ہے کہ " ہمیں کسی موضوع پر حرفِ آخر، آخری انسان کے لئے ہی چھوڑ دینا چاہیئے"۔

یاد رکھیئے قرآن کریم کا ایک ایک لفظ اپنی جگہ پہاڑ کی طرح اٹل ہے۔ اگر ہم اس کے حقائق کے سمجھنے میں غلطی کر جاتے ہیں تو یہ ہمارے تدبّر کا قصور ہے یا ہمارے زمانے کی علمی سطح کا نقص۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس خیال سے کہ ہم قرآنی حقائق کے سمجھنے میں کہیں غلطی نہ کر جائیں،

ہم ان حقائق پر غور و تدبر کرنا ہی چھوڑ دیں، جس خدا نے غور و تدبّر کا حکم دیا تھا اسے اچھی طرح سے علم تھا کہ انسانی غور و فکر غلطی بھی کر سکتا ہے اور جس دور میں غور و فکر کرنے والا انسان پیدا ہوا ہے اس دور کی علمی سطح بھی ناقص ہو سکتی ہے۔ اس کے باوجود اس نے خارجی کائنات پر غور و فکر کا بھی حکم دیا ہے ' اور قرآنی حقائق پر بھی' یہی وہ حقیقت ہے جسے قرآن میں ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے کہ سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ۔ (۴۱/۵۳) ہم انہیں اپنی نشانیاں انفس و آفاق میں دکھائیں گے تاآنکہ ان پر یہ بات ظاہر ہو جائے کہ (قرآن) واقعی ایک حقیقتِ ثابتہ ہے۔'' اس باب میں (جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے) بس اس احتیاط کی ضرورت ہے کہ غور و فکر کرنے والا اپنی تعبیر کو حرفِ آخر نہ سمجھ لے۔

(۱۹۶۲ء)

۸۔ قرآن کریم کے تراجم میں اختلاف

رسالپور سے ایک صاحب کا حسب ذیل مکتوب موصول ہوا ہے۔

''تعدادِ ازدواج کے متعلق طلوعِ اسلام اور مدیر صدقِ جدید کے الگ الگ فتاویٰ نے یہاں عجیب سی فضا پیدا کر رکھی ہے۔ ہر چند کہ قرآن کریم میں سورۃ النساء کی آیت مبارکہ ۳ کے معانی جو محترم پرویز صاحب نے کئے ہیں ایک ضابطہ حیات میں شادی کے متعلق ایک قانونی شق بالکل صاف اور واضح قابلِ فہم اور قابلِ عمل ہے۔ مگر صدقِ جدید ہی کا کیا تصور ہے جبکہ .... نے قرآن مجید مترجم عکسی و رنگین کے جو متعدد نسخے بڑی محنت اور احتیاط سے طبع کئے ہیں۔ اور ان میں شاہ رفیع الدین مرحوم محدّث دہلوی کا مستند، مقبول عام اور مشہور و معروف ترجمہ تحت اللفظ کیا گیا ہے اور حاشیہ پر تفسیر شاہ عبدالقادر صاحب کی کی گئی ہے۔ آیت مذکور کا لفظی ترجمہ اور تفسیر موضح القرآن یوں کرتے ہیں۔

ترجمہ:۔ اور اگر ڈرو تم یہ کہ نہ انصاف کرو گے بیچ یتیم عورتوں کے پس نکاح کرو جو خوش لگے تم کو سوائے ان کے عورتوں سے دو دو، اور تین تین اور چار چار۔ پس اگر ڈرو تم یہ کہ نہ عدل کرو تم پس ایک ہے یا جس کے مالک ہوئے داہنے ہاتھ تمہارے یہ بہت نزدیک ہے اس سے کہ نہ بے انصافی کرو۔ (۴/۳)

موضح القرآن نمبر۲ کا نوٹ

یعنی اگر جانو کہ یتیم لڑکی کو ہم نکاح کریں گے تو اس کا حق نہ ادا کریں گے — کیونکہ اس کا حق مانگنے والا نہیں، تو عورتیں بہت ہیں کچھ کمی نہیں۔ ایک مرد کو دو بھی اور تین بھی اور چار بھی روا ہیں۔ اس سے زیادہ جمع کوئی روا نہیں کیونکہ اتنے میں بھی انصاف کرنا مشکل ہے، زیادہ میں کب ہو سکے گا۔ سو اس قدر بھی جب کرو کہ جانو انصاف سے رہو گے نہیں تو ایک ہی بس ہے۔ یا اپنی لونڈی کفایت ہے۔ جس کو کئی عورتیں ہوں تو واجب ہے کھانے پینے میں اور دینے لینے میں برابر رکھے۔ اور رات رہنے میں باری برابر باندھے۔ اگر نہ کرے گا تو قیامت میں اس کا آدھا جسم گھسٹتا چلے گا۔ اور تاکیداً فرمایا کہ عورت مومن کا مہر پورا خوشی سے ادا کرو۔ اگر وہ خوشی سے کچھ چھوڑ دے تو اور بات ہے۔

اور قرآن کریم کے ایک دوسرے نسخے میں جس کی طباعت اور ترجمہ مولانا فتح محمد خان صاحب جالندھری مرحوم نے کیا ہے، آیت مبارکہ کا لفظی ترجمہ یوں لکھتے ہیں :۔

ترجمہ:۔ اور تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو گے تو ان کے سوا جو عورتیں تم کو پسند ہوں دو دو یا تین تین یا چار چار ان سے نکاح کر و۔ اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ سب عورتوں سے یکساں سلوک نہ کر سکو گے تو ایک عورت (کافی ہے) یا لونڈی جس کے تم مالک ہو۔ اس سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے۔

ہاں اگر وہ اسی خوشی سے اس میں سے کچھ تم کو چھوڑ دیں۔ تو اسے ذوق شوق سے کھالو۔ (۴/۴)

پچونکہ ہندوستان، پاکستان میں قرآن کریم کے یہ نسخے یا اس قسم کے دوسرے مترجم نسخے موجود ہیں۔ یہی تلاوت کئے جاتے ہیں، سمجھے اور سمجھائے جاتے ہیں تو آپ ہی غور فرمایئے کہ عوام جو عربی زبان نہیں جانتے وہ اس "ضابطۂ حیات" میں ایک شادی کے متعلق کیا، باقی اصول و احکام کو سمجھ کر کتنا صحیح یا غلط خود عمل کرتے ہیں اور دوسروں کو فتوے اور نصیحت دے سکتے ہیں۔

اس سے ظاہر ہے کہ جیسے عربی سے ناواقف عوام قرآن کی صحیح تعلیم سے محروم ہیں۔ اس طرح اگر........ صاحب غلط معانی لے کر لکھنے لگ جائیں تو ان کا کیا تصور ہے۔ ہاں ظلم یہ ہے کہ ان کی تقلید ہوتی ہے۔ اور جو کچھ وہ کہہ دیں وہ صحیح سمجھ لیا جاتا ہے اور اس طرح دوسری قومیں کیا مسلمان خود صحیح اسلام سے دور کہاں سے کہاں نکل جاتے ہیں۔

جواب

اس میں شبہ نہیں کہ یہ چیز ہر صاحب فکر کے لئے موجب حیرت بن جاتی ہے کہ قرآن کے موجودہ ترجموں میں جہاں کسی کے ہاں کوئی غلطی ہوتی ہے۔ ہر ایک ترجمہ میں وہی غلطی کیوں ہوتی ہے؟ اس کی ایک خاص وجہ ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نہ قرآن کے کسی ترجمہ کی ضرورت تھی اور نہ ہی اس کی کوئی تفسیر لکھی تھی۔ سب سے پہلی اور جامع تفسیر امام ابن جریر طبری نے تیسری صدی ہجری میں لکھی۔ اس تفسیر میں انہوں نے التزام یہ کیا کہ جو کچھ لکھا اس کی تائید میں کوئی نہ کوئی روایت ضرور لکھ دی۔ لہذا ان کی تفسیر ان کی اپنی تفسیر نہ رہی بلکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کبارؓ کی تفسیر سمجھی گئی۔ حالانکہ یہ وہ زمانہ تھا جب روایات سازی کا بازار گرم تھا اور ہر موضوع پر وضعی روایات آسانی سے دستیاب ہو جاتی تھیں۔ امام طبری نے تفسیر کے علاوہ سب سے پہلی جامع تاریخ بھی لکھی (یہ آپ کو معلوم ہی ہے کہ امام طبری دراصل شیعہ تھے۔ لیکن انہوں نے یہ تفسیر اور تاریخ دونوں سنیّوں کے امام کی حیثیت سے لکھیں) چنانچہ ان کی تفسیر ام التفاسیر اور ان کی تاریخ ام التواریخ کہلاتی ہے۔ ان کے بعد جو تفسیریں بھی لکھی گئیں وہ بالعموم امام طبری ہی کی تفسیر کے تتبع میں لکھی گئیں۔ اس لئے کہ ان کی تفسیر کی تائید میں روایات لکھی گئی تھیں لہذا ان کے خلاف تفسیر لکھنے کے معنیٰ یہ تھے کہ آپ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہؓ کی تفسیر کے خلاف جا رہے ہیں۔ جہاں جہاں کسی نے ان سے اختلاف کیا، وہ اسی بنا پر

کیا کہ ان کی فلاں روایت کمزور ہے اور اس کے مقابلہ میں یہ روایت قوی ہے۔ بنا بریں (بجز ان مستثنیات کے جن میں کسی نے اختلاف کیا ہو) ہمارے ہاں قرآن کا وہی مفہوم صحیح سمجھا گیا ہے جسے امام طبری نے سمجھا دیا ہے۔ تفسیروں کے بعد جب ترجموں کی باری آئی تو ان میں بھی اسی مفہوم کو پیشِ نظر رکھا گیا جو تفسیر میں بیان ہوا تھا۔ لہٰذا ہمارے ترجمے قرآنی الفاظ کے ترجمے نہیں بلکہ قرآن کے اس مفہوم کے مظاہر ہیں جو ہماری تفسیروں میں بیان ہوا ہے۔ چونکہ یہ تفسیریں مصر اور بخارا، شام اور ہندوستان عرب و عجم ہر جگہ درس میں پڑھائی جاتی ہیں اس لئے قرآن کا ترجمہ خواہ وہ فارسی میں ہو یا ترکی میں۔ اردو میں ہو یا خود عربی میں ہر جگہ کم و بیش ایک جیسا ہوتا ہے۔ اب جو غلطی ایک میں پائی جائے گی وہ دوسروں میں بھی پائی جائے گی۔ مثال کے طور پر سورۂ نساء کی زیرِ نظر آیت کو لیجئے۔ آیت یہ ہے۔ وَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَا تُقْسِطُوْا فِی الْیَتٰمٰی فَانْکِحُوْا مَا طَابَ لَکُمْ......... اس کا ترجمہ آپ کو یہ ملے گا کہ:

> اور اگر ڈرو تم یہ کہ نہ انصاف کرو گے بیچ یتیم عورتوں کے پس نکاح کرو خوش لگے تم کو سوائے ان کے عورتوں سے۔

آپ دیکھیں گے کہ یہ الفاظ کہ تم ان کے سوائے اور عورتوں سے نکاح کرو، قرآن میں نہیں ہیں۔ اور اسی ٹکڑے نے (کہ تم ان کے سوا اور عورتوں سے نکاح کرو) سارے مفہوم کو بدل دیا ہے۔ یعنی قرآن نے کہا تھا کہ انہی عورتوں میں سے (جو بلا شوہر کے رہ گئی ہوں) اپنی حسبِ پسند ایک سے زیادہ شادیاں کر لو۔ اور ترجمہ نے یہ کہا کہ ان عورتوں کو چھوڑ کر دوسری عورتوں سے شادیاں کرو۔ اب سوال یہ ہے کہ جب یہ الفاظ قرآن میں نہیں تو ترجمہ میں کیسے آ گئے؟ ترجموں میں یہ الفاظ تفسیر سے آئے۔ تفسیر میں ایک روایت کی سند سے آئے۔ چنانچہ بخاری میں ایک روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ سے اس آیت کا مفہوم پوچھا گیا تو انہوں نے فرمایا کہ لوگ یتیم لڑکیوں سے نکاح کر کے ان کی حق تلفی کرنا چاہتے تھے۔ اس لئے یہ حکم آیا کہ تم ان لڑکیوں سے نکاح نہ کرو۔ اور عورتیں بہت ہیں۔ ان سے دو دو تین تین چار چار تک نکاح کر لیا کرو۔ یہ روایت تفسیر میں آئی اور اس تفسیری مفہوم کے ماتحت ترجمے ہوئے۔ اب جو شخص اس ترجمہ پر اعتراض کرے تو اسے کہہ دیا جاتا ہے کہ یہ تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کا بیان فرمودہ مفہوم ہے۔ حالانکہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم

نے اپنی حدیثوں کا کوئی مجموعہ امت کو نہیں دیا تھا۔ اور تفسیریں اس زمانہ میں لکھی گئی تھیں جب خود محدثین کی تحقیق کے مطابق وضعی حدیثوں کا بازار گرم تھا۔ بہرحال یہ وجہ ہے کہ ہمارے ترجمے قرآن کے الفاظ سے مختلف ہو جاتے ہیں۔

ہمارے نزدیک جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے اپنی تفسیری احادیث کا کوئی مستند مجموعہ امت کو نہیں دیا تو قرآن کے سمجھنے کا صحیح اور محفوظ طریقہ یہی ہے کہ خارجی اثرات کو الگ رکھ کر قرآن کو خود قرآن ہی سے سمجھا جائے۔ یعنی عربی زبان کی رو سے اور قرآن نے تصریف آیات سے اپنا جو مفہوم خود واضح کر دیا ہے اس کی رُو سے۔

(سنہ ۱۹۵۵ء)

۹۔ بلا سمجھے قرآنِ کریم کی تلاوت

(س) تلاوتِ قرآنِ پاک ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ ہمارے یہاں اکثریت ان لوگوں کی ہے جو قرآنِ کریم کے الفاظ پڑھتے ہیں لیکن ان کے معنی بالکل نہیں سمجھتے۔ کیا اس سے کچھ فائدہ بھی ہے؟

جواب

طلوعِ اسلام میں اس سے بیشتر اس موضوع پر لکھا جا چکا ہے لیکن سوال کی اہمیت کے پیشِ نظر اس کی تکرار بھی فائدہ سے خالی نہیں ہوگی۔

ہم پوچھتے ہیں کہ کیا دنیا میں کوئی اور کتاب بھی ایسی ہے جسے آپ بلا سمجھے پڑھتے ہیں۔ کسی ایسی زبان میں لکھی ہوئی کتاب تو ایک طرف رہی جسے آپ جانتے ہی نہ ہوں۔ اگر کتاب کی زبان آپ جانتے ہوں اور وہ کتاب آپ کی استعداد سے زیادہ مشکل ہو تو بھی آپ اسے نہیں پڑھیں گے کہ جب کچھ پلے ہی نہیں پڑتا تو پھر اسے پڑھا کس لئے جائے۔

جب یہ کیفیت ہے تو پھر قرآن کو کیوں اس سے مستثنیٰ رکھا جاتا ہے؟ کتاب پڑھنے

سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ آپ اس کتاب کے مضامین (CONTENTS) کو سمجھ سکیں۔ اگر آپ اس کے مافیہ کو نہیں سمجھ سکتے تو اس کا پڑھنا آپ کو کیا فائدہ دے گا۔ یہ ایک عام سمجھ کی بات ہے۔ پھر معلوم نہیں "مذہب" کے معاملہ میں سمجھ کو کیوں الگ رکھ دیا جاتا ہے۔ قرآن ایک کتاب ہے اور اس میں یہ لکھا ہے کہ تمہیں دنیا میں زندگی کس طرح بسر کرنی چاہیئے۔ اب ظاہر ہے کہ اس کتاب کو پڑھا اس لئے جائے گا کہ سمجھا جائے، اور سمجھا اس لئے جائے گا کہ اس کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق زندگی بسر کی جائے۔ کہیئے! اس کے الفاظ کو دہرا لینے سے یہ مقصد حاصل ہو جائے گا؟ قرآن اپنے آپ کو "کتاب مبین" (ایک واضح کتاب) کہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ میری زبان "عربی مبین" (صاف اور سلیس واضح عربی زبان) ہے۔ وہ اپنے آپ کو "ہدایت" راہ نمائی اور نُور (روشنی) بتاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس میں قوموں کے عروج و زوال کے بین اصول منضبط ہیں۔ وہ بتاتا ہے کہ اس میں ارتقاء شرفِ انسانیت کے قوانین و آئین مندرج ہیں۔ وہ اپنے مضامین پر بار بار دعوتِ غور و فکر دیتا ہے۔ وہ ہر صاحبِ فکر و نظر کو اس میں تدبر و تفکر کے لئے تاکید کرتا ہے۔ وہ اس میں تدبر نہ کرنے والوں کو سطح انسانیت سے گرا ہوا قرار دیتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو عقل کی آنکھ کے لئے سورج کی حیثیت سے پیش کرتا ہے۔ ہم پوچھتے ہیں کہ قرآن کا یہ مقصد بلا سوچے سمجھے پڑھنے سے حاصل ہو سکتا ہے؟ ہم کہتے ہیں کہ قرآن پر اس سے بڑا ظلم اور کیا ہوگا کہ اسے بلا سمجھے پڑھا جائے۔ آپ کسی مصنف سے یہ کہیئے کہ میں تمہاری کتاب کے ایک لفظ کو بھی نہیں سمجھتا۔ لیکن اس کے باوجود ہر روز اسے پڑھتا ہوں۔ حتیٰ کہ مجھے وہ زبان بھی نہیں آتی۔ جس میں تم نے کتاب لکھی ہے۔ اس کے باوجود اس کے الفاظ کو دہراتا رہتا ہوں۔ آپ خود ہی سوچئے کہ وہ مصنف آپ کو کیا جواب دے گا؟ حقیقت یہ ہے کہ اُمت کو قرآن سے دور لے جانے کا سب سے مؤثر حربہ یہ تھا کہ اس کے دل میں اس خیال کو راسخ کر دیا جائے کہ قرآن کو بلا سمجھے پڑھنے سے بھی "ثواب" حاصل ہوتا ہے۔ یہ ان سازشوں میں سے بڑی سازش تھی۔ جو دنیا میں اس عظیم المرتبت قوم کو اس کے مقام سے گرانے کے لئے سوچی گئیں۔ (ہم جانتے ہیں کہ وہ مسلمان جن کی زبان عربی ہے یا جو عربی جانتے ہیں، وہ بھی دوسروں کے ساتھ ہی ذلیل ہیں۔ لیکن اس کے لئے اور وجوہات ہیں۔) جیسا کہ ہم پہلے لکھ چکے ہیں۔ یہ عقیدہ کہ بلا سمجھے قرآن کے الفاظ دہرانے سے "ثواب" ہوتا ہے۔ یکسر غیر قرآنی عقیدہ ہے۔ یہ عقیدہ

درحقیقت عہدِ سحر (MAGIC AGE) کی یادگار ہے۔ جب یہ سمجھا جاتا تھا کہ الفاظ اپنے اندر تاثیر رکھتے ہیں (معانی نہیں بلکہ الفاظ) یہ قرآنی اعمال۔ تعویذ۔ نقوش۔ وظائف اوراد سب اسی عقیدہ کی مستعار شکلیں ہیں۔ قوم ہزار برس سے ان توہمات میں الجھی چلی آرہی ہے اور ان سے نجات کی اب بھی کوئی صورت دکھائی نہیں دیتی۔ اس لئے کہ قوم کو جہالت کی ان وادیوں میں گھیرے رکھنے سے ایک طبقہ کی روٹی وابستہ ہے۔ اس لئے وہ اسے ظلمات سے نور کی طرف آنے ہی نہیں دیتا۔ جب کوئی اللہ تعالیٰ کا بندہ اس کے خلاف آواز اٹھاتا ہے۔ تو بھوک کا تصوّر اس طبقہ کو ہر قسم کی مخالفت کے لئے کمربستہ کر دیتا ہے اور اس آواز کو " مذہب اور سلف صالحین کے طریقہ" کے خلاف قرار دے کر عوام کے جذبات مشتعل کر دیتا ہے۔ یہی ہے مترفین اور دوسروں کی کمائی پر زندگی بسر کرنے والوں کا وہ گروہ جو ہمیشہ حق کی آواز کے خلاف محاذ قائم کرتا رہا ہے، اور آج بھی یہی کچھ کر رہا ہے۔ اس لئے کہ انہیں معلوم ہے کہ قرآن (حضرت) موسیٰ کا وہ اژدہا ہے جو ان ساحرین کی نگاہ فریب رسیوں کو صاف نگل جائے گا۔ اس لئے وہ قرآن کریم کو قوم کے سامنے کبھی بے نقاب نہیں ہونے دیں گے، اور اس کے لئے وہ ان پڑھوں کو قرآنی الفاظ کے دہرانے کے "ثواب" اور لکھے پڑھوں کو اسرائیلی روایات پر مشتمل تفاسیر کے فریب میں مبتلا رکھیں گے تاکہ۔ ہو نہ جائے آشکارا شرعِ پیغمبر کہیں۔

(۱۹۵۳ء)

۱۰۔ قرآن فہمی کا طریق

محترم عرشی صاحب کا مکتوب گرامی (پرویز صاحب کے نام)

"سلیم کے نام" خط (جون ۱۹۵۱ء) میں نے آج دوبارہ پڑھا۔ دراصل ان خطوط[1] میں ایک نئے علم کلام کی بنیاد پڑ رہی ہے۔ قرآن کو سمجھنے کے نئے راستے کھل رہے

---

[1] ان خطوط کا مجموعہ تین جلدوں میں شائع ہو چکا ہے۔ (طلوعِ اسلام)

ہیں، جو بظاہر نئے ہیں اور حقیقتاً پرانے۔ یعنی این وآں سے صرفِ نظر کرکے صرف قرآن کو سامنے رکھنا۔ جیسا کہ قرنِ اول میں تھا۔ اس تازہ خط میں کئی باتیں ہیں۔ جن پر مفصل اظہارِ رائے کی ضرورت ہے۔ سردست صرف دو باتوں کا ذکر کروں گا۔

(۱) آپ کے قلم سے شاید روح القدس نے یہ فقرے لکھوا دیئے ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم قرآن کے اس اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر کرلیں جو خاص خاص ادوار کا پیدا کردہ ہے۔ قرآن کے الفاظ کے وہ معانی متعین کریں جو زمانہ نزولِ قرآن میں رائج تھے اور ان معانی کی روشنی میں اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق قرآن کا مفہوم ازسرِنو متعین کریں۔

آپ نے بڑی بات کہہ دی ہے۔ فقہا و محدثین کی بے شمار اصطلاحات نے ہم کو اس قرآن سے بہت دور پھینک دیا ہے جو قدیم مخاطبین قرآن نے سمجھا اور سمجھتے ہی پیتل سے سونا اور کانچ سے الماس بن گئے۔ یعنی ابھی ابھی وہ لٹیرے، وحشی، لڑاکے، فاسق و فاجر، جواری، شرابی اور نہ جانے کیا کیا تھے کہ اچانک پردہ گرتا ہے۔ اور اس کے دوبارہ اٹھتے ہی وہی خونخوار چہرے مقدس و نورانی بن جاتے ہیں۔ ان کی ہر ادا میں دل نوازی اور جاذبیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بجائے ان کے سامنے سو پچاس بڑے بڑے فقہا و محدث اور قرآن کی بجائے صحاح ستہ و شرح وقایہ وغیرہ پیش کی جاتیں۔ تو یقیناً یہ نتیجہ نہ نکلتا جو تاریخ کے آسمان پر ستاروں سے زیادہ روشن نظر آرہا ہے۔ لہٰذا لازمی طور پر ضرورت ہے کہ قرآن کو انہی معنوں میں سمجھا جائے جن میں صحابہؓ نے سمجھا تھا اور یہ نکتہ بھی آپ نے خوب کہا کہ:

"اپنے زمانے کی علمی سطح کے مطابق"

یہ بات نہایت اہم بھی ہے اور ہمارے موجودہ مریضانہ حالات میں نہایت مشکل بھی۔ وہ ذہن جو صدیوں سے اصطلاحی مفہوموں سے متاثر بلکہ ماؤف ہو

چکے ہیں۔ اس وقت منڈی میں انہی کی درآمد برآمد ہو رہی ہے۔ ان سے یہ توقع رکھنا کہ "اصطلاحی مفہوم سے قطع نظر کر لیں" قطعاً ناممکن ہے۔ لے دے کے ایک طلوعِ اسلام ہے اور اس کے دو ایک لکھنے والے جن کا بحالتِ موجودہ اس امرِ عظیم سے عہدہ برآ ہونا سخت دشوار نظر آتا ہے۔ (لیکن اللہ تعالیٰ سے کچھ بھی بعید نہیں)

(۲) بات یہ ہے کہ "فطرت" کے مروجہ معانی کی تردید میں آپ نے معقول قدم اٹھایا ہے اور جو معنی اپنی طرف سے پیش کئے ہیں وہ قرآن مجید کی صحیح ترجمانی کرتے ہیں۔ اسی طریق پر سارے قرآن کے نہ سہی خاص خاص الفاظ کے معانی تلاش کر لئے جائیں تو آئندہ کے لئے راستہ تیار ہو جاتا ہے اور یہ کام کسی تنہا دماغ کے بس کی بات نہیں۔ مفکرین کی ایک جماعت ہو جو قرآن کے اندر غوطے لگا کر ان موتیوں کو برآمد کرے۔

جواب

میں نے محترم عرشی صاحب کا یہ خط اس لئے شائع کیا ہے کہ اس میں انہوں نے جس ضرورت کی طرف توجہ دلائی ہے وہ فی الواقعہ بڑی اہم ہے اور اس قابل کہ ملک کا سوچنے والا طبقہ اس پر غور و فکر کرے۔

میں عمر بھر ان اسباب وعلل پر غور کرتا رہا جن کی وجہ سے مسلمان اس سرچشمۂ حیات (یعنی قرآن کریم) سے دور ہوتے گئے۔ جس نے انہیں ایک زمانہ میں زندگی اور اس کی تمام سعادتوں سے نوازا تھا مجھے منجملہ دیگر اسباب کے ایک سبب یہ بھی نظر آیا۔ (اور یہ سبب بڑا بنیادی تھا) کہ ہمارے قرآن کے الفاظ کا جو مفہوم مروج ہے وہ بیشتر غیر قرآنی ہے اس کے لئے عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہم چونکہ قرآن کو ترجموں کے ذریعے سمجھتے ہیں، اس لئے اس کی اصل سے ناواقف رہ جاتے ہیں۔ لہذا قرآن سمجھنے کے لئے عربی جاننا نہایت ضروری ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن عربی زبان میں ہے اور جب تک ہم عربی نہ جانیں قرآن کو کیسے سمجھ سکتے ہیں؟ لیکن اس سے اس مشکل کا حل نہیں ہوتا جس کی طرف میں نے اشارہ کیا ہے۔ پہلی چیز تو یہ کہ جن حضرات نے قرآن کے ترجمے کئے ہیں وہ تو عربی جانتے تھے۔ اگر عربی جاننے سے صحیح قرآن سمجھ میں آجاتا تو ان کے ترجموں سے بھی قرآن

سمجھ میں آجانا چاہیئے تھا۔ تمام تر نہیں تو کم از کم قریب قریب ۔ دوسری چیز یہ (اور یہ پہلی سے بھی زیادہ اہم ہے) کہ مسلمانانِ عالم کا بیشتر حصّہ ایسا ہے جس کی مادری زبان عربی ہے ۔ ان کے لئے صحیح قرآن سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہونی چاہیئے ۔ لیکن یہ واقعہ ہے کہ وہ بھی قریب قریب اسی قسم کا قرآن سمجھتے ہیں ۔ جس قسم کا قرآن ہمارے ہاں ترجموں سے سمجھا جاتا ہے ۔ آپ عربی ممالک (یعنی عربی بولنے والے مصنفین) کی مذہبی کتابیں اٹھا کر دیکھئے ۔ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے ان میں اور اپنے ہاں کی مذہبی کتابوں میں کوئی فرق نہیں آئے گا ۔ مجھے ایک عرب ادیب کو قریب سے دیکھنے کا اتفاق ہوا ۔ ادب کا امام ۔ زبان پر اس قدر عبور کہ ایک ایک لفظ کی بیسیوں سندات مستحضر۔ ایسا نظر آتا تھا کہ اسے بڑے بڑے عربی لغت ، شعراء کے دواوین اور کتب محاضرات حفظ یاد ہیں مرادفات کے معانی میں ایسا لطیف فرق بتاتا ہے کہ سن کر لطف آجاتا تھا ۔ لیکن میری حیرت کی انتہا نہ رہتی جب میں دیکھتا کہ یونہی قرآن کی کوئی آیت سامنے آتی وہ وہی مفہوم بیان کرتا جو ہمارے مکتبوں پڑھایا جاتا ہے ۔ اور جس میں قرآن کہیں نام کو نہیں ہوتا ۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ ان کے ہاں

قرآن کا مروّجہ مفہوم

بھی قرآن کو انہی تفاسیر کے ذریعے سمجھا جاتا ہے ، جو عجم زدہ ذہنیتوں کی پیداوار ہیں اور اس ماحول کی تخلیق جس میں مسلمان قرآن سے دور جا چکا تھا ۔ مختصر الفاظ میں یوں سمجھئے کہ ہمارے ہاں قرآن کا ایک خاص مفہوم متعین ہو چکا ہے ۔ اور عرب ہوں یا غیر عرب ہر جگہ وہی متعین مفہوم رائج ہے ۔ لہٰذا قرآن سے بُعد کا اصلی سبب عربی نہ جاننا نہیں ۔ اس کا سبب وہ مصطلحہ مفہوم ہے جو ہمارے ہاں ایک مدت سے رائج چلا آرہا ہے اور یہ مفہوم عجمی ہے ، قرآنی نہیں ۔ ہم قرآن الفاظ کے معانی انہی اصطلاحات کی رُو سے سمجھنے کے عادی ہو چکے ہیں ۔ بلکہ یوں کہیئے کہ ہماری عربی وہ عربی ہی نہیں رہی جو زمانہ نزول قرآن میں تھی ۔ اس کے الفاظ تو بے شک وہی ہیں ، لیکن ان الفاظ کا مفہوم عجمی تصورات کا پیدا کردہ ہے ۔ اور یہی مفہوم عرب اور عجم ہر جگہ رائج ہے ۔ اس لئے قرآن کا صحیح مفہوم نہ عربی جاننے والے سمجھتے ہیں اور نہ وہ جو عربی نہیں جانتے اور قرآن کو ترجموں سے سمجھتے ہیں ۔

جب قرآن نازل ہوا تو ان اصطلاحات میں سے کسی کا بھی وجود نہ تھا ۔ جو بعد میں فقہ ، روایات ، تصوف ، کلام وغیرہ کی رو سے پیدا ہو گئیں اور آہستہ آہستہ دین کا جزو بنتی گئیں ۔

اگر ان اصطلاحات سے مقصود وقتی مسائل کا حل ہوتا (اور ان کا دائرۂ عمل وہیں تک محدود رہتا) تو اس میں کچھ مضائقہ نہ تھا لیکن مصیبت یہ ہوگئی کہ ان چیزوں کو دین کا مستقل اور غیر متبدل جزو سمجھ لیا گیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ خود قرآن بھی انہی کی روشنی میں سمجھا جانے لگا۔ اور رفتہ رفتہ یہ ہوا یہ کہ بجائے اس کے کہ قرآن متن اور اصل رہتا اور یہ چیزیں اس کی شرح اور جزئیات سمجھی جاتیں، یہ چیزیں اصل اور متن بن گئیں اور قرآن ان کا شارح ہو کر رہ گیا۔ اب قرآن کا سارا مفہوم انہی (بعد کے پیدا شدہ) تصورات کی تشریح ہے اور قرآن کا یہی مفہوم ہر جگہ پڑھایا اور سمجھایا جاتا ہے۔ خواہ عرب ہو یا عجم۔

عربی مبین

قرآن بار بار کہتا ہے کہ وہ "عربی مبین" میں نازل ہوا ہے۔ یعنی واضح اور سادہ زبان میں جو اس وقت عام طور پر بولی جاتی تھی۔ اس زمانہ کے عربوں کی معاشرت بالکل سادہ تھی۔ وہ عجم کے تکلفات اور حضارت کے اثرات سے غیر متاثر تھے۔ صحرا کی کھلی فضا۔ کھجوروں کے خوشے متاعِ حیات، چند پالتو مویشی، ایک آدھ خیمہ، دن میں کوئی نخلستان منزل گاہ۔ راتوں کے ستارے۔ دلیل راہ۔ یہی چیزیں ان کی نگاہوں کے سامنے رہتی تھیں اور انہی کے گرد ان کی زبان کے مشتقات و مصادر گھومتے تھے۔ آپ ان مشتقات کو دیکھئے۔ ان کا بیشتر حصہ اونٹ، گھوڑے، بکریاں، خیمے، نخلستان، کھجوریں، تلوار، صحرا، چاند، سورج، ستاروں کے محسوس مشاہدات پر مبنی ہوگا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی اس زبان میں وسعت بھی ایسی تھی کہ انہی مشتقات سے نکلے ہوئے الفاظ ایک دنیا کو محیط ہو جاتے تھے۔ ان کی زبان کی امکانی وسعتوں کا اندازہ اس ایک مثال سے لگائیے کہ مشہور معتزلی امام واصل بن عطاء حرف را (ر) کو ادا نہیں کر سکتا تھا۔ خطابت اس زمانے میں سب سے بڑا ہتھیار تھا اور اس کی سحر کاریاں فصاحت اور بلاغت کی رہین کرم تھیں۔ ایک نئے فرقے کے امام کی حیثیت سے واصل کو عمر بھر تقریریں کرنی پڑیں۔ مناظروں اور مباحثوں میں سرگرم تکلم رہنا پڑا۔ لیکن اس نے کہیں کسی جگہ کوئی ایسا لفظ استعمال نہیں کیا جس میں (ر) آتا ہو۔ اندازہ لگائیے کہ اس کے پاس کس قدر مرادفات کا ذخیرہ تھا۔ اور پھر غور فرمائیے کہ وہ زبان جس کے الفاظ کے سرمایہ کا یہ عالم تھا کہ کس قدر وسعت بداماں تھی۔

بہرحال جب قرآن نازل ہوا تو اس کے اوّلین مخاطبین نے اسے بغیر کسی دقّت کے سمجھ لیا۔

اس کے لئے نہ انہیں کسی تفسیر کی ضرورت تھی۔ نہ ان اٹھارہ علوم کی جنہیں اب قرآن سمجھنے کے لئے لازمی شرط قرار دیا جاتا ہے۔ یہ اس لئے کہ وہ الفاظ جن میں قرآن نازل ہوا تھا۔ ان کی روزمرہ کی گفتگو میں استعمال ہوتے تھے۔ لہذا وہ جانتے تھے کہ ان کا مفہوم کیا ہے۔ تغیرِ احوال و کوائف سے زبان

بعد کے تغیّرات

پر کیا کیا اثرات پڑتے ہیں۔ اس سے علم اللسان کا ہر طالب علم واقف ہے۔ عربی زبان ان تغیرات سے خاص طور پر متاثر ہوئی۔ اس کے لئے ہمارا علمی دور بالخصوص عباسیوں کا زمانہ تھا۔ جب عربی ذہنیت سمٹ کر پیچھے ہٹ چکی تھی اور عجمی اثرات پورے کے پورے اسلامی معاشرے پر چھا چکے تھے۔ ان عجمیوں نے زبان تو عربی اختیار کی، لیکن تصوّرات اپنے ہی رکھے۔ اس طرح عربی زبان عجمی تصورات کے اظہار کا ذریعہ (MEDIUM) بن گئی۔ یہی وہ دور ہے جس میں ہماری تصنیفات کا آغاز ہوا۔ لہذا ہماری ان کتابوں کی زبان تو عربی تھی۔ لیکن ان عربی الفاظ کا مفہوم وہ نہ تھا۔ جو زمانہ نزولِ قرآن میں عربوں کے ذہنوں میں ہوا کرتا تھا۔ یہ تو پھر بھی بعد کی بات ہے۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب غیر عربوں سے خلا ملا کی ابتدا ہوئی تو آپؓ مدینہ کے رہنے والوں سے کہا کرتے تھے کہ قرآن سمجھنا چاہتے ہو تو صحرا کے بدوؤں میں جا کر چند دن گزارا کرو۔ کیونکہ قرآن جس زبان میں نازل ہوا ہے وہ زبان ان کے ہاں غیر متاثر شکل میں باقی ہے۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ جس عربی زبان میں ہمارے عجمی آئمہ مذہب نے کتب تفاسیر وغیرہ لکھی ہیں، وہ زبان معنوی اعتبار سے قرآن کی زبان سے کس قدر قریب ہو سکتی ہے؟ یہی وہ زبان ہے جس میں ہمیں قرآن سمجھایا جاتا ہے۔ لہذا جو کچھ سمجھایا جاتا ہے وہ درحقیقت قرآن نہیں ہوتا بلکہ وہ غیر قرآنی مفہوم ہوتا ہے جسے قرآنی الفاظ میں سمو دیا گیا۔

اندریں حالات قرآن سمجھنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ اس کے بعد کے مفہوم سے صرف نظر کر کے دیکھا جائے کہ جس زمانے میں قرآن نازل ہوا تھا اس وقت ان الفاظ کے معانی کیا تھے جو قرآن میں آئے ہیں۔ ہماری خوش بختی ہے کہ ہمارے ہاں اتنا ذخیرہ موجود ہے جس سے ان کے الفاظ کے وہ معانی متعین کئے جا سکتے ہیں جو اس زمانے کے سیدھے سادے عربوں کے ہاں رائج تھے۔ یہ ذخیرہ مختلف مقامات میں بکھرا ہوا ہے، لیکن اسے یکجا کیا جا سکتا ہے۔ فلہذا سب سے پہلا کام کرنے کا یہ ہے کہ ایک ایسا لغت مرتب کر دیا جائے جس میں یہ بتایا جائے کہ قرآن کے الفاظ کے اصلی مانے کیا ہیں

قرآن کا لغت

اور زمانہ نزول قرآن میں یہ الفاظ کن معانی میں استعمال ہوتے تھے (اگر ہو سکے تو یہ بھی بتایا جائے کہ بعد میں ان الفاظ کے معانی میں کیا تغیرات واقع ہوئے۔ لیکن اگر ایسا نہ بھی کیا جا سکے تو چنداں مضائقہ نہیں) میری نگاہ سے قرآن کا کوئی لغت ایسا نہیں گزرا جس میں خصوصیت سے اس انداز سے قرآنی مفردات کے معانی متعین کئے گئے ہوں۔ متاخرین میں علامہ حمید الدین فراہیؒ نے اس ضمن میں کوشش شروع کی تھی۔ لیکن ان کی عمر نے وفا نہ کی اور یوں سمجھئے کہ وہ اس عظیم کام کو چھوڑ کر چلے گئے۔ انہیں عہد جاہلیہ کی زبان پر اتنا عبور اور قرآن کے ساتھ ایسا شغف تھا کہ وہ اگر کچھ مدت اور زندہ رہتے تو اس باب میں مفید کام کر جاتے۔

اس لغت کے مرتب کر لینے کے بعد دوسرا مرحلہ قرآنی الفاظ کے مفہوم کو ہمارے دور کی علمی سطح کے مطابق سمجھانا ہوگا۔ اس کے لئے کرنا یہ ہوگا کہ ہر لفظ کی اس روح کو سامنے رکھا جائے، جو اس کی اصل کی رو سے بے نقاب ہوئی ہے اور پھر دیکھا جائے کہ اس روح کو موجودہ زمانے کے کن الفاظ میں ٹھیک ٹھیک ادا کیا جا سکتا ہے۔ خواہ ایک لفظ میں، خواہ ایک فقرہ میں اور خواہ ایک مضمون میں۔ اس کے بعد یہ دیکھ لیا جائے کہ قرآن میں وہ لفظ کس کس جگہ استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ قرآن تصریف آیات سے اپنے معانی آپ سمجھاتا ہے۔ اس طرح قرآن کا صحیح صحیح مفہوم ہمارے سامنے آ جائے گا۔ میں نے اس طریق پر خود عمل کیا اور اس کے ایسے درخشندہ نتائج سامنے آئے ہیں جن سے روح وجد کرنے لگ جاتی ہے اور میں حیران رہ جاتا ہوں کہ اگر قرآنی الفاظ کی اصل کو سامنے رکھ لیا جائے تو پھر قرآن کس طرح اپنے مشکل سے مشکل مقامات کو بھی نہایت آسانی سے سمجھاتا چلا جاتا ہے۔

یہ لغت اگر ایک مرتبہ صحیح طور پر مرتب[1] ہو گیا، تو ہمیشہ کے لئے کام آئے گا۔ لیکن قرآن کا جو مفہوم اس لغت کی روشنی میں متعین کیا جائے گا۔ وہ ہر آنے والے زمانے کی علمی سطح کے ساتھ ساتھ (IMPROVE) ہوتا جائے گا۔

---

[1] للہ الحمد کہ پرویز صاحب کا یہ لغت مرتب ہو کر چار جلدوں میں شائع ہو چکا ہے اور مفہوم القرآن بھی شائع ہو چکا ہے۔ (۱۹۸۴ء)

میں محترمی عرشی صاحب سے حرف بحرف متفق ہوں کہ یہ کام کسی فرد کا نہیں۔ جماعت کے کرنے کا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جماعت ہے کہاں جو اس کام کو ہاتھ میں لے، ہمارے ہاں مذہب کے نام پر لاکھوں روپے سالانہ خرچ ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں قرآن کا کوئی حصہ نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے دلوں میں یہ بٹھا دیا گیا ہے کہ قرآن کا مصرف صرف اس کے الفاظ کی تلاوت ہے جس سے "ثواب" ہوتا ہے۔ جہاں تک مذہب کا تعلق ہے وہ قرآن سے باہر ہے۔ لہٰذا مذہب کے نام پر جو کچھ خرچ ہوتا ہے، وہ ان چیزوں کے لئے وقف ہوتا ہے جو خارج از قرآن ہیں۔ اگر کہیں سے رجعت الی القرآن کی آواز اٹھتی ہے تو مسلمانوں کو اس کی آواز سے اس طرح ڈرا دیا جاتا ہے گویا اس آواز کے کان میں پڑ جانے سے ان کی عاقبت خراب ہو جائے گی۔ اس لئے اگر مسلمان قرآن کی طرف آ جائیں تو ان کی پیشوائیت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اندریں حالات وہ وسائل کہاں سے میسر آئیں جو اس قسم کا قرآنی لٹریچر مرتب کرنے کے لئے ضروری ہیں جن کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ میں جانتا ہوں کہ ہم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو اس کام کے اہل ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ وہ جب اپنی زندگی اس کام کے لئے وقف کر دیں تو ان کی ضروریات زندگی کا سامان کہاں سے آئے گا؟ یہ انگلستان نہیں کہ ایک لارڈ نارتھمبرلینڈ عربی لغت مرتب کرانے کے لئے اپنی ریاست وقف کر دے گا[1]۔ ان حالات کے پیش نظر یہاں قرآن کے متعلق کسی کام کا ارادہ کرنے والوں کو یہ سوچ لینا چاہیئے کہ انہیں جو کچھ کرنا ہوگا۔ تنہا اپنے بھروسے پر کرنا ہو گا۔ جس نہج پر معارف القرآن لکھی گئی ہے اس کا خاکہ علامہ اقبالؒ کے ذہن کا رہین منت ہے۔

علامہ اقبالؒ کی ہدایت

میں نے اس خاکہ کو ایک مفصل خط کی صورت میں ملک کے ارباب علم و قلم کو بھیجا، اور ان سے درخواست کی کہ اگر وہ اس قسم کی کتاب کی افادیت سے متفق ہیں تو وہ ایسی کتاب تصنیف کریں۔ ان تمام حضرات نے کتاب کے خاکے کی بہت تعریف کی۔ لیکن ہر ایک نے یہ لکھ کر معذرت چاہی کہ ایسا کام افراد کا نہیں۔ جماعتوں کے کرنے کا ہے۔ میں نے حضرت علامہؒ کو اس سے مطلع کیا اور لکھا کہ اس کام کے لئے کوئی

---

[1] اس لارڈ نے تنہا اپنے خرچ سے (LANE'S LEXICON) مرتب کرایا تھا۔ جس کی تکمیل میں بیس برس صرف ہوئے تھے۔

آدمی تیار نہیں ہوتا۔ انہوں نے اسی خط کے حاشیئے پر لکھ کر خط واپس کر دیا کہ اگر کچھ وقت کے لئے تم ہی آدمی بن جاؤ تو اس میں کیا حرج ہے؟ یہ بات میرے وہم وگمان میں بھی نہ تھی کہ اس قسم کا قرآنی انسائیکلو پیڈیا لکھنے کے لئے وہ میری طرف اشارہ کریں گے۔ میں نے جب اپنی بے بضاعتی اور کم مائیگی کا اظہار کرتے ہوئے معذرت چاہی تو انہوں نے اس کے جواب میں ایک ایسی بات لکھی جس نے میری زندگی کا رُخ بدل دیا۔ انھوں نے تحریر فرمایا کہ تم مسافت کی لمبائی اور راستہ کی تاریکی سے ڈرتے ہوئے قدم نہیں اٹھاتے۔ کیونکہ تم سمجھتے ہو کہ تمہارے پاس جو چھوٹا سا مٹی کا دیا ہے وہ صرف دو چار قدم تک راستہ روشن کر سکتا ہے۔ تمہارا یہ خوف اسی وقت تک ہے جب تک تم اس دیئے کو لے کر ایک جگہ کھڑے ہو۔ تم اسے لے کر۔۔۔۔۔۔۔ چل پڑو اور پھر دیکھو کہ یہی چھوٹا سا دیا کس طرح سینکڑوں میل کا راستہ روشن کئے چلا جاتا ہے۔ نقص دیئے کا نہیں تمہارا اپنا ہے۔ تمہارے چلنے کی دیر ہے۔ یہ روشنی تم سے چار قدم آگے آگے ہو گی۔ اور جہاں تک چلتے جاؤ گے آگے ہی رہے گی۔

میں نے بلا مزید استفسار و تامل اس ننھے سے دیئے کو ہاتھوں میں لے کر چلنا شروع کر دیا۔ اور تجربے نے بتا دیا کہ یہ دیا فی الواقعہ میرے راستہ کو مسلسل روشن کرتا چلا گیا۔ معارف القرآن کی چار جلدیں (بتوفیقِ خداوندی) شائع ہو چکی ہیں اور پانچویں زیر ترتیب ہے۔ میں جب اپنی قطع کردہ راہ پر نگۂ بازگشت ڈالتا ہوں تو حیران رہ جاتا ہوں کہ یہ ساری مسافت میں نے ہی طے کی ہے؟ اگر اللہ نے مجھے اس سلسلہ کی تکمیل کے لئے مہلت دی اور توفیق عطا کر دی تو میں سمجھوں گا کہ میری زندگی رائیگاں نہیں گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ میری گوناگوں مصروفیات اور خرابیٔ صحت کے پیشِ نظر میرے لئے معارف القرآن کی تکمیل کا کام ہی کچھ کم نہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی میں یہ محسوس کر رہا ہوں کہ قرآن کا ایک ایسا لغت مرتب کرنا جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے اور اس کے مطابق قرآنی مفہوم کا تعین کرنا ازبس ضروری ہے۔ اگر یہ ہو گیا تو جو موانع اس وقت قرآن سمجھنے کی راہ میں سنگِ گراں بن کر حائل ہیں وہ دور ہو جائیں گے اور اس طرح مسلمان ایک مرتبہ پھر اپنے سرچشمۂ حیات (قرآن) کے نزدیک آ جائے گا۔ جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے میں جانتا ہوں کہ یہ کام ایک جماعت ہی کے کرنے کا ہے۔ لیکن میں جماعتوں کے انتظار میں ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھے رہنے کا قائل نہیں ہوں۔ اس لئے میں نے توفیقِ ایزدی کے بھروسے پر اس کام کو بھی از خود ہی شروع کر دیا ہے اور یہ سلسلہ بھی معارف القرآن کے

ساتھ ساتھ جاری ہے ۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ اس باب میں مَیں کس حد تک کامیاب ہو سکوں گا۔ نہ ہی میں اس چیز کو آغازِ سفر کے وقت دل میں آنے دیا کرتا ہوں ۔ جب تک مجھ میں ہمت ہوگی اور زندگی وفا کرے گی ۔ میں ان کاموں کو کرتا جاؤں گا ۔ جس مقام پر ہمت یا زندگی ختم ہو جائے گی ۔ وہیں یہ بھی رُک جائیں گے ۔ اگر اس دوران میں اللہ کے بندوں کو خیال آگیا اور اس طرح رفقائے کار کی کوئی جماعت پیدا ہو گئی، تو مَیں یہ سب کچھ ان کے سپرد کر کے بطور ایک رفیق کار ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا۔ اگر ایسا نہ ہوا تو میری یہی متاعِ حیات شاید کسی بعد میں آنے والے کے کام آ جائے گی مجھے اس کا احساس ہے کہ میں جو کچھ کرتا ہوں اس میں غلطیوں کا بھی امکان ہے ۔ اور خامیوں کا بھی ۔ لیکن میں نے کام کی ابتدا کر دی ہے ۔ میرے دوسرے رفقائے کار (اگر مجھے میسر آ گئے تو) یا بعد میں آنے والے راہرو میری غلطیوں کو درست کر دیں گے اور خامیوں کو پورا ۔ اگر یہ سب کچھ اور کسی کام نہ بھی آیا تو کم از کم میرے بعد انہی راستوں پر چلنے والے راہروؤں کو میرے نقوشِ قدم سے اتنی تسلّی تو ہو جائے گی کہ اس راستہ سے پہلے بھی کوئی مسافر گذرا ہے۔ اس لئے یہ راہ غیر مانوس (UNFREQUENTED) نہیں ۔ اتنی سی تسلّی بظاہر کچھ قابلِ قدر دکھائی نہیں دیتی ۔ لیکن میں اس کی قیمت پہچانتا ہوں ۔ اس لئے کہ مجھے یہ بھی میسّر نہیں آ سکی ۔

لیکن اس سے یہ مطلب نہیں کہ میں رفقائے کار کی تلاش یا فراہمی سے بے فکر ہوں ۔ میں جانتا ہوں کہ اس مقصد میں کامیابی کا راز "تزمیل" میں ہے مجھے "زمیل" تو مل رہے ہیں ۔ وسائلِ سفر نہیں مل رہے ۔ یہ وہ مقام ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے قرآن نے کہا تھا کہ جب وہ لوگ جن کے دل شوقِ شہادت سے لبریز ہیں ۔ لیکن ان کے پاس جہاد میں شریک ہونے کے لئے سواری نہ ہے نہ روپیہ کہ جس سے سواری کا جانور خرید سکیں ۔ تمہارے پاس (اے رسولؐ) بایں مقصد آتے ہیں کہ ان کے لئے سواری کا بندوبست کر دیا جائے اور سواری کا انتظام تمہارے پاس بھی نہیں ہوتا تو ان لوگوں کی حالت یہ ہوتی ہے کہ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ($\frac{9}{92}$) وہ اس طرح واپس جاتے ہیں کہ ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور اس حسرت سے غم آلود کہ ان کے پاس اتنا بھی نہیں جس سے جہاد کا سامان بھی بہم پہنچا لیا جائے ۔

لیکن ہمیں ان نامساعد حالات سے گھبرانا نہیں چاہیئے کہ ہر تاریک رات ایک نورانی صبح

کی تمہید ہوتی ہے۔ واللہ المستعان علیہ توکلت والیہ انیب۔ (سنہ ۱۹۵۳ء)

طلوع اسلام

جیسا کہ حاشیہ میں لکھا جا چکا ہے پرویز صاحب نے یہ لغت بھی مکمل کر دیا اور مفہوم القرآن بھی۔ اور یہ دونوں شائع ہو چکے ہیں۔

(سنہ ۱۹۷۶ء)

۱۱- ناسخ و منسوخ

کراچی سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں:-

آیۂ رجم سے متعلق ایک صاحب سے ذکر آیا تو انھوں نے فرمایا کہ قرآن کی سینکڑوں آیات ایسی ہیں جو منسوخ ہیں۔ یعنی وہ قرآن میں موجود ہیں لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اس لئے اگر ایک آیت ایسی بھی ہے جس کا حکم موجود ہے لیکن آیت کی تلاوت منسوخ ہو چکی ہے۔ تو اس میں کیا قباحت ہے! ان سے کہا کہ میں نے قرآن میں کہیں نہیں پڑھا کہ فلاں آیت فلاں سے منسوخ کر دی گئی ہے اور فلاں آیت فلاں سے۔ تو انہوں نے فرمایا کہ نہیں قرآن میں اس طرح نہیں لکھا۔ لیکن ہمارے علمائے کرام جانتے ہیں کہ کون سی آیت کس آیت سے منسوخ ہو چکی ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ یہ قرآن کس قسم کا ہے جس میں اس طرح ناسخ و منسوخ احکام ہیں۔ حالانکہ اس طرح تو کسی انسان کے بنائے ہوئے قانون میں بھی نہیں ہوتا تو انہوں نے فرمایا کہ جب خود قرآن میں یہ موجود ہے۔ مَا نَنسَخْ مِنْ اٰیَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَیْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا۔ (۲/۱۰۶) یعنی "جو آیت بھی ہم منسوخ کرتے ہیں۔ یا بھلا دیتے ہیں۔ تو اس سے بہتر یا اس جیسی

(آیت) اور لے آتے ہیں"۔ تو پھر آپ اس کا انکار کس طرح کر سکتے ہیں۔
کیا آپ تفصیلاً تحریر فرمائیں گے کہ یہ کیا معمہ ہے؟

جواب :-

ہمارے موجودہ "مذہب" کی کون سی بات معمہ نہیں جو آپ کو اس معمہ پر اس قدر اچنبھا ہوا۔ ایں خانہ ہمہ آفتاب است۔ قرآن میں ناسخ و منسوخ کا مسئلہ ان صاحب کا پیدا کردہ نہیں بلکہ اس وقت سے چلا آ رہا ہے۔ جب سے روایات وجود میں آئیں، اور اس وقت تک چلا جائے گا جب تک مسلمانوں کی یہ حالت رہے گی کہ واذا قیل لھم اتبعوا ما انزل اللہ قالوا بل نتبع ما الفینا علیہ اباء نا (۲:۱۷۰) "جب ان سے کہا جاتا ہے کہ قرآن کا اتباع کرو تو کہتے ہیں کہ نہیں ہم تو اسی مسلک کا اتباع کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا" اندھی تقلید اور قرآنی بصیرت دو متضاد چیزیں ہیں جو ایک جگہ کبھی اکٹھی نہیں ہو سکتیں۔ اسی مسلک تقلید کی رو سے مسلمانوں نے قرآن کے بیشتر حصہ کو منسوخ قرار دے رکھا ہے۔ اور یہ نسخ صرف قرآن کی دوسری آیات ہی سے نہیں ہوتا بلکہ قرآن کی آیتیں احادیث سے بھی منسوخ سمجھی جاتی ہیں۔

نسخ کے ثبوت میں قرآن کی وہی آیت پیش کی جاتی ہے جو اوپر درج کی جا چکی ہے۔ اگر آپ اس آیت کا صحیح مفہوم سامنے لائیں، تو اس کے بعد آپ فی الواقع حیران ہوں گے کہ یہ آیت اس قسم کے عقیدہ کی دلیل کس طرح بن سکتی ہے؟ لیکن قرآن کے ساتھ تو مسلمانوں نے یہ کیا کہ پہلے غیر قرآنی عقائد وضع کیے اور پھر ان کی سند کے لئے قرآن کی کھینچا تانی کی گئی۔

بات بالکل واضح تھی۔ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ نبی اکرمؐ سے پہلے تمام انبیاء کرامؑ خدا کا پیغام لاتے رہے۔ مخالفین کا اعتراض تھا کہ اگر قرآن کی تعلیم بھی وہی ہے جو پہلے انبیاء کرامؑ کی تھی تو پھر قرآن میں ان کتابوں سے مختلف احکام کیوں ہیں جنہیں وہ آسمانی کتابیں کہتے تھے۔ قرآن نے کہا کہ سابقہ ادوار میں وحی کا اسلوب یہ رہا ہے کہ جو احکام وقتی طور پر نافذ العمل رہنے کے لئے دیئے جاتے تھے انہیں بعد میں آنے والے رسول کی وحی منسوخ کر دیتی تھی۔ اور ان کی جگہ بہتر احکام (یعنی ایسے احکام جو زمانے کے بدلے ہوئے تقاضوں کو پورا کر سکیں) دیئے جاتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ سابقہ انبیاء کرامؑ کی وحی اپنی اصلی شکل میں موجود نہیں

رہتی تھی۔ ان میں تحریف و الحاق بھی ہوتا تھا۔ اور ان کا بیشتر حصہ حوادثِ ارضی و سماوی کی وجہ سے یا خود انسانی وسیسہ کاریوں کے باعث ذہنوں سے فراموش ہو جاتا تھا۔ بعد میں آنے والا رسولؑ اس فراموش شدہ حصہ کو من جانب اللہ حاصل کر کے پھر لوگوں کو دے جاتا تھا۔ قرآن چونکہ سب سے آخر میں آنے والی کتاب تھی اس لئے اس نے ان تمام سابقہ احکام کو جو وقتی طور پر نافذ العمل ہونے کے لئے دیئے گئے تھے منسوخ کر دیا۔ اور ان کی جگہ ایسے اصولی احکام دے دیئے۔ جو ہمیشہ کے لئے رہنے والے تھے۔ سابقہ انبیاء کرامؑ کی تعلیم کا وہ حصہ جو فراموش کر دیا گیا تھا، لیکن جس کا باقی رکھا جانا مقصود تھا اسے قرآن دوبارہ لے آیا۔ اب اہلِ کتاب کی یہ حالت تھی کہ وہ قرآن میں بعض باتیں ایسی پاتے تھے جو ان کے احکام کے خلاف جاتی تھیں۔ (یعنی جنہیں قرآن نے منسوخ کر دیا تھا۔ اور ان کی جگہ دوسرے احکام نے لے لی تھی) یا ایسی باتیں جن کا ان کتابوں میں کہیں ذکر نہ تھا جو ان کے پاس اس وقت موجود تھیں (یعنی وہ حصہ جو ان کے ہاں فراموش ہو چکا تھا اور جسے قرآن دوبارہ لایا) چنانچہ وہ اس کیفیتِ حال کو بطورِ اعتراض پیش کرتے تھے کہ اگر قرآن اسی خدا کی طرف سے ہے جس خدا نے سابقہ کتابیں نازل کی تھیں تو پھر قرآن بعینہٖ اُن کتابوں جیسا کیوں نہیں۔ ان کے جواب میں قرآن نے بتایا کہ وحی کا اسلوب یہ ہے کہ:-

مَا نَنسَخْ مِنْ آيَةٍ أَوْ نُنسِهَا نَأْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا أَوْ مِثْلِهَا۔ کہ ہم جن سابقہ احکام منسوخ کر دیتے ہیں ان کی جگہ جدید نبی کی وساطت سے ان سے بہتر احکام بھیج دیتے ہیں۔ اور سابقہ تعلیم میں سے جو حصہ فراموش کر دیا جاتا ہے اس کی جگہ اس کی مثل لے آتے ہیں۔ یہی اسلوب قرآن میں کار فرما ہے۔ چنانچہ سورۂ نحل میں منکرینِ قرآن کا یہ اعتراض ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے۔

وَإِذَا بَدَّلْنَا آيَةً مَّكَانَ آيَةٍ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يُنَزِّلُ قَالُوا إِنَّمَا أَنتَ مُفْتَرٍ بَلْ أَكْثَرُهُمْ لَا يَعْلَمُونَ۔ (۱۶/۱۰۱)

جب ہم ایک پیغام کی جگہ دوسرا پیغام بھیجتے ہیں اور خدا خوب جانتا ہے کہ وہ کیا نازل کر رہا ہے۔ تو یہ کہتے ہیں کہ (اے رسول) تو یہ کچھ اپنی طرف سے کہتا ہے (کیونکہ یہ ان کتابوں سے الگ ہے جو ہمارے پاس ہیں) لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ جانتے نہیں کہ (وحی کا اسلوب کیا ہے)

دیکھئے! بات کس قدر واضح ہے۔

یہ تو ہوا پیغاماتِ سابقہ کی جگہ دوسرے پیغامات لانے کی بابت۔ یعنی تنسیخ احکاماتِ سابقہ۔
اب لیجئے آیت زیرِ نظر کا دوسرا حصہ۔ یعنی اوننسھا (یعنی جو پیغامات فراموش کر دیئے جاتے ہیں
اس کے متعلق خود قرآن شاہد ہے کہ یہود و نصاریٰ نے اپنی کتابوں کا کتنا بڑا حصہ فراموش کر رکھا تھا۔
سورۂ المائدہ میں پہلے یہود کے متعلق ہے کہ یحرفون الکلم عن مواضعہ ونسوا
حظا مما ذکروا بہ (۵/۱۳) یعنی وہ ان الفاظ کو ان کی جگہ سے پھیر دیتے ہیں۔ (تحریف) اور
جو کچھ انہیں ذکر کے لئے دیا گیا تھا، اس کا ایک بڑا حصہ انہوں نے فراموش کر دیا ہے۔ یہی الفاظ
اس سے اگلی آیت میں نصاریٰ سے متعلق کہے گئے ہیں۔ یہ لوگ پیغاماتِ خداوندی میں اس طرح تحریف و
الحاق کرتے۔ لیکن اللہ تعالیٰ پھر ایک رسولؐ بھیج کر ان کی تحریف و الحاق کو چھانٹ پھٹک کر الگ کر دیتا۔
اور اپنے اصلی پیغام کو پھر اس کی جگہ رکھ دیتا ہے۔ سورۂ حج میں اسی حقیقت کو ان الفاظ میں بیان
کیا گیا ہے۔ جہاں فرمایا۔

وما ارسلنا من قبلك من رسول ولا نبی الا اذا تمنیٰ القی
الشیطٰن فی امنیتہ فینسخ اللہ ما یلقی الشیطٰن ثم یحکم
اللہ اٰیتہ واللہ علیم حکیم[1]۔ (۲۲/۵۲)

اور ہم نے تجھ سے پہلے کوئی نبیؐ اور رسولؐ نہیں بھیجا۔ جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ
گذرا ہو کہ اس کے تلاوت کردہ (پیغامِ خداوندی) میں شیطان نے اپنی طرف سے
کچھ نہ ملا دیا ہو (شیاطین یہ کرتے تھے) اللہ شیطان کی اس آمیزش کو (دوسرے
رسول کی بعثت سے) مٹا دیتا تھا۔ اور اپنے پیغام کو پھر محکم بنا دیتا تھا۔
اللہ علم والا۔ محکم پیغامات رکھنے والا ہے۔"

---

[1] ہمارے مفسرین نے اس آیۂ جلیلہ کی تفسیر میں اس قسم کی رنگ آمیزیاں کی ہیں اور حضور
نبی اکرمؐ کی طرف اس قسم کی لغو باتیں منسوب کی ہیں کہ جن کے تصور سے بھی روح کانپتی ہے اور ان سب
خرافات کا منبع روایات ہیں۔ اس سے زیادہ اور کیا کہا جائے کہ اللہ ہم سب پر رحم کرے۔

امید ہے کہ ان اشارات سے یہ حقیقت واضح ہوگئی ہوگی کہ "ما ننسخ من اٰیۃ" الخ کی آیت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اس مفہوم کو سامنے رکھئے اور پھر سوچئے کہ کیا اس عقیدہ کی کوئی اصل ہوسکتی ہے کہ قرآن کریم کی اپنی آیات دوسری آیات سے منسوخ ہیں اور بعض آیات ایسی ہیں جو قرآن میں نہیں ہیں۔ لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ یہی نہیں بلکہ یہ عقیدہ بھی کہ قرآن کی آیات روایات سے منسوخ ہیں۔ پھر یہ بھی سوچئے کہ اگر یہ عقیدہ رکھا جائے کہ قرآن کی بعض آیتیں دوسری آیات سے منسوخ ہوچکی ہیں تو اس سے قرآن بھیجنے والے خدا کے متعلق کیا تصور پیدا ہوتا ہے۔ لیکن مُلّا بے چارے کو اس سے کیا واسطہ کہ خدا کے متعلق کیا تصوّر پیدا ہوتا ہے، اور رسول اللہ کے متعلق کیا خیال قائم ہوتا ہے۔ اسے تو صرف اس سے غرض ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آرہا ہے۔ اس میں کہیں فرق نہ آجائے۔ خواہ وہ اپنی اصل کے اعتبار سے یہود کی مکذوبات ہوں یا نصاریٰ کی مفتریات۔ مجوس کی مخترعات ہوں یا صنادید عجم کی خرافات۔ ملّا کے نزدیک جو کچھ کتاب میں چھپا ہوا ہے، سند ہے۔ باقی رہا قرآن تو وہ مردوں کو ثواب پہنچانے کے لئے ہے یا اس لئے کہ:۔

از یٰسین او آساں بمیری

(۱۹۵۳ء)

۱۲- آیۂ رجم

قرآنِ کریم میں زنا کی سزا سو کوڑے مذکور ہیں۔ لونڈی اور غلام کے لئے اس سے نصف۔ لیکن شادی شدہ زانی اور زانیہ کے لئے رجم (سنگسار) کی سزا بتائی جاتی ہے۔ رجم کا نصف کس طرح سے ہوگا؟

جواب

قرآن کریم میں زنا کی سزا رجم (سنگسار) کہیں نہیں آئی۔ نہ شادی شدہ کے لئے۔ نہ غیر شادی شدہ کے لئے۔ یہ سزا یہودیوں کے ہاں رائج تھی۔ لیکن قرآن نے اسے تجویز نہیں کیا۔ ہمارے ہاں یہ سزا بعد کی

وضع کردہ ہے۔ اور اسے منسوب کیا جاتا ہے۔ حضور رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی طرف۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول اللہؐ (معاذ اللہ) قرآن کے احکام کے خلاف بھی فیصلے دیا کرتے تھے۔ کیا عرض کیا جائے کہ مسلمانوں نے اپنے دین میں کیا کیا کچھ داخل کر لیا ہے اور پھر ان چیزوں کو کس قدر مقدس بنا دیا گیا ہے۔

مزید وضاحت

ایک صاحب لکھتے ہیں :۔
نومبر کے طلوعِ اسلام میں آپ نے صحیح بخاری کی ایک روایت نقل کی ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں قرآن میں ایک آیت موجود تھی جس میں زانی کو سنگسار کرنے کا حکم تھا۔ اور اس کے بعد وہ آیت قرآن میں نہیں رہی۔ اسے پڑھ کر میرے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یہ بات تو بہت دور تک پہنچ گئی ہے۔ کیا اس موضوع پر ہماری تفسیر کی کتابوں میں کوئی بحث ہوئی ہے۔ اسے ذرا تفصیل سے لکھئے، مجھے تو اس دن سے نیند نہیں آتی۔ !

جواب :۔

اس روایت کو پڑھ کر آپ کی نیند کا اچاٹ ہو جانا ایک فطری امر ہے۔ ہر سعید روح پر یہی کیفیت گزرے گی۔ ابھی تو آپ نے صرف ایک روایت دیکھی ہے۔ اگر آپ کہیں روایات کی تمام کتابوں کو دیکھ لیں تو معلوم آپ پر کیا گزرے؟ اس موضوع پر ہماری کتب تفسیر میں لمبی چوڑی بحثیں موجود ہیں۔ اور انہوں نے بڑے شد و مد سے ثابت کیا ہے کہ واقعی قرآن کریم میں اس قسم کی آیت موجود تھی۔ اور وہ اب قرآن میں نہیں۔ مثلاً تفسیر ابن کثیر میں (جس کا شمار بلند پایہ تفاسیر میں ہوتا ہے۔) سورۂ نور کی آیت متعلقہ زنا کے ضمن میں حسب ذیل تصریحات موجود ہیں۔

"موطا مالک میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں حمد و ثنا کے بعد فرمایا کہ لوگو! اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا۔ اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اس کتاب اللہ میں رجم کرنے کے حکم کی آیت بھی تھی۔ جسے ہم نے تلاوت کیا۔ یاد کیا اور اس پر عمل بھی کیا۔ خود حضورؐ کے زمانے میں بھی رجم ہوا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ زمانہ گزرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خدا کے اس فریضہ کو جسے اللہ نے اپنی کتاب میں اتارا، چھوڑ کر مرجائیں۔ کتاب اللہ میں رجم

کا حکم مطلق حق ہے۔ اس پر جو زنا کرے اور ہو شادی شدہ خواہ مرد ہو یا عورت۔ جبکہ اس کے زنا
پر کوئی شرعی ثبوت یا حمل موجود ہو۔ یہ حدیث صحیحین میں اس سے بھی مسطول موجود ہے۔ مسند احمد میں
ہے کہ آپ نے اپنے خطبے میں فرمایا کہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم رجم یعنی سنگساری کا مسئلہ قرآن میں نہیں پاتے۔
قرآن میں صرف کوڑے مارنے کا حکم ہے۔ یاد رکھو خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا۔ اور
ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اگر مجھے یہ خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ قرآن میں جو نہ تھا عمرؓ
نے لکھ دیا۔ تو میں آیت رجم کو اسی طرح لکھ دیتا۔ جس طرح نازل ہوئی تھی۔ یہ حدیث نسائی شریف
میں بھی ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبے میں رجم کا ذکر کیا۔ اور فرمایا رجم ضروری ہے۔
وہ اللہ تعالیٰ کی حدوں میں سے ایک ہے۔ خود حضورؐ نے رجم کیا۔ اگر لوگوں کے اس کہنے کا کھٹکا نہ
ہوتا کہ عمرؓ نے کتاب اللہ میں زیادتی کی جو اس میں نہ تھی۔ تو میں کتاب اللہ کے ایک طرف آیت
رجم لکھ دیتا۔ عمرؓ بن خطاب۔ عبداللہ بن مناف، اور فلاں فلاں کی شہادت ہے کہ آنحضرت صلی
اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا۔ اور ہم نے بھی رجم کیا۔ یاد رکھو تمہارے بعد ایسے لوگ آنے والے ہیں۔
جو رجم کو اور شفاعت کو اور عذابِ قبر کو جھٹلائیں گے اور اس بات کو بھی کہ کچھ لوگ جہنم سے
اس کے بعد نکالے جائیں گے کہ وہ کوئلے ہو گئے۔ مسند احمد نے لکھا ہے کہ امیر المومنین حضرت
عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا۔ رجم کے حکم کا انکار کرنے کی ہلاکت سے بچنا۔ الخ امام ترمذی بھی
اسے لائے ہیں۔ اور اسے صحیح کہا ہے۔ ابوالعلیٰ موصلی میں ہے کہ لوگ مروان کے پاس بیٹھے
ہوئے تھے۔ حضرت زید بن ثابتؓ بھی تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم قرآن میں پڑھتے تھے کہ
شادی شدہ مرد یا عورت جب زناکاری کریں۔ تو انہیں ضرور رجم کر دو۔ مروان نے کہا کہ پھر تم
نے اس آیت کو قرآن میں نہ لکھ لیا۔۔۔۔؟ فرمایا سنو، ہم میں جب اس کا ذکر چلا۔ تو حضرت عمر
بن خطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ میں تمہاری تشفی کر دیتا ہوں کہ ایک شخص نبی اللہ صلے اللہ
علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے آپؐ سے ایسا ذکر کیا اور رجم کا بیان کیا۔ کسی نے کہا۔ یا رسول اللہؐ
آپؐ رجم کی آیت لکھ لیجئے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اب تو میں اسے نہیں لکھ سکتا۔ یا اسی کے مثل
یہ روایت نسائی میں بھی ہے۔

پس ان سب احادیث سے ثابت ہوا کہ رجم کی آیت پہلے لکھی ہوئی تھی یا پھر تلاوت میں منسوخ

ہوگئی، اور حکم باقی رہا۔ واللہ اعلم

خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی بیوی کے رجم کا حکم دیا جس نے اپنے ملازم سے بدکاری کرائی تھی۔ اسی طرح حضورؐ نے ماعز رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اور ایک غامدیہ عورت کو رجم کرایا۔ ان سب واقعات میں یہ مذکور نہیں کہ رجم سے پہلے آپ نے انہیں کوڑے بھی لگوائے ہوں۔ بلکہ ان سب صحیح اور صاف حدیثوں میں صرف رجم کا ذکر ہے۔ کسی میں بھی کوڑوں کا بیان نہیں۔ اسی لئے جمہور علماء اسلام کا یہی مذہب ہے ابوحنیفہ، مالک، شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام احمد رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔ پہلے اسے کوڑے مارنے چاہئیں پھر رجم کرنا چاہیئے۔ تاکہ قرآن و حدیث دونوں پر عمل ہو جائے جیسے کہ حضرت امیرالمومنین علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ جب آپ کے پاس سراحہ لائی گئی۔ جو شادی شدہ عورت تھی اور زناکاری میں آئی تھی۔ تو آپ نے جمعرات کو کوڑے لگوائے اور جمعہ کے دن سنگسار کرا دیا۔ اور فرمایا کہ کتاب اللہ پر عمل کرکے میں نے کوڑے پٹوائے اور سنت رسولؐ اللہ پر عمل کرکے سنگسار کرایا۔ مسند احمد، سنن اربعہ اور مسلم شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری بات لے لو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے رستہ نکال دیا۔ کنوارا، کنواری کے ساتھ زنا کرے۔ تو سو کوڑے اور سال بھر کی جلاوطنی اور شادی شدہ کے ساتھ کرے تو رجم ''

ملاحظہ فرمالیا آپ نے اسلاف کا تفسیری بیان؟ ——— آپ یقیناً حیران ہوں گے کہ وہ آیت جس میں زنا کی سزا سنگساری تھی کہاں چلی گئی اور جب آیت ہی نہیں رہی تو اس کا حکم کیسے باقی رہ گیا۔ لیکن اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ آپ کے ہاں یہ عقیدہ چلا آرہا ہے کہ قرآن میں بیشتر آیات ایسی ہیں۔ جن کی تلاوت تو کی جاتی ہے، لیکن ان کا حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ یہ حکم بعض دوسری آیات سے منسوخ سمجھا جاتا ہے اور بعض اوقات احادیث بھی قرآن کا حکم منسوخ کر دیتی ہیں۔ اور یہ عقیدہ بھی ہے کہ بعض آیات ایسی ہیں کہ جو قرآن میں موجود نہیں ہیں لیکن ان کا حکم باقی ہے۔ یعنی ان کی تلاوت منسوخ ہو گئی ہے اور حکم باقی ہے[1]۔

---

[1] آیۂ رجم کے متعلق ایک روایت میں ہے کہ وہ کھجور کے پتوں پر لکھی ہوئی تھی جنہیں حضرت عائشہؓ کی بکری کھا گئی۔

آپ شاید ہنسیں گے کہ ہم یہ کس قسم کی باتیں لکھ رہے ہیں۔ لیکن ہنسیئے نہیں بلکہ روئیے اس قوم کی حالت پر جس میں ہزار برس سے یہ عقائد مسلسل چلے آ رہے ہوں۔ اور جو شخص ان کے خلاف آواز اٹھائے، اسے خارج از اسلام ٹھہرا دیا جائے۔ باقی رہا یہ کہ بات کہاں تک پہنچ جاتی ہے۔" سو مولوی کو اس سے کیا غرض کہ بات کہاں کہاں پہنچ جاتی ہے۔ اس نے اشخاص کو اپنا معبود بنا رکھا ہے۔ اسے صرف اس سے غرض ہے کہ اس کے معبود محفوظ رہیں، خواہ ان کی حفاظت میں خدا، رسول، قرآن، دین، علم، عقل سب کے سب سیلاب کی نذر ہو جائیں۔ اور ان معبودوں کی حفاظت بھی وہ ان کے لئے نہیں کرتا۔ بلکہ اس لئے کرتا ہے کہ ان کی حفاظت میں خود اس کی حفاظت ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اگر مندر میں بت باقی نہ رہے تو برہمن کو کوئی نہ پوچھے گا۔
کس قدر تلخ ہیں یہ حقیقتیں۔ لیکن انہیں بالآخر کب تک چھپایا جا سکے گا؟

۱۳۔ قرآنی نصب العین

سوال:۔ آپ اپنے درس میں جس اسلام کا نقشہ پیش کرتے ہیں اس کے صحیح ہونے میں شبہ نہیں۔ اس کے ساتھ قرآن شریف کی سند ہوتی ہے۔ لیکن اس اسلام کا معیار اتنا بلند ہے کہ کم از کم ہم موجودہ مسلمان اس تک پہنچ نہیں سکتے۔ اس صورت میں اس صحیح اسلام کو عمل میں لانے کی شکل کیا ہوگی؟

جواب:۔

ایک چیز ہوتی ہے نصب العین اور دوسری چیز ہوتی ہے، اس نصب العین تک پہنچنے کا طریق۔ قرآن کریم جس اسلام کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ وہ اسلامی معاشرہ کا نصب العین ہے۔ وہ مسلمانوں (بلکہ یوں کہیئے کہ نوعِ انسان) کی اس دنیا میں منزلِ مقصود ہے۔ اسلام کے قرنِ اوّل میں ہوا یہ کہ جوں جوں قرآن نازل ہوتا گیا۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم ساتھ کے ساتھ اپنی جماعت کی تعلیم و تربیت فرماتے گئے۔ حتیٰ کہ جب تکمیلِ دین کا اعلان ہوا تو یہ جماعت بھی اس کے

پیش کردہ نصب العین تک پہنچ گئی۔ اس وقت حالت یہ ہے کہ قرآن اپنی مکمل شکل میں ہمارے پاس موجود ہے۔ لیکن مسلمانوں کی زندگی اس کے مطابق نہیں۔ اس لئے جب ہم قرآن میں پیش کردہ اسلام کو سامنے لاتے ہیں تو ہماری زندگی اُس میں فٹ نہیں بیٹھتی۔ اس لئے ہمیں یہ مقام اپنی حدِ وسعت سے دور معلوم ہوتا ہے۔ بلکہ بعض لوگ تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ یہ معیار محض مثالی (IDEAL) ہے۔ ممکن العمل نہیں۔ یہ غلط ہے۔ قرآن کا پیش کردہ اسلام ممکن العمل ہے۔ اس تک پہنچنے کا طریق یہ ہے کہ ہم اس اسلام کو بطور نصب العین اپنے سامنے رکھیں اور پھر بتدریج، قدم بہ قدم اس کی طرف بڑھتے جائیں۔ اس کے لئے لائحۂ عمل بھی وہی ہے جسے خود قرآن نے تجویز کیا اور نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ یعنی قوم کے بچوں کی صحیح تعلیم و تربیت۔ آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے (۱۲ اگست کے درس میں) سیرتِ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم پر تقریر کرتے ہوئے اس نکتے کی وضاحت کی تھی کہ حضورؐ کی سیرتِ طیبہ ہمارے لئے (بلکہ پوری انسانیت کے لئے) اُسوۂ حسنہ (بہترین ماڈل) ہے۔ دنیا کی مختلف مملکتوں کو بالعموم اور اسلامی ممالک کی حکومتوں کو بالخصوص اس ماڈل کو بطور نصب العین اپنے سامنے رکھنا چاہیئے۔ اور پھر رفتہ رفتہ اس تک پہنچنے کی کوشش کرنی چاہیئے۔ اس نصب العین کا سامنے رکھنا اس لئے ضروری ہے کہ جب تک کسی نصب العین کو سامنے نہ رکھا جائے۔ یہ کہا ہی نہیں جا سکتا کہ ہم صحیح راستے پر چل رہے ہیں یا نہیں۔ "ترقی" کے معنی ہی، اپنے نصب العین کی طرف بڑھتے جانا ہیں۔ اگر نصب العین سامنے نہ ہو تو کون کہہ سکتا ہے کہ ہم ترقی کر رہے ہیں یا تنزل کی طرف جا رہے ہیں۔

کیا کرنا چاہیئے

جن حالات میں ہم اس وقت گھرے ہوئے ہیں ان سے نکلنے کا ایک ہی طریق ہے۔ اور وہ یہ کہ ہم قرآنِ کریم سے اسلام کا صحیح، واضح اور متعین نقشہ مرتب کریں۔ اور اس نقشے کو بطور نصب العین اپنے سامنے رکھیں اور پھر اس کا جائزہ لیتے جائیں کہ ہمارا قدم اس نصب العین کی طرف اُٹھ رہا ہے یا نہیں۔ اس وقت ہماری بنیادی دشواری یہ ہے کہ قوم کے سامنے اسلام کا واضح اور متعین تصور ہی نہیں۔ اسلام کے متعلق ہر گروہ بلکہ ہر فرد کا تصوّر جداگانہ ہے، اس لئے ہر ایک کا قدم مختلف سمتوں کی طرف اٹھ رہا ہے۔ اس سے جو ملّی انتشار پیدا ہو سکتا ہے اس کی زندہ شہادت ہماری موجودہ حالت ہے۔ جب تک اسلام کا متعین تصوّر سامنے نہیں رکھا جاتا، نہ ہمارا انتشار ختم ہو سکتا ہے اور نہ ہی ہمارا قدم صحیح منزل کی طرف اٹھ سکتا

ہے ۔میں اپنی بصیرت کے مطابق اسلام کے اس تصوّر کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہوں، جسے قرآن کریم نے متعین کیا ہے ۔مجھے اس پر اصرار نہیں کہ میرے پیش کردہ تصور ہی کو صحیح تسلیم کیا جائے۔ میری دعوت یہ ہے کہ قوم کے اربابِ فکر و نظر سرجوڑ کر بیٹھیں اور قرآن کریم سے اسلام کا واضح اور متعین تصور متشکل کر کے اسے قوم کے سامنے بطور نصب العین رکھیں۔ اور پھر اس نصب العین کی طرف بڑھنے کے لئے عملی ذرائع اختیار کریں ۔ قوم اس پر آمادہ نہیں ہونا چاہتی ۔ ماڈرن طبقہ اس لئے آمادہ نہیں ہونا چاہتا کہ اسلام کا متعین نصب العین سامنے آجانے سے انہیں اپنی غیر اسلامی زندگی کو اسلامی قالب میں ڈھالنا پڑے گا اور قدامت (مذہب) پرست طبقہ اس لئے اس کی مخالفت کرتا ہے کہ اسلام کے ایک متعین تصور سے ہر فرقہ کا اپنا اپنا "اسلام" چھوڑنا پڑتا ہے ۔ یہ ہے اس مخالفت کی وجہ ——— لیکن ظاہر ہے کہ اس مخالفت سے اس مسئلہ کا حل نہیں مل سکتا۔ اگر ہمارا دعویٰ یہ ہے ——— اور یہ دعویٰ دیانتداری پر مبنی ہے کہ ہم نے یہاں اسلامی معاشرہ متشکل کرنا ہے تو ہمیں اسلام کا ایک واضح اور متعین تصور مرتب کر کے اسے بطور نصب العین سامنے رکھنا ہوگا۔ اگر ایسا نہیں کیا جائے گا تو موجودہ انتشار دن بدن بڑھتا جائے گا اور ہماری حالت بد سے بدتر ہوتی جائے گی۔

سنہ ۱۹۶۲ء

۱۴- قرآنی اور اسلامی

راولپنڈی سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آپ اپنی تحریروں میں اکثر "قرآنی نظام"۔ "قرآنی دستور"۔ "قرآنی معاشرہ" وغیرہ لکھتے ہیں۔ "اسلامی" نہیں لکھتے ۔ ان دونوں میں کیا فرق ہے؟

جواب

نزولِ قرآن کے زمانے میں تو قرآنی اور اسلامی میں کوئی فرق نہیں تھا۔ جو بات قرآنی

تھی وہی اسلامی تھی اور جو اسلامی تھی وہی قرآنی تھی اس لئے کہ اس زمانے میں اسلام نام ہی قرآن کے مطابق چلنے کا تھا۔ لیکن بعد میں جب مسلمانوں کی گاڑی نے پٹڑی بدل لی، تو رفتہ رفتہ قرآن اور اسلام میں بُعد ہوتا گیا۔ حتیٰ کہ اسلام میں اکثر و بیشتر ایسے تصورات، عقائد اور مسالک شامل ہو گئے جو قرآن کی ضد تھے۔ یہی اسلام اب تک مروّج چلا آرہا ہے۔ لہذا جس چیز کو "اسلامی" کہا جائے ضروری نہیں کہ وہ قرآنی بھی ہو۔ ہماری دعوت ہے کہ ہم اپنے تمام تصورات، عقائد و مسالک کو غیر قرآنی عناصر سے پاک کر کے پھر سے اپنی زندگی قرآن کے مطابق بنالیں۔ جب ایسا ہو جائے گا تو پھر قرآنی اور اسلامی ایک ہی بات ہو جائے گی۔ لیکن اس وقت ان دونوں میں تمیز کرنا ضروری ہے۔ اس وقت ہم "اسلامی" اس لئے نہیں کہتے کہ اس سے ذہن مروّجہ اسلام کی طرف منتقل ہو جاتا ہے جو کلیتہً قرآنی نہیں ہے۔

آپ صبح سے شام تک سنتے رہتے ہیں کہ "اسلام میں یوں آیا ہے"۔ "اسلام کی رُو سے فلاں بات یوں ہے"۔ "اسلام یہ کہتا ہے"۔ لیکن جب آپ ایسا کہنے والے سے پوچھیں کہ صاحب! جو کچھ آپ نے کہا ہے اس کی سند کیا ہے تو آپ دیکھیں گے کہ اس کے جواب میں کسی طبریؔ۔ کسی ابن کثیرؔ۔ کسی رازیؔ۔ کسی غزالی کا نام لے دیا جائے گا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات وارث شاہ اور بُلھے شاہ تک کے بھی حوالے پیش کر دیئے جائیں گے۔ لیکن ظاہر ہے کہ کسی بات کے اسلامی یا غیر اسلامی ہونے کے لئے کسی انسان کی سند کافی نہیں ہو سکتی۔ اس کے لئے سند صرف خدا کی کتاب کی ہونی چاہیئے۔ جس دن ہم نے یہ اصول اختیار کر لیا کہ کسی بات کے اسلامی ہونے کے لئے قرآن کی سند درکار ہے۔ اس دن اسلامی اور قرآنی ایک ہی ہو جائے گا۔ آپ کو غالباً یاد ہو گا کہ ۵۸-۱۹۵۷ء کے "اسلامک کلوکیم" میں (جو لاہور میں منعقد ہوا تھا) پرویزؔ صاحب نے یہی سوال اٹھایا تھا اور کہا تھا کہ ہمیں سب سے پہلے یہ اصول مقرر کر لینا چاہیئے کہ ہم میں سے جو شخص بھی یہ کہے کہ "اسلام نے یوں کہا ہے"۔ اسے اپنے دعویٰ کی تائید میں قرآن کی آیت پیش کرنی ہو گی۔ اور اگر اس کے پاس قرآن کی تائید نہ ہو تو اسے یہ کہنا نہیں چاہیئے کہ "اسلام نے یوں کہا ہے"! اسے یہ کہنا چاہیئے کہ فلاں صاحب کا یہ قول ہے۔ فلاں بزرگ نے یہ فرمایا ہے۔ فلاں کتاب میں یہ لکھا ہے۔ اس سے بات واضح ہو جائے گی اور اسلام کے سر خواہ مخواہ وہ کچھ نہیں تھوپا جائے گا، جس سے اسلام کو کچھ واسطہ نہیں۔

آج جو کچھ ہمارے ہاں "اسلامیات" کے نام سے مکتبوں۔ دارالعلوموں۔ اسکولوں اور کالجوں میں پڑھایا جاتا ہے (یا جس کی ریسرچ کے لئے کئی ادارے قائم ہیں) اس میں قرآن کا بہت کم حصّہ ہوتا ہے اور بیشتر وہی کچھ ہوتا ہے جسے "قرآنی اسلام" سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہوتا۔ بلکہ اس کیخلاف ہوتا ہے۔ ان حالات میں "قرآنی" اور مرّوجہ "اسلامی" میں فرق کرنا ضروری ہے۔ طلوعِ اسلام اس فرق کو ملحوظ رکھتا ہے۔ اگر وہ کہیں (ضرورۃً) اسلام کہتا بھی ہے تو اس سے اس کی مراد قرآنی اسلام ہوتی ہے۔

۱۹۶۰ء

۱۵- قرآنی قوانین سے کیا ہوگا؟

ایک صاحب دریافت کرتے ہیں؟

آپ اکثر و بیشتر لکھتے رہتے ہیں کہ جب قرآنی قوانین کا نفاذ ہوگا تو ان کے خوشگوار نتائج کو دیکھ کر، ایک دنیا اسلامی نظام کی طرف لپک کر آئے گی۔ اسلامی قوانین کے متعلق ہمیں تو اتنا ہی بتایا جاتا ہے کہ زانی کی سزا سو دُرّے ہوگی اور چور کے ہاتھ کاٹے جائیں گے۔ کیا اتنی سی تبدیلی کے نتائج ایسے ہوں گے کہ دنیا اس نظام کی طرف کھنچ کر آ جائے گی، اگر یہ نہیں تو آپ ایک دو مثالیں دے کر سمجھائیں کہ وہ قوانین کس قسم کے ہوں گے۔ نیز ایک آدھ مثال سے یہ بھی بتائیے کہ قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصول کس قسم کے ہیں، اور ان کی چار دیواری کے اندر رہتے ہوئے ہر دَور کا اسلامی نظام کس قسم کے قوانین بنانے کا مجاز ہے۔

طلوعِ اسلام آپ نے جو مثالیں دی ہیں۔ وہ تعزیرات (سزاؤں) کی ہیں۔ اگرچہ سزائیں بھی قوانین کا ایک حصّہ ہوتی ہیں، لیکن جن قوانین کے عالمگیر، پُرکشش انسانیت ساز خوش گوار............ نتائج کا ہم ذکر کرتے رہتے ہیں، ان کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ ایک مثال سے بات واضح ہو جائے گی۔ اسی سے یہ حقیقت بھی سامنے

آجائے گی کہ غیر متبدّل اصول کسے کہتے ہیں اور ان کی روشنی میں قوانین کیسے مرتب ہوتے ہیں۔

قرآنِ کریم میں ہے۔ وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ (۱۷/۷۰) ہم نے تمام انسانوں کو واجب التکریم بنایا ہے۔ یہ قرآن کا غیر متبدل اصول یا مستقل قدر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر انسانی بچہ، محض انسانی بچہ ہونے کی حیثیت سے، یکساں طور پر عزت و تکریم کا مستحق ہے۔ دنیا میں اس وقت، عزت اور تکریم کے معیار اضافی ہیں۔ امیر آدمی کے گھر پیدا ہونے والا بچہ، پیدائش کے ساتھ ہی ہزار عزتوں کا مستحق قرار پا جاتا ہے۔ غریب کے بچے کو کوئی بھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ اونچے محل میں پیدا ہونے والے بچہ کو پہلے ہی دن سینکڑوں مراعات حاصل ہوتی ہیں، جن سے جھونپڑی میں پیدا ہونے والا بچہ، یکسر محروم ہوتا ہے۔ عزت اور مراعات کی یہ تفریق و تقسیم، ساری عمر ان دونوں کے ساتھ رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عزت، نہ انسانی ہونے کی جہت سے ہوتی ہے۔ نہ جوہرِ ذاتی کی بنا پر۔ اسی قسم کی تفریق، سیّد یا پٹھان کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے، اور جولاہے اور موچی کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کے ساتھ چپکی رہتی ہے۔ اونچے اور امیر گھرانے کے بچوں کے لئے ہر قسم کے مواقع (OPPORTUNITIES) کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ غریب گھروں میں پیدا ہونے والے بچے، ان دروازوں کے پاس تک نہیں پھٹک سکتے۔

قرآنی مملکت میں کوئی ایسا قانون یا ضابطہ نافذ نہیں ہوسکتا جس میں، ایک بچے اور دوسرے بچے میں، اس قسم کی اضافی نسبتوں کی بنا پر، کسی قسم کی بھی تفریق کی جائے۔ اس میں ایسے قوانین نافذ ہوں گے، جن کی رُو سے۔

۱۔ ہر انسان کی عزت کی جائے۔ کسی کو، کسی اضافی نسبت کی بنا پر، نہ ذلیل سمجھا جائے۔ نہ ذلیل کیا جائے۔ ہر ایک کی عزّتِ نفس کو برقرار رکھا جائے اور سوسائٹی میں مدارج کا تعین، ذاتی جوہروں اور اعمال کی بنا پر کیا جائے۔

۲۔ ہر انسانی بچے کو، زندگی کے ہر شعبہ میں داخل ہونے اور آگے بڑھنے کے یکساں مواقع میسر ہوں، اور کوئی اضافی نسبت، نہ کسی کو کوئی رعایت دے سکے۔ نہ کسی کے راستے میں روک بن سکے۔

ظاہر ہے کہ ان قوانین کا دائرہ زندگی کے کسی ایک شعبہ تک محدود نہیں ہوگا مختلف شعبوں

سے متعلق جس قدر قوانین مرتب ہوں گے، ان میں قرآن کے اس غیر متبدل اصول کو مدِّنظر رکھا جائے گا اور جو قانون، کسی نوعیت سے بھی، اس اصول کے خلاف جائے گا، وہ کالعدم قرار پا جائے گا۔

یہ ایک مثال ہے۔ یہی صورت قرآنِ کریم کی تمام مستقل اقدار و قوانین کے ضمن میں ہو گی۔ مثلاً اس کا ہیش کہ وہ اصول یہ ہے کہ لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی (۵۳/۳۹) انسان صرف اس کا مستحق ہے جس کے لئے وہ محنت کرے۔ یہ ایک بڑا وسیع۔ جامع اور عالمگیر اصول ہے جو زندگی کے ہر شعبہ کو محیط ہے۔ اس اصول کے ماتحت اسلامی مملکت میں کوئی فرد، محنت کئے بغیر کچھ نہیں پا سکتا۔ البتہ جو شخص محنت سے معذور ہو، وہ اس سے مستثنیٰ ہو گا۔ یا جس شخص کی ضروریات اس کی محنت سے پوری نہ ہوتی ہوں، اس کی کمی پوری کر دی جائے گی (اسے احسان کہتے ہیں) لیکن یہ نہیں ہو سکے گا کہ محنت کوئی کرے اور اس کا ماحصل کوئی اور لے جائے۔ اسی طرح قرآن کا مستقل اصول یہ ہے کہ لَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰی (۶/۱۶۵) کوئی بوجھ اٹھانے والا، کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ یہ اصول بھی بڑا جامع ہے۔ اس کی رُو سے، ہر شخص اپنی اپنی ذمہ داری کو خود سنبھالے گا۔ یہ نہیں ہو گا کہ ذمہ داری ایک کی ہو اور اسے لاد دیا جائے کسی دوسرے کے اوپر۔ یا، کرے کوئی بھرے کوئی۔ لہٰذا اس مملکت میں ایسا قانون نہیں بن سکے گا جس کی رُو سے، کسی نہج سے بھی، اس قسم کی صورت پیدا ہو سکے۔

زمانے کی ضرورتوں کے مطابق، قوانین بدلتے رہیں گے۔ منسوخ ہوتے رہیں گے۔ ان میں اضافے بھی ہوتے رہیں گے۔ لیکن جو قوانین بھی نافذ العمل ہوں گے ان میں کوئی ایسی بات نہیں ہو گی، جو ان اصولوں کے خلاف جائے۔

مقصد پیشِ نظر کے ماتحت، ہم صرف انہی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔ اس قسم کے ہوں گے وہ قوانین جو قرآنی مملکت میں نافذ ہوں گے اور ان کے نتائج ایسے خوشگوار اور انسانیت کے لئے موجب فلاح و بہبود ہوں گے کہ انہیں دیکھ کر دنیا اس نظام کی طرف لپک آئے گی۔

(۱۹۶۱ء)

حدیث

۱۔ حضرت ابراہیمؑ کے (معاذ اللہ) تین جھوٹ

لاہور سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ پاکستان ٹائمز میں ایک صاحب نے لکھا ہے کہ بخاری شریف کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت ابراہیمؑ نے تین مرتبہ جھوٹ بولا تھا اس کے جواب میں مفتی ...... صاحب نے لکھا کہ اس کا ثبوت خود قرآن شریف میں موجود ہے۔ یہ پڑھ کر میرے تو پاؤں تلے کی زمین نکل گئی. آپ کچھ اس پر روشنی ڈالیں گے ؟

طلوعِ اسلام ہم اس (اور اس قسم کی کئی اور احادیث) کے متعلق کئی بار لکھ چکے ہیں اس لیے ان کی تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں اسی قسم کی حدیثوں کے صحیح ہونے کا تو انکار ہے، جس کی وجہ سے ہمیں منکرِ حدیث اور منکرِ شانِ رسالت قرار دیا جاتا ہے!

قرآن کریم میں حضرت ابراہیمؑ کے متعلق ہے۔ اِنَّهٗ كَانَ صِدِّيْقًا نَّبِيًّا (۱۹/۴۱) یقیناً وہ مجسم سچائی تھا اور اللہ کا نبی تھا" لیکن اگر قرآن کریم میں ان کے یا کسی اور نبیؑ کے متعلق اس صراحت سے یہ کچھ نہ بھی لکھا ہوتو بھی ایک نبیؑ کی صداقت میں ذرا سا شبہ بھی ایمان کو ختم کر دیتا ہے۔ یہ نبیؑ کی صداقت ہی تو ہے جس کی بنا پر اس کے دعویٰ نبوت کو صحیح تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر (معاذ اللہ) یہ تسلیم کر لیا جائے کہ خدا کے ایک جلیل القدر نبیؑ (حضرت ابراہیمؑ)

نے جھوٹ بولا تھا، اور اس کا ایک برگزیدہ نبیؑ (رسول اللہ) اس کی تصدیق کرتا ہے تو اس آسمان کے نیچے، ہم صداقت کہاں ڈھونڈنے جائیں گے؟

اس قسم کی روایات کی حقیقت کیا ہے، اس کے متعلق، ہم ایک نامور اہل حدیث عالم کی رائے پیش کرتے ہیں۔ مولانا ابو الکلام آزاد مرحوم اپنی تفسیر ترجمان القرآن جلد دوم (ص۶۶۹ پر) اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اگرچہ صحیحین کی اس روایت کی توجیہہ و تاویل کی بہت سی راہیں لوگوں نے کھولی ہیں مگر صاف بات وہی ہے جو امام ابو حنیفہؒ کی طرف منسوب ہے اور جسے امام رازیؒ نے بھی دہرایا ہے۔ یعنی ہمارے لیے یہ تسلیم کرلینا نہایت آسان ہے کہ ایک غیر معصوم راوی سے فہم و تعبیر حدیث میں غلطی ہوگئی۔ بہ مقابلہ اس کے کہ ایک معصوم اور برگزیدہ پیغمبر کو جھوٹا تسلیم کریں۔ اگر ایک راوی کی جگہ سینکڑوں راویوں کی روایت بھی ناقص ٹھہر جائے، تو بہر حال غیر معصوم انسانوں کی غلطی ہوگی لیکن اگر ایک معصوم پیغمبرؑ کو بھی غلط تسلیم کرلیا گیا تو نبوت و وحی کی ساری عمارت درہم برہم ہوگئی۔

بلاشبہ روایت صحیحین کی ہے لیکن اس تیرہ سو برس کے اندر کسی مسلمان نے بھی راویان حدیث کی عصمت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ نہ امام بخاری و مسلم کو معصوم تسلیم کیا ہے کسی روایت کے متعلق بڑی سے بڑی بات جو کہی گئی ہے وہ اس کی "صحت" ہے "عصمت" نہیں ہے اور "صحت" سے مقصود صحت مصطلحۂ فن ہے، نہ کہ صحت قطعی اور یقینی مثل صحت قرآن۔ اس ایک روایت پر صحت کی کتنی ہی مہریں لگ چکی ہوں۔ بہر حال غیر معصوم انسانوں کی ایک شہادت اور غیر معصوم ناقدوں کا ایک فیصلہ ہے۔ ایسا فیصلہ ہر بات کے لیے مفید حجت ہوسکتا ہے۔ مگر یقینیات و قطعیات کے خلاف نہیں ہوسکتا جب بھی ایسا ہوگا کہ کسی راوی کی شہادت یقینیات قطعیہ سے معارض ہوجائیگی تو یقینیات اپنی جگہ سے نہیں ہلیں گے، غیر معصوم کو اپنی جگہ چھوڑنی پڑے گی نبیؑ کا سب سے بڑا وصف جو قرآن نے بتایا ہے وہ اس کی سچائی ہے اور اس کی احتیاج تفصیل نہیں، نبوت ایک سیرت ہے جو صرف سچائی ہی سے بنتی ہے .... اور صرف سچائی ہی کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے ایک

نبی کسی بات سے عاجز نہیں ہوتا مگر اس بات سے کہ سچ نہ بولے۔ حقیقت اور سچائی کے خلاف جو کچھ ہے خواہ کسی شکل اور کسی درجہ میں ہو، نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا اگر نبوت ہوگی تو سچائی بھی ہوگی۔ اگر سچائی نہیں ہے تو نبوت بھی نہیں ہے، پس انبیاءؑ کرام کی سچائی اور عصمت، یقینیات دینیہ و نقلیہ سے ہے۔ روایات کی قسموں میں سے کتنی ہی بہتر قسم کی کوئی روایت ہو، بہر حال ایک غیر معصوم راوی کی شہادت سے زیادہ نہیں اور غیر معصوم کی شہادت ایک لمحہ کے لیے بھی یقینیات دینیہ کے مقابلہ میں تسلیم نہیں کی جاسکتی۔ ہمیں ماننا پڑے گا کہ یہ اللہ تعالٰے کے رسولؐ کا قول نہیں ہو سکتا۔ یقیناً یہاں راویوں سے غلطی ہوئی ہے اور ایسا مان لینے سے نہ تو آسمان پھٹ پڑے گا۔ نہ زمین شق ہو جائے گی۔

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

(صحیحین کے متعلق) جو کچھ ہے ان کی صحت کا اعتقاد ہے۔ یعنی ایسی صحت کا جیسی اور جس درجہ کی صحت ایک غیر معصوم انسان کے اختیارات کی ہو سکتی ہے۔ عصمت کا اعتقاد نہیں ہے اور اس لیے اگر کوئی روایت شاذ، یقینیات قطعیہ قرآنیہ سے معارض ہو جائے گی، تو ہم ایک لمحہ کے لیے بھی اس تضعیف میں تامل نہیں کرینگے کیونکہ اصل ہر حال میں قرآن ہے جس کا تواتر یقینی اور جس کی قطعیت شک و شبہ سے بالاتر ہے۔ ہر انسانی شہادت اس پر کسی جائے گی۔ وہ کسی غیر معصوم شہادت اور رائے پر کسا نہیں جا سکتا کہ

غرض اندر میاں سلامت اوست

طلوع اسلام | اگر آپ اس اقتباس کو کسی مولوی صاحب کے سامنے پیش کر دیں، یہ بتائے بغیر کہ اس کا مصنف کون ہے تو وہ جھٹ کہہ دیں گے کہ یہ وہی منکرِ حدیث طلوع اسلام ہے!

بہر حال حدیث اور قرآن کے باہمد گر معارض ہونے کے سلسلہ میں جو اصول مولانا آزاد (مرحوم) نے بیان کیا ہے۔ اگر ہمارے علمائے کرام اسے تسلیم کرلیں، تو امت کی کتنی مشکلات حل ہو جائیں

دین سے متعلق کتنے جھگڑے چک جائیں۔ اور غیر مسلم آئے دن جو ناموسِ رسالت مآبؐ پر (معاذاللہ) طعن کرتے ہیں۔ اس کا دروازہ کس حسن و خوبی سے بند ہو جائے لیکن ضد تعصب اور گروہ بندی کا کیا علاج!

(۱۹۶۲ء)

۲۔ احادیث کی صحیح پوزیشن

'صدقِ جدید' کی دس اپریل ۱۹۵۹ء کی اشاعت میں ایک خبر شائع ہوئی ہے کہ مصر میں بعض کاشتکاروں کو انجیل کا ایک نیا نسخہ ملا ہے جس میں حضرت عیسیٰؑ کے ۱۱۴ مقولے درج ہیں جن میں سے اکثر بالکل نئے ہیں۔ اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے جریدہ مذکور رقم طراز ہے

نئی نئی انجیلوں کی دریافت کا سلسلہ تقریباً دو ہزار سال گزر جانے پر اب تک قائم ہے اور مسیحیت کی ابتدائی صدیوں کی جتنی انجیلیں مل چکی ان کا تو کوئی حساب ہی نہیں! چار مشہور متعارف انجیلیں جو ہیں یہ تو اس سارے ذخیرے کو مسترد کر کے مستند قرار دی گئی ہیں۔ کیا کوئی نسبت بھی استناد و محفوظیت کے معیار سے انجیلوں کے ذخیرے کو قرآن سے ہے؟ کیا قرآن بھی سو پچاس نہیں دس بیس کی تعداد میں کوئی اور دریافت ہوئے ہیں۔ کوئی ایک بھی دوسرا قرآن کہیں مل سکا ہے؟ انجیلیں جتنی بھی ہیں سب حضرت مسیحؑ کے ملفوظات و سوانح ہی کے دعویدار ہیں۔ اور اس لحاظ سے وہ ہمارے ہاں کی صرف کتب حدیث و سیر کی ہم سطح ہو سکتی ہیں۔ کتنا بڑا ظلم ہے ایسی کتابوں کو قرآن مجید کے مقابلہ پر لانا۔

دریابادی صاحب نے فرمایا یہ ہے۔

۱۔ اناجیل کی حیثیت ہمارے یہاں کی کتب احادیث و سیر کی سی ہے۔

۲۔ اناجیل کو قرآن مجید کے مقابلہ پر لانا بہت بڑا ظلم ہے تو کیا کتب احادیث کو، جو اناجیل کی سطح پر ہیں۔ قرآن مجید کے مقابلہ پر لانا اور انہیں مثلہ، معہ، قرار دینا ظلم نہیں؟

۱۹۵۹ء

۳۔ تواتر

سوال۔ میں آپ کے درس میں اکثر شریک ہوتا ہوں۔ آپ جو باتیں بیان کرتے ہیں، ان کے ساتھ قرآن کریم کی سند ہوتی ہے۔ ویسے بھی وہ جی کو لگتی ہیں لیکن ان میں سے کئی باتوں کے متعلق کہا جاتا ہے کہ جو کچھ اسلاف سے متواتر چلا آرہا ہے وہ اس کے خلاف ہیں۔ تواتر کے متعلق علمی بحث زیادہ تر ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ کیا آپ کسی مثال سے بات سمجھا دیں گے؟

جواب۔ سب سے پہلے اسے اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ میں یہ نہیں کہتا کہ جو کچھ ہمارے ہاں اسلاف سے چلا آتا ہے، وہ سب کا سب غلط ہے۔ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ جو کچھ ہمارے پیچھے سے چلا آرہا ہے۔ اسے محض اس لیے صحیح تسلیم نہیں کرلینا چاہیئے کہ وہ پیچھے سے چلا آرہا ہے اس میں سہو اور غلطی کا امکان ہوسکتا ہے اس لیے اسے پرکھ لینا چاہیئے۔ جو کچھ اس میں صحیح ہو اسے قبول کرلینا چاہئیے جو غلط ہو اسے چھوڑ دینا چاہئیے اور یہ ظاہر ہے کہ جہاں تک دینی امور کا تعلق ہے، ان کے پرکھنے کی کسوٹی، قرآن کریم سے زیادہ قابل اعتماد اور کونسی ہوسکتی ہے؟

اب اس کی مثال دیکھیے۔ ہمارے ہاں شروع سے یہ بات بطور مسلّمہ چلی آرہی ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر نکاح کے وقت چھ سال کی اور رخصتی کے وقت نو سال کی تھی۔ مجھے اس بات کے صحیح تسلیم کرنے میں ہمیشہ تردّد رہا۔ کیونکہ قرآن کریم نے نکاح کے لیے بالغ ہونا ضروری قرار دیا ہے اور اس بات کا تصور تک بھی نہیں کیا جاسکتا کہ نبیٔ اکرمؐ کا کوئی عمل (معاذ اللہ) قرآن کے خلاف ہوسکتا ہے چنانچہ میں نے اس باب میں تحقیق کی اور خود ہماری کتب تاریخ وسیر سے یہ حقیقت سامنے آگئی کہ نکاح کے وقت حضرت عائشہؓ کی عمر انیس برس یا کم از کم سترہ برس کی تھی صلہ ظاہر ہے کہ حضرت عائشہؓ کی عمر کا واقعہ، ایک محسوس اور بدیہی بات ہے جس کے شاہد سینکڑوں، ہزاروں لوگ ہوں گے لیکن اس کے باوجود ہماری کتب روایات وسیر میں ان کی عمر صحیح درج نہ ہو سکی اور اس کے بعد آج تک اسی غلط عمر کو صحیح تسلیم کیا جاتا رہا جب اس قسم کے محسوس اور بدیہی

صلہ ۔ فٹ نوٹ صفحہ ۲۹۳ پر دیکھیں

واقعات میں ایسی غلطی ہوسکتی ہے تو غیر محسوس اور غیر مرئی امور میں ایسی غلطیوں کا امکان اور بھی زیادہ ہے۔ اگر یہ باتیں عام تاریخ سے متعلق ہوں تو ان میں سہو یا خطا، ہمارے ایمان یا اسلام پر اثر انداز نہیں ہوسکتا لیکن جو امور دین سے متعلق ہوں، یا ان کا تعلق نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم یا صحابہؓ کبار کی زندگی سے ہو اس میں اس قسم کے سہو یا خطا کے اثرات بڑے دور رس ہوتے ہیں ان امور میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے اس احتیاط کا تقاضا ہے کہ ہم ہمیشہ اپنے سامنے یہ اصول رکھیں کہ جو کچھ ہمارے پاس اسلاف سے چلا آرہا ہے اسے پرکھا جائے اور اگر اس میں کوئی ایسی بات ہو جو قرآنی تعلیم کے خلاف ہے یا اس سے حضور نبی اکرمؐ کی سیرتِ طیبہ یا صحابہ کبارؓ کے خلاف کوئی طعن پڑتا ہے تو اس کے متعلق کہہ دیا جائے کہ وہ ہم تک صحیح طور پر نہیں پہنچی۔ ایسا کہہ دینے سے اسلاف کے احترام میں کوئی فرق نہیں آتا اس لیے کہ وہ بھی بالآخر انسان تھے اور انسان سے سہو یا خطا کا امکان ہے انہوں نے دین کی جو خدمات سرانجام دیں، وہ ہمارے سر آنکھوں پر لیکن اس سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ انہیں معصوم اور منزہ عن الخطا مانا جائے۔ یہ بات اور بھی واضح ہو جائے گی جب اسے سمجھ لیا جائے کہ جو حضرات اس وقت ہمارے سامنے موجود ہیں وہی آنے والوں کیلئے "اسلاف" ہو جائیں گے۔ سو جب ہم اپنے سامنے کے حضرات کو ان کی زندگی میں سہو و خطا سے منزہ نہیں مانتے تو یہی حضرات اپنی وفات کے بعد منزہ عن الخطا کیسے ہوسکتے ہیں؟

۱۹۶۲ء

۴۔ احادیث صحیحہ کا مجموعہ

ایک صاحب لکھتے ہیں۔

"جس طرح امام بخاریؒ نے چھ لاکھ احادیث میں سے تقریباً چھ ہزار احادیث کو صحیح مان

ص۱ میرا یہ مقالہ طلوع اسلام میں شائع ہوا تھا اور اب "طاہرہ کے نام خطوط" (جلد دوم) میں شامل ہو چکا ہے۔ (سابقہ صفحہ کا نوٹ)

کر مجموعہ بخاری شریف مرتب کر ڈالا تھا اسی طرح آپ بھی قرآن پاک اور شان رسالت
سے مطابقت رکھنے والی احادیث کا ایک گراں قدر مجموعہ مرتب فرما کر شائع کریں ایسے
مجموعہ کی موجودگی میں آئندہ کسی مولوی یا کسی جماعت کو آپ کے بارے میں منکر حدیث
منکر سنت اور منکر شانِ رسالت ثابت کرنے کا پراپیگنڈہ کرنے کی جرأت نہ رہے گی
یہ الزام جس کا سہارا لے کر یہ لوگ طلوع اسلام کے مسلک کے خلاف ایک متحدہ محاذ
کھوے ہوئے ہیں خود بخود ختم ہو جائے گا آپ کا یہ کارنامہ عامۃ المسلمین کو قرآنی تعلیمات
کے زیادہ نزدیک لانے کا باعث بننے کے علاوہ سیدھے سادھے مسلمانوں کے دلوں میں
طلوع اسلام کے خلاف بھرے ہوئے زہر کے لیے بھی ایک تریاق ثابت ہو گا۔"

طلوع اسلام | سب سے پہلے اتنا عرض کر دینا ضروری ہے کہ طلوع اسلام کے سامنے ایک مقصد اور ایک نصب العین ہے یعنی دینِ خالص کی تشہیر و اشاعت اور اس معاشرہ کی تشکیل جسے نبئ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں نے متشکل فرمایا تھا۔ ہم جو کچھ کرتے ہیں اسی مقصد کے حصول کے لیے کرتے ہیں، نہ اس لیے کہ مخالفین کو ہمارے خلاف پراپیگنڈہ کرنے کا موقع نہ ملے۔ ہمارا مسلک موافقین اور مخالفین سب کے سامنے کھلا ہے۔ مخالفین ہمارے خلاف اس لیے پراپیگنڈہ نہیں کرتے کہ ہمارا مسلک غلط ہے وہ اس لیے پراپیگنڈہ کرتے ہیں کہ قرآنی معاشرہ کی تشکیل سے ان کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی ہے۔

جہاں تک ہمارے مکتوب نگار کی تجویز کا تعلق ہے اس کا بنیادی جواب وہی ہے جو تاریخ کی تدوین نو کے سلسلہ میں ہم طلوع اسلام میں پہلے بیان کر چکے ہیں۔ یعنی یہ کام بین الملی حیثیت سے کرنے کا ہے نہ کہ انفرادی حیثیت سے۔

جہاں تک احادیث کا مجموعہ مرتب کرنے کا تعلق ہے، یہ معاملہ عام تاریخ کی ترتیب جدید سے بھی زیادہ نازک ہے۔ امام بخاریؒ نے چھ لاکھ مروج احادیث میں سے، اپنی صوابدید کے مطابق ایک مجموعہ مرتب کیا لیکن بعد میں ہوا یہ کہ اس مجموعہ کے متعلق یہ سمجھ لیا گیا کہ اس کا ایک ایک لفظ قول یا عملِ رسولؐ ہے۔ ہمارا خیال ہے کہ یہ بات خود امام موصوف کے ذہن میں بھی نہیں ہو گی کہ ان کی اس انفرادی کوشش کو بعد میں یہ حیثیت دے دی جائے گی نتیجہ اس کا یہ کہ اگر آج کوئی شخص اس

مجموعہ کی کسی حدیث کے متعلق یہ کہہ دے کہ قرآن کے خلاف ہے لہذا غلط ہے تو اس کے متعلق یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ وہ خود قولِ رسولؐ کا منکر ہے۔ یعنی امام بخاریؒ کے انتخابی فیصلے پر تنقید (معاذاللہ) خود ذاتِ رسالت مآبؐ پر تنقید قرار دے دی جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ یہ مجموعہ قرآن کی مثل اور اس کا ہم پایہ (مثلہ معہ) تصور کر لیا گیا ہے۔ یہی وہ خدشہ تھا جس کے پیشِ نظر حضرت عمرؓ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ رسول اللہ کی احادیث کا کوئی مجموعہ مرتب نہ کیا جائے۔ مختصر جامع بیان العلم میں ہے کہ حضرت عمرؓ کو خیال پیدا ہوا کہ سننِ رسولؐ اللہ کو لکھوایا جائے آپ نے صحابہؓ سے مشورہ کیا۔ مشورہ کے بعد آپ ایک ماہ تک اس معاملہ کو سوچتے رہے اور بالآخر فیصلہ کیا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے۔ دلیل یہ تھی کہ۔

> پہلی قومیں اسی وجہ سے ہلاک ہوئیں کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی حدیثیں لکھیں اور انہی پر جھک پڑیں اور اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا۔

ہو سکتا ہے کہ ہم آج ایک جدید مجموعہ احادیث مرتب کریں جسے ہم اپنی صوابدید کے مطابق صحیح سمجھیں اور کل کے لوگ اس مجموعہ کو خود اقوال رسولؐ اللہ سمجھنے لگ جائیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جس چیز کو کسی قسم کی "شرعی حیثیت" حاصل ہو جاتی ہو اسے انفرادی کوششوں پر چھوڑنا ہی نہیں چاہیئے۔ زید بکر یا عمر کو کیا حق حاصل ہے کہ اپنے کسی فیصلہ کو اُمت کے لیے شریعت بنا دے۔ یہ کام اسلامی حکومت (خلافت علیٰ منہاج رسالت) کے کرنے کا ہے۔ اسی کا کام ہے کہ وہ

(ا) ایک مستند تاریخ مرتب کرے اور اسے اُمت کے لیے بطور نصاب مقرر کر دے اور باقی کتب تاریخ کے متعلق فیصلہ کر دے کہ وہ غیر مستند ہیں اور

(ii) فقہ اور روایات کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لے کر اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق قوانین مرتب کرے۔ اُمت کے لیے یہ قوانین شرعی حیثیت رکھیں گے۔ خلافت علیٰ منہاج رسالت کے زمانے میں یہی ہوتا تھا اور یہی وجہ تھی کہ حضرت عمرؓ نے مجموعۂ احادیث مرتب کرنے کی مخالفت کی تھی تاکہ وہ مجموعہ کہیں دین کی حیثیت اختیار نہ کر جائے اور اس طرح۔

> اُمت اسی پر جھک پڑے اور کتاب اللہ کو چھوڑ دے۔

۱۹۵۹ء

۵۔ حق و باطل کا معیار

جماعت اہل حدیث کے ترجمان، معاصر منہاج کی 9/11 نومبر کی اشاعت میں "یہ کیوں" کے عنوان سے، حسب ذیل شذرہ شائع ہوا ہے۔

اکتوبر کے "طلوع اسلام" کے صفحہ اوّل پر چوکھٹا میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے رسول اللہ علیہ وسلم کی مندرجہ ذیل حدیث نقل کی گئی ہے کہ:۔

حضرت علی رضی اللہ تعالے عنہ، کی روایت ہے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ خبردار فتنہ واقع ہوگا، میں نے عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اس سے کیونکر نجات ہو گی؟ آپ نے فرمایا کہ کتاب اللہ (پر عمل کرنے) سے، جس میں تمہارے درمیان (حرام و حلال یا طاعت و گناہ وغیرہ کا) حکم ہے۔ اور حق و باطل کے اندر قول فیصل ہے جس متکبر نے قرآن کو چھوڑا۔ ہلاک کرے گا، اس کو اللہ۔ اور جس نے قرآن کے سوا کسی دوسری چیز میں ہدایت طلب کی، گمراہ کرے گا اس کو اللہ۔ جس نے قرآن کی طرف بلایا اس کو سیدھی راہ دکھائی گئی۔

(مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی۔ دارمی)

معلوم ہے آپ کو یہ حدیث کیوں نقل کی گئی ہے؟ یہ تاثر پیدا کرنے کے لیے کہ اصل چیز کتاب اللہ (قرآن مجید) ہے۔ حدیث اور سنت رسول صلے اللہ علیہ وسلم کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔!

یہاں دو سوال پیدا ہوتے ہیں:۔

ایک یہ کہ "ادارہ طلوع اسلام" کے نزدیک جب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی احادیث غیر معتمد علیہ، غیر مستند ناقابلِ استناد و حجت اور عجمی سازش کا فسانہ ہیں تو حضور صلے اللہ علیہ وسلم کا فرمان کیونکر لائق استناد اور قابلِ حجت و استدلال ہو سکتا ہے؟ ادارہ طلوع اسلام کے پاس اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ یہ فرمان فی الواقع رسول اللہ

صلے اللہ علیہ وسلم کا ہے اور اس میں عجمی سازش کارفرما نہیں ہے؟

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب اصل چیز کتاب اللہ ہے اور باقی سب چیزیں ناقابل اعتماد اور غیر معتبر ہیں تو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے اس فرمان کو نقل کرنے کا کیا مطلب؟ آپ کو چاہیے کہ ہر چیز میں کتاب اللہ ہی کو مقدم رکھیں اور اسی سے اپنے مسلک کی حقانیت اور صحت و استواری ثابت کریں۔

جب کتاب اللہ کے سوا باقی سب چیزیں غلط اور ہلاکت کی طرف لے جانے والی ہیں۔ تو کیا یہ حدیث اس میں نہیں آتی؟ یہ آخر کیوں مستثنےٰ ٹھہری؟ کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ جو چیز اپنے مطلب کے مطابق سمجھی اس کو لے لیا اور جو اپنے ذہن کے قالب میں موزوں نہ ہوئی اس کو غیر صحیح قرار دے کر مسترد کر دیا؟

طلوع اسلام مشکل یہ ہے کہ تعصب کی وجہ سے انسان کے ماتھے کی آنکھیں تو ٹھیک رہتی ہیں۔ وَلٰكِنْ تَعْمَى الْقُلُوبُ الَّتِي فِي الصُّدُورِ (۲۲/۴۶) (س کے دل کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں اگر ہمارے معاصر کی دل کی آنکھیں روشن ہوتیں تو اسے اپنے سوالات کا جواب خود طلوع اسلام کے صفحات میں مل جاتا۔ طلوع اسلام پہلے دن سے اس حقیقت کا اعلان کرتا چلا آ رہا ہے کہ اس کے نزدیک صحیح اور غلط کا معیار (خواہ وہ احادیث ہوں یا کسی اور کے اقوال و اعمال و آراء و خیالات) قرآن کریم ہے۔ جو بات قرآن کے مطابق ہو اسے ہم صحیح مانتے ہیں، جو اس کے خلاف ہو اسے غلط سمجھتے ہیں اور اگر وہ حدیث ہے تو اس کی بابت کہہ دیتے کہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی طرف اس کی نسبت صحیح نہیں۔ ہمارے نزدیک وہ احادیث "غیر معتمد علیہ۔ غیر مستند۔ ناقابل استناد و حجت اور عجمی سازش کا فسانہ" ہیں جو قرآن کے خلاف ہیں اور اس لیے رسول اللہ کی طرف ان کی نسبت صحیح نہیں۔ ہمارا مسلک یہ نہیں کہ

> "جو چیز اپنے مطلب کے مطابق سمجھی اسے لے لیا اور جو اپنے ذہن کے قالب میں موزوں نہ ہوئی اس کو غیر صحیح قرار دے کر مسترد کر دیا"

ہمارا مسلک یہ ہے کہ

رد و قبول کا معیار قرآن ہے جو اس کے مطابق ہے اسے ہم لیتے ہیں، جو اس کے خلاف

ہوا سے مسترد کر دیتے ہیں۔

جیسا کہ ہم نے اوپر لکھا ہے ہم اپنے اس مسلک کا اعلان پہلے دن سے کرتے چلے آرہے ہیں۔ طلوع اسلام کے ٹائیٹل پر اور ادارہ کی طرف سے شائع کردہ اکثر تصانیف پر، ایک بلاک شائع ہوتا ہے جس کا عنوان ہے "طلوع اسلام کا مقصد اور مسلک"

اس میں شق نمبر ۳ میں لکھا ہے۔

> حق اور باطل کا معیار قرآن ہے ہر وہ بات جو قرآن کے مطابق ہے وہ صحیح ہے جو اس کے خلاف ہے وہ غلط ہے۔

اور اس سے اگلی شق میں لکھا ہے۔

> حضورؐ کی سیرت کا صحیح معیار خود قرآن کریم ہے۔

اسے بھی چھوڑیئے۔ اگر معاصر موصوف طلوع اسلام کی آخری اشاعت (یعنی نومبر ۱۹۵۸ء کا پرچہ) ہی ملاحظہ کر لیتا تو اس کے صـ ۳۹ پر اسے یہ عبارت نظر آجاتی۔

> مختصر الفاظ میں۔ جو فیصلہ، جو عقیدہ، جو نظریہ یا سیرت طیبہ کے متعلق جو روایات قرآن کے خلاف ہو یا حضورؐ کی شان کے خلاف۔ ہم اسے صحیح نہیں سمجھتے۔ نہ حضورؐ کا کوئی حکم قرآن کے خلاف ہو سکتا تھا نہ کوئی قول یا فعل اس کے خلاف
>
> بالفاظ دیگر دینی امور اور کوائفِ سیرتِ مقدسہ میں غلط اور صحیح کا معیار قرآن ہے۔

کیا معاصر موصوف اتنی جرأت سے کام لے گا کہ ہمارے اس مسلک کو اپنے ہاں شائع کر دے۔

صرف ایک کلمہ

آیئے! اگلے ہاتھوں ہم معاصر موصوف کے سامنے اس کی ایک مثال بھی پیش کر دیں۔ منہاج کی ۲۵/۲۸ اکتوبر کی اشاعت میں حسبِ ذیل روایت شائع ہوئی ہے۔

> طلحہ بن عبید اللہؓ کے انتقال کے وقت حضرت ابوبکرؓ تشریف لائے۔ دیکھا کہ چہرہ کا رنگ فق ہے اور بہت لاغر ہوگئے ہیں۔ فرمایا۔ آپ کا رنگ کیوں بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ کہنے لگے۔ ایک بات تھی جو میں نے سرکارِ مدینہ سے سنی تھی لیکن افسوس اس کی پوری تفصیل دریافت کرنے کی نوبت نہ آئی۔ یہ سب پریشانی اور رنج اسی وجہ سے ہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے دریافت کیا کہ وہ کیا بات تھی۔ کہا میں نے حضور

صلے اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنا کہ مجھ کو ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر اس کو موت کے وقت پڑھا جائے تو تمام گناہ اور معاصی معاف ہو جاتے ہیں۔ خواہ مقدار و شمار میں وہ سمندر کے جھاگ کے برابر ہی کیوں نہ ہوں۔ افسوس پھر یہ پوچھنا یاد نہ رہا کہ وہ کونسا کلمہ ہے حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا کہ وہ کلمہ میں بتائے دیتا ہوں وہ ہے۔

لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰه

ہمارے نزدیک یہ روایت اس لیے صحیح نہیں کہ یہ قرآن کے بنیادی اصول (قانون مکافاتِ عمل) کے خلاف جاتی جس کا اعلان ہے کہ فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ، وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ (۹۹/۸-۷) جس نے ایک ذرہ برابر اچھا کام کیا، وہ اس (کا نتیجہ) اپنے سامنے دیکھے گا اور جس نے ایک ذرہ برابر کام کیا اس کا نتیجہ بھی۔" اور ہم نے اسے "عجمی سازش" (یعنی ان لوگوں کی سازش جو مسلمانوں کو اسلام سے بیگانہ بنانے کے درپے تھے) اس لیے کہتے ہیں کہ ان مخالفینِ اسلام کی اسکیم یہ تھی کہ مسلمانوں جیسی یکسر عملی قوم کو، حصول جنت کے ایسے آسان طریقے بتا دیئے جائیں جن سے یہ عمل سے یکسر بے گانہ ہو جائے۔

اب آپ نے اندازہ فرمایا کہ ہمارے نزدیک حق و باطل کا معیار کیا ہے؟

(سنہ ۱۹۵۸ء)

نیز یہ روایت (۱۰/۹۱-۹۰ ، ۴/۱۸-۱۷ ، ۲۹/۲ ، ۳/۱۴۲ ، ۹/۱۶ وغیرہ) کے بھی خلاف ہے

(سنہ ۱۹۸۶ء)

۱۱

تاریخ اور اسلام

ا۔ تاریخ کی اہمیت کراچی سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ۔
(۱) کسی قوم کی زندگی میں تاریخ کی کیا حیثیت ہوتی ہے؟
(۲) مسلمانوں کی تاریخ کس حد تک قابلِ اعتماد ہے؟ اور
(۳) ہمارے ہاں تاریخ کی کونسی کتاب ایسی ہے جس کے مطالعہ کی ہم سفارش کرتے ہیں۔

طلوع اسلام قرآن کریم تاریخِ اقوام کے مطالعہ پر بڑا زور دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کے پیش کردہ حقائق کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان کے سامنے اس کے دور تک کا پورا علم اور اقوام سالقہ کے احوال و کوائف ہوں۔ ان اقوام کی تاریخ سے اس کے سامنے یہ حقیقت آجائے گی کہ اگر کوئی قوم فلاں قسم کی روش زندگی اختیار کرے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا اور فلاں انداز کے مطابق چلے تو اس کا حاصل یہ ہے۔ یہی وہ مقصد ہے جس کے لیے اس نے خود اقوام گذشتہ کی تاریخی سرگزشتوں کو بار بار دہرایا ہے۔

یہ تو رہا دوسری قوموں کی تاریخ کے متعلق، جہاں تک کسی قوم کی اپنی تاریخ کا تعلق ہے اقبال نے کہا ہے کہ اس کی حیثیت ایسی ہی ہے، جیسی ایک فرد کے لیے حافظہ کی حیثیت ہوتی ہے اگر کسی شخص کا حافظہ جاتا رہے تو اس کی سابقہ شخصیت پوری کی پوری محو ہو جاتی ہے اسی طرح اگر کسی قوم کی تاریخ گم ہو جائے تو اس کا قومی تشخص بھی ختم ہو جاتا ہے اور باقی صرف افسانے رہ جاتے ہیں۔ تاریخ ہی وہ رشتہ ہوتا ہے جس سے ایک دور کا انسان اپنے ماضی کے ساتھ وابستہ رہ سکتا ہے اگر یہ رشتہ منقطع ہو جائے تو ماضی کے ساتھ اس کا تعلق بھی ختم ہو جاتا ہے، اس اعتبار سے

ایک قوم کی زندگی میں اس کی تاریخ کو بڑی اہمیت حاصل ہوتی ہے لیکن یہ اہمیت تاریخ کو حاصل ہوتی ہے افسانوں کو نہیں۔ اگر کسی قوم کی تاریخ باقی نہ رہے صرف افسانے رہ جائیں یا اس کی تاریخ میں افسانوں کی آمیزش ہو جائے تو یہ چیز اس قوم کے حق میں نفع بخش ہونے کے بجائے ہلاکت آفریں بن جاتی ہے اس قسم کی افسانوی تاریخ کا وجود اس کے عدم سے زیادہ نقصان رساں ہوتا ہے

مسلمانوں کی تاریخ بہ ہیئتِ مجموعی چار ادوار پر تقسیم کی جاسکتی ہے۔ پہلا دور محمد رسول اللہ والذین معہٗ کا دور ہے جس میں انہیں حکومت و مملکت ہی حاصل نہ تھی بلکہ نوعِ انسانی کے کاروانِ رشد و ہدایت کی قیادت بھی انہی کے حصّے میں تھی اس سے انہیں دنیا کی سرفرازیاں بھی حاصل تھی اور آخرت کی خوشگواریاں بھی، پھر دوسرا دور وہ آیا جس میں ان کا قرآنی نظام زندگی ملوکیت میں بدل گیا۔ اب ان کے پاس دولت و قوت، حشمت و ثروت، حکومت و مملکت تو پہلے سے بھی زیادہ تھی۔ لیکن یہ قوم انسانیت کی امامتِ کبریٰ کی وارث نہیں رہی تھی۔ اس سے اگلا دور وہ ہے جس میں ان کی قوت و دولت اور حکومت و مملکت پر بھی زوال آگیا اور رفتہ رفتہ یہ قوم پستی کی انتہا تک پہنچ گئی اس کے بعد ان کی تاریخ کا چوتھا دور عصرِ حاضر کا دور ہے جس میں ان کے عروقِ مردہ میں پھر سے زندگی کے آثار دکھائی دینے لگے ہیں اور اندازہ ہوتا ہے کہ شاید یہ پھر اپنا کھویا ہوا مقام حاصل کر سکیں۔ اس دور کے مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ معلوم کرے کہ قوم ان مراحل سے کس طرح گذری ہے اور ان تغیرات کے اسباب و علل کیا تھے اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ ان کے سامنے اپنی قوم کی صحیح اور قابلِ اعتماد تاریخ ہو۔

یوں تو ہر قوم کی تاریخ نویسی ایک مشکل فن ہے، لیکن مسلمانوں کی تاریخ کی صورت میں یہ مشکل اور بھی بڑھ جاتی ہے اس لیے کہ تاریخ میں شخصیتیں بہرحال سامنے آئیں گی اور تاریخی شخصیتوں کے متعلق حالت یہ ہے کہ ہماری بعض کے ساتھ عقیدت وابستہ ہے اور بعض کے خلاف جذبۂ عناد ان حالات میں ظاہر ہے کہ ہماری تاریخ کی کتابیں جنبہ داری یا تعصّب سے بمشکل محفوظ ہونگی اس کے علاوہ ان عناصر کو بھی سامنے رکھئے جو اسلام میں تخریب پیدا کرنے کے لیے مصروفِ عمل رہے ہیں۔

اب رہا آپ کا یہ سوال کہ ہم تاریخ کی کتابوں میں سے کونسی کتاب کی سفارش کرتے ہیں

سو اگر آپ کا مقصد یہ ہے کہ ہم تاریخ کی کوئی ایسی کتاب بتائیں جس پہ بالکلیہ اعتماد کیا جا سکے تو معاف رکھیئے ہم اس سے قاصر ہیں۔

جہاں تک دورِ رسالت اور عہدِ صحابہؓ کا تعلق ہے، محفوظ ترین طریقہ یہ ہے کہ آپ ان کی تاریخ کا قرآن کریم کی روشنی میں مطالعہ کریں، اور جو بات قرآن کے خلاف نظر آئے اسے صحیح نہ سمجھیں اس لیے کہ حضور نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم، اور آپ کے صحابہؓ قرآن پر عمل کرتے تھے اس لیے ان کی سیرت کو قرآن کے مطابق ہونا چاہیئے۔

(۱۹۵۵ء)

۲۔ اسلامی تاریخ

ایک صاحب لکھتے ہیں:۔

آپ کہتے ہیں کہ تاریخ ظنی چیز ہے اس لیے وہ یقینی طور پر قابل اعتماد نہیں ہو سکتی لیکن اسلامی تاریخ تو بڑی قابل اعتماد سمجھی جاتی ہے اس کے ذریعہ ہم دنیا کے سامنے اپنے ماضی کو پیش کر سکتے ہیں ہمارے مورخین عام ہسٹوریَنز HISTORIANS کی طرح نہیں تھے وہ تو بڑے بڑے ائمہ تھے وہ رسول اللہ کے زمانے سے قریب تر تھے اس لیے اس تاریخ کو دوسری تاریخ کے برابر نہیں سمجھنا چاہیئے اگر یہ تاریخ نہ ہو تو ہم صحابہ کرامؓ کی سیرت اور کردار کا مطالعہ کہاں سے کریں؟

جواب

تاریخ، تاریخ ہی ہے خواہ وہ مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلموں کی۔ فرق صرف اتنا ہے کہ آپ کی تاریخ کے ساتھ آپ کی عقیدت وابستہ ہوتی ہے، اور دوسروں کی تاریخ کو آپ صرف تاریخ کی حیثیت سے دیکھتے ہیں۔ ورنہ یقینیات کا رتبہ نہ اسے حاصل ہو سکتا ہے نہ اسے۔ ہمارے مؤرخین بھی مورخین ہی تھے۔ امام کا لفظ ہمارے ہاں کی ایک عام اصطلاح تھی۔ اس سے معصومیت اور تقدس متلزم نہیں آتی معلوم ایسا ہوتا ہے کہ آپ نے اپنی تاریخ کا مطالعہ خود نہیں کیا ورنہ آپ تفصیلات دریافت کئے بغیر ہم سے متفق ہوتے۔ آپ نے چونکہ سیرت صحابہؓ کا ذکر کیا ہے اس لیے ہم تاریخ سے صحابہؓ کبار ہی کے متعلق ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔ آپ اسے دیکھئے اور پھر خود ہی فیصلہ فرما لیجئے کہ تاریخ ظنی شے ہے یا یقینی۔

امام محمد بن جریر الطبری ہمارے ہاں تفسیر اور تاریخ دونوں کے امام کہلاتے ہیں ان کی تفسیر ام تفاسیر ہے اسی طرح ان کی تاریخ بھی ام التواریخ ہے یعنی تفاسیر میں ان کی تفسیر سب سے پہلی اور اسلامی

خلیفۂ اوّل کا انتخاب

تاریخ میں ان کی تاریخ اولیت کا سہرا لیے ہوئے ہے[1] یوں کہیئے کہ ہمارے ہاں صحابہؓ سے قریب ترین زمانہ کی مفصل تاریخ یہی ہے اس کے بعد کی تاریخیں بیشتر اسی تاریخ پر مبنی ہیں جیسے بعد کی تفسیریں بالعموم تفسیر طبری ہی کے تتبع میں لکھی گئی ہیں۔ یہ ہے تاریخ طبری کی حیثیت۔ اس میں سے بھی صرف وہ واقعہ لیجئے جو رسول اللہ

---

[1] فٹ نوٹ صفحہ ۳۰۴ پر دیکھیں۔

صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلے پیش آیا یعنی حضرت ابوبکرؓ کے انتخاب خلافت کا واقعہ۔ مختصراً بات یوں بیان کی جاتی ہے کہ حضورؐ کی وفات کے بعد انصار سقیفہ بنی ساعدہ میں جمع ہوئے اور اپنے میں سے حضرت سعدؓ کو خلیفہ منتخب کرنا چاہا اس کے بعد وہاں حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ تشریف لے گئے۔ مسئلہ پیش نظر کے مختلف پہلوؤں پر تقریریں ہوئیں اور بالآخر حضرت ابوبکرؓ متفقہ طور پر خلیفہ منتخب ہو گئے۔ بات اتنی جلدی ختم ہو جانے کی ایک وجہ یہ ہوئی کہ کسی طرف سے یہ تجویز بھی آئی کہ ایک خلیفہ انصار میں سے ہو جائے اور ایک مہاجرین میں سے۔ چونکہ یہ چیز اتحاد ملت اور وحدت مرکز کے اصول کے خلاف تھی۔ جو درحقیقت اسلام کا بنیادی نقطہ تھا اس لیے اس امر کا احساس پیدا ہو گیا کہ مبادا مسئلہ انتخاب ہی ملت میں تفرقے کا موجب نہ بن جائے اس پر سب نے حضرت ابوبکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

اب اس "معرکۂ انتخاب" کی تفصیل امام طبری کے الفاظ میں سنیئے۔ ان کی تاریخ کی جلد اول کے حصہ چہارم کا آغاز اسی واقعہ سے ہوتا ہے، لکھتے ہیں۔

طبری کا بیان

اب ہر طرف سے آ آ کر لوگ ابوبکرؓ کی بیعت کرنے لگے۔ قریب تھا کہ وہ سعدؓ کو روند ڈالتے اس پر سعدؓ کے کسی آدمی نے کہا کہ سعدؓ کو بچاؤ سعدؓ کو نہ روندو۔ عمرؓ نے کہا۔ اللہ اسے ہلاک کرے اس کو قتل کر دو۔ اور خود ان کے سرہانے آ کر کھڑے ہو گئے اور کہا میں چاہتا ہوں کہ تم کو روند کر ہلاک کر دوں۔ سعدؓ نے عمرؓ کی ڈاڑھی پکڑ لی۔ عمرؓ نے کہا چھوڑ دو، اگر اس کا ایک بال بھی بیکا ہوا تو تمہارے منہ میں ایک دانت بھی نہیں رہے گا۔ ابوبکرؓ نے کہا عمرؓ خاموش رہو اس موقع پر نرمی برتنا زیادہ سودمند ہے۔ عمرؓ نے سعدؓ کا پیچھا چھوڑ دیا۔ سعدؓ نے کہا اگر مجھ میں اٹھنے کی طاقت ہوتی تو میں تمام مدینے کے گلی کوچوں کو اپنے حامیوں سے بھر دیتا کہ تمہارے اور تمہارے ساتھیوں کے ہوش و حواس جاتے رہتے اور بخدا اس وقت میں تم کو ایسی قوم کے حوالے کر دیتا جو میری بات نہ مانتے بلکہ میں ان کا

صلا تفسیر اور تاریخ میں طبری سے پہلے بھی کچھ متفرق چیزیں ملتی ہیں لیکن قرآن کی مکمل تفسیر اور مفصل تاریخ سب سے پہلی طبری ہی کی ہے۔ (سابقہ صفحہ کا نوٹ)

اتباع کرتا۔ اچھا اب مجھے یہاں سے اٹھائے چلو ۔۔۔۔۔۔ چند روز ان سے تعرض نہیں کیا گیا۔ اس کے بعد ان سے کہلا بھیجا گیا کہ چونکہ تمام لوگوں نے اور خود تمہاری قوم نے بھی بیعت کر لی ہے تم بھی آکر بیعت کر لو۔ سعدؓ نے کہا کہ یہ نہیں ہو سکتا۔ تا وقتیکہ میں تمہارے مقابلہ میں اپنا ترکش نہ خالی کر دوں۔ اپنے نیزے کو تمہارے خون سے نہ رنگ لوں اور اپنی تلوار سے جس پر میرا بس چلے وار نہ کر لوں اور اپنے خاندان اور قوم کے ان افراد کے ساتھ جو میرا ساتھ دیں تم سے لڑ نہ لوں، ہرگز بیعت نہ کروں گا اس کے بعد سے سعدؓ، ابوبکرؓ کی امامت میں نماز نہ پڑھتے تھے اور نہ جماعت میں شریک ہوتے تھے۔ حج میں بھی مناسک کو ان کے ساتھ ادا نہ کرتے۔ ابوبکرؓ کے انتقال تک ان کی یہی روش رہی۔

یہ ہے تصویر امام طبری کے الفاظ میں ان صحابہؓ کبار کی جن کے متعلق قرآن کی شہادت ہے کہ محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم (۴۸/۲۹) یعنی کفار کے مقابلہ میں نہایت سخت، لیکن آپس میں محبت اور ہمدردی کے پیکر۔ یہ ہیں وہ صحابہؓ جن کا نقشہ اس طرح کھینچا گیا ہے کہ ایک کی داڑھی دوسرے کے ہاتھ میں ہے اور وہ اس کے دانت توڑنے کی دھمکی دے رہے ہیں۔ ایک امیدوار خلیفہ بن گئے ہیں اور دوسرے امیدوار کی کیفیت یہ ہے کہ وہ ان کے خلاف اپنے ترکش کا ہر تیر چلانے کی فکر میں اور اپنی تلوار کو ان کے خون سے رنگین کرنے کی سوچ میں ہیں

فرمائیے کہ اس تاریخ کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ کیا اسے اس لیے صحیح مان لیا جائے کہ اس کے لکھنے والے امام الجریر طبری ہیں اور وہ رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے قریب ترین زمانے میں ہوئے ہیں[1]؟ اگر یہ تاریخ صحیح ہے تو پھر جو کچھ ان بزرگان کرام کے خلاف یورپ کے پادری اور ہندوؤں کے مہاشے لکھتے چلے آرہے ہیں، آپ اس پر چیں بجبیں اور خنجر بدست کیوں ہوتے ہیں۔ ہمارے نزدیک عہد محمدؐ رسول اللہ والذین معہ کی تاریخ کے صحیح اور غلط ہونے کا معیار بھی قرآن کریم ہی ہے۔ اس لئے کہ اس عہد سعادت آگیں کے جو واقعات عبرت و بصیرت کا سامان اپنے اندر رکھتے تھے۔ قرآن نے انہیں اپنے دامنِ حفاظت میں لے لیا ہے یہی اس دور کی سچی تاریخ ہے۔ رہا باقی تاریخ کا وہ حصہ جو اس

---

[1] حالانکہ یہ بھی رسول اللہؐ سے قریب زمانہ کے نہیں ہیں۔ ان کی وفات ۳۱۰ھ میں ہوئی تھی۔

(قرآنی) تاریخ سے مطابقت رکھے۔ یہ وجہ ہے کہ ہم تاریخ کو ظنی قرار دیتے ہیں۔ اور صرف قرآن کو یقینی۔ اس نہج سے کتب روایات بھی درحقیقت کتب تاریخ ہی ہیں اور ان کا بیشتر حصّہ اس سازش کا پیدا کردہ یا اس سے متأثر ہے، جو مسلمانوں کو قرآن سے دور رکھنے یا ان کے رسولؐ اور دست پروردگان حضورؐ رسالت مآب کو ان کے مقام سے گرانے کے لیے عمل میں لائی گئی تھی۔ مثال کے طور پر اسی واقعہ کے ضمن میں دیکھیے کہ تاریخ کے ساتھ روایات میں کیا ہو رہا تھا طبری کی تاریخ میں صحابہ کبارؓ کی سیرت کا وہ نقشہ ہے جسے آپ اوپر دیکھ چکے ہیں۔ انہی صحابہؓ کے متعلق امام بخاریؒ کے مجموعہ روایات میں حسب ذیل "سرٹیفکیٹ" موجود ہے۔

بخاری کتاب انبیاء میں ہے کہ:۔

صحابہؓ کے متعلق بخاری کی روایت

رسول اللہ نے فرمایا کہ قیامت کے دن میرے صحابہؓ میں سے کچھ لوگوں کو بائیں جانب (جہنم کی طرف) لے جانے کا حکم ہوگا تو میں عرض کروں گا کہ یہ تو میرے اصحاب ہیں۔ جواب دیا جائے گا کہ جب آپ ان سے رخصت ہوئے ہیں تو یہ لوگ اسلام سے مرتد ہو گئے تھے تو میں وہی کہوں گا جو ایک نیک بندے عیسیٰؑ نے کہا تھا" میں ان پر اس وقت تک نگراں تھا۔ جب تک میں ان میں موجود تھا..... الخ

یہ ہے صحابہ رسول اللہؐ کے متعلق بخاری شریف کی شہادت..... اب فرمائیے کہ مسلمانوں کی سب سے پہلی تاریخ اور (قرآن کے بعد) سب سے صحیح کتاب کی ان شہادات کے متعلق آپ کا کیا خیال ہے؟ اگر آپ انہیں صحیح تسلیم کرتے ہیں تو آپ جانیں اور آپ کا دل! لیکن ہم سے اس کی توقع نہ رکھیے کہ ہم صحابہ کبارؓ کے متعلق اس قسم کا خیال بھی دل میں لا سکیں۔ خواہ طبرستان اور بخارا کے ہزار امام، اس کی شہادت کیوں نہ دیں۔

سنہ ۱۹۵۳ء

۳۔ قرآن اور تاریخ کی حیثیت

پوچھا گیا ہے کہ قرآنی احکام اور تاریخ کی باہمی حیثیت کیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت مسلمان

جس پریشانی فکر و نظر سے گزر رہا ہے (اور اس کی یہ کیفیت آج سے نہیں صدیوں ہی سے ایسی چلی آرہی ہے) اس کی بنیادی وجہ قرآن اور تاریخ کے صحیح مؤقف (پوزیشن) کا عدم تعین ہے یعنی اس نے دین اور تاریخ کا صحیح صحیح مقام متعین نہیں کیا، جس کی وجہ سے زندگی کی کوئی حقیقت اور دین کا صحیح نظام اس کے سامنے واضح طور پر نہیں آتا۔ جس معاملہ میں دیکھو اختلاف، جس مسئلہ میں غور کرو تشتت و افتراق۔ اگر ہم قرآن کو اس کے صحیح مقام پر رکھیں، اور تاریخ کو اسکی حد سے آگے نہ بڑھنے دیں تو ہماری بہت سی مشکلات کا حل آج ہی ہو جائے۔

قرآن ایک حقیقت ثابتہ ہے۔ ایک یقینی صحیفہ ہے جس کا ایک ایک لفظ بعینہٖ وہی ہے جو نبیٔ اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے حسن وساطت سے نوع انسانی کو ملا۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں، کسی ردوبدل کا امکان نہیں۔ لہذا جو چیز قرآن میں ہے اسے بلا توقف وتامل حتمی اور یقینی تصور کرنا ہوگا یہ ایک مسلمان کا ایمان ہے جس میں کسی کو بھی اختلاف نہیں۔

قرآن کے بعد تاریخ دین ہمارے سامنے آتی ہے۔ تاریخ دین سے مراد یہ ہے کہ عہد رسول اللہ والذین معہٗ میں قرآنی نظام کس طرح متشکل ہوا۔ تاریخ دین کی کتابوں میں کتب احادیث کو خاص اہمیت حاصل ہے کہ ان کی صحت کو عقیدہ میں شامل کیا جاتا ہے۔ چنانچہ بخاری شریف کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ (قرآن کے بعد دنیا میں سب سے زیادہ صحیح کتاب) مانا اور منوایا جاتا ہے۔ لیکن کتب احادیث (یعنی دیگر کتب وتاریخ تو ایک طرف۔ خود کتب احادیث بھی) جس زمانہ میں اور جس انداز سے مرتب ہوئی ہیں وہ اس پر شاہد ہے کہ انہیں کس حد تک حتمی اور یقینی کہا جا سکتا ہے بخاری شریف عہد رسالتمآب سے قریب سوا دو سو سال بعد مرتب ہوئی ہے اور اس کا مدار تمام تران روایات پر مشتمل ہے جنہیں امام بخاریؒ نے لوگوں کی زبانی سنا۔ انہوں نے قریب چھ لاکھ روایات جمع کیں اور انہیں اپنے قیاس سے چھانٹا اور قریب چھ ہزار اپنے مجموعہ میں داخل کیں اب اس سے خود اندازہ فرمایئے کہ جہاں تک حتم و یقین کا تعلق ہے قرآن کے مقابلہ میں تاریخ کی ان "صحیح ترین" کتابوں کی حیثیت بھی کیا رہ جاتی ہے۔

اب اس سے آگے بڑھیے نبیؐ اکرم کی پوری حیات طیبہ، قرآن کے مطابق تھی۔ خود قرآن میں حضورؐ سے ارشاد ہے کہ آپؐ وحی کا اتباع کریں (۱)۔ حضورؐ کا دعویٰ بھی یہی تھا کہ میں قرآن کا اتباع کرتا ہوں (۲)۔ اگر قرآن میں یہ کچھ بصراحت مذکور نہ بھی ہوتا تو بھی اس میں شک وشبہ کی گنجائش نہ تھی کہ حضورؐ کی سیرت طیبہ قرآن کا اتباع تھی اس لئے کہ

اگر رسولؐ بھی اپنی وحی کا اتباع نہیں کرے گا، تو اور کون اس کا اتباع کرے گا۔ رسولؐ کے ساتھ وہ جماعت سامنے آتی ہے، جو رسولؐ کی تربیت یافتہ اور قرآنی نظام کے قیام کی اولین ذمہ دار تھی، ظاہر ہے کہ قدوسیوں کی اس جماعت کی زندگی بھی قرآن ہی کا اتباع تھی۔

تاریخ ظنی ہے

اب اگر ہم دیکھیں کہ قرآن میں ایک حکم ہے اور تاریخ (کتب روایات و سیر) میں نبی اکرمؐ یا صحابہؓ کا کوئی عمل یا قول اس کے خلاف مذکور ہے تو ہمیں اسی نتیجہ پر پہنچنا ہوگا کہ تاریخ نے اس اہم واقعہ کو ہم تک صحیح طور پر نہیں پہنچایا یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ یہ عمل یا قول۔ قرآنی حکم نازل ہونے سے پہلے کا ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسرا نتیجہ ہے ہی نہیں جو قرآن کے ماننے والوں کے نزدیک قابل قبول ہو، اس لیے کہ قرآن حتمی ہے، اور تاریخ ظنی۔ اور جب بھی ظن اور یقین میں تصادم و تنازع ہوگا تو یقین کو بہر حال و بہر نوع صحیح تسلیم کیا جائے۔ ان الظن لا یغنی من الحق شیئاً (۵۳/۲۸)

لیکن ہماری بدبختی کہ ہم نے ظن کو یقین پر غالب قرار دے رکھا ہے چنانچہ یہ چیز ہمارے عقیدہ میں داخل ہیں کہ حدیث، قرآن پر قاضی ہے۔ حتیٰ کہ اس کی ناسخ بھی۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ دین یکسر ظنیات کا مجموعہ بن چکا ہے۔ حتیٰ کہ اس ذات اقدس و اعظم کی حیاتِ طیبہ بھی جو اپنی سیرت کی رفعت اور کردار کی پاکیزگی میں انسانی کمال کے افق اعلیٰ پر فائز المرام ہے۔ ایسے واقعات سے ملوث کر دی ہے جنہیں دیکھ کر نگاہیں زمین میں گڑ جاتی ہیں۔ تفصیل کا یہ موقعہ نہیں۔ اس کے لیے آپ "اصح الکتب بعد کتاب اللہ" یعنی بخاری شریف کو ہی اٹھا کر دیکھیے۔ حقیقت سامنے آجائے گی، احکام و مسائل کو چھوڑیے صرف تاریخی واقعات کو لیجیے، اور سوچئے کہ کیا یہ تاریخ کسی صورت میں بھی قابل اعتماد قرار پا سکتی ہے مثلاً بخاری شریف (کتاب الوضوء) میں ہے۔

> حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ عکل یا عرینہ کے چند آدمی آئے اور مدینہ میں انہیں پیٹ کی بیماری ہوگئی۔ رسول اللہ نے انہیں اونٹنیوں میں جانے اور ان کا دودھ اور پیشاب پینے کا حکم دیا۔ چنانچہ وہ گئے، جب تندرست ہو گئے تو حضورؐ کے چرواہے کو قتل کر کے اونٹنیوں کو ہانک کر لے گئے۔ جب صبح کو آپ کو خبر ہوئی، تو آپ نے ان کے پیچھے آدمی دوڑائے۔ سورج چڑھتے ہی وہ لوگ (گرفتار کر کے) لائے گئے۔ آپ نے حکم دیا کہ ان کے ہاتھ پاؤں کاٹ

دیئے جائیں، سیسہ پگھلا کران کی آنکھوں میں ڈالا جائے اور مقام حرہ میں پھینک دیا جائے۔ وہ لوگ شدت پیاس پانی مانگتے تھے لیکن انہیں پانی نہیں دیا جاتا تھا۔[1]

کیا آپ کا خیال ہے کہ حضورؐ نے انہیں اونٹنیوں کا پیشاب پینے کا حکم دیا ہوگا اور اس ذات رحمۃ اللعالمین نے ان مجرمین کو اسی طرح قتل کروایا ہوگا۔ جس طرح اس حدیث میں مذکور ہے؟ یا مثلاً کعب بن اشرف کے واقعہ قتل کو لیجئے، جو بخاری کی ایک حدیث میں شرح و بسط سے مذکور ہے۔ مختصراً یہ کہ حضورؐ نے فرمایا کہ "کعب بن اشرف نے خدا اور اس کے رسولؐ کو تکلیف دی ہے۔ لہٰذا اس کو کون قتل کرے گا۔ محمد ابن مسلمہ نے کھڑے ہو کر عرض کیا کہ یا رسولؐ اللہ! کیا آپ چاہتے ہیں کہ میں اسے قتل کر دوں؟ فرمایا۔ ہاں! ابن مسلمہ نے عرض کیا کہ پہلے مجھے اس سے بات بنانے کی اجازت دیجئے۔ فرمایا۔ جو تدبیر چاہو کر دو۔" چنانچہ اس کے بعد اس بات بنانے اور تدبیر کرنے" کی پوری تفصیل موجود ہے کہ حضرت مسلمہؓ نے کس طرح کعب بن اشرف کو بہانہ سازی اور فریب دہی سے بلایا اور اس کے سر کی خوشبو سونگھنے کے بہانے سے اسے قتل کر دیا۔

ظاہر ہے کہ حضور سرور کائناتؐ یا صحابہ کبارؓ تو ایک طرف، دشمن کو اس طرح بہانہ سازی سے قتل کرنا عام عربوں کی قومی خصوصیات کے بھی منافی تھا۔ اسلام نے آکر انہیں مکارم اخلاق کی جن بلندیوں پر کھڑا کر دیا تھا۔ اسے سورج کی آنکھ نے دوبارہ نہیں دیکھا۔ لیکن ان کا تو زمانہ جاہلیت میں بھی یہ عالم تھا کہ ان کی دوستی اور دشمنی بالکل للکار کر ہوتی تھی۔ خدع و دنائت ان کے قومی خصائص کے منافی تھا۔ لہٰذا ظاہر ہے تاریخ کا یہ واقعہ قطعاً قابل اعتماد نہیں۔

یا مثلاً بخاری شریف میں ہے کہ:۔

حضرت عمرؓ کہتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ نے محمدؐ کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے اور اب ان پر کتاب نازل کی۔ اس میں سنگساری (زنا کی سزا میں رجم) کی آیت موجود ہے۔

قرآن ہمارے پاس موجود ہے، اس میں سنگساری کی آیت کہیں نہیں۔ اب اگر کوئی شخص اس روایت سے یہ دلیل لے آئے کہ جو قرآن اس وقت ہمارے پاس موجود ہے یہ وہ قرآن نہیں جو حضرت عمرؓ کے زمانہ میں تھا۔ اس قرآن میں اس سے کچھ زیادہ بھی تھا، تو یہ دلیل اس لیے غلط ہوگی کہ قرآن اپنی حفاظت کے لیے

---

[1] ہم نے احتیاطاً ترجمہ بھی خود نہیں کیا" مولانا مولوی حکیم دائم صاحب جلالیؒ کے مطبوعہ ترجمہ کو نقل کر دیا ہے۔

نعوذ اللہ تعالیٰ کو ذمہ دار بتاتا ہے اور یہ روایت اس حفاظت کی تکذیب کرتی ہے یا مثلاً ازواج نبی اکرمؐ کے سلسلہ میں بخاری میں یہ روایت ہے کہ فتح خیبر کے بعد (حضرت صفیہؓ) کے حسن وجمال کا چرچا حضورؐ تک پہنچا تو حضورؐ نے (قیدیوں میں سے) انہیں اپنے لیے انتخاب فرما لیا۔ فرمایئے اگر ہم اس تاریخی بیان کو صحیح مان لیں تو بات کہاں تک جا پہنچتی ہے۔ یا بخاری کی یہ روایت کہ "حضورؐ اپنی گیارہ (یا نو۹) ازدواج مطہرات کا دورہ ایک شب میں فرما لیا کرتے تھے، چنانچہ جب لوگوں کو اس روایت پر تعجب ہوا تو اس کے راوی (حضرت انسؓ) نے ان سے کہا کہ اس میں تعجب کی کونسی بات ہے۔ نبی اکرمؐ میں تیس آدمیوں کی قوت رجولیت تھی۔

اس بیان سے ہمارا مقصود یہ ہے کہ تاریخ کے واقعات ظنی ہوتے ہیں اس لیے انہیں کسی حتمی نتیجہ کا مدار نہیں قرار دینا چاہیئے اور جب صورت یہ ہے تو قرآن کی تفسیر تاریخی واقعات کے تحت بھی نہیں کرنی چاہیئے تاریخی واقعات کو ہمیشہ قرآن کے تابع رکھنا چاہیئے[1]

ممکن ہے یہاں کہہ دیا جائے کہ اس صورت میں تاریخ کی کوئی حیثیت ہی باقی نہیں رہتی یہ درست ہے۔ ظنی علم کی حیثیت دوسرے ظنی علم کے مقابلہ میں باقی رہ سکتی ہے۔ یقینی علم کے مقابلہ میں اس کی کیا حیثیت رہ سکتی ہے؟ باقی دنیا کو اس لیے تاریخ پر بھروسہ کرنا پڑتا ہے کہ ان کے پاس یقینی علم کہیں بھی نہیں ہوتا اقوامِ عالم میں یہ خصوصیتِ کبریٰ صرف مسلمانوں کو حاصل ہے کہ ان کے پاس چودہ سو سال سے ایک ایسا یقینی صحیفہ موجود ہے جس کا ایک ایک حرف اپنی جگہ پر ہمالیہ سے بھی زیادہ پائیدار اور محکم ہے۔ لہٰذا ہمیں اس یقینی ذریعہ علم کو چھوڑ کر ظنی ذریعہ علم کو دلیل وحجت بنانے کی کیا ضرورت ہے۔ جس دن مسلمانوں نے اس حقیقت کو بے نقاب دیکھ لیا اسی دن ان کی قسمت بدل جائے گی۔ اس لئے کہ اس کے بعد ان کا دین پھر اپنے اصلی اور یقینی خطوط پر متشکل ہو جائے گا اور اپنے فطری نتائج سے انہیں اقوامِ عالم کی امامت و قیادت کا مستحق بنا دے گا۔

امام حسنؓ اور تاریخ | محترم مستفسر نے رسول اکرمؐ کے نواسہ امام حسنؓ کی شادیوں اور طلاقوں کا

---

[1] ہمارے ہاں اس قسم کی سیرت کوئی نہیں لکھی گئی جس میں تاریخ کو قرآن کے تابع رکھا گیا ہو۔ معراجِ انسانیت اس قسم کی پہلی کوشش ہے جس میں حضورؐ کی سیرتِ طیبہ کو قرآنی اصولوں کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے۔ اور تاریخ کو اسی حد تک قابلِ اعتماد سمجھا گیا ہے۔ جہاں تک وہ قرآن کے تابع جاتی ہے۔

ذکر بھی فرمایا ہے، یہ درست ہے کہ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ انھوں نے سو سے زیادہ بیویاں کیں اور انہیں طلاقیں دیں اور دوسری طرف حدیث میں یہ بھی ہے کہ طلاق کو حضورؐ نے بہت ناپسندیدہ عمل (البغض) قرار دیا ہے اب فرمائیے کہ تاریخ کے ان بیانات کی روشنی میں رسول اللہ کے نواسہ حضرت امام حسنؓ کے متعلق آپ کس نتیجہ پر پہنچتے ہیں؟

یزید کے متعلق روایات

اور اگر تاریخ کا اس سے بھی زیادہ دلچسپ واقعہ سننا ہو تو وہ بھی سن لیجئے، بخاری شریف میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میری اُمت کا پہلا لشکر جو قیصر کے شہر (قسطنطنیہ) پر حملہ کرے گا، وہ بخشا جا چکا ہے۔ (اول جیش من اُمتی یغزون مدینۃ قیصر مغفور لھم۔ بخاری) اور تاریخ اس پر شاہد کہ جس پہلے لشکر نے قسطنطنیہ پر حملہ کیا تھا اس کے ایک دستہ کا سپہ سالار یزید (ابن معاویہؓ) تھا ۱۹۵۳ء

۴۔ صدر اوّل کی تاریخ میں کیا ہے

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ جنوری ۱۹۵۹ء کے طلوع اسلام میں آپ نے تاریخ اور قرآن کے عنوان سے جو شذرہ لکھا ہے وہ مختصر ہونے کے باوجود بڑا پُرمغز، حقیقت کشا اور دین کے سمجھنے میں صحیح رہنمائی دینے والا ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ آپ کم از کم ہمارے پہلے دور (عہد محمد رسول اللہ والذین معہ) کی تاریخ کے ان واقعات کو بھی سامنے لاتے جو قرآن کے خلاف جاتے ہیں اور اس لیے اس قابل نہیں کہ انہیں صحیح تسلیم کر لیا جائے۔ اگر آپ اتنی تفصیل میں نہیں جا سکتے تو مثال کے طور پر کچھ واقعات ایسے بیان کر دیجئے جن سے اس امر کی وضاحت ہو جائے۔ یہ چیز میری طرح اور بہت سے قارئین کے لیے بڑے فائدے کا موجب ہو گی۔

طلوع اسلام

ہم اس سے متفق ہیں (اور اس چیز کی اہمیت کو کئی بار سامنے لا چکے ہیں) کہ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم (کم از کم) قرن اوّل کی تاریخ کا جائزہ قرآن حکیم کی روشنی میں لیں اور ان تمام واقعات کو، جو قرآن کی تعلیم کے خلاف جاتے ہیں۔ تاریخ سے خارج کر کے اسے از سر نو مرتب کریں لیکن یہ ظاہر ہے کہ اول تو یہ کام کسی ایک فرد یا ادارہ کے کرنے کا

نہیں۔ پوری ملت کے کرنے کا ہے۔ اس لیے کہ یہ کوشش اسی صورت میں مفید ہو سکتی ہے جب اس قسم کی تاریخ مرتب ہو جانے کے بعد، سابقہ کتب تاریخ کو نا قابل اعتماد قرار دے کر، اس جدید تاریخ کو دنیا میں رائج کیا جائے اور یہ کام بین الملی حیثیت ہی سے ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر کوئی ادارہ اس کام کو از خود کرنا چاہے تو اس کے پاس بڑے وسیع ذرائع ہونے چاہئیں۔ ادارہ طلوع اسلام کے پاس وہ ذرائع کہاں ہیں؟

باقی رہا اس عہد کی تاریخ سے کچھ مثالیں پیش کرنے کا سوال، سو اس کے لیے بہت دور جانے کی ضرورت نہیں، نبی اکرمؐ کی وفات کے بعد جو پہلا واقعہ تاریخ میں مذکور ہے (بلکہ یوں کہیئے کہ جس کا آغاز حضورؐ کی حیات ارضی کے آخری لمحات ہی میں ہو گیا تھا) وہی اس حقیقت کی بین مثال ہے اس واقعہ کو سامنے لانے سے پہلے تمہیداً اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآنی تعلیم کا بنیادی تصور یہ ہے کہ:۔

۱۔ ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب التکریم ہے۔
۲۔ مدارج کا معیار انسان کا ذاتی جوہر اور حسن عمل ہے۔
۳۔ خون اور رنگ (قبیلہ، نسب، قوم) کے امتیازات یا نسلی تفاخر کا تصور یکسر غیر قرآنی ہے
۴۔ ملت کے معاملات، باہمی مشورہ سے طے ہونے چاہئیں۔
۵۔ ملوکیت۔ یعنی حکومت کا ورثہ میں ملنا غیر قرآنی تصور ہے۔

خلیفہ کا انتخاب باہمی مشورہ سے ہونا چاہیئے۔

قرآن کی یہ وہ تعلیم ہے جس میں کسی کو اختلاف نہیں ہو سکتا یہی وہ تعلیم تھی جسے نبی اکرمؐ زندگی بھر عام کرتے اور اس پر عمل کر کے دکھاتے رہے۔ یہی وہ تعلیم تھی جسے صحابہ کبارؓ نے حاصل کیا اور اس پر عمل پیرا رہے۔ ان حقائق کی روشنی میں کیا کوئی شخص اس کا تصور بھی کر سکتا ہے کہ یہی صحابہؓ رسول اللہ کی وفات کے چند ثانیہ بعد (بلکہ حضورؐ کی وفات سے بھی پہلے) خدانہ کردہ ایسی روش اختیار کر لیں گے جو قرآن کی اس بنیادی تعلیم اور نبی اکرمؐ کی حیات طیبہ کے پورے پروگرام کے خلاف ہو، کوئی مسلمان اس کا تصور نہیں کر سکتا۔ لیکن دیکھئے کہ ہماری تاریخ اس باب میں کیا کہتی ہے۔

حضرت علیؓ اور مسئلہ خلافت

بخاری شریف میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے اس بیماری میں جس میں آپؐ نے وفات فرمائی، علی ابن ابی طالبؓ

رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس سے باہر آئے تو لوگوں نے ان سے پوچھا۔ ابوالحسنؓ رسول اللہ نے کس حال میں صبح فرمائی۔ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ الحمد للہ اچھی حالت میں صبح فرمائی ہے۔ عباسؓ بن عبدالمطلب ان کا ہاتھ پکڑ کر ایک طرف کو لے گئے اور ان سے کہنے لگے۔ خدا کی قسم تین دن کے بعد تم لاٹھی کے غلام ہو گے۔ بخدا میرا یہ خیال ہے کہ رسول اللہ کا اپنی اس بیماری میں انتقال ہو جائے گا۔ میں خوب پہچانتا ہوں کہ عبدالمطلب کی اولاد کے چہرے مرتے وقت کیسے ہوتے ہیں۔ چلو۔ رسول اللہ کے پاس چلیں، اور آپ سے دریافت کر لیں کہ آپ کے بعد حکومت کن لوگوں میں ہوگی۔ اگر ہم میں ہوئی تو ہمیں معلوم ہو جائے گا اور اگر ہمارے سوا دوسرے لوگوں میں ہوئی تو بھی ہمیں معلوم ہو جائے گا اور آپ جانشین کو ہمارے حق میں وصیت فرما دیں گے۔ (اس پر حضرتؓ علیؓ نے فرمایا کہ کیا اس امر کی طمع ہمارے سوا کسی دوسرے کو بھی ہو سکتی ہے؟ عباسؓ نے فرمایا کہ میرا خیال ہے کہ خدا کی قسم ایسا ضرور ہو گا) اس پر علیؓ نے کہا کہ خدا کی قسم اس بارہ میں اگر ہم نے رسول اللہ سے پوچھ لیا اور آپ نے انکار کر دیا تو آپؐ کے بعد لوگ پھر ہمیں حکومت کبھی بھی نہیں دیں گے۔ خدا کی قسم میں اس بات کو رسول اللہ سے ہرگز نہیں پوچھوں گا۔ (صحیح بخاری ج ۲ ص ۶۳۹)

اس روایت سے ظاہر ہے کہ (تاریخ کی رو سے) ابھی حضور صلعم کا انتقال بھی نہیں ہوا تھا کہ آپ کی جانشینی کا سوال بنو ہاشم میں سے حضرت عباسؓ اور حضرت علیؓ کے دل میں پیدا ہونا شروع ہو گیا تھا۔ حضرت علیؓ مطمئن تھے کہ خلافت کسی اور کے پاس نہیں جائیگی لیکن حضرت عباسؓ کا انداز کچھ اور تھا اس لیے وہ اس بارے میں نبی اکرمؐ سے تصریح کرا لینا ضروری سمجھتے تھے اس پر حضرت علیؓ کی طرف جو جواب منسوب کیا گیا ہے وہ قابل غور ہے یعنی "بخدا اگر اس بارے میں ہم نے رسول اللہ سے پوچھ لیا اور آپ نے انکار کر دیا تو آپؐ کے بعد لوگ ہمیں کبھی بھی حکومت نہیں دیں گے"

اب آگے بڑھیے۔ رسول اللہ اس دنیا سے تشریف لے گئے آپ نے اپنے جانشین کے متعلق کوئی وصیت نہیں فرمائی۔ امت کو پہلی مرتبہ امیر ملت کے انتخاب سے واسطہ پڑا۔ رسول اللہ کی ہنوز تجہیز و تکفین بھی نہیں ہوئی تھی کہ سقیفہ بنی ساعدہ میں انصار کا ایک اجتماع ہوا جس میں حضرت سعدؓ بن عبادہ کو خلافت کا امیدوار قرار دیا گیا۔ وہیں

بیعت حضرت ابوبکر صدیقؓ

یہ تجویز بھی سامنے لائی گئی کہ ایک امیر انصار میں سے ہو اور ایک قریش (مہاجرین) میں سے۔ اس وقت مہاجرین حضرت

ص: بین القوسین عبارت بخاری میں نہیں ہے مگر علامہ عینی نے مراسیل شعبی سے اس اضافہ کو نقل کیا ہے۔

ابوبکرؓ۔ حضرت عمرؓ۔ اور دیگر صحابہؓ) بھی وہاں تشریف لے گئے۔ اس اجتماع کی جو روئیداد تاریخ نے بیان کی ہے اس میں کہا گیا ہے کہ حضرت حباب بن منذرؓ نے حسب ذیل تقریر فرمائی۔

"اے انصار! امارت اپنے ہاتھوں ہی میں رکھو، کیونکہ لوگ تمہارے مطیع ہیں۔ کسی شخص میں یہ جرأت نہ ہوگی کہ وہ تمہارے خلاف آواز اٹھا سکے یا تمہاری رائے کے خلاف کوئی کام کر سکے تم اہل عزت و ثروت ہو۔ تم تعداد اور تجربے کی بنا پر دوسروں سے بڑھ چڑھ کر ہو۔ تم بہادر اور دلیر ہو۔ لوگوں کی نگاہیں تمہاری طرف لگی ہوئی ہیں۔ ایسی حالت میں تم ایک دوسرے کی مخالفت کرکے اپنا معاملہ خراب نہ کرو۔ یہ لوگ تمہاری بات ماننے پر مجبور ہیں۔ زیادہ سے زیادہ رعایت جو ہم انہیں دے سکتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک امیر ہم میں سے اور ایک ان میں سے۔" (محمد حسین ہیکل کی کتاب "ابوبکر صدیق اکبرؓ" صفحہ ۱۰۱)

اس کے جواب میں حضرت عمرؓ کی طرف حسب ذیل تقریر منسوب کی گئی ہے۔

"ایک میان میں دو تلواریں جمع نہیں ہو سکتیں۔ اللہ کی قسم! عرب تمہیں امیر بنانے پر ہرگز رضامند نہ ہوں گے۔ جب رسول اللہؐ تم میں سے نہ تھے۔ ہاں اگر امارت ان لوگوں کے ہاتھوں میں آئے جن میں رسول اللہ مبعوث ہوئے تھے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہوگا۔ اگر عربوں کے کسی طبقے نے ہماری امارت اور خلافت سے انکار کیا تو اس کے خلاف ہمارے ہاتھ میں دلائل ظاہرہ اور براہین قاطعہ ہوں گے۔ رسول اللہ کی جانشینی اور امارت کے بارے میں کون شخص ہم سے جھگڑا کر سکتا ہے۔ جب ہم آپ کے جان نثار اور اہل عشیرہ ہیں۔ اس معاملہ میں ہم سے جھگڑا کرنے والا وہی ہو سکتا ہے جو باطل کا پیروکار، گناہوں سے آلودہ اور ہلاکت کے گڑھے میں گرنے کے لیے تیار ہو۔"

دوسرے مقام پر ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے یہ حدیث پیش کی گئی کہ رسول اللہؐ نے فرمایا تھا کہ **الائمہ من قریش** یعنی خلافت قریش میں رہے۔ اس پر انصار خاموش ہو گئے اور ابوبکرؓ خلیفہ منتخب کر لیے گئے۔

آپ غور کیجئے کہ یہ جو کہا گیا ہے کہ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ہم رسول اللہؐ کے اہل خاندان ہیں۔ اس لیے خلافت کے ہم حقدار ہیں اور پھر یہ حدیث کہ خلافت قریش میں رہے گی۔ کس طرح قرآن کی اس بنیادی تعلیم کے خلاف

جاتی ہے۔ جس کی عملی تبلیغ نبی اکرمؐ ساری عمر فرماتے رہے۔

اور آگے بڑھئے۔ تاریخ یہ بتاتی ہے کہ جب لوگ حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کے لیے ہجوم کر کے آگے بڑھنے لگے تو انصار میں سے ایک نے کہا کہ:۔

دیکھو سعدؓ تمہارے پاؤں کے نیچے نہ روندے جائیں۔

اس پر حضرت عمرؓ نے کہا۔

وہ ہے ہی روندے جانے کے قابل۔ اللہ اسے ذلت نصیب کرے۔ (ص۱۱۴)

تاریخ میں یہ بھی مذکور ہے کہ حضرت سعدؓ نے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی۔

وہ نہ ان کے ساتھ نماز پڑھتے اور نہ ان کے ساتھ شامل ہو کر حج کے ارکان بجالاتے (ص۱۱۵)

یہ ہے ہماری تاریخ کی رو سے، باہمی تعلقات کا نقشہ ان صحابہؓ کا جن کے متعلق قرآن یہ سارٹیفکیٹ دیتا ہے کہ اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ۔ وہ کفار کے مقابلہ میں بڑے سخت اور آپس میں بہت ہمدرد تھے۔ ($\frac{48}{29}$)

حضرت علیؓ کا مؤقف

یہ تو رہی اس اجتماع کی روداد۔ اب یہ دیکھئے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت کے متعلق حضرت علیؓ (اور دیگر ارباب بنو ہاشم) کا رد عمل (تاریخ کی رو سے) کیا تھا۔ ہیکل اپنی کتاب میں لکھتا ہے:۔

یعقوبی نے بیان کیا ہے کہ مہاجرین و انصار میں سے ایک جماعت نے ابوبکرؓ سے بیعت نہیں کی اور ان کا میلان علیؓ بن ابی طالب کی طرف تھا۔ ان میں عباسؓ بن عبدالمطلب، فضل ابن عباس، زبیر ابن العوامؓ ابن العاص، خالد بن سعید، مقداد بن عمر، سلمان فارسی، ابو ذر غفاری عمار بن یاسر براء بن عازب اور ابی بن کعب رضی اللہ عنہم شامل تھے۔

ابوبکرؓ نے عمرؓ بن الخطابؓ، ابو عبیدۃ ابن الجراح اور مغیرۃؓ بن شعبہ سے ان لوگوں کے بارہ میں مشورہ کیا۔ انہوں نے حضرت صدیقؓ کو عباسؓ ابن عبدالمطلب سے ملاقات کرنے کا مشورہ دیا چنانچہ ابوبکرؓ نے ایسا ہی کیا۔ صدیق اکبرؓ نے اپنی طویل گفتگو میں حضرت عباسؓ سے کہا ہم آپ کے پاس اس لیے آئے ہیں کہ اس امر خلافت میں آپ کا حصہ بھی ہونا چاہیئے جو آپ کو اور آپ کی اولاد کو برابر ملتا رہے۔ کیونکہ آپ بہر حال رسول اللہ کے چچا ہیں۔ یعقوبی نے حضرت عباسؓ

کی گفتگو بیان کرتے ہوئے ان کا یہ جواب نقل کیا ہے

"اگر حکومت ہمارا حق ہے تو ہم اس پر راضی نہیں کہ کچھ لیں اور کچھ چھوڑ دیں"۔

ایک روایت میں یہ بھی موجود ہے جسے یعقوبی اور دوسرے بہت سے مورخین نے نقل کیا ہے اور یہ روایت آج تک برابر مشہور چلی آ رہی ہے کہ مہاجرین و انصار کی ایک جماعت حضرت فاطمہؓ کے مکان میں حضرت علیؓ کے پاس جمع ہوئی۔ جو حضرت علیؓ سے بیعت کرنا چاہتی تھی۔ ان میں خالدؓ بن سعید بھی تھے، جنہوں نے فرمایا، "خدا کی قسم! لوگوں میں کوئی بھی محمدؐ کی جانشینی کا تم سے زیادہ حقدار نہیں ہے"۔

ابو بکرؓ و عمرؓ کو حضرت فاطمہؓ کے مکان میں ان لوگوں کے اجتماع کی خبر ہوئی تو وہ ایک جماعت کے ساتھ وہاں پہنچے۔ حضرت عمرؓ نے ان کو پکڑ کر پچھاڑ دیا اور ان کی تلوار توڑ ڈالی اور یہ لوگ مکان کے اندر گھس گئے۔ حضرت فاطمہؓ نکلیں، اور انہوں نے پکار کر کہا، "خدا کی قسم! تم لوگ یا تو باہر نکل جاؤ۔ ورنہ میں اپنے بال پراگندہ کر کے خدا کے سامنے فریاد و زاری اور بددعا کروں گی!"

حضرت فاطمہؓ کی اس دھمکی پر گھر میں جس قدر لوگ تھے۔ سب ایک دم باہر نکل گئے یہ لوگ کچھ دن تک تو یونہی رہے پھر یکے بعد دیگرے آہستہ آہستہ حضرت ابو بکرؓ کی بیعت کرنے چلے گئے۔ مگر حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کے انتقال تک۔ یعنی چھ ماہ تک۔ بیعت نہیں کی اور ایک روایت کے مطابق یہ بھی کہا جاتا ہے کہ نہیں چالیس روز کے بعد انہوں نے بیعت کر لی تھی

حضرت علیؓ اور بنو ہاشم کے تخلف کے بارہ میں جو روایت سب سے زیادہ مشہور اور شائع و ذائع ہے۔ یہ وہ روایت ہے جسے ابن قتیبہ نے (اپنی کتاب) الامامۃ والسیاست میں بیان کیا ہے۔ اسے اور اسی قسم کی دوسری روایتوں کو ان کے معاصرین اور متاخرین نے بھی بیان کیا ہے وہ روایت یوں ہے کہ حضرت عمرؓ ایک جماعت کے ساتھ ابو بکرؓ کی بیعت کی تکمیل کے بعد بنو ہاشم کے پاس گئے اور ان سے مطالبہ کیا کہ باہر نکل کر جیسا کہ تمام لوگوں نے بیعت کر لی ہے وہ بھی بیعت کر لیں۔ بنو ہاشم اس وقت حضرت علیؓ کے مکان میں مجتمع تھے۔ بنو ہاشم اور ان کے تمام ہم نواؤں نے عمرؓ کی دعوت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ بلکہ زبیر بن العوامؓ ہاتھ میں تلوار لیے عمرؓ اور

ان کے ساتھیوں کی طرف نکلے۔ عمرؓ نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ ان کو پکڑ لو۔ چنانچہ لوگوں نے ان کے ہاتھ سے تلوار چھین لی اور انہوں نے جاکر بیعت کر لی۔ علیؓ ابن ابی طالب سے کہا گیا کہ ابوبکرؓ سے بیعت کر لو۔ علیؓ نے جواب دیا۔ میں تم سے بیعت نہیں کر سکتا۔ تمہاری بہ نسبت میں امر خلافت کا زیادہ حقدار ہوں اور تم لوگوں کو مجھ سے بیعت کرنا چاہیئے۔ تم لوگوں نے یہ امر خلافت انصار سے لیا ہے اور نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اپنی قرابت سے استدلال کیا ہے۔ تم لوگ اہل بیت سے خلافت کو غصباً چھیننا چاہتے ہو۔ کیا تم نے انصار سے یہ نہیں کہا کہ تم ان کی نسبت خلافت کے اس لیے زیادہ حقدار ہو کہ محمدؐ تم میں سے تھے۔ اسی بنا پر انہوں نے تمہیں قیادت و امامت سونپ دی؟ لہٰذا اب میں بھی تمہارے خلاف اسی دلیل سے استدلال کرتا ہوں جس دلیل سے تم نے انصار کے مقابلہ میں استدلال کیا تھا۔ ہم زندگی اور موت ہر دو حال میں رسولؐ اللہ سے زیادہ قریب ہیں۔ اگر تم میں ایمان ہے تو انصاف سے کام لو۔ ورنہ اس ظلم کے نتیجہ کے لیے تیار رہو اور وہ نتیجہ تم جانتے ہو۔

حضرت عمرؓ نے کہا "جب تک تم بیعت نہ کر لو تمہیں یوں نہیں چھوڑا جا سکتا"

حضرت علیؓ نے گرمی اور شدت کے ساتھ جواب دیا۔ اونٹنی کا دودھ دوھ لو، آدھا تمہیں مل جائے گا اور آج اس کا تھن باندھ کر چھوڑ دو تاکہ باقی کل مل جائے۔

ابوبکرؓ کو ڈر ہوا کہ ان کی تیز کلامی کہیں شدت اختیار نہ کرے۔ لہٰذا وہ دونوں کے بیچ میں آ گئے اور حضرت علیؓ سے انہوں نے فرمایا۔ اگر تم بیعت نہیں کرتے تو میں تمہیں مجبور نہیں کرتا۔"

اس کے بعد ابوعبیدہ بن الجراح حضرت علیؓ کے پاس گئے اور نرمی سے ان کو سمجھایا اور کہا۔ "بھیا! تم نوعمر ہو۔ یہ لوگ تمہاری قوم کے بوڑھے ہیں۔ نہ تمہیں ان جیسا تجربہ ہے نہ معاملات کی پہچان ہے۔ میں یقیناً یہ سمجھتا ہوں کہ امر خلافت کے لیے ابوبکرؓ تم سے زیادہ قوی اہل اور موزوں شخص ہیں۔ لہٰذا اس امر کو تم ان ہی کے حوالہ کر دو۔ اگر تم زندہ رہے اور تمہاری عمر نے وفا کی تو اس میں شبہ نہیں کہ تم فضل، دین، علم، فہم، سبقت اسلام، نسب اور قرابت کے اعتبار سے ہر طرح اس کے اہل ہو۔"

اس پر حضرت علیؓ برافروختہ ہو کر بولے۔ مہاجرین کی جماعت اللہ سے ڈرو۔ اللہ سے ڈرو عرب پر محمدؐ کی سلطنت کو اس کے گھر اور اس کے مخزن سے نکال کر اپنے گھروں اور اپنے حفاظت خانوں میں نہ لے جاؤ اور سلطنت والوں کو ان کے مقام اور حق سے نہ ہٹاؤ۔ خدا کی قسم اے مہاجرین! ہم اس کے زیادہ حقدار ہیں۔ کیونکہ ہم اہل بیت ہیں اور جب تک ہم میں کتاب اللہ کے پڑھنے والے۔ رسول اللہ کی سنتوں کو جاننے والے، امر رعیت کا لحاظ رکھنے والے، ان سے برائیوں کو دور کرنے والے، ان کے درمیان مساوات کے ساتھ اموال کو تقسیم کرنے والے موجود ہیں ہم ہی امر خلافت کے مستحق ہیں۔ خدا کی قسم خلافت ہم ہی میں ہے۔ تم لوگ خواہشات کی پیروی کر کے اللہ کی راہ سے گمراہ نہ ہو جاؤ کہ اس طرح تم حق سے دور ہوتے چلے جاؤ گے۔

روات کا بیان ہے کہ بشیر بن سعد اس گفتگو کے وقت موجود تھے انہوں نے یہ باتیں سنیں تو انہوں نے کہا۔ اے علیؓ! اگر انصار نے یہ باتیں ابو بکرؓ کے ہاتھ پر بیعت کر لینے سے پہلے سن لی ہوتیں تو وہ کبھی تمہارے بارے میں اختلاف نہ کرتے۔

حضرت علیؓ یہاں سے غصہ میں بھرے ہوئے نکلے اور رات کے وقت حضرت فاطمہؓ کو ایک سواری پر سوار کر کے ساتھ لیا اور انصار کی مجالس میں گھومنا شروع کر دیا حضرت فاطمہؓ نے انصار سے مدد مانگی تو وہ جواب میں کہتے تھے۔ اے رسول اللہ کی صاحبزادی! ہم اس شخص (ابو بکرؓ) کے ہاتھ پر بیعت کر چکے ہیں۔ اگر تمہارا شوہر اور چچیرا بھائی ابو بکرؓ سے پہلے آجاتا تو ہم اسے ہرگز نہ چھوڑتے۔

حضرت علیؓ کا غصہ اس جواب پر اور بھی تیز ہو گیا اور انہوں نے جواب دیا۔ کیا میں رسولؐ اللہ کو بلا دفن گھر میں چھوڑ کر چلا آتا اور سلطنت کیلئے لوگوں سے جھگڑتا پھرتا؟

اس پر حضرت فاطمہؓ فرماتی ہیں۔ "ابوالحسن (علیؓ) نے وہی کچھ کیا جو ان کو زیبا تھا اور لوگوں نے وہ کچھ کیا جس کا خدا کو جواب اور حساب دیں گے۔

اس واقعہ کے متعلق بخاری میں حسب ذیل روایت ملتی ہے۔

حضرت فاطمہؓ نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد چھ ماہ تک زندہ رہیں جب ان کا انتقال ہوا تو ان کے شوہر حضرت علیؓ نے رات کو ان کو دفن کر دیا اور ان کے انتقال کی ابو بکرؓ کو اطلاع

نہیں دی بلکہ خود ہی نماز پڑھ لی۔ اور جب تک حضرت فاطمہؓ زندہ رہیں، لوگوں کی نگاہوں میں حضرت علیؓ کا ایک خاص وقار رہا۔ لیکن جب حضرت فاطمہؓ کا انتقال ہوا تو حضرت علیؓ نے محسوس کیا کہ لوگوں کے چہرے اب بدل گئے ہیں تو اب انہوں نے ابوبکرؓ سے صلح کر لینے اور بیعت کرنے کی خواہش کی۔ ان چھ ماہ تک انہوں نے بیعت نہیں کی تھی چنانچہ انہوں نے ابوبکرؓ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے پاس تشریف لائیے مگر آپ کے ساتھ کوئی دوسرا شخص نہ آئے۔ حضرت علیؓ کو یہ بات گوارا نہیں تھی کہ وہ حضرت عمرؓ کو ساتھ لائیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا، نہیں خدا کی قسم آپ ان کے ہاں تنہا نہیں جا سکیں گے اس پر حضرت صدیقؓ نے کہا تم سمجھتے ہو۔ وہ میرا کیا کرلیں گے۔ خدا کی قسم میں ان کے پاس ضرور جاؤں گا۔ چنانچہ صدیق اکبرؓ تشریف لے گئے تو حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور فرمایا۔ "ہم آپ کی فضیلت کو اور جو کچھ خدا نے آپ کو عطا کیا ہے اسے پہچانتے ہیں اور کسی بھلائی پر جو آپ کو حق تعالیٰ عطا فرمائے ہم حسد نہیں کرتے، لیکن تم نے امر خلافت میں ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے ہم سمجھتے تھے کہ رسولؐ اللہ سے ہماری قرابت کی وجہ سے اس میں ہمارا حصہ ہے۔"

ظہر کی نماز پڑھنے کے بعد ابوبکرؓ صدیق ممبر پر چڑھے، خطبہ دیا اور بیعت سے علیؓ کے تخلف کی صورت کو بیان کیا اور جو عذر انہوں نے بیان کیا تھا اسے پیش کیا، پھر مغفرت کی دعا مانگی اور (اس کے بعد) حضرت علیؓ نے خطبہ پڑھا اور حضرت ابوبکرؓ کے حق عظمت کا بیان کیا اور کہا کہ انہوں نے اب تک جو کچھ کیا ہے وہ ابوبکرؓ سے کسی حسد کی بنا پر نہیں کیا، اور نہ اس

ؐ۱ بعینہٖ اسی سند کے ساتھ ابن جریر طبری نے بھی اس روایت کو نقل کیا ہے۔ انہوں نے اس کے ساتھ اتنا اضافہ اور کیا ہے۔ معمر کہتے ہیں کہ کسی نے ابن شہاب زہری سے پوچھا کہ کیا حضرت علیؓ نے چھ ماہ تک ابوبکرؓ کی بیعت نہیں کی تو زہری نے جواب دیا کہ نہیں نہ حضرت علیؓ نے بیعت کی اور نہ ہی بنو ہاشم میں سے کسی اور نے بیعت کی۔ حتیٰ کہ چھ ماہ بعد حضرت علیؓ نے بیعت کر لی تو بنو ہاشم نے بھی بیعت کر لی۔

(ابن جریر طبری جلد ۳ صفحہ ۴۴۸)

ابن جریر کی روایت کے مطابق حضرت علیؓ نے اس موقعہ پر تمام بنو ہاشم کو اپنے ہاں جمع کر لیا تھا۔

فضیلت سے انکار کی بنا پر جو خدا نے انہیں دی ہے بلکہ ہم سمجھتے تھے کہ امر خلافت میں ہمارا حصہ ہے اور ابو بکرؓ نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے لہٰذا ہم اپنے دلوں میں ناراض تھے۔

(صحیح بخاری جلد ۲ صفحہ ۶۰۹)

قطع نظر اس کے یہ تاریخی روایات صحابہؓ کبار کے باہمی تعلقات کے متعلق کس قسم کی تصویر پیش کرتی ہیں غور طلب بات یہ ہے کہ ان کی رو سے، ایک طرف مہاجرین، انصار کے مقابلہ میں "حق خلافت" کیلئے یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ "الائمۃ من قریش" تو دوسری طرف خود قریش میں سے حضرت علیؓ اپنے حق خلافت کی تائید میں یہ دلیل پیش کرتے ہیں کہ رسول اللہؐ سے قرابت کی بنا پر انہیں خلافت بطور استحقاق ملنی چاہیئے اور جن لوگوں نے انہیں ان کے حق سے محروم کیا ہے وہ مستبد اور غاصب ہیں۔ یہی وہ "غصب و استبداد" ہے جس کی بنا پر تاریخ (یعنی شیعہ حضرات کی روایت) یہاں تک کہتی ہے کہ رسول اللہؐ کی وفات کے بعد، بجز معدودے چند حضرات (جنہوں نے حضرت ابو بکرؓ کی بیعت نہیں کی تھی) تمام صحابہؓ (معاذ اللہ) مرتد ہو گئے تھے۔ اس کے متعلق ممکن ہے سُنی حضرات کہہ دیں کہ یہ روایت تعصب پر مبنی ہے لیکن اس کا کیا جواب کہ خود بخاری میں بھی حسب ذیل روایت موجود ہے۔

حضرت ابن عباسؓ آنحضرتؐ سے روایت کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا

کہ تم لوگ برہنہ پا۔ برہنہ بدن۔ بغیر ختنہ کئے حشر کئے جاؤ گے آپ نے یہ آیت پڑھی۔

كَمَا بَدَأْنَا أَوَّلَ خَلْقٍ نُعِيدُهُ وَعْدًا عَلَيْنَا إِنَّا كُنَّا فَاعِلِينَ

اور قیامت کے دن سب سے پہلے جسے کپڑے پہنائے جائیں گے وہ ابراہیمؑ ہیں

اور اس دن میرے چند صحابہؓ بائیں جانب (یعنی جہنم کی طرف) لے جا رہے ہوں گے میں کہوں گا، یہ تو میرے صحابہ ہیں۔ پھر اللہ فرمائے گا۔ یہ لوگ اپنے پچھلے دین پر لوٹ گئے تھے

(بقیہ نوٹ سابقہ صفحہ ۱۰)

۳ ابن جریر طبری نے یہاں یہ الفاظ نقل کئے ہیں کہ ولکنا کنا نری ان لنا فی ھذا الامر حقا فاستبددتم بہ علینا یعنی ہم یہ سمجھتے تھے کہ امر خلافت ہمارا حق ہے اور تم نے ہمارے خلاف استبداد سے کام لیا ہے۔ (ابن جریر طبری ج ۲ صفحہ ۴۴۸)

۱ جب سے آپ ان کے پاس سے جا ہوئے پس میں کہوں گا۔ جیسا کہ نیک بندے (یعنی عیسےؑ) نے کہا تھا۔ کنت علیھم شھیدا ما دمت فیھم۔

(بخاری کتاب الانبیاء۔ ترجمہ شائع کردہ۔ نور محمد تاجر کتب کراچی۔ جلد دوم۔ ص ۱۴۹)

یہ ہیں چند مثالیں، ہمارے تاریخی ذخیرہ میں سے، صرف ایک واقعہ کے متعلق جو رسول اللہؐ کی وفات کے فوری بعد پیش آیا اس سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ اس کے بعد کے واقعات کے متعلق اس تاریخ میں کیا کچھ نہیں ہو گا۔

اور یہ ہے وہ تاریخ جسے قرآن کے مقابلہ میں، دینی معاملات میں بہ حیثیت سند پیش کیا جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ طلوع اسلام کا اس باب میں یہ مسلک ہے کہ ہم نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے متعلق یہ ایمان اور حضورؐ کے صحابہؓ کبار کے متعلق یہ یقین رکھتے ہیں کہ انہوں نے اپنی زندگی قرآن کریم کے مطابق بسر کی ہوگی۔ لہٰذا اگر ہماری تاریخ میں کوئی ایسی بات ان کی طرف منسوب کی گئی ہے جو قرآن کے خلاف ہے تو ہم بلا تامل کہہ دیں گے کہ تاریخ کا بیان غلط ہے انہوں نے کبھی ایسا کیا یا کہا نہیں ہو گا اور ہمارا یہی وہ جرم ہے جس کی بنا پر ہمیں "منکر حدیث" اور نہ معلوم کیا کچھ نہیں کہا جا رہا۔ غور فرمائیے کہ ہم بخاری کی اس حدیث کو کس طرح صحیح تسلیم کر لیں کہ حضورؐ کی وفات کے بعد صحابہؓ کبار کی ایک جماعت (معاذ اللہ، معاذ اللہ) دین سے مرتد ہو گئی تھی! ہم کہاں سے وہ جگر لائیں جو یہ کچھ سن کر شق نہ ہو جائے؟

یہ وجہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ قرآن اور تاریخ کے مقابلہ میں قرآن کو سند ماننا چاہیئے اور کسی مروجہ عقیدہ یا عمل کے لیے تاریخ کو بطور حجت پیش نہیں کرنا چاہیئے اور یہی وجہ ہے جو ہم کہتے ہیں کہ جب تک ہم قرن اوّل کی تاریخ کا قرآن کی روشنی میں تنقید کر کے اسے از سر نو مرتب نہیں کرتے، نہ دین کی صحیح عملی شکل ہمارے سامنے آسکتی ہے اور نہ ہی ان حضراتؓ کی صحیح سیرت، لیکن جمود او تقلید کا بُرا ہو کہ جو شخص اس قسم کی آواز بلند کرتا ہے اسے ملحد اور بے دین قرار دے دیا جاتا ہے۔ (۱۹۵۹ء)

۵۔ خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

---

۱ بخاری کے اصلی الفاظ "مرتدین علی اعقابھم" ہیں۔

لاہور سے ایک صاحب لکھتے ہیں۔

طلوع اسلام کی حال کی اشاعت میں آپ نے تاریخ کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس نے بہت سے لوگوں کی آنکھیں کھول دی ہیں میں خود تاریخ کا طالب علم ہوں میں جب اپنی تاریخ کے ان مقامات پر غور کرتا تھا تو ذہن میں اس قدر الجھنیں پیدا ہوتی تھیں کہ بیان سے باہر ہے۔ آپ نے صرف ایک واقعہ پر اکتفا کیا ہے یعنی نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد سب سے پہلے واقعہ۔ لیکن جوں جوں ہم آگے بڑھتے ہیں یہ الجھنیں زیادہ ہوتی جاتی ہیں۔ مثلاً میں تاریخ کی روشنی میں یزید کے واقعہ کو کبھی نہیں سمجھ سکا صحیح بخاری میں ایک حدیث ہے کہ نبی اکرمؐ نے فرمایا کہ میری امت کا پہلا لشکر جو قسطنطنیہ پر حملہ کرے گا وہ بخشا ہوا ہے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ جس لشکر نے سب سے پہلے قسطنطنیہ پر حملہ کیا، اس کا سپہ سالار یزید ابن معاویہ تھا اور اس میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ عبداللہ ابن عباسؓ۔ حضرت امام حسینؓ، جیسے جلیل القدر اصحاب بہ حیثیت سپاہی شریک تھے۔ خود صحیح بخاری کے شارح عسقلانی نے لکھا ہے کہ یہ حدیث (جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے) امیر معاویہ اور یزید کی منقبت میں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر صحیح بخاری کی یہ حدیث صحیح ہے اور جو حضرات علم حدیث میں سند مانے جاتے ہیں ان کا اصرار ہے کہ بخاری کی تمام حدیثیں صحیح ہیں) تو پھر جس شخص (یعنی یزید) کی بخشش کا خود رسول اللہؐ یقین دلائیں۔ اس کے خلاف ہم لوگ (یعنی اہل سنت والجماعت) کس طرح لب کشائی کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں؟ یہ بات میرے دل میں مدت سے کھٹکتی چلی آرہی ہے۔ اس کے علاوہ ایک اور بات بھی ہے۔ یزید کی خلافت کے متعلق ایک طرف ہمارا عقیدہ یہ ہے کہ اس سے اسلام کی جڑ کٹ گئی اور حضرت امام حسینؓ نے اس کے خلاف آواز بلند کر کے دین کی گرتی ہوئی عمارت کو سنبھال لیا۔ چنانچہ خواجہ معین الدین اجمیریؒ اس سلسلہ میں فرماتے ہیں کہ

حقا کہ بنائے لا الہ ہست حسینؓ

لیکن دوسری طرف ہمیں تاریخ بتاتی ہے کہ یزید کی بیعت میں کم از کم دو اڑھائی سو صحابہؓ شریک تھے اور باقی تابعینؒ حضرات تھے جن حضرات نے اس کی بیعت سے انکار کیا تھا، ان کی تعداد شاید ان سے بھی کم ہو (جنہوں نے (مثلاً) حضرت ابوبکرؓ صدیق کی بیعت میں شرکت نہیں کی تھی۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر یزید کی خلافت سے اصولاً اسلام

ص۱ یہ رباعی خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی نہیں۔

کی جڑ کٹتی تھی یا انفرادی طور پر وہ ایسا فاسق و فاجر تھا جیسا کہ بتایا جاتا ہے تو پھر اس قدر صحابہؓ اور تابعین حضراتؒ نے اس کی بیعت کس طرح کر لی؟ اگر ہم یزید اور اس کی خلافت سے متعلق وہی عقیدہ رکھیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے تو پھر ان تمام صحابہؓ اور تابعینؒ حضرات کے متعلق کیا کہا جائے گا جنہوں نے اس کی بیعت کی تھی؟ اور اگر ان حضرات کے . . . .

. . . .

اس فیصلہ اور عمل کے متعلق سمجھا جائے کہ وہ حق کے مطابق تھا تو پھر ہم یزید کے خلاف کس طرح لب کشائی کر سکتے ہیں؟ اگر یہ کہا جائے کہ ان حضرات نے مجبوراً بیعت کی تھی یعنی ان سے استبداداً بیعت لی گئی تھی تو اس سے (معاف فرمائیے) ان حضرات (رضی اللہ عنہم) کی سیرت کے متعلق جو خیال پیدا ہوتا ہے وہ ظاہر ہے۔ اگر سوال کوئی فروعی سا ہوتا تب بھی شاید اس بات سے چشم پوشی کر لی جا سکتی۔ لیکن یہ سوال ایسا اہم تھا، جس پر خود اسلام کی عمارت کے قائم رہنے اور گر پڑنے کا دارو مدار تھا۔ ایسے اہم سوال کے متعلق یہ سمجھ لینا کہ ان تمام حضرات نے ڈر کے مارے بیعت کر لی اور جرأت ایمانی کا ثبوت صرف چند افراد (حضرت امام حسینؓ اور آپ کے ساتھیوں) نے دیا، صحابہؓ کبار اور تابعینؒ کے متعلق جس قسم کا تصور پیدا کرتا ہے وہ ظاہر ہے۔ میرے دل میں ان تمام حضرات کی بڑی عظمت اور عقیدت ہے اس لیے میں تو اس کا تصور تک بھی نہیں کر سکتا۔ لیکن دوسری طرف مشکل یہ آن پڑتی ہے کہ اگر ان حضرات کے اس عمل (یعنی یزید کی بیعت کر لینے) کو حق بجانب قرار دیا جائے تو پھر حضرت امام حسینؓ . . . . . . اور آپ کے ساتھیوں کے متعلق کیا کہا جائے گا۔ میرے دل میں ان کی بھی ویسی ہی عظمت اور عقیدت ہے۔

یہ ہیں وہ الجھنیں جن میں میں ایک مدت سے گرفتار ہوں اور جن کا کوئی حل میری سمجھ میں نہیں آتا۔ شیعہ حضرات نے اپنے لیے اس الجھن کا حل نکال لیا۔ یعنی انہوں نے یہ عقیدہ اختیار کر لیا کہ امام بھی رسولؐ کی طرح خدا کی طرف سے مقرر کردہ ہوتا ہے اور یہ امامت حضرت علیؓ اور آپ کی اولاد میں رہنی تھی جن لوگوں نے ان حضرات میں سے کسی کی بھی امامت کا انکار کیا، ان کا انکار ایسا ہی تھا جیسا نبوت کا انکار۔ لہذا ایسے لوگ حق پر ہو نہیں سکتے۔ اس میں نہ امت کے منتخب کردہ خلیفہ کا سوال ہے نہ باپ کے بعد وراثت میں خلافت پانے کا سوال۔ حتیٰ کہ اس میں نہ کسی خلیفہ کے فاسق و فاجر ہونے کا سوال ہے، نہ صالح اور متقی ہونے کا سوال۔ شیعہ حضرات نے اپنے لیے یوں راستہ صاف کر لیا لیکن ہم (سنی)، جو اس عقیدہ کو صحیح نہیں سمجھتے، اس الجھن سے کس طرح نکلیں۔ جس کی طرف میں نے اوپر اشارہ کیا ہے؟ میں شکر گزار ہوں گا، اگر آپ

براہ کرم اس مشکل مسئلہ کے حل کی کوئی صورت بتا دیں گے۔

طلوع اسلام جب تک ہماری تاریخ وہی رہے گی جو اس وقت تک ہمارے ہاں چلی آرہی ہے اس الجھن (اور اس قسم کی سینکڑوں الجھنوں) کا کوئی حل پیش نہیں کیا جاسکتا۔ ان مشکلات کا علاج وہی ہے جسے ہم ایک مدت سے پیش کرتے چلے آرہے ہیں۔ یعنی یہ کہ ہم اپنی تاریخ کو از سر نو مرتب کریں۔ اگر ہم نے ایسا نہ کیا تو یقین مانیے، ہم اپنی آنے والی (تعلیم یافتہ) نسلوں کو کبھی اسلام پر مطمئن نہیں کرسکیں گے۔ ہماری تاریخ اس وقت تک ساتھ دے سکتی تھی جب تک ہم نے قوم کے لیے سوچنا حرام قرار دے رکھا تھا۔ ہماری نئی نسلوں نے سوچنا شروع کردیا ہے اور انہیں اس سے کوئی قوت باز نہیں رکھ سکتی۔ اگر ہم نے ان سوچنے والی نسلوں کو یہ بتایا (جیسا کہ ہم جہلا کو بتاتے چلے آرہے ہیں) کہ ہماری یہی تاریخ، اسلام کی صحیح تعلیم کی مظہر ہے تو وہ اس قسم کے اسلام کو دل میں جگہ دینے کے لیے کبھی تیار نہیں ہوں گے۔ ہمارے ارباب مذہب کو اس خطرہ کا کوئی احساس نہیں وہ "ان مغرب زدہ ملحدین" کا علاج گالیوں کے سوا کچھ اور جانتے ہی نہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ قوم میں غور و فکر کی صلاحیت اور عادت پیدا نہ ہو اس لیے کہ وہ کبھی اس پر آمادہ نہیں ہوسکتے کہ ہماری تاریخ کو کوئی ہاتھ تک بھی لگا سکے۔ یہ کام اسلامی حکومت کے کرنے کا ہے دیکھیں یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے اور کب آتی ہے ؎

آوازۂ حق اٹھتا ہے کب اور کدھر سے
مسکین و لکم ماندہ دریں کش مکش اندر

(۱۹۵۹ء)

غلام اور لونڈیاں

۱۔ ایک خط میں نے ذیل کا خط محترم سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب کی خدمت میں بھیجا تھا۔

میں آپ کے اس مطالبہ سے متفق ہوں کہ پاکستان میں شریعت کا نظام نافذ ہونا چاہیئے۔ اس باب میں دو ایک باتیں دریافت طلب ہیں جن کی وضاحت کے لئے یہ عریضہ ارسال خدمت ہے۔ امید ہے کہ آپ جواب سے سرفراز فرمائیں گے۔

(۱) سوال یہ ہے کہ کیا نظامِ شریعت میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈی بنانے کی اجازت ہوگی؟ کیا ان غلاموں اور لونڈیوں کو فروخت کرنے کا بھی حق حاصل ہوگا؟ کیا ان لونڈیوں سے بیویوں کے علاوہ تمتع جائز ہوگا، اور اس پر تعداد کی تو کوئی قید نہ ہوگی۔؟

(۲) کیا اس نظامِ شریعت میں لونڈی اور غلام کی خرید و فروخت (علاوہ ان لونڈی غلاموں کے جو جنگی قیدی ہوں) پاکستان میں جائز ہوگی، جس طرح آج کل حجاز میں بردہ فروشی ہوتی ہے!

اس کے جواب میں مودودی صاحب کی طرف سے ذیل کا گرامی نامہ موصول ہوا ہے۔

مکرمی و محترمی! اسلام علیکم ورحمۃ اللہ و برکاتہ،! آپ کا عنایت نامہ ملا، جو سوالات آپ نے کئے ہیں۔ ان کا مختصر جواب تو "ہاں اور نہیں" کی شکل میں دیا جا سکتا ہے۔ لیکن اس سے آپ کی تسکین نہیں ہوگی، اس لئے میں ذرا تفصیل کے ساتھ آپ کو جواب دیتا ہوں۔

نظامِ شریعت میں جنگی قیدیوں کو لونڈی غلام بنانے کی اجازت اسی صورت میں دی گئی ہے۔ جبکہ وہ قوم جس سے ہماری جنگ ہوئی ہو نہ تو قیدیوں کے تبادلے پر راضی ہو۔ نہ فدیہ لے کر قیدی چھوڑے اور نہ فدیہ دے کر اپنے قیدی چھڑائے۔

آپ خود غور کریں تو سمجھ سکتے ہیں کہ اس صورت میں جو قیدی کسی حکومت کے پاس رہ جائیں۔ وہ یا تو انہیں قتل کر دے گی۔ یا انہیں عمر بھر اس قسم کے "انسانی باڑوں" میں رکھے گی۔ جنہیں آج کل (CONCENTRATION CAMPS) کہا جاتا ہے۔ اور کسی قسم کے "انسانی حقوق" دیئے بغیر ان سے جبری محنت لیتی رہے گی۔ ظاہر ہے کہ یہ صورت زیادہ بے رحمانہ بھی ہے اور خود اس ملک کے لئے بھی زیادہ مفید نہیں ہے۔ جس میں اس قسم کے قیدیوں کی ایک بڑی تعداد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ایک خارجی عنصر کی حیثیت سے موجود رہے۔ اسلام نے ایسے حالات کے لئے جو شکل اختیار کی ہے، وہ یہ ہے کہ ان قیدیوں کو فرداً فرداً مسلمانوں میں تقسیم کر دیا جائے اور ان کی ایک قانونی حیثیت مشخص کر دی جائے۔ اس طرح جو انفرادی رابطہ ایک ایک شخص کا ایک مسلم خاندان سے پیدا ہوگا۔ اس میں، اس کا امکان زیادہ ہے کہ ان سے انسانیت اور شرافت کا برتاؤ ہو، اور ان کا ایک اچھا خاصا حصہ بتدریج مسلمانوں کی سوسائٹی میں جذب ہو جائے۔

جن مسلمانوں کو ایسے اسیران جنگ پر حقوق ملکیت حاصل ہوتے ہیں، ان کے لئے شریعت نے یہ ضابطہ مقرر کیا ہے کہ اگر لونڈی یا غلام ان سے درخواست کرے کہ میں محنت مزدوری کر کے اپنے فدیہ کی رقم فراہم کرنا چاہتا ہوں تو وہ اس کی درخواست کو رد کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ انہیں ازروئے قانون ایک خاص مدت تک کے لئے اس کو مہلت دینی ہوگی، اور اس مدت میں اگر وہ اپنی رقم ادا کر دے تو اسے آزاد کر دینا پڑے گا۔

اس قسم کے غلاموں اور لونڈیوں کو بیچنے کی اجازت دراصل اس معنی میں ہے کہ ایک شخص کو ان سے فدیہ وصول نہ ہونے تک اس سے خدمت لینے کا جو حق حاصل ہے.........
اس کو وہ معاوضہ لے کر دوسرے شخص تک منتقل کر دیتا ہے قانون میں یہ گنجائش جس مصلحت سے رکھی گئی ہے اس کو پوری طرح سے اسی صورت میں سمجھ سکتے ہیں جبکہ کسی دشمن فوج کے سپاہی کو بطور قیدی رکھنے کا اتفاق ہو۔ فوجی سپاہیوں سے خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے، اور اسی طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا، کوئی کھیل نہیں ہے۔ اگر کسی شخص کے لئے گنجائش نہ چھوڑی جاتی کہ جس قیدی مرد یا عورت سے وہ عہدہ برآ نہ ہو سکے اس کے حقوق ملکیت دوسرے

کی طرف منتقل کردے تو یہ لوگ بلائے جان بن جاتے۔

جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لئے (جبکہ نہ ان کا تبادلہ ہوا اور نہ فدیہ کا معاملہ طے ہو سکے۔) اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس شخص کی ملکیت میں وہ دے دی جائیں اس کو ان کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دے دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلنے کا ایک مستقل ذریعہ بن جاتیں۔ قانونی حیثیت سے "ملک یمین" اور عقد نکاح میں خاص فرق نہیں ہے۔ بلکہ "ملک یمین" تو باقاعدہ حکومت کے توسط سے حاصل ہوئی ہے، جو عورت کسی کے "ملک یمین" میں دے دی جائے، اس کے ساتھ کسی دوسرے شخص کا جنسی تعلق جائز نہیں ہے۔ جو اولاد اس سے ہوگی اس کا نسب اصل مالک ہی سے ثابت ہوگا اور وہ اپنے باپ کی اسی طرح جائز وارث ہوگی جس طرح کسی آزاد بیوی کی اولاد۔ جس لونڈی سے اولاد ہو جائے اسے بیچنے کا مالک کو حق نہیں رہتا۔ اور مالک کے مرنے کے بعد وہ عورت خود بخود آزاد ہو جاتی ہے۔

لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کی قید اس لئے نہیں لگائی گئی کہ ان عورتوں کی تعداد کا کوئی تعین ممکن نہیں ہے جو کسی جنگ میں گرفتار ہو کر آ سکتی ہیں۔ بالفرض اگر ایسی عورتوں کی بہت بڑی تعداد جمع ہو جائے تو سوسائٹی میں انہیں کھپانے کی کیا تدبیر ہو سکتی ہے، اگر لونڈیوں سے تمتع کے لئے تعداد کا تعین پہلے ہی کر دیا جائے۔ لیکن بعد کے ادوار میں امراء اور رؤسا نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنا دیا وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔ کوئی رئیس اگر عیاشی کرنا چاہے اور قانون کے منشا کے خلاف قانون کی گنجائشوں سے فائدہ اٹھانے پر اتر آئے۔ تو نکاح کا ضابطہ ہی کب اس کے لئے رکاوٹ بن سکتا ہے۔ وہ روز ایک نئی عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔ اور دوسرے دن اسے طلاق دے سکتا ہے۔

حجاز میں جو بردہ فروشی آج کل ہوتی ہے۔ اس کی تفصیل مجھے نہیں معلوم۔ لیکن اصولی طور پر میں یہ عرض کر سکتا ہوں کہ، جنگ کے سوا کسی دوسرے طریقے سے آزاد آدمیوں کو پکڑنا اور ان کی خرید و فروخت کرنا شریعت میں حرام ہے۔ والسلام بقلم ابو صالح اصلاحی بحکم

حضرت مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی۔

محترم مودودی صاحبؒ نے میرے استفسارات کا جواب نفی یا اثبات میں نہیں دیا۔ لیکن ان کے خط سے ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک اسلام میں جنگ کے قیدیوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت ہے۔ ان لونڈیوں سے تمتع بھی جائز ہوگا۔ اور اس پہ تعداد کی کوئی قید نہیں ہوگی۔

اس کی تائید میں انہوں نے جو دلائل بیان فرمائے ہیں کم از کم میں تو ان سے مطمئن نہیں ہوا۔ میرا تو اس تصور سے دل کانپتا ہے کہ اسلام جو دنیا سے غلامی کو مٹانے کا مدعی ہے۔ وہ خود انسانوں کو غلام اور لونڈیاں بنانے کی اجازت دیتا ہو۔ لیکن چونکہ یہ معاملہ مذہب سے تعلق رکھتا ہے، اس لئے گذارش ہے کہ براہ کرم مطلع فرمائیں کہ کیا مودودی صاحب کے خط سے میں جس نتیجہ پہ پہنچا ہوں وہ درست ہے۔ اور آیا اسلام کی یہی تعلیم ہے؟ جواب خواہ براہِ راست مجھے تحریر فرمادیں۔ خواہ طلوع اسلام میں درج فرمادیں۔ والسلام

جواب

ہمارے بھائی نے مودودی صاحب کے خط سے جو نتیجہ اخذ کیا ہے وہ درست ہے۔ وہ اس کے قائل ہیں کہ اسلام میں اسیران جنگ کو غلام اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں بنایا جاسکتا ہے۔ اور ان لونڈیوں سے بلاقید نکاح و تعداد جنسی تعلقات بھی پیدا کیے جاسکتے ہیں۔ باقی رہے ان کے دلائل تو وہ یقیناً ارسطو کے ان دلائل سے زیادہ دقیع اور قوی نہیں جو وہ نفس غلامی کے جواز بلکہ وجوب میں دیا کرتا تھا۔ کہتے ہیں اس کے پاس ستر غلام تھے اور وہ غلامی کے وجوب میں اتنے ہی دلائل رکھتا تھا جنہیں ناقابل تردید سمجھا جاتا تھا لیکن زمانہ کو ارسطو کے دلائل لے ڈوبے اور اسلام کو مودودی صاحب جیسے فقہا کی منطق۔

؎ حذر اے چیرہ دستاں سخت ہیں فطرت کی تعزیریں

ہمیں اس اضطراب کی علت بھی معلوم ہے جس کی وجہ سے مودودی صاحب کو اس سیدھے سادھے جواب کے لئے دلائل و مصالح کے سہارے تلاش کرنے پڑے۔ خواہ وہ دلائل و مصالح خود سہاروں کے محتاج ہی کیوں نہ ہوں۔ اور وہ علت یہ ہے کہ ایک طرف ان کا دامن روایات کی خار دار جھاڑیوں میں الجھا رہتا ہے اور دوسری طرف وہ "ماڈرن" بھی بننا چاہتے ہیں۔ لہٰذا کشمکش لازمی ہے ؎

ایماں مجھے روکے ہے تو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ مرے پیچھے ہے کلیسا مرے آگے

طلوعِ اسلام خدا کے عطا فرمودہ دین ہی کو دین سمجھتا ہے جو حقائق کا صحیح ترجمان ہونے کی وجہ سے قدامت و

جدت کی کش مکشوں سے بلند ہے۔ وہ جس قدر فراست بھی حاصل کر سکنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ خدا کی کتاب منیر سے حاصل کرتا ہے۔ اس لئے اسے ان امور میں کبھی الجھاؤ پیدا نہیں ہوتا ؎

قلندر جز دو حرف لا الٰہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہہ شہر قارون ہے لغت ہائے حجازی کا

قرآن اسیران جنگ کے متعلق سورۂ محمد کی ایک ہی آیت میں حکم ہے اور اس آیت کے چار لفظوں نے معاملہ کو صاف کر دیا ہے۔ اس نے کہا کہ جنگ میں جو قیدی تمہارے ہاتھ آئیں۔

فَإِمَّا مَنًّا بَعْدُ وَإِمَّا فِدَاءً (۴۷/۴)

انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دو یا احسان رکھ کر

اللہ اللہ خیر سلّا۔ باقی رہی وہ مدت جس میں وہ بطور قیدی تمہارے پاس رہیں تو ظاہر ہے کہ وہ انسان ہیں، اور ان سے انسانوں جیسا سلوک روا رکھا جائے گا کسی سے انسانیت سے گرا ہوا سلوک۔ خود مسلمان کے شعار کے خلاف ہے کسی انسان پر دوسرے انسان کا "حق ملکیت" یکسر غیر فطری ہے۔ اس لئے ناممکن ہے کہ وہ ایک انسان کو دوسرے انسان کی ملکیت میں دے دینے کی اجازت دے دے اور اس کے لئے راہیں کشادہ کر دے۔ غلامی اسی کو کہتے ہیں۔ اور اسلام کا دامنِ تقدس ان اتہامات سے یکسر پاک ہے۔ جو اس کے دشمنوں نے وضعی روایات کے راستہ اس پر لگائے اور جو آج ہماری شومئی قسمت سے ہمارا دین بن چکے ہیں۔

سبحان اللہ تعالیٰ عمّا یصفون

قرآن میں ملک یمین (غلاموں اور لونڈیوں) کے متعلق جس قدر احکام ہیں وہ ان غلاموں اور لونڈیوں سے متعلق ہیں جو نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے ہاں موجود تھے اور جنہیں آہستہ آہستہ ان احکامات کی رو سے جزو سوسائٹی بنایا جا سکتا تھا۔ اس نے انہیں اس طرح بتدریج معاشرۂ اسلامی میں جذب کیا۔ اور آئندہ کے لئے غلامی کے دروازے اس حکم کی رُو سے بند کر دیئے جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے۔ لیکن مسلمانوں کی ملوکیت نے ان دروازوں کو ایک ایک کر کے پھر سے کھول لیا۔ اور بالائے قیامت کہ اس ننگ انسانیت مسلک کو وضعی روایات کی رو سے منسوب کر دیا۔ اس ذاتِ اقدسؐ و اعظم کی طرف۔ جس کے ظہور کا مقصد ہی قرآن نے یہ بتایا تھا کہ وہ اغلال و سلاسل کو توڑنے کے لئے آیا ہے جس میں انسانیت جکڑی ہوئی چلی آ رہی تھی۔

ویضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم (۷/۱۵۷)

مودودی صاحب غلامی کی تائید میں دلیل یہ پیش کرتے ہیں کہ آج کل جنگ کے قیدی جس قسم کے "انسانی باڑوں" (CONCENTRATION CAMPS) میں رکھے جاتے ہیں۔ اور ان سے وہاں جس قسم کا انسانیت سوز سلوک کیا جاتا ہے۔ اس سے بہتر ہے کہ انہیں غلام اور لونڈیاں بنالیا جائے۔

ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہیئے!

اوّل تو یہ کہ انہوں نے فرض کر لیا ہے کہ قرآنی نظام میں قیدیوں کے عبوری زمانہ میں کیمپوں کی یہی حالت ہوگی جیسی آج کل کی ابلیسی سیاست میں ہوتی ہے۔ اُس نظام میں جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ انسانوں سے انسانوں جیسا سلوک کیا جائے گا۔ وہ نظام ظلم روکنے کے لئے قائم ہوتا ہے۔ نہ کہ ظلم کرنے کے لئے۔ پھر یہ بھی دیکھئے کہ بجائے اس کے کہ ہم ان CAMPS کی اصلاح کا کوئی طریقہ سوچیں جو مسلمانوں کے ہاں اسیرانِ جنگ کے لئے تیار کیے جائیں گے ہم کہتے ہیں تو یہ کہ اسلام نے اس خرابی کا حل یہ بتایا ہے کہ انکے مردوں کو غلام بنالیا جائے اور ان کی عورتوں کو لونڈیاں کیا عمدہ اصلاح ہے! انسانیت اس پر ناز کرے گی؛ اور دنیا کے قیدی اس احسان عظیم پر سجدہ ریز ہوں گے، جب وہ اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھیں گے کہ ان کی بیویاں۔ بہنیں۔ بیٹیاں۔ "ان مصلحین" کی ہوس رانیوں اور عیش جوئیوں کا سامان بن رہی ہیں۔ مودودی صاحب فرماتے ہیں کہ:-

فوجی سپاہیوں سے خدمت لینا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ اور اسی طرح دشمن قوم کی کسی عورت کو گھر میں رکھنا کوئی کھیل نہیں ہے۔

یعنی قیدیوں سے کام لینا مشکل ہے۔ اور اسی طرح ان کی عورتوں کو گھروں میں رکھنا بے حد پُرخطر۔ لیکن جب انہیں غلام بنالیا جائے تو پھر یہ مشکل آسان ہو جاتی ہے اور ان کی عورتوں سے جب ان کے مردوں کے سامنے ان کی اپنی مرضی کے خلاف جنسی تعلقات قائم کر لئے جائیں تو اس سے وہ تمام خطرات رفع ہو جائیں گے جو دشمن قوم کے افراد ہونے کی جہت سے ان کی طرف سے وارد ہو سکتے تھے! یا للعجب۔

پھر فرماتے ہیں :-

جنگ میں گرفتار ہونے والی عورتوں کے لئے اس سے بہتر حل اور کیا ہو سکتا ہے کہ جس شخص کی ملکیت میں وہ دی جائیں۔ اس کو ان کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کرنے کا قانونی حق دے دیا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جاتا تو یہ عورتیں ملک میں بداخلاقی پھیلانے کا ایک مستقل ذریعہ بن جاتیں۔

یعنی اگر ایک شخص دس بیس عورتیں سنبھال لے۔ ان سے ان کی مرضی کے خلاف جنسی تعلقات پیدا کرلے اور پھر جب جی چاہے، انہیں کسی دوسرے کی طرف منتقل کردے۔ اور اس کی اس دوسرے سے قیمت بھی وصول کرلے تو یہ سب کچھ پاکیزگیٔ اخلاق میں شامل ہے۔ اور اگر ان عورتوں کو اس طرح آپس میں نہ بانٹا جائے تو وہ سوسائٹی میں منتقل بداخلاقی" پھیلانے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ اب اس کے متعلق اس سے زیادہ کیا کہا جائے کہ اول الذکر بداخلاقی اس لئے حسنِ اخلاق میں داخل ہوگئی کہ آپ نے اسے "مشروع" قرار دے دیا۔ اور مؤخر الذکر اس لئے حرام قرار پاگئی کہ آپ کی بارگاہ سے اسے جواز کا فتویٰ نہیں مل سکا۔ آریہ سماجی "نیوگ" کی تائید میں بھی یہی دلیل پیش کیا کرتے تھے کہ جس قسم کے تعلق کو سوسائٹی جائز قرار دے دے وہ جائز ہوجاتا ہے۔ اس پر کسی اور کو اعتراض کا کیا حق حاصل ہے؟

لونڈیوں کی تعداد کو بے قید چھوڑ دینے کا فلسفہ بیان فرمانے کے بعد مودودی صاحب ارشاد فرماتے ہیں۔

> لیکن بعد کے ادوار میں امراء و رؤسا نے اس قانونی گنجائش کو جس طرح عیاشی کا حیلہ بنایا وہ ظاہر ہے کہ شریعت کے منشاء کے بالکل خلاف ہے۔

سمجھ میں نہیں آتا کہ جب قوم کے ہاں لونڈیاں دھڑا دھڑ آرہی ہوں۔ ان کی تعداد کی بھی کوئی حد مقرر نہ ہو۔ وہ ایک دوسرے کی طرف منتقل بھی کی جاسکتی ہوں۔ تو پھر وہ کونسی "عیاشی" ہے جسے آپ شریعت کی منشاء کے خلاف کہہ سکتے ہیں۔ جسے لونڈی مل جائے اور "شریعت" اس سے جنسی تعلقات کی اجازت دیتی ہو۔ تو پھر اس لونڈی سے تمتع، عیاشی کا حیلہ کس طرح بن جائے گا۔ عیاشی کے سامان تو خود فراہم کردیئے جائیں اور پھر ان سے مستفید ہونے والوں پر الزام دھرا جائے! باقی رہا ہر روز ایک نئی عورت سے نکاح کرکے دوسرے دن طلاق دے دینا۔ سو یہ بھی اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب نظام شریعت قرآن پر مبنی نہ ہو۔ قرآنی نظام میں طلاق دے دینا ایسا کھیل نہیں۔ اس میں یہ مذاق نہیں ہوگا کہ طلاق۔ طلاق۔ طلاق کہا اور بیوی کو ٹھوکر مار کر نکال باہر کیا۔

مودودی صاحب نے لونڈیوں پر بڑا احسان یہ ظاہر فرمایا ہے کہ جس لونڈی سے اولاد ہوجائے اسے بیچنے کا مالک کو کوئی حق نہیں رہتا۔ اور مالک کے مرنے کے بعد وہ عورت خود بخود آزاد ہوجاتی ہے۔ لیکن کسی اور کو شاید معلوم ہو یا نہ ہو، انہیں تو یقیناً معلوم ہوگا کہ ان کی "شریعت" نے یہ تدبیر بھی خود ہی بتادی ہے کہ لونڈیوں سے جنسی تعلقات بھی قائم کیے جائیں اور پھر یہ خدشہ بھی نہ رہے کہ ان کے اولاد پیدا ہوجائے گی اور اس طرح اسے

پہنچنے کا امکان باقی نہ رہے گا۔

سنئیے وہ تدبیر کیا ہے؟ صحیح بخاری کتاب البیوع - باب بیع الرقیق (مطبوعہ مصر، جلد دوم ص۱۸۱) میں حدیث بیان کی گئی ہے۔

"ان اباسعید الخدری اخبرہ انہ بینما ھو جالس عند رسول اللہ قال یارسول اللہ انا نصیب سبیا فنحب الاثمان فکیف تری فی العزل فقال اوانکم تفعلون ذالک؟ علیکم ان لاتفعلوا ذالکم فانھا لیست نسمۃ کتب اللہ ان تخرج الاھی خارجۃ۔

ابوسعید خدری سے روایت ہے کہ انہوں نے ایک روز جبکہ رسول اللہؐ کے پاس بیٹھے ہوئے تھے حضورؐ سے یہ عرض کیا کہ ہم قیدی عورتوں کے ساتھ جماع کرتے ہیں۔ مگر ہم چاہتے ہیں کہ وہ حاملہ نہ ہوں کیونکہ ہم انہیں بیچنا چاہتے ہیں۔ تو عزل کرنے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ کیا تم ایسا کرتے ہو۔ تم پر ایسا کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ کیونکہ جو بچہ پیدا ہونے والا خدا نے مقرر کیا ہے وہ پیدا ہو کر رہے گا۔

عزل کے متعلق صحیح بخاری کتاب النکاح، باب العزل (جلد سوم صفحہ ۱۶۲) میں جابر بن عبداللہ کی یہ روایت بھی موجود ہے کہ :۔

قال کنا نعزل علی عھد النبی والقرآن ینزل

ہم حضورؐ کے زمانہ میں عزل کیا کرتے تھے۔ اور قرآن نازل ہوا کرتا تھا۔

اور اگر حمل ہو جائے تو؟ اسی صحیح بخاری (جلد دوم ص۱۸۱) میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ :۔

لا باس ان یصیب من الجاریۃ الحامل ما دون الفرج

اس میں حرج نہیں کہ اپنی حاملہ لونڈی سے شرمگاہ کے علاوہ دوسری جگہ سے مجامعت کر لی جائے

لہ طلوع اسلام پر وہ وقت بڑا اذیت و کرب کا ہوتا ہے۔ جب اسے کوئی ایسی بات کرنی پڑ جائے جسے دنیا کے سامنے پیش کرتے سے ہماری نگاہیں زمین میں گڑ جائیں۔ لیکن یہ کیا جائے۔ بعض صورتیں ایسی پیش آجاتی ہیں کہ ان میں یہ ناگوار فریضہ ناگزیر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ موضوع زیر نظر میں ہم عمداً اس سے گریز کرتے رہے کہ وہ روایات درج نہ کرنی پڑیں۔ جو لونڈیوں کے بارے میں ہماری کتب احادیث میں موجود ہیں۔ لیکن ایک دو روایات تو ضرور نقل کرنی ہی پڑ گئیں۔ ان کے بغیر اصل بات سمجھ میں نہیں آ سکتی۔

معاذاللہ! معاذاللہ! یہ ہیں وہ روایات جنہیں حضور ختمی مرتبت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذاتِ گرامی اور صحابہ کبارؓ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اور نہیں سمجھا جاتا کہ کل قیامت کو خدا، اور اس کے رسولِ امین کے سامنے کیا جواب دیں گے۔

بہرحال یہ ہے وہ "نظامِ شریعت" جسے یہ حضرات یہاں رائج کرنا چاہتے ہیں۔ آپ اسے اپنے ہاں رائج کریں گے اور قومِ مخالف کے جنگی قیدیوں کو غلام اور ان کی مستورات کو لونڈیاں بنائیں گے تو آپ انہیں بھی نہیں روک سکتے کہ وہ آپ کے قیدیوں کو غلام بنائیں۔ اور آپ کی شریف بیبیوں کے ساتھ اسی طرح جنسی تعلقات قائم کر کے انہیں آگے منتقل کرتے رہیں۔ یہ سلسلہ جب عام ہو جائے گا تو یہ حضرات خوش ہوں گے کہ "خدا کا دین" کس طرح ساری دنیا میں خود بخود پھیل رہا ہے ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے!
فقیہہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

۱۹۵۳ء

۲۔ غلام اور لونڈیاں عہدِ عباسیہ میں

۱۔ **سوال:** آپ نے کہا ہے کہ اسلام، احترامِ آدمیت سکھاتا ہے۔ پھر یہ زرخرید باندیوں اور دشمنوں کی قیدی عورتوں کو لونڈیاں بنانے کی اجازت کیسے دیتا ہے؟

جواب: اسلام نہ زرخرید باندیوں کی اجازت دیتا ہے، نہ دشمن کی قیدی عورتوں کو لونڈیاں بنانے کی۔ دشمن کے قیدیوں کے متعلق اس نے بالفاظ صریح کہہ دیا کہ انہیں یا تو فدیہ لے کر چھوڑنا ہوگا یا احساناً۔ باقی رہا کسی انسان (مرد یا عورت) کو بھیڑ، بکری کی طرح خریدنا (اور اس طرح اس مرد کو غلام اور عورت کو باندی بنا لینا) تو اس تصور سے اسلام کی روح کانپتی ہے۔ قرآن کریم میں غلاموں اور لونڈیوں کے متعلق جو احکام ہیں وہ ان کے متعلق ہیں جو ظہورِ اسلام کے وقت عربوں کے معاشرے میں موجود تھے۔ قرآن نے آہستہ آہستہ انہیں یا تو رہا کرا دیا یا جزوِ خاندان بنا دیا، اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کر دیا۔

۲۔ سوال:۔ لونڈیاں اور باندیاں خلفائے عباسیہ اور اُمیہ رکھتے تھے۔ اس کے متعلق کیا خیال ہے؟

جواب:۔ وہ خلفائے عباسیہ یا اُمیہ کا ذاتی فعل تھا جس کا ذمہ دار اسلام نہیں۔ ان کا کوئی قول یا عمل اسلام میں سند نہیں ہو سکتا۔ آپ تو، ان کے ہاں کے غلاموں اور لونڈیوں کی بابت دریافت فرماتے ہیں۔ ان کا سرے سے بادشاہت کو ورثہ میں لینا کونسا اسلامی عمل تھا؟

۳۔ سوال:۔ قرآن کا حکم ہے کہ جنگی قیدیوں کو فدیہ لے کر یا احسان کے طور پر چھوڑ دیا جائے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ جب کسی قوم کو معلوم ہو کہ مسلمانوں نے ان کے قیدیوں کو بغیر کچھ لئے چھوڑ دینا ہے، تو فدیہ کیوں دیں گے؟

جواب:۔ جنگ میں اوّل تو بالعموم ہوتا یہ ہے کہ کچھ ہمارے لوگ دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے ہیں، کچھ ان کے لوگ ہمارے یہاں قید ہوتے ہیں۔ اس صورت میں قیدیوں کا تبادلہ خود ان کا فدیہ بن جاتا ہے۔ ایسی صورت نہ بھی ہو، تو بھی کوئی قوم، صلح ہو جانے کے بعد یہ نہیں چاہتی کہ ان کے افرادِ قوم دوسروں کی قید میں رہیں، وہ انہیں ضرور چھڑا لیتی ہے۔ لیکن اگر بالفرضِ محال ایسی صورت پیدا نہ ہو اور ہمیں ان قیدیوں کو بغیر کچھ لیے چھوڑ دینا پڑے تو اس کے نتائج جس قدر خوشگوار نکل سکتے ہیں، اس کا ہم اندازہ نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ چونکہ آج ساری دنیا پر "کاروباری" ذہنیت چھا گئی ہے۔ اس لئے ہم احسان کی قدر و قیمت اور اس کے انسانیت ساز نتائج سے لذّت آشنا ہی نہیں رہے۔ بیع و شریٰ کی اس منڈی میں جہاں ہر شے روپے سے تولی جاتی ہے، انسانیت کی بلند اقدار کی کوئی قیمت محسوس نہیں ہوتی۔ لیکن یاد رکھیے! یہ اقدار اپنی مستقل قیمت رکھتی ہیں۔ اس گئے گزرے زمانے میں بھی جہاں کہیں اس قسم کی کسی قدر کی نمود ہوتی ہے اس کے سامنے آنے سے روح میں بے ساختہ شگفتگی پیدا ہو جاتی ہے۔ اس قسم کا واقعہ کہ ایک شخص نے اپنا سب کچھ خرچ کر کے، ایک بیوہ کے دو مریض بچوں کی جان بچائی، "کاروباری" دنیا میں حماقت سے تعبیر کیا جائے گا۔ لیکن دنیائے انسانیت میں آج بھی اس کا ذکر تحسین و تبریک کے ساتھ ہو گا۔ قرآن، بلند انسانی اقدار کا وزن، کاروباری میزان میں نہیں کرتا۔ اس کے لئے اس کے اپنے پیمانے ہیں۔ احسان، اسی قسم کی قدر ہے۔

۱۹۶۳ء

قرآن کا سیاسی نظام

۱۔ مرکزِ ملت

ہمیں بہت سے حضرات کی طرف سے یہ استفسار موصول ہوا ہے کہ طلوعِ اسلام کے خلاف سب سے بڑا چارج یہ لگایا جاتا ہے کہ یہ کہتا ہے کہ مرکزِ ملت کی اطاعت "خدا اور رسول" کی اطاعت ہوتی ہے، اور مرکزِ ملّت سے مراد مرکزی حکومت پاکستان یا اسی قسم کی اور حکومت ہے۔ اس بات کی وضاحت کی جائے۔

ہم اس کی وضاحت ایک مرتبہ نہیں، متعدد بار کر چکے ہیں اور طلوعِ اسلام میں صراحت سے لکھ چکے ہیں کہ اس سے ہمارا مطلب کیا ہے۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے ہاں انداز یہ اختیار کیا جاتا ہے کہ جس کی مخالفت مقصود ہو اس کی صحیح بات لوگوں کے سامنے نہ آنے دی جائے۔ خود ہی اس کی طرف ایک غلط بات منسوب کر دی جائے اور پھر اسے ہدفِ طعن و تشنیع بنا کر اس کے خلاف پروپیگنڈا شروع کر دیا جائے۔ آپ ایک بار پھر سن لیجئے کہ مرکزِ ملّت سے ہماری مراد کیا ہے۔

عام مذاہب میں صورت یہ ہے کہ جن امور کو مذہبی احکام کہا جاتا ہے وہ چند اخلاقی ہدایات یا پوجا پاٹ کی رسوم پر مشتمل ہوتے ہیں۔ لوگ اپنے اپنے طور پر ان کی پابندی کرتے ہیں، بالفاظِ دیگر ان کے ہاں مذہب انفرادی چیز ہے۔ لیکن اسلام کا تصوّر اس سے مختلف ہے۔ اسلام ایک دین (نظامِ حیات) ہے جو ایک منظم اور اجتماعی شکل میں بروئے کار آتا ہے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ یہ ایک ایسی مملکت متشکل کرتا ہے جس میں احکامِ خداوندی قانون کی حیثیت اختیار کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس مملکت کے قوانین کی اطاعت کے لئے کسی سنٹرل اتھارٹی کی ضرورت ہوگی، جس کا فیصلہ آخری فیصلہ ہوگا۔ اس کو ہم "مرکزِ ملت" کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔

نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے اسلامی مملکت کی تشکیل فرمائی۔ جس کی سنٹرل اتھارٹی خود حضورؐ ہی تھے۔ آپؐ کے سوا اور ہو کون سکتا تھا؟ اس مملکت میں احکام خداوندی کی اطاعت سے مقصود ان قوانین کی اطاعت تھی جسے یہ سنٹرل اتھارٹی نافذ کرتی تھی۔ یعنی صورت یہ نہیں تھی کہ قرآنی احکام پر جس طرح کسی نے چاہا عمل کر لیا۔ ہر مسلمان کے لئے ضروری تھا کہ وہ نبی اکرمؐ کی طرف سے صادر فرمودہ فیصلوں کی کی اطاعت کرے۔ اسی کا نام اللہ اور رسولؐ کی اطاعت تھا۔

یہ نظام نبی اکرمؐ کی زندگی تک محدود نہیں تھا۔ اس لئے حضورؐ کی دنیا سے تشریف بری کے بعد یہ اسی طرح قائم رہا۔ اسے "خلافت علی منہاجِ نبوت" کہا جاتا ہے۔ اس میں سنٹرل اتھارٹی خلیفۃ المسلمین تھا۔ یہی وہ سنٹرل اتھارٹی (یا مرکزِ ملت) تھا جس کے فیصلوں کی اطاعت ہر مسلمان پر لازم تھی۔ کسی کو اس کا اختیار نہیں تھا کہ وہ قرآنِ کریم یا نبیؐ اکرم کے فیصلے پر اپنے طور پر جس طرح جی چاہے عمل کر کے کہے کہ میں خدا اور رسولؐ کی اطاعت کر رہا ہوں۔ مثلاً جب حضرت ابوبکرؓ نے مانعینِ زکوٰۃ کے خلاف جہاد کا فیصلہ کیا تو انفرادی طور پر کئی ایک صحابہؓ کو اس سے اختلاف تھا لیکن ان سب نے اطاعت اس سنٹرل اتھارٹی کے کے فیصلے کی کی۔ یا جب حضرت عمرؓ نے فیصلہ کیا کہ عراق کی مفتوحہ زمینیں سپاہیوں میں تقسیم نہ کی جائیں تو اکثر صحابہؓ کو اس سے اختلاف تھا۔ لیکن اس کے باوجود عمل سنٹرل اتھارٹی کے فیصلے کے مطابق ہی ہوا۔ ظاہر ہے کہ جن صحابہؓ نے اپنی ذاتی رائے کے خلاف (جو بہرحال ان کے تفقہ فی الدّین ہی کا نتیجہ تھی) مرکز کے فیصلہ کی اطاعت کی تو انہوں نے نہ تو (معاذ اللہ) طوعاً و کرہاً کسی مستبد حاکم کی اطاعت کی تھی اور نہ ہی ان کی یہ اطاعت (پناہ بخدا) "خدا اور رسولؐ کی معصیت تھی۔ یہ بلکہ عین خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے مرادف تھی یعنی عامۃ المسلمین کیلئے خلافت علی منہاجِ نبوت کا فیصلہ، خدا اور رسولؐ کے فیصلے کے مرادف تھا۔

جب بدقسمتی سے خلافت، ملوکیت میں تبدیل ہو گئی تو دین کے نظام کا یہ نقشہ باقی نہ رہا۔ اس کی وہ سنٹرل اتھارٹی باقی نہ رہی۔ اب وہ دیگر مذاہب کی طرح انفرادی سطح پر آگیا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ امت میں مختلف فرقے پیدا ہو گئے۔ سنٹرل اتھارٹی کی موجودگی میں مختلف فرقوں کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اب خدا اور رسولؐ کی اطاعت کا عملی طریق اس کے سوا کوئی ہو نہیں سکتا تھا کہ ایک فرقہ (یا اگر کوئی شخص کسی فرقہ سے متعلق نہیں ہونا چاہتا تھا تو وہ فرد) اپنے طور پر قرآن کریم اور احادیثِ نبویؐ کی پیروی کرے۔ یہ سلسلہ اب تک چلا آرہا ہے۔

ہمارے نزدیک دین کی وہی شکل مقصود تھی جو عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافت علیٰ منہاجِ نبوت میں قائم تھی اور دین اپنی وہی شکل اس وقت اختیار کرے گا۔ جب خلافت علیٰ منہاجِ نبوت دوبارہ قائم ہو۔ ہم اس کے دوبارہ قائم کرنے کے لئے کوشاں ہیں، اسی کو ہم قرآنی حکومت۔ حکومت خداوندی۔ اسلامی نظام یا اسلامی حکومت اور اس کی سنٹرل اتھارٹی کو "مرکزِ ملت" کہتے ہیں۔ خواہ وہ (امت کے مشورہ سے) ایک فرد کی صورت میں ہو، یا ایک مجلس کی شکل میں۔ اس مرکزِ ملت کے فیصلوں کی اطاعت، ہمارے نزدیک، اسی طرح خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے مرادف ہو گی۔ جس طرح مثلاً حضرت ابوبکر صدیقؓ کے فیصلوں کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے مرادف تھی۔ اس وقت افرادِ امت کو اس کی اجازت نہیں ہو گی کہ وہ قرآنِ کریم۔ سنتِ رسولؐ اللہ یا فقہ ائمہؒ پر اپنی صوابدید کے مطابق اپنے طور پر عمل کریں۔ اس وقت یہ سنٹرل اتھارٹی (یعنی خلافت علیٰ منہاج نبوت) کتاب و سنت و فقہ وغیرہ کی روشنی میں معاملہ زیرِ نظر کے متعلق جو فیصلہ دے گی اس کا اتباع سب کے لئے ضروری ہو گا۔ اس سے امت میں وہ وحدت پیدا ہو سکے گی جو عہدِ رسالت مآبؐ اور خلافتِ راشدہ میں تھی۔

یہ بات کہ قرآنِ کریم میں جہاں اس ضمن میں "اللہ اور رسولؐ" کے الفاظ آئے ہیں۔ اس سے مراد اسلامی نظام ہے۔ ہماری اختراع نہیں، یہ خیال متقدمین کا بھی تھا۔ اور خود ہمارے زمانے کے مفسرین کا بھی ہے۔

مثلاً قرآنِ کریم کی ایک آیت ہے۔ یَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَالرَّسُوْلِ [۸/۱] اے رسول! تم سے پوچھتے ہیں، انفال کے متعلق۔ کہہ دو کہ انفال "اللہ اور رسولؐ" کے لئے ہے۔ امام ابنِ جریر طبری (جن کی تفسیر کو ام التفاسیر کہا جاتا ہے) اللہ اور رسولؐ کی تفسیر میں مختلف اقوال نقل کرنے کے بعد اپنا فیصلہ یہ لکھتے ہیں۔

واولی هذه الاقوال بالصواب فی معنی الانفال
قول من قال هی زیادات یزیدها الامام لبعض
الجیش او جمیعهم

"انفال کے معنی کے متعلق ان تمام اقوال میں سے قرینِ صواب ان لوگوں کا قول ہے جنہوں نے کہا ہے کہ یہ وہ اضافے ہیں جو امام وقت بعض یا کل فوج کے لئے کرتا ہے"۔

یہاں انفال کے معنی سے بحث نہیں۔ مدعا صرف یہ ہے کہ "اللہ و رسول" کی تفسیر انہوں نے امام وقت لکھی ہے۔

(۲) امام رازیؒ نے آیت (۵/۳۳) انما جزآء الذین یحاربون اللہ و رسولہ کے تحت، امام ابوحنیفہؒ کا یہ قول نقل کیا ہے۔

قال ابوحنیفہ اذا قتل واخذ المال فالامام مخیر فیہ بین ثلاثۃ اشیاء۔

امام ابوحنیفہ نے فرمایا ہے کہ اگر باغی یا ڈاکو نے قتل بھی کیا ہے، اور مال بھی لیا ہے تو امام کو اختیار ہے کہ تینوں سزاؤں (قتل۔ قطع اور صلب) میں سے جو سزا چاہے اس کو دے"۔

(۳) اسی آیت کی تفسیر میں علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ الدرالمنثور میں یہ روایت درج کرتے ہیں

عن السعید بن المسیب والحسن والضحاک قالوا الامام مخیر فی المحارب یصنع بہ مایشاء

سعید بن مسیب، حسن بصری اور ضحاک (علیہم الرحمۃ) نے کہا ہے کہ محارب کے معاملہ میں امام کو اختیار ہے کہ جو چاہے کرے۔

(۴) یہی امام محی السنۃؒ بغویؒ نے معالم التنزیل میں لکھا ہے اور فتح البیان میں نواب صدیق حسن خاں مرحوم لکھتے ہیں۔

قال ابن عباس وسعید بن المسیب ومجاھد وعطاء والحسن البصری وابراھیم النخعی والضحاک وابوثور من شھر السلاح فی قبۃ الاسلام واخاف السبیل ثم ظفر بہ وقدر علیہ فامام المسلمین فیہ الخیار۔

حضرت ابن عباس۔ سعید بن المسیب مجاہد عطا حسن بصری، ابراہیم نخعی ضحاک ابوثور علیہم الرحمۃ نے کہا ہے کہ جس نے اسلامی محروسہ میں ہتھیار اٹھایا اور راستوں کو پُرخطر کر دیا۔ پھر وہ گرفت میں آیا اور پکڑا گیا۔ اس کے بارے میں مسلمانوں کے امام کو اختیار ہے

(جو سزا چاہے دے)۔

ان حضرات کے اقوال سے دو باتیں ظاہر ہوگئیں۔ ایک یہ کہ ان کے نزدیک "اللہ اور رسولؐ" سے مراد "امام وقت" ہے اور دوسرے یہ کہ یہ احکام، رسولؐ اللہ کی ذات گرامی یا آپ کی زندگی تک محدود نہیں تھے بلکہ دائمی ہیں۔

مولانا ابوالکلام آزادؔ، آیہ انفال کے متعلق اپنی تفسیر (ترجمان القرآن جلد دوم) میں لکھتے ہیں۔

مال غنیمت جو لڑائی میں ہاتھ آئے وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کا ہے۔ یعنی یہ بات نہیں ہونی چاہیئے کہ جو جس کے ہاتھ میں پڑ گیا وہ اس کا ہو گیا۔ بلکہ سب کچھ امام کے سامنے پیش کرنا چاہیئے۔ وہ اسے جماعت میں تقسیم کرے گا۔

آگے چل کر لکھتے ہیں۔

لیکن قرآن کریم نے یہ حکم دے کر مالِ غنیمت جو کچھ بھی ہاتھ آئے، حکومت (یعنی اسٹیٹ) کا ہے نہ کہ لوٹنے والوں کا، سپاہیوں کی ذاتی طمع و حرص کے ابھرنے کی راہ روک دی۔

آپ دیکھیے یہاں انہوں نے "اللہ اور رسولؐ" کے معنی حکومت (یعنی اسٹیٹ) لئے ہیں۔

اسی طرح سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب اپنی تفسیر تفہیم القرآن جلد اوّل (صفحہ ۶۵-۴۶۴) میں سورۃ المائدہ کی آیت نمبر ۳۳ کا ترجمہ اور تفسیر یوں لکھتے ہیں۔ آیت یہ ہے۔

إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۟ أَوْ يُصَلَّبُوٓا۟ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ خِلَٰفٍ أَوْ يُنفَوْا۟ مِنَ ٱلْأَرْضِ ... (۵/۳۳)

وہ اس کا ترجمہ یہ لکھتے ہیں:-

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولؐ سے لڑتے ہیں اور زمین میں اس لئے تگ و دو کرتے پھرتے ہیں کہ فساد برپا کریں ح۵۵ ان کی سزا یہ ہے کہ قتل کئے جائیں یا سولی چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ اور پاؤں مخالف سمتوں سے کاٹ ڈالے جائیں یا وہ جلاوطن کر دیئے جائیں ح۵۶

جن الفاظ پر ح۵۵ اور ح۵۶ نمبر دیئے گئے ہیں وہ ان کی تشریح حسب ذیل الفاظ میں کرتے ہیں۔

ح۵۵ زمین سے مراد یہاں وہ ملک یا وہ علاقہ ہے جس میں امن و انتظام کرنے کی ذمہ داری

اسلامی حکومت نے لے رکھی ہو اور خدا اور رسولؐ سے لڑنے کا مطلب اس نظام صالح کے خلاف جنگ کرنا ہے جو اسلام کی حکومت نے ملک میں قائم کر رکھا ہو۔ اللہ تعالیٰ کی مرضی یہ ہے اور اسی لئے اس نے اپنا رسولؐ بھیجا تھا کہ زمین میں ایک ایسا صالح نظام قائم ہو جو انسان اور حیوان اور درخت اور ہر اس چیز کو جو زمین پر ہے، امن بخشے، جس کے تحت انسانیت اپنی فطرت کے کمالِ مطلوب کو پہنچ سکے۔ جس کے زمین کے وسائل اس طرح استعمال کئے جائیں کہ وہ انسان کی ترقی میں مددگار ہوں نہ کہ اس کی تباہی و بربادی میں، ایسا نظام جب کسی سرزمین میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا قطع نظر اس کے کہ وہ چھوٹے پیمانے پر قتل و غارت اور رہزنی و ڈکیتی کی حد تک ہو یا بڑے پیمانے پر اس صالح نظام کو الٹنے اور اس کی جگہ فاسد نظام قائم کر دینے کے لئے ہو، دراصل خدا، اور رسولؐ کے خلاف جنگ ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے تعزیراتِ ہند میں ہر اس شخص کو جو ہندوستان کی برطانوی حکومت کا تختہ الٹنے کی کوشش کرے۔ بادشاہ کے خلاف لڑائی ...... (WAGING WAR AGAINST THE KING) کا مجرم قرار دیا گیا ہے۔ چاہے اس کی کارروائی ملک کے کسی دور دراز گوشے میں ایک معمولی سپاہی کے خلاف ہی کیوں نہ ہو اور بادشاہ اس کی دسترس سے کتنا ہی دور ہو۔ صلہ پر مختلف سزائیں بر سبیل اجمال بیان کر دی گئی ہیں تاکہ قاضی یا امام وقت اپنے اجتہاد سے ہر مجرم کو اس کے جرم کی نوعیت کے مطابق سزا دے۔ اصل مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ کسی شخص کا اسلامی حکومت کے اندر رہتے ہوئے اسلامی نظام کو الٹنے کی کوشش کرنا بدترین جرم ہے اور اسے ان انتہائی سزاؤں میں سے کوئی سزا دی جا سکتی ہے۔

آپ دیکھئے مودودی صاحب نے واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ "خدا اور رسولؐ" سے مراد اسلامی حکومت یا اسلامی نظام ہے۔ اسی کو طلوعِ اسلام مرکزِ ملت یا خلافت علیٰ منہاجِ نبوت سے تعبیر کرتا ہے یہ بات اس نے آج نہیں کہی، وہ تشکیلِ پاکستان کے بعد سے اسے برابر دہرائے چلا آ رہا ہے۔ (مثلاً) ستمبر ۱۹۴۸ء کے طلوعِ اسلام میں "خدا و رسولؐ کی اطاعت" کے عنوان سے ایک مقالہ شائع ہوا تھا جسے بعد میں ادارہ کی طرف سے شائع کردہ کتاب "اسلامی نظام" میں شامل کر لیا گیا تھا۔ اس میں آپ کو یہ الفاظ ملیں گے۔

قرآن شریف کی ان نصوص صریحہ سے یہ حقیقت واضح طور پر سامنے آگئی کہ "اللہ اور رسولؐ" کی اطاعت

سے مراد مرکزِ حکومتِ قرآن کی اطاعت ہے۔ وہ مرکز جو خدا کے احکام کا نافذ کرنے والا اور رسول اللہ کی امامتِ کبریٰ کو آگے چلانے والا ہوگا۔ اس اعتبار سے یہ مرکز "خدا اور رسولؐ" کا قائم مقام ہو جاتا ہے۔

اور اس مضمون کو آخری سطریں یہ تھیں۔

یہ حصہ صرف ترتیب و تدوینِ قوانین کا ہے۔ لیکن یہ قوانین کبھی وہ نتائج پیدا نہیں کر سکتے۔ جو اسلامی نظام کا ماحصل ہیں۔ جب تک ان کے نافذ کرنے والوں کو سیرت میں وہ تبدیلی نہیں پیدا ہو جائے گی جو قرآن چاہتا ہے۔ ہماری تاریخ میں اکثر ابواب ایسے ہیں جن میں مسلمان بادشاہوں نے وہی قوانین رائج کئے جنہیں ہم قانونِ شریعت کہتے ہیں (اور آج بھی کئی ایک اسلامی ممالک میں قوانینِ شریعت رائج ہیں) لیکن بایں ہمہ، ان کی سلطنتیں نوعِ انسان کے لئے کبھی موجبِ رحمت نہ بن سکیں۔ ان قوانین نے اپنے صحیح اور مکمل نتائج اس وقت پیدا کئے تھے جب یہ دنیا میں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ کے مقدس ہاتھوں سے نافذ ہوئے تھے۔ اس لئے یہ دیکھنے کے لئے کہ ہمارا نظام وہی نتائج پیدا کر رہا ہے یا نہیں، ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ ہماری سیرت، سیرتِ محمدیہؐ کے قالب میں ڈھل رہی ہے یا نہیں۔ سیرتِ محمدیہؐ معراجِ انسانیت ہے اور اس کی اصل تصویر قرآن کے صفحات میں محفوظ ہے۔

اگر با و نرسیدی تمام بولہبی است

اُمید ہے اس سے آپ پر یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ "مرکزِ ملت" سے ہماری مراد اسلامی نظام یا خلافت علیٰ منہاجِ نبوت کے سوا کچھ نہیں۔ جیسا کہ شروع میں لکھا جا چکا ہے۔ ہم اس حقیقت کو اس سے قبل کئی بار طلوعِ اسلام میں بیان کر چکے ہیں۔ جو حضرات ہماری مخالفت کرتے ہیں۔ ان میں سے قریب قریب ہر ایک کے ہاں طلوعِ اسلام جاتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ وہ اس سے بے خبر نہیں کہ "مرکزِ ملت" سے ہماری مراد کیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے کہ یہ حضرات برابر لکھتے چلے جا رہے ہیں کہ طلوعِ اسلام کے نزدیک ہر فاسق و فاجر حکومت کی اطاعت (معاذ اللہ، معاذ اللہ) "خدا اور رسولؐ" کی اطاعت ہے۔ آپ ہی فرمایئے کہ ہم اس کا کیا علاج کر سکتے ہیں۔ (۱۹۶۱ء)

۲ مرکزِ ملّت کی اطاعت

نوشہرہ سے ایک صاحب کا حسب ذیل خط موصول ہوا ہے۔

آپ کے لٹریچر سے ایک بات بالکل کھل کر سامنے آتی ہے۔ لفظِ رسولؐ کے معنی مرکزِ ملت (CENTRAL AUTHORITY) کے بھی ہیں اور وہ مرکزِ ملت ہی کی حیثیت سے امت کے مطاع ہے۔ ایک قاری کے ذہن میں لامحالہ چند سوالات ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ امید ہے کہ آپ کے ان سوالات کا دلائل کے ساتھ تسلی بخش جواب دیکر مزید خلجان سے نجات دلائیں گے۔

۱۔ اگر رسولؐ، بحیثیت رسولؐ (اپنے اصل معنوں میں) نہیں بلکہ بحیثیتِ مرکزِ ملت مطاع ہے تو

(ا) کلمۂ طیبہ (لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰہِ) میں محمدؐ کی رسالت پر ایمان لانے کی کیا حیثیت رہ جاتی ہے؟ اور

(ب) کلمہ کے اس جزو کو مستقل حیثیت کیوں دی گئی ہے، جبکہ مرکزِ ملت گاہ بگاہ بدلتے والے ہستی ہے۔

۲۔ قرآن پاک میں رسولؐ کی غیر مشروط اطاعت کا جو حکم دیا گیا ہے تو اس کی حیثیت اس مرکزِ ملت (سنٹرل اتھارٹی) کی موجودگی میں کیا رہ جاتی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی عائد کردہ حلال و حرام کی قیود کو توڑے اور اوامر و نواہی کی پروا نہ کرے۔

۳۔ کیا ان انبیاءؑ کی جو کوئی ریاست قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہو سکے اطاعت ان کے امتیوں پہ ان کی وفات کے بعد ختم ہو جاتی تھی، اور دوسرے نبی کے آنے تک وہ اپنی یا اس ملک کے مرکزِ ملت کی مرضی پر رضا و رغبت زندگی گذارنے کے مجاز تھے۔

۴۔ کیا خلافت راشدہ میں قرآن کے ساتھ ساتھ سنّت کو بھی قانون کی اساس کا درجہ حاصل تھا یا نہیں؟

طلوعِ اسلام | چونکہ آپ نے ایک ایسا سوال اٹھایا ہے جس کا تعلق طلوعِ اسلام کی طرف سے پیش کردہ ایک بنیادی اصول سے ہے، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کا جواب طلوع اسلام کے صفحات پر دیا جائے تاکہ دیگر قارئین بھی اس سے مستفید ہو سکیں۔

۱۔ نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کی ایک حیثیت یہ تھی کہ حضورؐ خدا کی طرف سے وحی پاتے تھے اور اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچاتے تھے، حضورؐ کی یہ حیثیت منفرد تھی، جس میں نہ اس وقت کوئی اور شریک ہو سکتا تھا، نہ اس کے بعد۔ اس لئے کہ حضورؐ کے بعد خدا سے وحی پانے کا سلسلہ ختم ہو گیا۔ حضورؐ کی یہ حیثیت قیامت تک باقی رہے گی۔ اس لئے کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا، جب تک وہ حضورؐ کی رسالت پر ایمان نہ لائے رسالت کی حیثیت تو ایسی ہے کہ جب تک کوئی شخص تمام انبیاءؑ پر ایمان نہ لائے وہ مسلمان نہیں ہو سکتا۔

۲۔ حضورؐ کا دوسرا منصب ایک ایسا نظام قائم کرنا تھا جس میں خدا کے احکام کو عملاً نافذ کیا جائے۔ اس میں پہلا مرحلہ اس نظام کے لئے تیاری کا تھا۔ اس مرحلہ میں حضورؐ ہی اپنے رفقاء کے سربراہ تھے۔ دوسرا مرحلہ وہ تھا جس میں وہ نظام قائم ہو گیا تھا۔ اس میں حضورؐ اس نظام کے مرکز (بلند ترین اتھارٹی) تھے۔ دورِ حاضر کی اصطلاح کے مطابق اس قسم کے نظام کو مملکت یا ریاست (STATE) اور اس اتھارٹی کو سنٹرل اتھارٹی کہا جاتا ہے۔ ہر دو مراحل میں، حضورؐ کی اطاعت جماعت مومنین پر فرض تھی۔

۳۔ حضورؐ کی وفات کے بعد، وحی کا سلسلہ تو منقطع ہو گیا، لیکن دین کا نظام مسلسل آگے چلا۔ اسے خلافت علیٰ منہاجِ رسالت کہا جاتا ہے۔ اب مرکزِ ملّت، حضورؐ کا جانشین، خلیفۃ الرسولؐ، یا امیر المومنین تھا۔ اور امت کے لئے اس کی اطاعت فرض تھی۔

۴۔ اگر یہ سلسلہ بدستور آگے چلتا تو ان جانشینانِ رسالت مآبؐ کی اطاعت اسی طرح باقی رہتی۔ لیکن کچھ عرصہ کے بعد یہ سلسلہ رک گیا۔ اور خلافت سلطنت میں تبدیل ہو گئی۔ جس میں احکامِ خداوندی کے بجائے سلطانی احکام کی فرمانروائی تھی۔ چونکہ دین کا نظام باقی نہیں رہا، اس لئے ان سلاطین کی اطاعت اسی قسم کی تھی، جس قسم کی دنیا کے اور بادشاہوں کی اطاعت ہوتی ہے۔ ان سلاطین کو "مرکزِ ملت" کہنا ہی غلط ہے۔ "مرکزِ ملّت" صرف اسی نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو کہا جائے گا۔ (خواہ وہ ایک فرد ہو یا ایک جماعت) جو احکامِ خداوندی کو نافذ کرے اور امورِ مملکت امت کے مشورہ سے طے پائیں۔ جو نظام خدا کی عائد کردہ حلال و حرام کی قیود کو توڑے اور اوامر و نواہی کی پروا نہ کرے وہ طاغوتی نظام ہے۔ اسے خدا اور اس کے رسولؐ سے کیا تعلق؟ اس کی اطاعت، طاغوت کی اطاعت ہے۔ یہ طلوعِ اسلام کے مخالفین کی افترا پردازی ہے۔ جو سب کچھ جانتے بوجھتے محض بدنیتی سے یہ مشہور کرتے ہیں کہ طلوعِ اسلام فلاں فلاں کو مرکزِ ملت اور ان کی اطاعت

کو خدا اور رسولؐ کی اطاعت قرار دیتا ہے۔ هٰذَا اِفْكٌ عَظِيمٌ۔ طلوع اسلام نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ اس نے مرکزِ ملت کی تشریح ہمیشہ "خلافت علیٰ منہاج رسالت" کے الفاظ سے کی ہے۔ یعنی اس قسم کا نظام جو مُحَمَّدٌ رَّسُولُ اللّٰهِ ط وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ کے مقدس ہاتھوں سے قائم ہوا تھا جس میں مملکت کا تمام کاروبار قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے ہوتا تھا۔

۵۔ جب صحیح اسلامی نظام (یا خلافت علیٰ منہاج رسالت) باقی نہ رہے تو پھر دین عملاً موجود نہیں رہتا، مذہب رہ جاتا ہے۔ جس میں سیاسی امور کو حکومت اپنے ہاتھ میں رکھتی ہے۔ اور شخصی امور میں لوگوں کو اجازت دے دیتی ہے کہ وہ جس طرح جی چاہے عمل کریں۔ سابقہ امتوں میں بھی یہ صورت پیدا ہو جاتی تھی، اور اب ہمارے ہاں صدیوں سے یہی ثنویت کارفرما ہے۔ شخصی امور میں لوگ اپنی صوابدید کے مطابق، اسی طریق پر چلنے کی کوشش کرتے چلے آرہے ہیں جو حضورؐ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں رائج تھا۔ اس میں جس قدر اختلاف پائے جاتے ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ اس طریق کار میں اختلاف ناگزیر ہیں یہی وہ مجبوری تھی جس کی وجہ سے یہ روایت وضع کر لی گئی کہ حضورؐ نے فرمایا ہے کہ "میری امت کا اختلاف رحمت ہے"۔ "مرکزِ ملت" کی موجودگی میں اختلاف کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ (واضح رہے کہ اب خود اہلِ حدیث حضرات نے بھی اس کا اعتراف کرلیا ہے کہ حدیث وضعی ہے)

۶۔ ایسا نظام جس میں امت کو احکامِ خداوندی کے مطابق چلایا جائے پھر سے قائم کیا جا سکتا ہے۔ اس نظام کی بلند ترین اتھارٹی کو وہ "مرکزِ ملت" کہا جائے گا۔ جس کی اطاعت خدا اور رسولؐ کی اطاعت کے قائمقام ہو گی۔ ظاہر ہے کہ یہ مرکز سب سے پہلے خود احکامِ خداوندی کی اطاعت کرے گا۔

جو حکومت کسی اصول پر قائم ہو، جب تک وہ مسلسل آگے چلتی رہے، اس میں اس کے سابقہ ادوار کے فیصلے علیٰ حالہ نافذ العمل رہتے ہیں۔ لیکن جن امور میں زمانے کے تقاضوں کے مطابق کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہو، ان میں اس دور کی حکومت ضروری تبدیلی کرلیتی ہے۔ جب تک اسلامی حکومت (خلافت علیٰ منہاج رسالت) قائم رہی، اس میں احکام کی یہی پوزیشن رہی۔ قرآن کریم نے جب امورِ مملکت کو باہمی مشورہ سے طے کرنے کا حکم دیا تھا تو اس کا یہی منشاء تھا۔ اس کی روشنی میں جب ہم اس حدیث کو دیکھتے ہیں جس میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم پر میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت واجب ہے"۔ تو بات واضح ہو جاتی ہے۔ اگر حضورؐ کے زمانے کے فیصلوں کو ہمیشہ کے لئے علیٰ حالہ رہنا مقصود ہوتا تو اس حدیث میں "خلفائے راشدین کی سنت" کی اطاعت کا اضافہ نہ کیا جاتا۔ یہی وجہ ہے

کہ تاریخ میں ایسے واقعات کا پتہ ملتا ہے، جن میں نبی اکرمؐ کے زمانے کے فیصلوں میں زمانۂ خلافت میں تبدیلی کی گئی - اس کی تفصیل طلوعِ اسلام میں متعدد بار پیش کی جاچکی ہے[1]۔ یہ خلفائے راشدین، کسی خاص زمانہ تک محدود نہ تھے۔ اگر خلافتِ راشدہ، مسلسل آگے چلتی تو حضرت ابوبکرؓ کے زمانہ سے لے کر آج تک کے خلفاء، خلفائے راشدین ہوتے۔ اگر وہ سلسلہ کسی وجہ سے منقطع ہوگیا ہے تو اسے پھر جاری کیا جاسکتا ہے۔ جب وہی سلسلہ پھر قائم کیا جائے گا تو ان نئے خلفائے راشدین کی سنّت کی اطاعت واجب ہوجائے، اس سے مراد ہوں گے۔ وہ فیصلے جو یہ نظام قرآنِ کریم کے احکام کو نافذ کرنے کے سلسلہ میں باہمی مشاورت سے کریگا۔ اس سلسلہ میں وہ یقیناً ان فیصلوں کو بھی سامنے رکھے گا جو اس سے پہلے زمانۂ نبویؐ اور خلافت راشدہ میں طے پائے تھے۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان فیصلوں کے ریکارڈ کو (جس طرح وہ ہم تک پہنچا ہے۔) یقینی طور پر صحیح نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن چونکہ اسلامی نظام کے لئے غلط اور صحیح کا بنیادی معیار، قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصول و احکام ہوں گے، اس لئے اسے سابقہ ریکارڈ کے پرکھنے میں بھی دقّت نہیں ہوگی۔

یہ ہے اس باب میں طلوعِ اسلام کا مسلک، جسے ہم اپنی بصیرت کے مطابق قرآنِ کریم سے سمجھ سکے ہیں

(۱۹۶۱ء)

۳۔ اسلام اور جمہوریّت

سوال :۔ آج کل یہ سلوگن عام کیا جارہا ہے کہ اسلام اور جمہوریت پاکستان کے دو ستون ہیں، اس کا صحیح مطلب کیا ہے؟ کیا اسلام میں جمہوریت شامل نہیں؟

جواب :۔ اس کا مطلب انہیں سے پوچھئے جو اس سلوگن کو لے کر اٹھے ہیں۔ ہمارے ہاں سلوگن خاص مقاصد کے ماتحت وضع ہوتے ہیں اور انہی مقاصد کے حصول کے لئے بلند کیے جاتے ہیں۔ اسلام کو ان میں سپر کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ پاکستان کی بنیاد "اسلامی جمہوریت" پر ہے تو یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ اسلام اور جمہوریت، پاکستان کے دو ستون ہیں، ایسے ہی ہے جیسے (مثلاً) یہ کہا جائے کہ اسلام اور عدل، اسلامی حکومت

---

[1] یہ تفصیل "سلیم کے نام خطوط" میں ملے گی۔

کے دو ستون ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ جب "اسلام" کہا جائے تو اس میں عدل شامل نہیں ہوتا۔ اس لئے اسلام کے ساتھ عدل کی شرط عائد کرنا بھی ضروری ہے۔

لیکن اگر "جمہوریت" سے مراد، مغربی انداز جمہوریت ہے، جس میں پارلیمان کی اکثریت کے فیصلے بلا شرط مبنی برحق سمجھے جاتے اور ملک کا قانون بن جاتے ہیں، تو یہ وہ جمہوریت تھی جس سے پیچھا چھڑانے کے لئے پاکستان کا مطالبہ کیا گیا تھا، اور جو اسلام کی عین نقیض ہے۔ لہٰذا اس مفہوم کی رو سے، اسلام اور جمہوریت، دو متضاد نظریات ہیں جو کبھی یکجا نہیں ہو سکتے۔

اسلامی حکومت کی بنیاد قرآن ہے اور یہ وہ جامع ضابطۂ زندگی ہے جس میں صحیح جمہوریت سے مراد ہے قرآن کریم کی حدود کے اندر رہتے ہوئے، امورِ مملکت کو امت کے باہمی مشورے سے طے کرنا"۔
(۱۹۶۳ء)

۴۔ اسلامی نظام کی خصوصیّت

سوال:۔ اسلامی نظامِ معاشرہ کی وہ بنیادی خصوصیت کونسی ہے جس کے پیش کرنے سے یہ بات واضح ہو جائے کہ یہ نظام دیگر نظام ہائے زندگی سے ارفع و اعلیٰ ہے۔

جواب:۔ انسانی زندگی کا منتہا ایک فرد کی انفرادیت کا استحکام اور اس کی ذات کی نشوونما ہے۔ اختیار اور ارادہ انسانی ذات کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اسلامی نظام فرد کے اختیار و ارادہ کی وسعتوں کو زیادہ سے زیادہ کرتا چلا جاتا ہے۔ اور اس پر صرف وہ پابندیاں عائد کرتا ہے جن سے ایک فرد دوسرے افراد کے اختیار و ارادہ کی راہ میں رکاوٹ نہ بن جائے۔ اس نظام کا مقصود و مطلوب، فرد کی انفرادیت کا حفظ و بقا ہے۔ اسی لئے وہ ہر اس ضابطہ اور اسلوب کی مخالفت کرتا ہے، جس سے فرد کی انفرادیت میں کمزوری واقع ہوئی ہو۔ اس کے نزدیک ملوکیت حرام ہے۔ کیونکہ اس اسلوبِ معاشرہ میں ایک فرد، دوسرے فرد کے فیصلوں کا محکوم ہو جاتا ہے وہ مذہبی نظام (THEOCRACY) کی مخالفت کرتا ہے۔ کیونکہ اس کے تابع فرد کو اپنی عقل و بصیرت کی رو سے کسی بات کے ماننے یا نہ ماننے کا اختیار نہیں رہتا۔ وہ نظام سرمایہ داری کا دشمن ہے۔ کیونکہ اس میں معاشی محتاجی کی بنا پر فرد کی انفرادیت باقی نہیں رہتی۔ وہ پیدائش کے اعتبار

سے انسانی بچوں میں تفریق کو باطل ٹھہراتا ہے۔ کیونکہ اس سے ایک فرد ان حالات کی بناء پر دوسرے افراد سے پیچھے رہ جاتا ہے جن پر اسے کوئی اختیار نہیں تھا۔ اسی اصول کے مطابق وہ مرد اور عورت میں انسانی تفریق کو غلط قرار دیتا ہے۔ کیونکہ کوئی بچہ نہ اپنی مرضی سے لڑکا بنتا ہے نہ لڑکی۔ نیز وہ ہر اس کمی کو پورا اور کمزوری کو رفع کرتا ہے۔ جس کے پیدا کرنے کا ذمہ دار فرد متعلقہ نہیں تھا۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں اسلامی نظام معاشرہ کی وہ خصوصیت جو اسے انسانوں کے خود ساختہ نظام ہائے زندگی سے ممتاز کرتی ہے۔ یوں سمجھئے کہ اسلام کی رو سے نظام فرد کے لئے ہوتا ہے، فرد نظام کے لئے نہیں ہوتا۔ ۱۹۶۲ء

۵۔ جُرم اور سَزا

سوال:۔ ایک شخص خدا کے حکم کی خلاف ورزی (جرم) کرتا ہے۔ اسلامی مملکت اسے سزا دیتی ہے۔ کیا اس سے خدا کے حکم کی خلاف ورزی کے اثرات ختم ہو جاتے ہیں، یا اس سے آگے کچھ اور بھی ہونا ہے؟

جواب:۔ خدا کے احکام کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ ایک قسم ان احکام کی ہے جو اسلامی مملکت میں قانون کی حیثیت رکھتے ہیں۔ مثلاً خدا کا حکم ہے کہ چوری نہ کرو۔ چوری نہ کرنا اسلامی مملکت میں جرم قرار پاتا ہے۔ جو شخص اس جرم کا مرتکب ہوتا ہے۔ حکومت کی طرف سے اسے سزا ملتی ہے۔ جہاں تک صرف چوری کے فعل کا تعلق ہے، یہ سوسائٹی کے خلاف جرم ہے سوسائٹی اسے سزا دیتی ہے تاکہ جرم کی روک تھام ہو سکے اور معاشرہ میں امن و اطمینان قائم رہے سوال یہ ہے کہ کیا اس سزا سے جرم کا معاملہ صاف ہو گیا، یا اسے کچھ باقی رہ گیا؟ اسے شراب کی مثال سے سمجھئے۔ شراب پینا جرم ہے۔ ایک شخص شراب پیتا ہے۔ سوسائٹی اسے سزا دیتی ہے۔ جرمانہ کر دیتی ہے، قید کر دیتی ہے، بید لگاتی ہے، وغیرہ وغیرہ۔ جو جرم اس شخص نے سوسائٹی کے خلاف کیا تھا، سوسائٹی نے اس کی سزا دے دی۔ ہو سکتا ہے کہ اس سزا سے، یہ شخص آئندہ ارتکاب جرم سے اجتناب کرے۔ اور اس کی سزا دیگر افراد کے لئے موجب عبرت ہو۔

لیکن شراب نے اس شخص کی صحت پر بُرا اثر کیا ہے۔ سوسائٹی کی طرف سے دی جانے والی سزا سے یہ اثر نہیں مٹ سکتا۔ اس کے لئے اسے علاج کرانا ہوگا۔ اس سے ظاہر ہے کہ کسی فعل سے جو جو اثرات شخص متعلقہ

کی ذات (یعنی اس کے اپنے آپ) پر مرتب ہوتے ہیں، سوسائٹی کی سزا ان کا ازالہ نہیں کرسکتی۔

لیکن قرآنی نقطۂ نگاہ سے جرم (یعنی حکم خداوندی کی خلاف ورزی) سے ایک تیسرا اثر بھی مرتب ہوتا ہے۔ اور یہ اثر مرتب ہوتا ہے انسان کے نفس۔ ذات (PERSONALITY) پر۔ شراب کی مثال میں۔

(۱) ایک جرم سوسائٹی کے خلاف ہوتا ہے، سوسائٹی کی طرف سے سزا، اس جرم کا ازالہ کر دیتی ہے۔

(۲) ایک اثر اس شخص کی صحت پر ہوتا ہے۔ اس کا ازالہ مناسب علاج کر دیتا ہے۔

(۳) ایک اثر اس شخص کی ذات پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جس طرح سزا اس نقصان کا ازالہ نہیں کرسکتی جو شراب کی وجہ سے اس شخص کی صحت پر ہوا ہے۔ اسی طرح سزا اور طبی علاج، اس اثر کو زائل نہیں کرسکتے جو خدا کے حکم کی خلاف ورزی سے اس کی ذات پر مرتب ہوا ہے۔

یہ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنے کمرے کے اندر شراب پیئے اور اس طرح نہ پولیس کی گرفت میں آئے، اور نہ اس جرم کی سزا پائے۔ لیکن اس سے وہ اس نقصان سے نہیں بچ سکتا جو اس کی صحت کے نقطۂ نگاہ سے ہوا ہے۔ وہ اثر مرتب ہو کر رہے گا، خواہ اسے کسی نے شراب پیتے دیکھا ہو یا نہ۔ اور خواہ اسے اس جرم کی سزا ملی ہو یا وہ بچ گیا ہو۔

شراب کی مثال سے آگے بڑھیئے۔ ایک شخص چوری کا گھی کھاتا ہے اور پکڑا نہیں جاتا۔ ظاہر ہے کہ اس سے صحت پر مضر اثر نہیں پڑے گا۔ بلکہ وہ اور اچھی ہو جائے گی۔ لیکن اس سے جو اثر اس کی ذات پر مرتب ہوا ہے۔ اس کے مضر اثرات تو اپنی جگہ پر ہوں گے۔ جو کچھ ہم نے اوپر لکھا ہے اس سے واضح ہے کہ انسان کے غلط عمل کا۔

(۱) ایک اثر سوسائٹی پر ہوتا ہے۔ سوسائٹی اس کا ازالہ سزا دے کر کرتی ہے۔

(۲) دوسرا اثر صحت پر ہوتا ہے۔ اس کا ازالہ مناسب علاج سے ہو سکتا ہے، لیکن

(۳) تیسرا اثر اس شخص کی ذات پر ہوتا ہے جس کا ازالہ نہ سوسائٹی کی سزا سے ہو سکتا ہے نہ طبی علاج سے۔ یہ اثر ہر جرم سے مرتب ہوتا ہے خواہ سوسائٹی اس کی سزا دے یا نہ دے اور خواہ اس کا اثر مجرم کی صحت پر پڑے یا نہ پڑے۔ یہ وہ حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے ان جامع الفاظ میں بیان کیا ہے کہ وَمَنْ يَكْسِبْ إِثْمًا فَإِنَّمَا يَكْسِبُهُ عَلَىٰ نَفْسِهِ (۴/۱۱۱) جو شخص کوئی جرم کرتا ہے، اس کا مضر اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ یہ بنیادی اصول ہے

جو مومن اور غیر مومن میں خطِ امتیاز کھینچتا ہے۔ مومن اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے اور کافر، صرف پہلے دو اثرات کو مانتا ہے۔ اس تیسرے اثر کو تسلیم نہیں کرتا، کیونکہ انسانی ذات، پر اس کا ایمان ہی نہیں ہوتا۔ اس تیسرے اثر کا ازالہ قرآن کریم کے تجویز کردہ نسخہ سے ہو سکتا ہے۔ یعنی احساس جرم اور آئندہ کے لئے اصلاح (مَن تاب واصلح) کے بعد ایسے کام کرنے جن سے انسانی ذات کو اس قدر تقویت مل جائے کہ اس سے اس جرم کے مضر اثرات کا ازالہ بھی ہو جائے، اور آئندہ کے لئے وہ جرم پر آمادہ کرنے والی ترغیبات کی مدافعت کرنے کے بھی قابل ہو جائے۔ اگر کوئی شخص اس تیسرے اثر کا اس طرح ازالہ نہیں کرتا تو خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق اس کی سزا پاتا ہے۔ اس سزا کو اگر وہ اس زندگی میں محسوس نہ کرے، تو موت کے بعد کی زندگی میں محسوس کرتا ہے۔ سوال صرف محسوس کرنے کا ہے، ورنہ اس کا اثر، ارتکاب جرم کے ساتھ ہی مرتب ہونا شروع ہو جاتا ہے۔

جن قوموں میں جرائم عام ہو جائیں، ان پر تینوں قسم کی تباہیاں آتی ہیں۔ پہلی تباہی اس طرح کہ اس قوم میں تخریبی قوتیں عام ہو جاتی ہیں، معاشرہ میں امن و سلامتی باقی نہیں رہتی۔ اس عدم تحفظ (INSECURITY) کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص اپنے لئے زیادہ سے زیادہ سمیٹنے کی فکر کرتا ہے اور اجتماعی مفاد کسی کے پیشِ نظر نہیں رہتا وغیرہ وغیرہ۔

دوسری تباہی اس طرح آتی ہے کہ اس قوم کی صحت اور توانائی ختم ہو جاتی ہے۔ ہمت اور جرأت صلابت ہو جاتا ہے۔ لوگ محنت کے عادی نہیں رہتے۔ ذہنی قویٰ کمزور ہو جاتے ہیں۔ زندہ صلاحیتیں مضمحل ہو جاتی ہیں اور اس طرح وہ قوم زندگی کی ٹھوس حقیقتوں کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں رہتی۔

اور تیسری اور سب سے بڑی تباہی اس طرح آتی ہے کہ اس طرح قوم میں مستقل اقدار کا تصور ہی نہیں رہتا۔ وہ حیوانی سطح پر زندہ رہتی اور اسی سطح پر مر جاتی ہے اس میں انسانیت کی خوبیاں پیدا ہی نہیں ہوتیں۔ انسانی ذات سے انکار کرنے والی قوم چونکہ اس کمزوری کو تسلیم ہی نہیں کرتی۔ اس لئے اسے اس تباہی کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ یہ وہ تباہی ہے جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ یہ ان مقامات سے آتی ہے جن کا انہیں شعور تک نہیں ہوتا۔ (من حیث لا یشعرون) $\frac{۱۶}{۲۶}$ - $\frac{۱۶}{۴۵}$ - $\frac{۳۹}{۲۵}$

اب ان احکام کو لیجئے، جو مملکت کے قوانین کی زد میں نہیں آتے۔ ان کی دو قسمیں ہیں۔ قسم اوّل کی مثال یوں سمجھئے کہ آپ کسی دوست کو ملنے کے لئے جاتے ہیں۔ وہ تپاک سے ملتا ہے اور آپ کے ساتھ محو گفتگو ہے

آپ کی نگاہ اس کی گھڑی پر پڑتی ہے جو میز کے ایک طرف پڑی ہے۔ آپ سوچتے ہیں کہ اگر وہ کسی کام کے لئے کمرے سے باہر چلا جائے تو آپ وہ گھڑی چرالیں۔ آپ سارا وقت یہی سوچتے رہتے ہیں، لیکن وہ آپ کا دوست اپنی جگہ سے سرکتا تک نہیں۔ اسے باہر جانے کی ضرورت نہیں پڑتی اور آپ ملاقات ختم کر کے مایوس واپس آجاتے ہیں۔ جہاں تک ملک کے قانون کا تعلق ہے آپ نے کوئی جرم نہیں کیا۔ لیکن جہاں تک قرآن کے قانونِ مکافات کا تعلق ہے، آپ ایک سنگین جرم کے مرتکب ہو چکے ہیں۔ اس کی سزا آپ کو مل کر رہے گی۔ یہ وہی جرم ہے جس کے متعلق پہلے لکھا جا چکا ہے۔ اس کا اثر انسان کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اس کی ایک سزا تو انسانی ذات کی نشوونما دب جانے کی صورت میں ملے گی، اور دوسری سزا (جس کے تصور سے انسان کی چیخیں نکل جاتی ہیں) اس شکل میں ملے گی کہ مرنے کے بعد، آپ کا وہ دوست جس کی نگاہوں میں آپ بہترین مخلص دوست تھے اور معاشرہ جس میں آپ اس قدر معتبر بنے ہوئے تھے۔ سب موجود ہوں گے۔ اور ان کے سامنے آپ کا سینہ چاک کر کے دکھایا جائے گا کہ اس ملاقات کے وقت آپ کے دل میں کیا خیالات گذر رہے تھے۔ آپ سوچئے کہ اس وقت آپ کی حالت کیا ہو گی؟ ہمارے نزدیک اس سزا سے زیادہ سخت اور شدید سزا کا تصور تک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ وہ جہنم ہے جس کی آگ، قرآن کے الفاظ میں، انسان کے دل میں شعلہ ریز ہوتی ہے۔ (۱۰۴/۷)

دوسری قسم کی مثال یوں سمجھئے کہ قرآن کریم "عدل اور انصاف" کا حکم دیتا ہے۔ عدل کے معنی ہیں کسی کا واجب حق دے دینا۔ اگر آپ کسی کا یہ حق دبا لیتے ہیں تو آپ قانون شکنی کرتے ہیں۔ حکومت اس کا نوٹس لے گی۔ اور حق دار کو اس کا حق دلائے گی۔ اور اگر اس میں خیانت کا پہلو بھی ہو گا، تو اس جرم کی سزا ملے گی۔ لیکن احسان اس قسم کا حکم نہیں۔ آپ ایک مزدور کو تین روپیہ روز پر کام پر لگاتے ہیں۔ اگر آپ اسے شام کو تین روپے دے دیتے ہیں تو آپ نے تقاضائے عدل کو پورا کر دیا[1]۔ لیکن اگر آپ دیکھتے ہیں کہ تین روپے میں اس کے بال بچوں کا پیٹ نہیں پلتا اور آپ اسے ایک روپیہ زیادہ دے دیتے ہیں تو اسے احسان کہیں گے۔ یعنی کسی کی کمی پوری کر کے اس کے بگڑے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا۔ اگر آپ اسے ایک روپیہ زائد نہیں دیتے تو آپ از روئے قانون کسی جرم کے مرتکب نہیں ہوتے۔ لیکن آپ اپنی ذات کے خلاف جرم کرتے ہیں۔ آپ کی ذات کی نشوونما عدل اور احسان دونوں سے ہونی تھی۔ آپ نے احسان نہیں کیا تو آپ کی ذات کی نشوونما رک گئی۔ یہ سخت سزا ہے جو کسی ذات کو دی جائے۔

---

[1] ہم اس وقت اس سوال سے بحث نہیں کر رہے ہیں کہ مزدور کی تین روپے روز کی اجرت بھی عدل کے اصول پر مبنی تھی یا نہیں۔

تحــ (۱۸/۴۹ - ۱۷/۱۳-۱۴ - ۱۰۰/۱۰ - ۸۶/۹)

لہٰذا قرآنی معاشرہ کے افراد، نہ صرف ان جرائم سے بچتے ہیں جو ازروئے قانون، جرم ہیں۔ بلکہ ان "جرائم" سے بھی بچتے ہیں جو قانون کی زد میں نہیں آتے۔ جو معاشرہ ان جرائم کو عادی طور پر نظرانداز کر دیتا ہے اس میں مستقل اقدار کا بہت بڑا حصہ عملی دائرے میں نہیں آتا۔ لہٰذا نشوونما یافتہ ذات نے جو تعمیری کام کرنے تھے، یہ معاشرہ ان سے محروم رہ جاتا ہے۔ یہ چیز بجائے خویش اس کی تباہی کے لئے کافی ہوتی ہے، خواہ وہ ان جرائم کی، جو قانون کی زد میں آتے ہیں، کتنی ہی روک تھام کیوں نہ کرے۔ اس معاشرہ کا حسنِ تدبّر اور خوبیٔ نظم و نسق اسے اس بنیادی کمزوری کے تباہ کن نتائج سے نہیں بچا سکتے۔ لیکن جس معاشرہ میں نہ قانونی جرائم کی روک تھام ہو اور نہ ہی ذات کے خلاف جرائم کا انسداد، اس کا جو انجام ہو سکتا ہے، اس کے متعلق سوائے اس کے اور کیا کہا جا سکتا ہے کہ ؎

خدا عدو کو بھی یہ خواب بد نہ دکھلائے

قفس کے سامنے جلتا تھا آشیاں اپنا

یاد رکھئے! یہ تو ممکن ہے کہ کسی معاشرہ میں قانونی جرائم کی روک تھام کا انتظام ہو۔ لیکن اس میں ذات کے خلاف جرائم کو کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ یہ معاشرہ تباہ تو ہوگا، لیکن کچھ عرصہ کے بعد مغرب کے ساتھ یہی ہوا ہے۔

لیکن اگر کسی معاشرہ میں قانونی جرائم کے انسداد کا انتظام نہیں، تو اس میں ذات کے خلاف جرائم کی اہمیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ معاشرہ اوّل الذکر کے مقابلہ میں بہت جلد تباہ ہوگا۔

اس سے واضح ہے کہ جس معاشرہ میں قانونی جرائم عام ہوں، وہ معاشرہ دینی نہیں کہلا سکتا۔ نہ ہی اس میں "دیندار" یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے سکتے ہیں کہ ہم تو دین کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں۔ جو لوگ جرائم کرتے ہیں ان سے ہمیں کیا واسطہ۔ وہ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہیں یہ ذہنیت دین کی حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ دین کی اہمیت محسوس کرنے والے افراد کا فریضہ ہے کہ وہ ایسا معاشرہ قائم کریں جس میں جرائم بار ہی نہ پا سکیں۔ ان کا فریضہ صرف اپنے آپ کو جرائم سے بچانا نہیں، دوسروں کو جرائم سے باز رکھنا بھی ہے۔ اور یہ کیفیت صرف قرآنی معاشرہ میں ممکن ہے۔ جس میں ہر فرد اس امر کا شدید احساس رکھتا ہے کہ اس سے کوئی ایسا کام سرزد نہ ہونے پائے، جس سے اس کی ذات پر مضر اثر پڑے۔ اس میں قانون اور ذات دونوں کے خلاف جرائم آ جاتے ہیں۔

۱۹۶۱ء

۶ ۔ شرعی سزائیں

طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۴۹ء میں آپ نے لکھا ہے کہ قرآن نے جو سزائیں بتائی ہیں، وہ زیادہ سے زیادہ سزائیں ہیں۔ حدودِ شرعی نافذ کرنے والے، احوال وظروف اور جرم کی نوعیت کے پیشِ نظر ان سے کم سزا بھی دے سکیں گے۔

(۱) کیا یہ آپ ہی کا اجتہاد ہے، یا اس سے پہلے کہیں اس کی مثال بھی ملتی ہے؟

(۲) زانی کی سزا سو کوڑے لکھی ہے، کیا کوئی شخص سو کوڑے کھا کر زندہ بچ سکتا ہے، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زانی کی سزا موت ہے، اور موت کا طریقہ کوڑے مارنا ہے۔ اس لئے اس کی سزا اگر سنگساری کر دی گئی تھی۔ تو اس میں کیا حرج تھا؟

جواب

جی نہیں۔ یہ ہمارا ہی اجتہاد نہیں تاریخ میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ مثلاً چوری کی سزا قطعِ ید ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ سزا ہے۔ جو قرآن نے متعین کی ہے۔ کس قدر چوری اور کن حالات میں چوری کے جرم میں مجرم اس سزا کا مستحق ہوگا۔ اور کن حالات میں اس سے کم سزا کا سزاوار، اس کے متعلق فقہ اور روایات دونوں میں تفصیلی مباحث موجود ہیں۔ روایات (مسلم اور بخاری) میں ہے کہ دینار سے کم کی چوری میں اس کا ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا۔ فقہ میں اس کو نصاب کہتے ہیں۔ بعض کے نزدیک نصاب ایک دینا ہے۔ اور بعض کے نزدیک ربع (چوتھائی) دینار۔ یہ تو رہا مقدار کا سوال۔ اب لیجئے احوال و ظروف کو۔ فقہ کی رو سے چور کو اس وقت تک قطعِ ید کی سزا نہیں دی جائے گی جب تک اس نے مال کسی محفوظ جگہ سے نہ چرایا ہو۔

سارق کسے کہتے ہیں؟

نسائی کی ایک روایت ہے کہ حضرتؐ سے دریافت کیا گیا کہ جو جانور پہاڑوں پر چرتے ہوں ان کی چوری کی بابت کیا حکم ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اگر کوئی شخص ایسا جانور چرا لے تو وہ جانور اور اس جانور جیسا ایک اور جانور پیش کرے، اور اسے کوڑوں کی سزا دی جائے۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ جو شخص بھوکا ہو۔ وہ اگر اپنی ضرورت کے مطابق کسی درخت سے پھل توڑ کر کھا لے (بشرطیکہ ساتھ باندھ کر نہ لے جائے) تو اس پر کچھ مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ اور اگر کچھ ساتھ لے جائے تو اس کا دگنا معاوضہ اور کوڑوں کی سزا ہوگی۔ اسی بناء پر حضرت عمرؓ نے زمانہ قحط میں روٹی چرا کر کھانے والے کو سارق نہیں ٹھہرایا۔ امام ابن حزم

ایسے مواقع کے متعلق یہاں تک کہتے ہیں کہ جب غربا و پر ایسا وقت آجائے۔ اور دولت منداس اضطرار کا احساس نہ کریں تو بھوکے غریبوں کو اجازت ہے کہ ان لوگوں کو لوٹ کر اپنی خوراک حاصل کرلیں۔ اگر اس کش مکش میں غریب مارا جائے۔ تو اس کے قاتل پر اس کا خون بہا ہوگا، اور اگر امیر مارا جائے تو اس امیر پر خدا کی لعنت ہوگی۔ غریب قاتل پر کچھ مواخذہ نہیں ہوگا۔

آپ کا دوسرا سوال کوڑوں کے متعلق ہے۔ کوڑے اس قسم کے نہیں ہوتے کہ سو کوڑوں سے انسان کی موت واقع ہوجائے۔ تاریخ میں ہمیں یہ واقعہ ملتا ہے کہ عہد حضرت عمرؓ میں ایک شخص نے دھوکے سے بیت المال سے کچھ روپیہ وصول کرلیا۔ حضرت عمرؓ نے اس کو سو کوڑے لگوائے۔ پھر دوسرے دن مزید سو کوڑوں کی سزا دی اور پھر تیسرے دن سو کوڑے اور لگوائے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کوڑے ایسی چیز نہ تھے کہ جن سے موت واقع ہوجائے۔

باقی رہا یہ کہ زنا کی سزا سنگساری (رجم) میں کیا ہرج ہے تو اس میں ہرج یہ ہے کہ یہ سزا قرآن کریم نے مقرر نہیں کی۔ اس نے زنا کی سزا کوڑے ہی تجویز کی ہے۔ (۲۴/۲) ۱۹۵۳ء

۷۔ زنا کی سزا

سورۂ نساء میں ایک آیت ہے۔

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآئِکُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْکُمْ .... (۴/۱۵)

اس کے متعلق کسی صاحب نے مدیر صدق، مولانا عبدالماجد دریا بادی سے حسب ذیل استفسار کیا۔

" نص سے ثابت ہے کہ جرم زنا کے الزام میں اربعۃ" منکم یعنی چار گواہوں کی ضرورت ہے اور گواہ بھی قیاسی نہیں۔ عینی اور چشم دید واقع ہوں۔

فعل زنا یہ ایک ایسا بدترین اور مذموم فعل ہے جو کہ برضا ہو یا بالجبر ہر حالت میں خفیہ اور پوشیدہ طور پر واقع ہوتا ہے۔ اور مطلق ہی سو فیصدی موقعوں پر اس کا انکشاف ہوتا ہے۔ تو ایسی صورت میں اللہ میاں کا چار گواہوں کی قید لگانا سمجھ میں نہیں آتا۔

معلوم نہیں ان حالات میں چار گواہوں کی قید کا غایت و خاصہ کیا ہے ؟ بالفرض جب تک
چار گواہ نہ ہوں اور اگر کوئی مرد کسی شادی شدہ عورت کے ساتھ بالرضا یا بالجبر زنا کرتا ہے
تو وہ صرف گواہوں کے نہ ہونے کے باعث قابلِ گرفت نہ ہو سکے گا۔ چاہے عورت لاکھ بار اقرار
کرے، لیکن بے سود۔ چنانچہ اسی وجہ سے مرد اس معاملہ میں آزاد ہو جاتا ہے۔ لہٰذا اب دریافت طلب
امر یہ ہے کہ شریعت حقہ میں جرم زنا کے الزام کے کیا طریقے ہیں ؟ مفصل وضاحت فرمائیں گے"۔

اس کے جواب میں مفسر دریابادی صاحب نے لکھا ہے کہ :-

"معصیت کی بعض ایسی صورتیں ہیں کہ ان کا جتنا چرچا کیا جائے اتنا ہی وہ اور پھیلتی ہیں، اور اس میں
نمبر اوّل یہ زنا کاری اور اس کے متعلقات ہیں، بے حیائی اور فحش محض اپنے تذکرے ہی سے متعدی
ہونے لگتے ہیں۔ شریعت یہ چاہتی ہے کہ حتی الامکان کسی واقعۂ زنا کا چرچا ہی نہ پھیلنے پائے۔ اس
لئے اگر ایک آدھ شخص چھپ چھپا کر کسی واقعۂ زنا کو دیکھ لیں۔ تو انہیں چاہیئے کہ اس پر خاک ڈالیں،
اور اس کا نام اپنی زبان پر نہ لائیں۔ لیکن جب مجرم اتنے ڈھیٹ اور بے باک ہو جائیں کہ اخفا کا اہتمام
ہی چھوڑ دیں، اور ان کے شیطانی ڈرامے کے من و عن گواہ چشم دید چار چار موجود ہوں تو اب تو جرم انفرادی
نہیں۔ تمام تر اجتماعی حیثیت کا ہو گیا۔ اور اب مجرموں پر حد شرعی لازم آ گئی۔ اور اب انہیں سزا ایسی
عبرت انگیز ملنی ہی چاہیئے۔ جس سے معاشرہ تھرا اُٹھے، اور ایسی عبرتناک سزا علی الاعلان ملے جو معاشرے
کے علم میں براہِ راست آ جائے"۔

آپ نے غور فرمایا کہ مولانا دریابادی کی تفسیر کی رو سے بات کیا ہوئی ؟ بات یہ ہوئی کہ اللہ تعالیٰ کا منشا یہ ہے کہ اگر لوگ زنا
اس طرح کریں کہ اس فعل کے ارتکاب کو عام طور پر لوگ نہ دیکھ سکیں تو پھر یہ جرم جرم ہی نہیں۔ حتیٰ کہ اگر کوئی ایک آدھ
آدمی کہیں چھپ چھپا کر انہیں ایسا کرتے دیکھ بھی لے، تو بھی اس کے لئے مناسب یہ ہے کہ اس کا کہیں چرچا نہ کرے۔
لیکن اگر لوگ اس طرح زنا کرنے لگیں کہ ان کے اس فعل کو لوگ کھلے بندوں دیکھیں تو ایسی صورت میں یہ جرم بڑا سنگین ہو
جاتا ہے، اور اس کی انہیں عبرت انگیز سزا ملنی چاہیئے۔

قرآن کریم کے متعلق ہمارا دعویٰ ہے (اور یہ دعویٰ برحق ہے اور اس پر ہمارا ایمان بھی ہے۔) کہ یہ ایک
ایسا ضابطۂ قوانین ہے جس کی مثال و نظیر دنیا کے تمام لوگ مل کر بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ آپ سوچیئے کہ اس ضابطہ کے
ایک اہم قانون کے متعلق جو کچھ دریابادی صاحب نے لکھا ہے وہ اگر غیروں کے سامنے آ جائے۔ تو وہ اس ضابطۂ قانون

کے متعلق کیا کہیں گے ؟ جنسی اختلاط ایک ایسا فعل ہے کہ دنیا میں بےحیا انسان بھی اسے گوارا نہیں کر سکتا کہ وہ کسی ایسی جگہ اس کا مرتکب ہو جہاں اس پر دوسرے لوگوں کی نگاہ پڑے ۔ زنا تو ایک طرف رہا ۔ میاں بیوی تک بھی اسے گوارا نہیں کر سکتے کہ کوئی شخص انہیں اس فعل میں مصروف پائے ۔ حالانکہ اس کا ہر ایک کو علم ہوتا ہے کہ شادی جنسی اختلاط ہی کا دوسرا نام ہوتا ہے ۔ اور اس کا نتیجہ بھی بچوں کی صورت میں دنیا کے سامنے آجاتا ہے ۔ اس قسم کی اتفاقی صورتیں تو کبھی کبھار پیدا ہو جاتی ہیں کہ کسی جوڑے نے کسی ایسی جگہ اس امر کا ارتکاب کیا جہاں اسے اطمینان تھا کہ انہیں کوئی نہیں دیکھتا اور اتفاق سے ایسا ہو گیا کہ کوئی راہ گذر ادھر سے آنکلا ، اور اس نے انہیں دیکھ لیا ۔ لیکن یہ چیز کہ لوگ سر را ہے اور کھلے بندوں جنسی اختلاط میں مصروف ہو جائیں (اور وہ بھی زنا کے طور پر) انسان کے تصوّر میں بھی نہیں آسکتی ۔ اندریں حالات آپ غور کیجئے کہ محترم دریا بادی صاحب نے جو تفسیر پیش فرمائی ہے وہ کس حد تک قرآنی ہو سکتی ہے ؟

تو یہ ہے اس آیت کی وہ تفسیر جسے ہمارے علمائے کرام کا ایک گروہ پیش کرتا ہے ۔ دوسرا گروہ یہ کہتا ہے کہ یہ آیت ہی منسوخ ہے ۔ لیکن وہ بھی اسے منسوخ اسی حد تک مانتے ہیں جہاں تک سزا کا تعلق ہے ۔ جرم زنا کے ثبوت کے لئے چار عینی گواہوں کی ضرورت ان سب کے نزدیک ضروری ہے ۔ بہرحال آپ ان علماء کا نقطۂ نگاہ بھی دیکھئے جو اسے منسوخ بھی مانتے ہیں ۔ تفسیر ابن کثیر ہمارے ہاں ایک بڑی قابلِ اعتماد تفسیر سمجھی جاتی ہے ۔ یہ تفسیر درحقیقت امام طبری کی تفسیر ہی کا ایک "سب ایڈیشن" ہے ۔ اس میں آیت کی تفسیر میں لکھا ہے ۔

> ابتدائے اسلام میں یہ حکم تھا کہ جب عادل گواہوں کی شہادت سے کسی عورت کی سیاہ کاری ظاہر ہو جائے تو اسے گھر سے باہر نہ نکلنے دیا جائے ۔ گھر ہی میں قید کر دی جائے اور جنم قید ہو ۔ یعنی موت سے پہلے نہ چھوڑا جائے ۔ خدا اس کا بیان فرما کر پھر فرماتا ہے کہ ہاں یہ اور بات ہے کہ خدا ان کے لئے کوئی اور راہ بتا دے ۔ پھر جب دوسری صورت کی سزا تجویز ہوئی تو وہ ناسخ ٹھہری اور یہ حکم ہٹ گیا ۔ حضرت ابن عباسؓ فرماتے ہیں جب تک سورۂ نور کی آیت نہ اتری زنا کار عورت کا یہی حکم رہا ۔ پھر اس آیت میں شادی شدہ کو رجم کرتے یعنی پتھر مار مار کر مار ڈالتے اور بے شادی شدہ کو کوڑے مارنے کا حکم اترا ۔ حضرت عکرمہؒ حضرت سعید بن جبیرؒ حضرت حسنؒ حضرت عطا خراسانیؒ حضرت ابو صالحؒ حضرت قتادہؒ حضرت زید بن اسلمؒ حضرت ضحاکؒ کا بھی یہی قول ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس امر پر سب کا اتفاق ہے ۔

اس تفسیر میں آپ کے سامنے ایک نئی بات آگئی۔ یعنی اس میں لکھا ہے کہ سورۃ نور کی آیت میں شادی شدہ کو رجم کرنا۔ یعنی پتھر مار مار کر مار ڈالنا۔ اور بے شادی شدہ کو کوڑے مارنے کا حکم اترا۔ لیکن سورہ نور میں کسی جگہ بھی رجم کا ذکر نہیں۔ اس میں صرف یہ حکم ہے۔

الزانية والزانى فاجلدوا كل واحد منهما مائة جلدة (۲۴/۲)

یعنی زانی عورت اور زانی مرد میں سے ہر ایک کو سو سو کوڑے لگاؤ۔

آپ حیران ہوں گے کہ آیت میں تو صرف کوڑے لگانے کا حکم ہے۔ پھر امام ابن کثیر نے یہ کیسے فرما دیا کہ اس میں رجم کرنے کا بھی حکم ہے۔ لیکن آپ کو شاید اس کا علم نہیں ہمارے علمائے تفسیر و روایات کے نزدیک قرآن کی آیتوں کی کتنی قسمیں ہیں ان کے عقیدہ کی رو سے قرآن میں بے شمار آیات ایسی ہیں جن کا حکم منسوخ ہو چکا ہے، اور وہ محض ثواب کی خاطر پڑھی جاتی ہیں۔ لیکن اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز یہ عقیدہ ہے کہ قرآن کی ایسی آیتیں بھی ہیں جو قرآن کے اندر موجود نہیں لیکن ان کا حکم موجود ہے۔ آیت رجم انہی آیات میں سے ہے۔ یعنی اس کا حکم تو موجود ہے۔ لیکن خود آیت قرآن میں موجود نہیں ہے۔ اس اجمال کی تفسیر خود امام ابن کثیر کی زبانی سنیئے۔ وہ سورہ نور کی مذکورہ بالا آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

> موطا مالک میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالےٰ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں حمد وثنا کے بعد فرمایا کہ لوگو! اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد صلے اللہ علیہ وسلم کو حق کے ساتھ بھیجا اور آپ پر اپنی کتاب نازل فرمائی۔ اس کتاب اللہ میں رجم کرنے کے حکم کی آیت بھی تھی جسے ہم نے تلاوت کی۔ یاد کی۔ اس پر عمل بھی کیا۔ خود حضورؐ کے زمانہ میں بھی رجم ہوا۔ اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ مجھے ڈر لگتا ہے کہ کچھ زمانہ گذرنے کے بعد کوئی یہ نہ کہنے لگے کہ ہم رجم کو کتاب اللہ میں نہیں پاتے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ خدا کے اس فریضے کو جسے اللہ نے اپنی کتاب میں اتارا، چھوڑ کر گمراہ ہو جائیں۔ کتاب اللہ میں رجم کا حکم مطلق حق ہے اس پر جو زنا کرے اور ہو شادی شدہ خواہ مرد ہو یا عورت ہو جبکہ اس کے زنا پر شرعی دلیل ہو یا حمل ہو یا اقرار ہو۔ یہ حدیث صحیحین میں اس سے بھی مطوّل ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبہ میں فرمایا۔ لوگ کہتے ہیں کہ رجم یعنی سنگساری کا مسئلہ ہم قرآن میں نہیں پاتے۔ قرآن میں صرف کوڑے مارنے کا حکم ہے۔ یاد رکھو! رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم نے رجم کیا۔ اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اگر مجھے خوف نہ ہوتا کہ لوگ کہیں گے کہ قرآن میں جو نہ تھا عمرؓ نے لکھ دیا۔ تو میں آیت رجم کو اسی طرح لکھ دیتا۔ جس طرح نازل ہوئی تھی۔ یہ حدیث نسائی شریف

میں بھی ہے۔ مسند احمد میں ہے کہ آپ نے اپنے خطبہ میں رجم کا ذکر کیا اور فرمایا رجم ضروری ہے۔ وہ اللہ تعالیٰ کی حدوں میں سے ایک حد ہے۔ خود حضورؐ نے رجم کیا اور ہم نے بھی آپ کے بعد رجم کیا۔ اگر لوگوں کے اس کہنے کا کھٹکا نہ ہوتا کہ عمرؓ نے کتاب اللہ میں زیادتی کی جو اس میں نہ تھی تو میں کتاب اللہ کے ایک طرف آیت رجم لکھ دیتا۔ عمر بن خطاب عبداللہ بن عوف اور فلاں اور فلاں کی شہادت ہے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے بھی رجم کیا۔ یاد رکھو تمہارے بعد ایسے لوگ آنے والے ہیں جو رجم کو اور شفاعت اور عذاب قبر کو جھٹلائیں گے اور اس بات کو بھی کہ کچھ لوگ جہنم میں سے اس کے بعد نکالے جائیں گے کہ وہ کوئلے ہو گئے ہوں۔ مسند احمد میں ہے کہ امیر المومنین حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ رجم کے حکم سے انکار کرنے کی ہلاکت سے بچنا الخ امام ترمذیؒ بھی اسے لائے ہیں اور اسے صحیح کہا ہے۔ ابو یعلیٰ موصلی میں ہے کہ لوگ مروان کے پاس بیٹھے ہوئے تھے۔ حضرت زیدؓ بن ثابت بھی تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ہم قرآن میں پڑھتے تھے کہ شادی شدہ مرد یا عورت جب زناکاری کریں تو انہیں ضرور رجم کردو۔ مروان نے کہا کہ پھر تم نے اس آیت کو قرآن میں نہ لکھ لیا؟ فرمایا سنو، ہم میں جب اس کا ذکر چلا تو حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ میں تمہاری تشفی کئے دیتا ہوں۔ ایک شخص نبی صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا۔ اس نے آپ سے ایسا ایسا ذکر کیا اور رجم کا بیان کیا۔ کسی نے کہا۔ یا رسول اللہؐ آپ رجم کی آیت لکھ لیجئے۔ آپ نے فرمایا اب تو میں لکھ نہیں سکتا۔ یا اسی کی مثل یہ روایت نسائی میں بھی ہے۔ پس ان سب احادیث سے ثابت ہوا کہ رجم کی آیت پہلے لکھی ہوئی تھی۔ پھر تلاوت میں منسوخ ہو گئی اور حکم باقی رہا۔ واللہ اعلم۔

تو آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی بیوی کے رجم کا حکم دیا۔ جس نے اپنے ملازم سے بدکاری کرائی تھی۔ اسی طرح حضورؐ نے ماعز رضی اللہ عنہ کو اور ایک غامدیہ عورت کو رجم کرایا۔ ان سب واقعات میں یہ مذکور نہیں کہ رجم سے پہلے آپ نے انہیں کوڑے بھی لگوائے ہوں۔ بلکہ ان سب صحیح اور صاف حدیثوں میں صرف رجم کا ذکر ہے۔ کسی میں کوڑوں کا بیان نہیں۔ اسی لئے جمہور علماء اسلام کا یہی مذہب ہے ابو حنیفہؒ، مالکؒ، شافعیؒ رحمہم اللہ بھی اسی طرف گئے ہیں۔ امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ پہلے اسے کوڑے مارنے چاہئیں پھر رجم کرنا چاہیئے تاکہ قرآن و حدیث دونوں پر عمل ہو جائے۔ جیسے کہ حضرت امیر المومنین

علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے منقول ہے کہ جب آپ کے پاس سراحہ لائی گئی جو شادی شدہ عورت تھی اور زنا کاری میں آئی تھی تو آپ نے جمعرات کے دن تو اسے کوڑے پٹوائے اور سنت رسول اللہ پر عمل کر کے سنگسار کرا دیا۔

مسند احمد سنن اربعہ اور مسلم شریف میں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ میری بات لے لو میری بات لے لو۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے لئے راستہ نکال دیا۔ کنوارا کنواری کے ساتھ زنا کرے تو سو کوڑے اور سال بھر کی جلاوطنی اور شادی شدہ، شادی شدہ کے ساتھ کرے تو رجم۔

آپ نے غور فرمایا کہ ہمارے آئمہ تفسیر و روایات کے نزدیک خود قرآن کی کیا پوزیشن ہے اور زنا کے متعلق کیا احکام ہیں ؟

اس تمام پریشانی فکر و نظر کے بعد آپ قرآن کریم کی طرف آیئے اور دیکھئے کہ وہاں سے اس آیت کے معنی کیا ملتے ہیں۔ آیت میں یہ لکھا ہے کہ تمہاری عورتوں میں سے جو فحش کا ارتکاب کرے تو اس کے لئے چار گواہوں کی ضرورت ہے اور جب یہ جرم ثابت ہو جائے تو ان کی سزا یہ ہے کہ ان کی آزادی سلب کر لی جائے۔ قرآن میں فحش کا لفظ متعدد مقامات پر آیا ہے۔ اس کے معنی ناپسندیدہ حرکات یا بے حیائی کی باتیں ہیں۔ مثلاً سورۃ اعراف میں کفار کے متعلق ہے۔

وإذا فعلوا فاحشة قالوا وجدنا عليها اٰباءنا ۔ (۷/۲۸)

یہ لوگ جب کسی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ داداؤں کو ایسا ہی کرتے پایا ہے۔

ظاہر ہے کہ یہاں فاحشہ کے معنی عام بے حیائی کی باتوں کے ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ قرآن نے زنا کو بھی فحش (بے حیائی) کہا ہے۔ اس لئے کہ زنا ہے ہی بے حیائی۔ لیکن ہر فحش (بے حیائی) زنا ہی نہیں ہو سکتی۔ بے حیائی میں اور باتیں بھی تو داخل ہیں۔

سورۃ نور میں زنا کی تصریح کے ساتھ اس کی سزا کا ذکر ہے۔ اس لئے ظاہر ہے کہ سورہ نساء کی آیت میں فاحشۃ سے مراد زنا کے علاوہ دوسری بے حیائیاں ہیں۔ لہٰذا اس آیت کے واضح معنی یہ ہوئے کہ جو عورتیں زنا کے علاوہ اور بے حیائی کی باتیں کریں۔ تو اس کے لئے چار گواہوں کی ضرورت ہے۔ اور جب یہ جرم ثابت ہو جائے تو اس کی سزا یہ ہے کہ ان کی آزادی روک لی جائے۔ یعنی قرآن نے جرم زنا کے لئے چار عینی شاہدوں کی ضرورت نہیں بتائی۔ عام بے حیائی کی باتوں کے لئے (جو زنا تک لے جانے کا موجب بن سکتی ہیں۔) چار گواہوں کی شرط عائد کی ہے۔

آپ فرمایئے کہ قرآنی آیت کے اس مفہوم میں کسی قسم کا کوئی اشکال یا ابہام باقی رہ جاتا ہے ؟ لیکن مشکل

یہ ہے کہ جو شخص اس مفہوم کو پیش کرے گا جو خود قرآن سے متعین ہوتا ہے اور عقل کے مطابق ہے تو اس کے متعلق شور مچا دیا جائے گا کہ وہ منکرِ حدیث و منکرِ سنت رسول اللہ ہے۔ بالفاظِ دیگر اس کا جرم یہ ہے کہ اس کی غیرت گوارا نہیں کرتی کہ وہ اس قسم کی رکیک روایات کو حضور رسالت مآب صلے اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی طرف منسوب کرے۔ وہ یہ کہتا ہے کہ یہ روایات وضعی ہیں اور حضورؐ کی طرف یونہی منسوب کر دی گئی ہیں۔ اسی کا نام "فتنہ انکارِ حدیث" ہے۔

سنہ ۱۹۵۵ء

(متفرقات)

۱- کیا عمر گھٹ بڑھ سکتی ہے؟

ایک صاحب لاہور سے دریافت فرماتے ہیں۔

آیا انسان کی موت کا وقت پہلے سے ہی متعین ہوتا ہے؟

یعنی اس عالم کون و فساد میں ہر متنفس کا عرصۂ حیات خدائے عزّوجل کی طرف سے مقدر کر دیا گیا ہے اور اس میں کم و بیش نہیں ہو سکتا۔ یا مرگ و زیست حالات و حادثات دہر کے تابع ہوتے ہیں۔

بعض اوقات کسی مریض کے علاج میں کوتاہی، مریض کا اخفائے مرض، مناسب طبی امداد کی عدم موجودگی، غلط تشخیص وغیرہ موت کا باعث بن جاتے ہیں۔ ان حالات میں کیا سمجھنا چاہیئے کہ متوفی کا عرصۂ حیات ہی اسی قدر تھا یا اس کا مناسب علاج ہوتا تو وہ زندہ رہ سکتا تھا۔

یا مثلاً ایک شخص سات بجے صبح تندرست و توانا جہاز میں سوار ہوتا ہے۔ اور سات بج کر ۱۵ منٹ پر ہوائی حادثہ کی وجہ سے ہلاک ہو جاتا ہے۔ کیا وہ جہاز پر سوار نہ ہونے سے بچ سکتا تھا؟

صلۂ رحمی، صدقات و خیرات سے عمر بڑھ سکتی ہے اور مرض الموت سے نجات مل سکتی ہے یا یہ محض توہمات ہیں؟

طلوعِ اسلام یہ سوال دراصل مسئلہ تقدیر سے متعلق ہے، اور تقدیر کا مسئلہ وہ ہے جس کے متعلق غلط تصور نے مسلمانوں کو برباد کر رکھا ہے۔ تقدیر کا مسئلہ اس قدر اہم ہے کہ اس کے متعلق ہر دور میں کتابوں کے انبار لکھے گئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس کی پیچیدگیاں حل ہونے میں نہیں

آئیں۔ محترم پرویز صاحب نے اپنی کتاب معارف القرآن کی پہلی جلد میں اس[1] موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالی ہے اور ہم سمجھتے ہیں کہ اس کا مطالعہ بہت سے اشکال کو رفع کر دیتا ہے۔

جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے۔ یہ سوال کہ انسان کی عمر پہلے سے متعین ہے، یا یہ گھٹ بڑھ سکتی ہے، اسی اصولی مسئلہ کے متعلق ہے کہ انسان مجبور محض ہے یا اسے اختیار و ارادہ بھی حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب باب المراسلات میں ضمنی طور پر نہیں دیا جا سکتا۔ اس لئے ہم اس اصولی سوال کے متعلقات و تضمنات سے صرف نظر کرتے ہوئے صرف اسی نکتہ کے متعلق کچھ صراحت کریں گے۔ کہ انسان کی عمر پہلے سے متعین ہے یا گھٹ بڑھ سکتی ہے؟

سورۂ آل عمران میں ہے کہ:۔

وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ۔ (۳/۱۴۵)

اس کا ترجمہ عام طور پر یوں کیا جاتا ہے کہ:۔

"کسی شخص کے لئے یہ نہیں کہ وہ اللہ کے حکم کے بغیر مر جائے۔ موت کا مقرر وقت لکھا ہوا ہے"۔

اور اس سے مفہوم یہ لیا جاتا ہے کہ:۔

موت کا ایک دن معیّن ہے۔

اس لئے نہ تو انسان کی احتیاط اور تدبیر اس وقت معیّن کو مؤخر کر سکتی ہے اور نہ ہی اس کی بے احتیاطی قبل از وقت موت لا سکتی ہے۔ اس عقیدہ کا اثر یہ ہے کہ لوگ عام طور پر اپنی صحت سے لاپرواہی برتتے ہیں۔ بیمار ہو جاتے ہیں تو اول تو علاج ہی نہیں کرتے، اور اگر علاج کرتے ہیں تو بڑی بددلی سے۔ متعدی امراض کے متعلق کبھی احتیاط نہیں برتتے اور جب بھی ان سے اس کے متعلق کہا جائے تو جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ موت اور بیماری سب پہلے سے لکھی ہوئی ہے انسان کی کوئی تدبیر اس لکھے کو مٹا نہیں سکتی۔ اگر موت آنی ہے تو ہزار تدبیروں کے باوجود آکر رہے گی، اور اگر اس کا وقت نہیں آیا تو انسان جس قدر بد احتیاطی چاہے کرے اسے کوئی نہیں مار سکتا۔ لیکن یہ تصور قرآن کے منشاء کے خلاف ہے۔

---

[1] اس جلد کا نام "من و یزداں" ہے۔ جس میں "مشیت" کے عنوان کے تحت اس مسئلہ پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ (۱۹۶۴ء)
نیز اس موضوع پر مبسوط تصنیف کتاب التقدیر شائع ہو چکی ہے (۱۹۶۶ء)

قرآن یہ کہتا ہے کہ ہر شخص جو پیدا ہوا ہے اسے موت ضرور آئے گی۔ لیکن اس نے یہ کہیں نہیں بتایا کہ موت کب آئے گی۔ اس لئے ہر شخص کی موت کا وقت وہ ہوتا ہے جب وہ مر جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اللہ کے قانون نے ہر چیز کے اثرات کے اندازے مقرر کر دیئے ہیں۔ آگ کے سامنے ہاتھ رکھو تو وہ (سردی کے موسم میں) خوشگوار گرمی پہنچائے گی۔ لیکن اگر اس کے اندر ہاتھ ڈال دو۔ تو ہاتھ جل جائے گا۔ پانی کا ایک گلاس ہو تو وہ زندگی عطا کرے گا، لیکن جب اسی پانی میں ڈوب جاؤ تو اس سے موت واقع ہو جائے گی۔ سنکھیا کی بوندیں (طبی اصولوں کے مطابق) کھاؤ تو وہ کئی امراض کو فائدہ دے گا۔ لیکن اگر اس کی ڈلی نگل جاؤ تو اس سے ہلاکت واقع ہو جائے گی۔ یہ ان اشیاء کے پیمانے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے اسی طرح موت کے پیمانے مقرر کر دیئے ہیں۔

نَحْنُ قَدَّرْنَا بَیْنَکُمُ الْمَوْتَ۔ (۵۶/۶۰)

ہم نے تمہارے درمیان موت کے پیمانے مقرر کر دیئے۔

یہ پیمانے ایسے قوانین کے مطابق متعین ہوئے ہیں جن میں تبدیلی نہیں ہوتی۔ اسی چیز کو قرآن نے دوسرے مقامات پر کتاب مؤجل کہا ہے۔ کتاب کے معنی قانون ہیں اور مؤجل کے معنی مقرر کردہ۔ یعنی یہ خدا کا مقرر کردہ قانون ہے کہ فلاں چیز سے ہلاکت ہوگی اور فلاں سے زندگی ملے گی۔ اس کے بعد قرآن نے کہہ دیا کہ یاد رکھو۔

لَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّهْلُکَةِ (۲/۱۹۵)

اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں ہلاکت میں نہ ڈالو۔[1]

اگر موت کا وقت پہلے ہی سے مقرر ہوتا تو یہ کہنے کی ضرورت ہی نہ تھی کہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یہی وہ حکم ہے جس کی رو سے خودکشی جرم قرار پاجاتی ہے۔ بہ ظاہر ہے کہ خودکشی کی ایک صورت تو وہ ہے جس میں انسان اپنا خاتمہ چند لمحوں میں کر لیتا ہے۔ لیکن اس کی دوسری شکل وہ بھی ہے جس میں انسان آہستہ آہستہ خودکشی کرتا ہے۔ مثلاً اگر تپ دق کا مریض اپنی صحت اور بیماری کے علاج سے لاپرواہی برتتا ہے تو وہ تدریجی خودکشی کرتا ہے۔ وہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتا ہے۔

قرآن علم الطب کی کتاب نہیں کہ وہ انسانی امراض اور ان کے علاج سے بحث کرے۔ لیکن اس کے باوجود اس نے ایسے اشارات دے دیئے ہیں جن سے توجہ اس طرف منعطف ہو جاتی ہے کہ ایسے کاموں سے اجتناب برتنا چاہیئے

---

[1] اگرچہ یہ آیت اجتماعی موت اور حیات کے قانون سے بحث کرتی ہے لیکن انفرادی موت اور حیات بھی اس کے دائرہ سے باہر نہیں۔

جن سے امراض پیدا ہوتے ہیں۔ اور جب امراض پیدا ہوں تو ایسی چیزیں استعمال کرنی چاہئیں جن سے شفا ملتی ہے مثلاً اس نے ایک عام اصول بیان کیا ہے کہ :-

کلوا واشربوا ولا تسرفوا (۷/۳۱)

کھاؤ پیو ، لیکن زیادتی نہ کرو۔

یہ صحت کا بنیادی اصول ہے۔ دوسری طرف مثلاً شہد سے متعلق کہا ہے کہ :-

فیہ شفاء للناس (۱۶/۶۹)

اس میں لوگوں کے لئے شفا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ اگر موت اور مرض کو ایک مقررہ وقت پر آنا ہے جس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی تو پرہیز اور علاج سے متعلق ان ہدایات کی ضرورت ہی کوئی نہیں تھی۔ قرآن کہتا یہ ہے کہ مرض اور موت کے لئے قانون مقرر ہیں یہ چیزیں ان ہی قوانین کے مطابق جاتی ہیں۔ لہٰذا ایک خاص قانون کے مطابق عمر گھٹ جاتی ہے اور دوسرے قانون کے مطابق عمر بڑھ جاتی ہے۔ سورۂ فاطر میں اس کی تصریح موجود ہے جہاں فرمایا کہ :-

وَمَا يُعَمَّرُ مِنْ مُّعَمَّرٍ وَّلَا يُنْقَصُ مِنْ عُمُرِهٖٓ اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ ۔ (۳۵/۱۱)

نہ کسی کی عمر بڑھتی ہے اور نہ گھٹتی ہے مگر قانون کے مطابق۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قانون کے مطابق عمر لمبی ہوتی ہے اور قانون ہی کے مطابق کم ہوتی ہے۔ اور قانون یہ ہے کہ بے احتیاطی سے عمر کم ہوتی ہے۔ اور احتیاط سے عمر بڑھ جاتی ہے۔

سطور بالا میں ہم نے "عمر گھٹنے" اور "عمر بڑھنے" کے الفاظ رواج عامہ کے مطابق استعمال کئے ہیں ورنہ ظاہر ہے کہ حقیقت کے اعتبار سے گھٹنے اور بڑھنے کے الفاظ صرف اس وقت استعمال کئے جا سکتے ہیں۔ جب پہلے عمر کو متعین شدہ فرض کر لیا جائے۔ لیکن جیسا کہ اوپر لکھا گیا ہے عمر کے متعین ہونے کا تصور ہی صحیح نہیں۔ جسم کی مشینری خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق چلتی ہے اور اس قانون کی خلاف ورزی سے رک جاتی ہے۔ انسان کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ چاہے تو خدا کے قانون کی خلاف ورزی بھی کر سکتا ہے۔ اسی قانون کی خلاف ورزی سے یہ مشین چلنے سے رک جاتی ہے۔ کبھی بتدریج اور کبھی یک لخت۔ اب یہ انسان کے اختیار میں ہے کہ جی چاہے تو اس قانون کی خلاف ورزی سے اس چلتی گاڑی کو روک دے اور جی چاہے تو ان قوانین کے اتباع سے عمر طبعی تک پہنچ جائے۔ یاد رکھئے موت کا وقت مقرر نہیں قانون مقرر ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ صدقات و خیرات سے بیماری رفع ہوسکتی ہے اور موت ٹل سکتی ہے یا نہیں۔ تو یہ ظاہر ہے کہ جسم کی مشینری خدا کے طبعی قوانین کے مطابق چلتی ہے۔ اس پر غیر طبعی افعال کا براہ راست اثر نہیں ہوتا۔ البتہ صدقہ و خیرات وغیرہ، غیر طبعی افعال کا اثر مریض پر نفسیاتی طور پر ہوتا ہے اور نفسیاتی اثر (PSYCHOLOGICAL) سے مریض کی قوتِ مدافعت بڑھ جاتی ہے جس سے بیماری کے رفع ہونے میں مدد ملتی ہے۔ یہ نفسیاتی اثر عقیدہ کے ماتحت ہوتا ہے۔ اگر عقیدہ نہ رہے تو پھر اس کا اثر بھی نہیں رہتا۔ ہمیں قرآن سے اس عقیدہ کی کوئی سند نہیں ملتی۔ یہ عقیدہ جھاڑ پھونک گنڈے تعویذ کے عقائد کے قبیل سے ہے۔ جو انسان کے دورِ سحر (MAGIC AGE) کی یادگار ہے۔ قرآن ان توہم پرستیوں سے بہت بلند ہے۔ وہ عقل و بصیرت اور قوانین و ضوابط سے بات کرتا ہے نفسیاتی فریب کے الجھاؤ میں نہیں الجھاتا۔

۱۹۵۳ء

۲۔ امام مہدی کا مذہب

ایک صاحب کراچی سے دریافت کرتے ہیں کہ:۔

شیعہ حضرات بھی امام مہدی کی آمد کے منتظر ہیں اور سنی بھی۔

سوال یہ ہے کہ امام مہدی سنی ہوں گے یا شیعہ؟

طلوعِ اسلام

آپ کو یہ کہانی ذرا پیچھے سے شروع کرنی چاہیئے تھی۔ صرف شیعہ اور سنی ہی نہیں، دنیا کے تمام اہلِ مذاہب ایک آنے والے کے منتظر ہیں۔ ان میں سے ہر ایک کا عقیدہ ہے کہ یہ آنے والا آخری زمانہ (قیامت کے قریب) آئے گا اور ان کے مذہب کو باقی تمام مذاہب پر غالب کر کے ان کے تسلط کو قائم کر دے گا۔

ہندو کلنکی اوتار کے منتظر ہیں جو ان کے نزدیک ویدک دھرم کو غالب کرے گا۔ بدھ، مہاتما بدھ کے متیا اوتار کے منتظر ہیں جو بدھ مت کو تمام مذاہب پر غالب کرے گا۔ جینی آخری مہا دیر کے منتظر ہیں۔ جس کے ہاتھ جین مت کو غلبہ ہوگا۔ مجوسی میترا کے آنے کے منتظر ہیں جو زرتشتی مذہب کے غلبہ و تسلط کا حامل ہوگا۔ یہودی ایک آخری اسرائیلی نبی کے منتظر ہیں۔ جو بنی اسرائیل کو تمام اقوام پر غالب کر دے گا۔ عیسائی حضرت مسیحؑ کی آمد کے منتظر ہیں۔ جن سے سارا

دنیا میں عیسائیت کا تسلط ہو جائے گا۔ اسی طرح مسلمان بھی ایک مہدی کے منتظر ہیں جن سے اسلام کا دین تمام ادیان پر غالب آجائے گا۔

اب سوچئے کہ یہ سب آنے والے قیامت کے قریب، یعنی ایک ہی زمانہ میں دنیا میں آئیں گے اور ہر ایک کی ذمہ داری یہ ہوگی کہ وہ دوسرے مذاہب کو مغلوب کرے اور اپنے مذاہب کو غالب۔ ذرا تصوّر میں لایئے کہ اس وقت دنیا کا نقشہ کیا ہوگا؟ کیا ان کے ہاتھوں قیامت سے پہلے ہی قیامت برپا نہیں ہو جائے گی؟

اس کے بعد مسلمانوں کو لیجئے۔ شیعہ حضرات اس انتظار میں ہیں کہ امام آخرالزماں تشریف لائیں گے اور اپنے شیعوں کو تمام مسلمانوں پر غالب کریں گے اور ان کی حکومت قائم کریں گے۔ یہی نہیں بلکہ ان کا عقیدہ یہ بھی ہے کہ وہ سنیوں کے تینوں خلیفوں (حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ) کو پھر دنیا میں بلائیں گے اور انہیں قتل کریں گے (اسے رجعت کا عقیدہ کہتے ہیں) دوسری طرف امام آخرالزماں کی آمد کے سُنّی بھی منتظر ہیں۔ وہ لامحالہ سنیوں کے اسلام ہی کو غالب کرنے کے لئے آئیں گے۔ لیکن یہاں پھر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ سنیوں کے کس فرقہ کے اسلام کو غالب کریں گے؟ اہلِ فقہ کے یا اہلِ حدیث کے۔ اور پھر فقہ والوں میں سے حنفیوں کے یا شافعیوں کے، حنبلیوں کے یا مالکیوں کے؟

جہاں تک حضرت عیسٰےعلیہ السلام کا تعلق ہے ان کی بابت تو حضرت مجدد الف ثانیؒ نے حضرت خضرؑ سے بحالت کشف معلوم کر لیا تھا کہ وہ حنفی المذہب ہوں گے۔ چنانچہ وہ اپنے مکتوبات کی جلد سوم میں لکھتے ہیں کہ حضرت خضرؑ نے انہیں بتایا کہ:۔

> اگر بالفرض دراں امت پیغمبرے مبعوث می باشد موافق فقہ حنفی عمل می کرد۔ دریں وقت حقیقتِ سخن حضرت خواجہ محمد پارسا قدس سرہ معلوم شد کہ حضرت عیسٰے بعد از نزول بمذہب امام ابو حنیفہ عمل خواہد کرد۔

اور چونکہ یہ بھی عقیدہ ہے کہ حضرت عیسٰے علیہ السلام امام مہدی کی متابعت کریں گے اس لئے ظاہر ہے کہ امام مہدی کا مذہب بھی حنفی ہوگا۔ لیکن دوسری طرف شیخ اکبر محی الدین ابن عربی فتوحاتِ مکیہ میں لکھتے ہیں کہ امام مہدی ظاہر ہوں گے تو فقہاء خصوصیت سے ان کی مخالفت کریں گے۔ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ ابن عربی کے خیال کے مطابق امام مہدی اہلِ طریقت میں سے ہوں گے۔

دنیا کے دیگر اہلِ مذاہب آنے والے کے متعلق جو عقیدہ جی میں آئے رکھیں۔ لیکن جہاں تک قرآن کریم کا تعلق

ہے، اس میں نبی اکرم صلے اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی آنے والے کا کوئی ذکر نہیں۔ نہ امام مہدی کا۔ نہ حضرت عیسےٰ کا۔

۱۹۵۴ء

۳۔ حضرت عیسیٰؑ کی واپسی

دہران سے ایک صاحب کہتے ہیں کہ قرآن میں حضرت عیسےٰؑ کے متعلق مَہْدًا کے ساتھ کَھْلاً آیا ہے (جس کے معنی ادھیڑ عمر کے ہیں) تو بعض لوگ اس سے یہ دلیل لاتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے اتر کر اپنی عمر کا باقی ماندہ حصہ یہاں گذاریں گے اور پھر وفات پائیں گے۔ قرآن اس کے متعلق کیا کہتا ہے؟

طلوع اسلام قرآن میں حضرت عیسیٰؑ کے زندہ آسمانوں پر چلے جانے اور دوبارہ آنے کا کوئی ذکر نہیں حضرت عیسےٰؑ یہودیوں کی سازشانہ تدبیروں سے بچ کر کسی اور طرف ہجرت کر کے چلے گئے تھے۔ جہاں انہوں نے عمر کا باقی حصہ گزارا۔ یعنی وہ وہاں کَھْلاً کی عمر تک پہنچ گئے تھے۔ کسی آنے والے کا تصور — وہ کوئی پرانا نبی ہو یا نیا مسیح ہو یا مہدی۔ قرآن کی کھلی ہوئی تعلیم کے خلاف اور ختم نبوت کے نقیض ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی اور قرآن آخری کتاب ہے۔ رسول اللہؐ کے بعد امتِ مسلمہ کو اس کتاب کا وارث بنایا گیا ہے اور قرآنی نظام کو عملاً نافذ کرنے کا ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے مسلمانوں کی توجہ کو ملت اور نظام کے تصور سے ہٹا کر افراد کی طرف منتقل کر دینا عجم کی انہی سازشوں میں سے ایک سازش تھی۔ جس کی رو سے انہوں نے اس امت کو صراطِ مستقیم سے ہٹا کر دوسری راہوں پہ ڈال دیا۔ ان کا دوبارہ صراطِ مستقیم پہ آنا اپنے ہاں قرآنی نظام کو رائج کرنے سے ہو گا نہ کہ کسی موعود آنے والے کے ہاتھوں۔ آنے والوں کا دور رسول اللہؐ پر ختم ہو گیا۔

۱۹۵۵ء

۴۔ بہائیت اور مرزائیت

اشاعت سابقہ کے باب المرسلات میں ہم نے بہائیت اور مرزائیت کے متعلق ضمنی طور پہ کچھ عرض کیا تھا۔

لیکن عدم گنجائش کی وجہ سے بحث تشنۂ تکمیل رہ گئی تھی۔ آپ غور کریں گے۔ تو یہ حقیقت نمایاں طور پر آپ کے سامنے آجائے گی کہ بہائیت اور مرزائیت قسم کی تحریکیں دراصل مایوسی کی پیدا کردہ ہیں اور ایک آنے والے کا عقیدہ (جسے مسلمانوں نے مجوسیوں سے مستعار لیا ہے) انہیں ہوا دینے کا موجب ہے یوں تو مسلمانوں کا زوال ایک عرصہ سے شروع ہو چکا تھا۔ لیکن گذشتہ (انیسویں) صدی میں مسلمانوں کے تمام ممالک اس قدر مصائب کا شکار ہو رہے تھے کہ ان کے سامنے نجات کا کوئی راستہ ہی نہیں رہا تھا۔ ان پیہم مصائب و نوائب سے چاروں طرف مایوسی ہی مایوسی پھیل رہی تھی اس مایوسی سے یہ خیال پیدا ہوا کہ اسلام بحیثیت ایک زندہ مذہب کے ختم ہو چکا ہے اب اس میں اُبھرنے کی صلاحیت ہی باقی نہیں رہی۔ اب مسلمانوں کو ایک نئے مذہب کی ضرورت ہے جس کے لئے ایک نئے ظہور کا وقت آچکا ہے۔ (یعنی وجۂ مایوسی تھی مسلمانوں کی حالت اور نتیجہ یہ اخذ کیا گیا کہ خود اسلام ہی بانجھ ہو چکا ہے) اس کی وجہ سے ایران میں مرزا علی محمد باب اور بہاء اللہ صاحب اٹھ کھڑے ہوئے اور پنجاب میں مرزا غلام احمد صاحب نے ایک نئے ظہور کا دعویٰ کر دیا۔ دنیا میں ہر دعویٰ کے لئے دلائل مل جاتے ہیں۔ ان حضرات نے تو پھر بھی نبوت اور مہدویت وغیرہ کے دعاوی کئے تھے۔ لوگ خدا بننے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اس دعوئے میں بہاء اللہ صاحب کا مسلک مرزا غلام احمد صاحب سے زیادہ صاف اور "دیانتدارانہ" تھا۔ بہاء اللہ صاحب نے یہ کہا کہ ہر کتاب ایک متعین میعاد تک کے لئے ہوتی ہے۔ جب اس کی میعاد ختم ہو جاتی ہے تو وہ ریلوے کے پرانے ٹائم ٹیبل کی طرح منسوخ ہو جاتی ہے۔ اور اس کی جگہ ایک نئی کتاب لے لیتی ہے۔ قرآن کا دور (معاذ اللہ) ختم ہو گیا ہے۔ اب اس کی جگہ وہ کتاب آگئی ہے جو مجھے ملی ہے۔ مرزا صاحب نے بھی دعویٰ تو ایسا ہی کیا، لیکن اس کے ساتھ ہی کہا کہ میں نبی تو ہوں، لیکن کوئی نئی کتاب نہیں لایا۔ حالانکہ "نبی بلا کتاب" کا تصور ہی بے معنی ہے۔ یہی وجہ ہے جو ہم نے کہا ہے کہ بہاء اللہ صاحب کا دعویٰ مرزا صاحب کی نسبت زیادہ "دیانتدارانہ" تھا۔ بہاء اللہ صاحب نے قرآن کو منسوخ کر کے جو نیا دین پیش کیا اس کی اصولی تعلیم یہ ہے۔

(۱) حق کی آزادانہ تحقیق۔ (۲) وحدت انسانیہ (۳) محبت اور اخوت۔

(۴) تمام مذاہب اپنی اصل کے اعتبار سے ایک ہیں[1] (۵) مذہب اور سائنس کے اعتبار سے۔

---

[1] اسلام کے مستقبل کے متعلق مایوسی کا شکار مولانا ابوالکلام بھی تھے جنہوں نے تھک کر کہہ دیا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں اس لئے کسی مذہب کو کسی دوسرے مذہب پر کوئی فضیلت نہیں۔ ان کی یہی مایوسی تھی جس کی وجہ سے وہ ہندوؤں سے جا ملے۔

(۶) عالمگیر امن - (۷) بین الاقوامی زبان - (۸) جبری تعلیم بالخصوص عورتوں کے لئے -
(۹) مرد اور عورت کی مساوات - (۱۰) سب کے لئے کام - (۱۱) دولت اور غربت کی افراط کا مٹانا -
(۱۲) خدا کی توحید (بہ حوالہ "بہائی" مذہب اور اسلام"۔ مصنفہ ایس ایچ قریشی) اور مرزا صاحب کی نبوت نے جو کچھ پیش کیا، اس کا ملخص تھا۔ جہاد کی تنسیخ اور وفات مسیح۔

مسلمان برسوں سے مرزا صاحب (اور ان کی اُمت) کے ساتھ مناظرے کرتے چلے آ رہے ہیں جن میں ان کے دلائل کا رد پیش کیا جاتا ہے۔ اب شاید یہ سلسلہ بہائیت کے ساتھ شروع ہوگا۔ لیکن اصل سوال ان کے دلائل کا نہیں۔ اصل سوال یہ ہے کہ آیا قرآن اپنی راہ نمائی میں عاجز آچکا ہے یا اس میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ تمام نوع انسانی کی ہمیشہ کے لئے راہ نمائی کر سکے۔ اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ قرآن سے اب مزید راہ نمائی نہیں مل سکتی تو اسے چاہیئے جس جگہ سے نئی راہنمائی مل سکتی ہو وہاں چلا جائے البتہ یہ سمجھ لے کہ اس کے بعد اُسکا قرآن اور قرآن والوں کے ساتھ کوئی واسطہ باقی نہیں رہے گا۔ لیکن جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہماری راہنمائی کے لئے قرآن کافی ہے اس کے لئے کسی نئے ظہور کے کسی دعوے اور اس دعوے کی کسی دلیل پر غور کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ بہائیوں کی دلیل یہ ہوتی ہے کہ فنائے عالم کا عقیدہ غلط ہے۔ عالم اسی طرح سے رہے گا۔ لہٰذا قیامت کے معنی قوموں کا انقلاب ہے جو ایک نئے ظہور کے ہاتھوں رونما ہوتا ہے۔ فرض کیجئے کہ فنائے عالم کا عقیدہ غلط ہے اور یہ بھی فرض کر لیجئے کہ قیامت سے مراد ایک عظیم الشان دنیاوی انقلاب ہے۔ تو جو شخص قرآن کی دائمی راہنمائی کا قائل ہے۔ وہ کہدے گا کہ یہ عظیم الشان انقلاب قرآن ہی کے ذریعے رونما ہوگا۔ ان کی دوسری دلیل یہ ہوتی ہے کہ ہر قوم کے لئے ایک مدت معین ہوتی ہے۔ مسلمانوں کی قوم کی مدت ختم ہوگئی ہے۔ اس لئے اب ایک نئی قوم اٹھے گی۔ فرض کیجئے کہ یہ بھی ٹھیک ہے کہ جو قوم تاریخ میں مسلمان کے نام سے متعارف چلی آ رہی ہے۔ اس کی مدت ختم ہو چکی ہے۔ تو جو شخص قرآن کی ابدیت کا قائل ہے وہ کہے گا کہ اس کے بعد ایک اور قوم (جو ابھی تک مسلمان نہیں) اٹھے گی، اور اسی قرآن سے ایک نیا انقلاب پیدا کر دے گی۔ یہی وہ نکتہ ہے جس کی طرف علامہ اقبالؒ نے ان الفاظ میں اشارہ کیا ہے کہ؎

محفل مابے مے و بے ساقی است
ساز قرآں را نوا ہا باقی است !
زخمۂ مابے اثر افتد اگر

آسماں دارد ہزاروں زخمہ در
ذکرِ حق از اُمتاں آمد غنی
از زمان و از مکاں آمد غنی
ذکرِ حق از ذکر ہر ذاکر جداست
احتیاجِ روم و شام او را کجاست
حق اگر از پیشِ ما بردارد ش!
پیشِ قومے دیگرے بگزاردش
از مسلماں دیدہ ام تقلید و ظن
ہر زماں جانم بلرزد در بدن!
ترسم از روزے کہ محرومش کنند
آتشِ خود بردلِ دیگر زنند

ہمارا چونکہ ایمان ہے (اور علی وجہ البصیرت ایمان) کہ قرآن تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ تک کے لئے کامل راہ نمائی دینے کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہے اس لئے ہم کسی بہائی اور کسی مرزائی کی دلیل پر وقت ضائع کرنے کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ ہاں یہ مسائل کہ عالم فنا آمادہ ہے یا نہیں قیامت کا صحیح مفہوم کیا ہے۔ اجل امت کا قرآنی مطلب کیا ہے۔ علمی مباحث ہیں جن پر عند الضرورت گفتگو کی جا سکتی ہے۔ لیکن اس سلسلہ میں نہیں کہ ان مسائل کا کوئی تعلق کسی نئے ظہور کی آمد سے ہے۔ رسول اللہ کے بعد کسی اور ظہور کا تصور بھی ہمارے نزدیک توہین رسالت ہے جسے رسالتِ محمدیہ پر ایمان کے بعد قطعاً برداشت نہیں کیا جا سکتا۔ (۱۹۵۵ء)

۵۔ پاکستان میں پیری مریدی

جہلم سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ پاکستان میں پیری مریدی کا بہت زور ہو گیا ہے۔ جہلا میں ہی نہیں بلکہ اچھے خاصے پڑھے لکھے طبقہ میں بھی۔ اس کی وجہ کیا ہے اور علاج کیا؟

طلوعِ اسلام

پیری مریدی کی نفسیات پر غور کیا جائے تو بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ پاکستان میں اس کا زور کیوں ہو گیا ہے کہ جو قوم قانون کی پابند ہو اسے غیر قانونی سہارے ڈھونڈنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ "قانون" میں قوانینِ فطرت۔ وحی کے متعین کردہ قوانینِ انسانیت اور مملکت کے معاشرتی قوانین سب آجاتے ہیں۔ مثلاً۔

۱۔ جو شخص جسم سے متعلق طبعی قوانین پر یقین رکھتا ہے وہ اگر بیمار ہوتا ہے تو حکیم یا ڈاکٹر کی طرف رجوع کرتا ہے۔ "روحانی عاملوں" کی طرف وہی جاتا ہے جسے ان قوانین کا علم یا ان پر یقین نہ ہو۔

۲۔ دین کا مدار، قانونِ مکافاتِ عمل پر ہے۔ یعنی ہر عمل اپنا نتیجہ مرتب کرتا ہے اور کوئی قوت اس نتیجے کو بدل نہیں سکتی۔ جو شخص دین کی اس بنیادی حقیقت پر یقین رکھتا ہے وہ کبھی ان آسروں کی تلاش نہیں کرتا جو "قانونِ مکافات" کے خلاف نتائج برآمد کر دینے کے مدعی ہوں۔ وہ عمل کرتا ہے اور اس کے نتیجے کا منتظر رہتا ہے۔

۳۔ جس معاشرہ کا نظم و نسق قانون کے مطابق طے پاتا ہو اس میں جو شخص قانون کا اتباع کرتا ہے اسے کسی قسم کا خطرہ نہیں رہتا جو اس کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ سزا پاتا ہے۔ غیر قانونی سہاروں کی کسی کو ضرورت نہیں پڑتی۔ خواہ وہ رشوت یا سفارش کی شکل میں ہوں اور خواہ پیروں فقیروں کی دعا یا نذر نیاز کی صورت میں۔

بدقسمتی سے پاکستان میں گذشتہ دس سال تک لاقانونیت کا دور دورہ رہا ہے۔ اس لئے یہاں کے رہنے والے غیر قانونی سہاروں کے عادی ہو گئے ہیں۔ مثلاً اگر کسی شخص نے کوئی کاروبار شروع کیا تو اس نے یہ نہیں پوچھا کہ اسے قاعدے اور قانون کے مطابق کیا کرنا اور کیا کمانا چاہیئے۔ اس نے معلوم کرنا یہ شروع کیا کہ کون کون سے غیر قانونی ذرائع اختیار کئے جائیں کسے رشوت دی جائے اور کس تک سفارش پہنچائی جائے۔ تاکہ زیادہ سے زیادہ لوٹ مچائی جا سکے۔ اس کے لئے اگر ہزار روپیہ رشوت کے دیئے تو دس روپے پیر صاحب کی بھی نذر کر دیئے۔ تاکہ وہ بھی اس کی اس مہم میں اس کی مدد کریں۔ پھر اگر پکڑے گئے تو جہاں دو ہزار روپیہ پولیس یا عدالت تک پہنچایا، سو روپیہ "روحانی آسروں" پر بھی خرچ کر دیا۔ تاکہ ان کی مدد سے اس بلا سے نجات مل جائے۔

یا اگر کوئی شخص (خلافِ قاعدہ) ملازمت میں ترقی کرنا چاہتا تو ایک طرف وہ افسرِ بالا تک سفارشیں اور رشوت پہنچاتا، اور دوسری طرف نذر نیاز مانتا تاکہ ان ذرائع سے کامیابی ہو جائے۔

مختصراً یہ کہ جب انسان خلافِ قانون روشِ زندگی اختیار کرلے تو اپنے آپ پر اعتماد (SELF CONFIDENCE) باقی نہیں رہتا۔ اور جب خود اعتمادی نہ رہے تو پھر روحانی سہاروں" کی تلاش شروع ہوجاتی ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبال نے کہا تھا کہ[1]

محکوم کو پیروں کی کرامات کا سودا
ہے بندۂ آزاد خود اک زندہ کرامات

قانون کا پابند اپنی قوتِ بازو اور قانون کی محکمیت پر بھروسہ رکھتا ہے اسے اس قسم کے نفسیاتی (PSYCHOLOGICAL) سہاروں۔ (یا بالفاظِ دیگر فریبِ نفس) کی ضرورت نہیں ہوتی۔ قرآن نے جہاں میسرہ سے منع فرمایا ہے تو اس کی لِم بھی یہی ہے۔ میسرہ کے عام معنی "جوا" کیے جاتے ہیں۔ درحقیقت اس سے مراد ایسی دولت ہے جو آسانی سے ہاتھ آجائے۔ لیسر بائیں ہاتھ کو کہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی آسان کام کے لئے کہتے ہیں کہ "یہ تو میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے"۔ جو دولت قاعدے اور قانون کے خلاف، محنت اور مشقت کے بغیر نہایت آسانی سے ہاتھ آجائے وہ میسرہ میں شامل ہے۔ گذشتہ دس سال، ہماری قوم کا بیشتر طبقہ اسی طرح دولت حاصل کرنے میں مصروف رہا اور اس کا اس طرح عادی ہوگیا کہ قاعدے اور قانون کے مطابق، محنت و مشقت سے روٹی کمانا اس کے لئے مصیبت بن گیا۔ اس قسم کی (میسرہ کی) کمائی کے لئے انسان نفسیاتی سہاروں کا محتاج ہوتا ہے۔ علاوہ بریں، ناجائز طریقوں سے دولت کمانے کے بعد، دل میں ایک خلش بھی پیدا ہوتی ہے۔ (اسے سوسائٹی کا رڈ کہیئے یا بچپن سے دل میں پڑے ہوئے خیالات کا نتیجہ۔ بہرحال ایک خلش ضرور پیدا ہوتی ہے اگرچہ رفتہ رفتہ اس کا احساس بھی مٹ جاتا ہے) اس خلش کی طرف سے اطمینان حاصل کرنے کے لئے بھی انسان کو فریب نفس کی ضرورت لاحق ہوتی ہے۔ یہ مقصد پیروں فقیروں کی دعاؤں اور منتوں اور نیازوں سے حاصل ہوجاتا ہے۔ پیر، ہر مصیبت کے وقت کام آنے اور آخرت میں نجات دلانے کا ضامن ہوتا ہے۔ جو اس کا دامن تھام لے وہ ہر بلا سے محفوظ رہتا ہے۔ اس کی نظروں میں نیکوکار اور بدکار میں کوئی تمیز نہیں ہوتی۔ بلکہ جو زیادہ گنہگار (یعنی مجرم) اور بدکردار ہو وہ اس کی نگاہوں میں زیادہ عزیز ہوتا ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ بدکرداروں کے طبقے عام طور پر پیر پرست ہوتے ہیں) اس کا تصوّر ان لوگوں کو نفسیاتی کش مکش سے نجات دلا کر "اطمینانِ قلب" کا موجب بن جاتا ہے۔

یہ ہیں، مختصراً وہ وجوہات جن کی بنا پر پاکستان میں پیر پرستی کا زیادہ زور ہوگیا۔ اب رہا اس کا علاج؟ سو مرض کی تشخیص کے بعد، علاج بآسانی سمجھ میں آسکتا ہے۔ یعنی

(i) جہاں تک قوانینِ طبعی سے ناواقفیت (جہالت) کی بناء پر پیر پرستی اور قبر پرستی کا تعلق ہے، اس کا علاج سائنس کی تعلیم کا عام کرنا ہے۔ اس سے توہم پرستیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔

(ii) جہاں تک مذہب کے معاملہ میں پیر پرستی کا تعلق ہے، اس کا علاج قرآن کریم کی تعلیم کو عام کرنا ہے۔ اس سے خدا کا محکم اور اٹل قانونِ مکافات اس طرح بے نقاب ہو کر سامنے آجاتا ہے کہ انسان نفسیاتی کشمکش میں مبتلا ہی نہیں ہوتا۔ قرآن اپنے آپ کو شفاءٌ لما فی الصدور کہتا ہے۔ (۵۷/۱۰)

(iii) جہاں تک دنیاوی معاملات کے لئے "روحانی سہاروں" کا تعلق ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرہ میں قانون کا سکہ اس طرح سے رواں ہو کہ اس کی اطاعت کرنے والے کو کسی قسم کا خوف اور حزن نہ رہے۔ اور جو اس کی خلاف ورزی کرے، اسے کوئی قوت پاداشِ عمل سے بچا نہ سکے۔ نیز، معاشرہ میں خدا کا متعین کردہ نظامِ ربوبیت اس انداز سے قائم کر دیا جائے کہ مملکت کا کوئی فرد اپنی بنیادی ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے اور نا فاضلہ دولت کسی کے پاس جمع نہ ہونے پائے۔ نظامِ خداوندی کی یہ وہ زندہ کرامات ہیں جنہیں آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد انسان کو کسی وہمی سہارے کی ضرورت نہیں رہتی۔

وہ تھی مرض کی تشخیص اور یہ ہے اس کا علاج۔ (ستمبر ۱۹۵۹ء)

۶۔ متفرق سوالات

گجرات سے ایک صاحب کا حسبِ ذیل خط موصول ہوا ہے۔

چند موٹے موٹے اختلافی مسائل کے متعلق جناب کی رائے سے مستفید ہونے کی آج کل کے زمانہ کے حالات میں ازحد ضرورت ہے۔ اس لئے استدعا ہے کہ ان کے سلسلہ میں قرآن مجید کی روشنی میں ان کے جوابات اپنے مؤقر رسالہ میں دے کر مشکور فرمادیں۔ تاکہ جملہ مسلمانانِ پاکستان ان سے فیضیاب ہو سکیں۔ چونکہ جناب کا قرآن مجید پر کامل عبور ہے۔ اس لئے یہ تکلیف دی ہے۔

سوال۔ (۱) سود کا لینا، دینا۔ ازروئے قرآنِ مجید حرام مطلق ہے۔ اس کی کوئی تاویل قرآن مجید میں نہیں ہے کہ فلاں قسم کا جائز ہے۔ موجودہ زمانہ میں کاروبار تجارت کا دارومدار سود پر ہے۔۔۔۔۔۔ اس بارہ

میں آپ کی کیا رائے ہے ۔

(۲) زکوٰۃ کے علاوہ دیگر ٹیکس جو حکومت لوگوں سے لیتی ہے ۔ان کے جواز یا عدم جواز کے بارہ میں جناب کی کیا رائے ہے ۔کیا دیگر مروجہ ٹیکسوں کی موجودگی میں زکوٰۃ کو نظر انداز کر دینا چاہیئے یا زکوٰۃ کو بحال رکھ کر ان کو نظر انداز کرنا مناسب ہوگا ۔

(۳) وقف علی الاولاد کا مروّجہ قانون قرآن مجید کی کس آیت یا حکم کے ماتحت ہے ۔اگر یہ قانون غیراز قرآن ہے، تو یہ کیوں منسوخ نہ ہونا چاہیئے ۔جس کی رو سے جائیدادیں قیامت تک ایک خاص گروہ کی تحویل میں دی جاتی ہیں ۔جن کو ان کی فروخت کی بھی اجازت نہیں اور آمدنی بکثرت حصہ داروں میں بٹ کر آہستہ آہستہ بالکل معدوم ہو جاتی ہے ۔

(۴) حق شفع کا قانون قرآن مجید کے کس حکم کے ماتحت جاری ہے ۔جس کی وجہ سے مالک جائیداد اپنی جائیداد کی پوری قیمت وصول نہیں کر سکتا ۔بلکہ شفع کی مرضی کے تابع ہو جاتا ہے ۔ یا سودا کرتے وقت ناجائز طور پر بخوف حق شفع اس کی قیمت حد سے زیادہ فرضی طور پر لکھواتا ہے ۔کیا اس قانون کی وجہ سے مالک جائیداد کے آزادانہ حق فروخت میں دست اندازی آزروئے قرآن مجید جائز ہے اور اس کا مفاد کیا ہے ۔

(۵) قانون وراثت میں ایک مالک کو اپنی پوری جائیداد کے متعلق انصاف سے اپنے لواحقین جس میں ماں باپ بھی شریک ہیں ۔پورے مال کے متعلق وصیّت کرنے کا کیوں حق حاصل نہیں بلکہ کسی ایسے شخص کو جس نے اس کی خدمت کی ہو ۔وصیّت میں کیوں شامل نہیں کر سکتا ۔بجائے ان رشتہ داروں یا تعلق داروں کے جنہوں نے عمر بھر اس کو چین نہ لینے دیا ہو ۔ مگر اس کی موت کے بعد اس کی جائیداد کے وارث بن جاتے ہوں ۔وصیّت کا حق ازروئے قرآن مجید سب سے اوّل مالک کو حاصل ہے اور ہونا بھی چاہیئے ۔اور جب اس کی وصیّت پوری ہو چکے اور جو کچھ باقی بچ رہے، اس کی تقسیم وارثان میں مطابق تجویز و حکم قرآن ہوتی مناسب ہے ۔جناب کی اس بارہ میں کیا رائے ہے ؟

(۶) حلالہ کا جو قانون قرآن مجید میں ہے ۔اس سے پایا جاتا ہے کہ ایک خاوند اگر اپنی بیوی کو بدچلنی کے شک پر طلاق دیدے ۔تو وہ اگر اپنے آشنا سے جس کی وجہ سے اس کے پہلے خاوند نے اسے طلاق دی ہے نکاح کر سکتی ہے ۔اور اس شک کو یقین کا درجہ دے کر مطلقہ ہو جانے پر پھر پہلے خاوند سے نکاح کر سکتی ہے ۔کیا ایسا ہونا اخلاقاً درست اور روا ہے ۔ رائے عالی سے مستفید فرما دیں کوئی تاویل خلاف قرآن نہ پیش

کی جاوے ؟

(۷) لڑکیوں کو لڑکوں سے وراثت میں نصف حصہ کس بنا پر تجویز کیا گیا ہے ۔ درآنحالیکہ لڑکیاں اور لڑکے پیدائش اور پرورش کے لحاظ سے ماں باپ کی نظر اور سلوک میں یکساں درجہ رکھتے ہیں ؟

(۸) جب لڑکیاں بھی اپنے والدین کی جائیداد میں حق دار قرار دی جاویں تو ان کے نکاح اور شادی کے وقت ان کو جہیز کس بنا پر دینا لازمی قرار دیا گیا ہے ۔ نیز جہیز کی کوئی حد کیوں مقرر نہیں کی گئی ہے ۔ جس کی وجہ سے معاشرہ میں بہت خرابی پیدا ہو رہی ہے ۔ بلکہ جہیز میں کمی اکثر حالات میں مانع نکاح ثابت ہوئی ۔ اس بارہ میں جناب کی کیا رائے ہے ؟

(۹) نیک مسلمان کو اپنی جائز منکوحہ بیوی کے علاوہ ایک لونڈی بطور زوجہ بلا نکاح رکھنے کی اجازت ہے ۔ اس کا کیا مفاد ہے ۔ واضح فرما کر مشکور فرماویں ؟

(۱۰) ازروئے قرآن مجید جب مسلمان مرد باوجود لاکھ کوششوں کے دو بیویوں کے درمیان انصاف اور عدل نہیں کر سکتے تو پھر ان کو ایک سے زیادہ بیویاں کرنے کی کیوں ایک ناممکن امر کی موجودگی میں اجازت دی گئی ہے اور اس فعل میں کیا فائدہ مضمر ہے ۔ واضح فرما کر مشکور کریں ؟

(۱۱) جب نبی اکرمؐ نے گیارہ بیویاں اپنے نکاح میں رکھیں تو عام مسلمانوں کو فقط چار کی ہی اجازت دی گئی ۔ ملاّ کہتا ہے کہ چار کی تعداد مقرر ہونے سے پہلے پیغمبرؐ نے ایسا کیا تھا ۔ اور بعد میں چار کی حد مقرر ہوئی ۔ اس کا ثبوت کہاں ہے کہ وہ حکم پہلے نازل ہوا اور چار والا بعد میں ۔ مہربانی فرما کر اس پر مفصل روشنی ڈالیں ؟

(۱۲) جب منہ بولے بیٹے کی مطلقہ بیوی سے کسی ایک مرد کو حق نکاح حاصل ہے ۔ تو منہ بولی ماؤں سے کیوں ان کا حق نکاح باقی نہیں رکھا گیا ۔ جیسا کہ نبیؐ کی بیویوںؓ کے بارہ میں ہے ۔ حالانکہ نبیؐ کی بیویاںؓ بھی مسلمانوں کی احتراماً مائیں قرار دی گئی ہیں ۔ اصلی مائیں تو ان کی بھی وہی ہیں جنہوں نے ان کو جنم دیا ؟

(۱۳) قرآن مجید میں متعدد بار آتا ہے کہ اہل کتاب یعنی عیسائیوں اور یہودیوں کے ہاتھ میں کتب الٰہی ہیں ، وہ ان کی تصدیق کرتا ہے ۔ درآنحالیکہ ان کتب کو قرآن مجید محرف قرار دیتا ہے ۔ اور ان کے احکام کو ناقابلِ اتباع قرار دیتا ہے ۔ پھر اس کی تصدیق کا کیا حاصل ہے ۔

(۱۴) حج کی تقریب پر جو لاکھوں جانور بطور قربانی ذبح کر کے ، ان کا گوشت زمین میں دفن کیا جاتا ہے ۔ کیا یہ صریح طور پر اسراف کے تحت نہیں ۔ اور قرآن مجید میں آتا ہے کہ خدا کو ان کا خون اور گوشت نہیں پہنچتا ۔ بلکہ تقویٰ

یعنی ان جانوروں کی قیمت جو ادا کی جاتی ہے وہ بمنزلہ تقویٰ کے ہے ۔ کیونکہ درحقیقت جانوروں کے قربان ہونے کا درد تو ان کو ہی ہوتا ہے جو ذبح ہوجاتے ہیں۔ قربانی کرنے والوں کو تو جو روپیہ وہ خرچ کرتے ہیں اس کا ہی رنج یا تکلیف ہوسکتی ہے ۔ قرآن مجید میں ہے کہ اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں اور خدا ان کو دوست نہیں رکھتا۔ ہر ایک حاجی جو حج کرکے آتا ہے وہ ایمانداری سے اس امر کی گواہی دے سکتا ہے کہ ان جانوروں کا گوشت ضائع جاتا ہے اور کم انسانوں کے کام آتا ہے اس کے علاوہ دیگر ممالک میں مسلمانوں کے اپنے شہروں اور گاؤں میں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں اس تقریب پر بلا ضرورت جانور ذبح کیے جاتے ہیں ۔ جن کی وجہ سے گوشت مہنگا ہی نہیں ہورہا ہے بلکہ کھانے والوں کے لیے بلحاظ اصول حفظانِ صحت نہایت برا اثر پڑتا ہے ۔ مگر پھر بھی اس فضول خرچی کو نہ صرف جاری ہی رکھا جا رہا ہے ۔ بلکہ ایسا کرنے والوں کو عزت کی نظر سے دیکھا جاتا ہے ۔ کیا یہ مناسب نہیں کہ اس قسم کی قربانی کی بجائے اس کی قیمت قربانی کرنے والوں سے لے کر رفاہ عامہ کے کاموں پر خرچ کی جاوے ۔ اس بارہ میں اپنی رائے عالی سے مستفید فرماویں ۔

مذکورہ بالا سوالات کے جواب موصول ہوجانے پر باقی ماندہ دیگر مسائل پر جو اختلاف کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ مزید گذارش کی جاوے گی ۔

والسلام

ان سوالات میں سے بیشتر کے متعلق اس سے پہلے تفصیل سے لکھا جا چکا ہے ۔ ان کا مختصر جواب درج ذیل ہے ۔

جواب (۱)

قرآن کریم کی رُو سے ، جو کچھ محنت سے کمایا جائے وہ جائز ہے اور جو محض سرمایہ لگا کر زائد وصول کیا جائے ، وہ ناجائز ہے ۔ اس اعتبار سے صرف سود ہی ناجائز نہیں قرار پاتا ۔ (خواہ بینک کا ہو یا کسی اور قسم کا) بلکہ اور بھی بہت کچھ ناجائز قرار پا جاتا ہے ، جسے آج کل عام طور پر جائز سمجھا جاتا ہے ۔ اور جس کے متعلق دریافت کرنے کی بھی ضرورت نہیں سمجھی جاتی ۔ اصل یہ ہے کہ دنیا کا موجودہ معاشی نظام غیر قرآنی ہے ، اس لئے سوال اس کی بعض شقوں کے متعلق نہیں ہونا چاہیئے ۔ قرآن کے معاشی نظام میں ، زائد از ضرورت دولت کسی کے پاس نہیں رہتی ، اس لئے سرمایہ پہ کچھ وصول کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔ دوسری طرف اس نظام میں کسی کی کوئی ضرورت رکی نہیں رہتی

اس لئے کوئی فرد کسی دوسرے فرد کا محتاج اور دست نگر نہیں ہوتا۔ اس نظام میں بینکوں کا کاروبار بھی آج سے مختلف ہوگا اور تجارت کا نہج بھی مختلف۔

جواب (۲) اسلامی حکومت، نوعِ انسان کی نشوونما کے لئے جو کچھ افرادِ مملکت سے لیتی ہے اور اسے نوعِ انسانی کی نشوونما کے لئے صرف کرتی ہے، قرآن کی اصطلاح میں زکوٰۃ کہا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے کہا ہے کہ اسلامی حکومت "زکوٰۃ" دیتی ہے (۴۱/۲۲) یعنی نوعِ انسانی کی نشوونما کا سامان بہم پہنچاتی ہے۔ جب اسلامی حکومت نہ ہو، تو زکوٰۃ کی حیثیت محض خیرات کی رہ جاتی ہے۔ اور حکومت کے ٹیکس اپنی جداگانہ حیثیت رکھتے ہیں۔ واضح رہے کہ زکوٰۃ کے نصاب یا شرح وغیرہ کا ذکر قرآن کریم میں نہیں۔ قرآن کی رُو سے تو مسلمان کی ساری فاضلہ دولت "زکوٰۃ" کے لئے وقف ہونی چاہیئے۔ (۲/۲۱۹)

جواب (۳) وقف علی الاولاد تو ایک طرف، قرآن کریم کی رُو سے سرے سے وقف ہی کی کوئی حیثیت نہیں۔ وقف میں مرنے والا، قیامت تک زندہ انسانوں کو، اپنے منشار اور حکم کا پابند کردیتا ہے، اور چونکہ (مرنے کے بعد) اسے خود اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کی بھی قدرت نہیں رہتی، اس لئے حالات کا تقاضا کچھ ہی کیوں نہ ہو، وقف کا فیصلہ اٹل اور ناقابلِ تغیر و تبدّل رہتا ہے۔ قرآن ایسی پوزیشن کو کب روا رکھ سکتا ہے؟ اس کے نزدیک، مردہ بدستِ زندہ ہوتا ہے۔ زندہ بدستِ مردہ نہیں ہوتا۔

جواب (۴) حقِ شفع کا قانون، قرآنی نہیں۔

جواب (۵) قرآن کریم کی رو سے، ہر شخص کو اپنے پورے مال میں وصیّت کا حق حاصل ہے، اور وہ اپنی صوابدید کے مطابق جس کے حق میں چاہے وصیّت کر سکتا ہے۔ "حق" ہی نہیں، بلکہ قرآن کریم بہ نصِ صریح، وصیّت کرنے کو فرض قرار دیتا ہے۔ اور جہاں وراثت کے حصوں کا ذکر کرتا ہے، واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ یہ تقسیم، وصیّت پوری کرنے، اور متوفی کا قرض ادا کرنے کے بعد عمل میں آئے گی۔ یعنی جو حصے قرآن کریم میں مذکور ہیں، ان کے مطابق تقسیم صرف اس وقت ہوگی جب کسی کی وصیّت اس کے پورے ترکہ کو محیط نہ ہو (COVER) نہ کرتی ہو؟ یا اتفاق سے کسی کو وصیّت کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو۔

جواب (۶) قرآنِ کریم میں "حلالہ" کا کوئی قانون نہیں۔ اس کا قانون یہ ہے کہ جب کسی میاں بیوی کی زندگی میں تیسری مرتبہ طلاق کی نوبت آجائے۔ یعنی ان میں ایک مرتبہ طلاق ہوئی اور انہوں نے پھر آپس میں نکاح کرلیا۔ پھر دوسری مرتبہ بھی ایسا ہی ہوا۔ اب اگر تیسری مرتبہ طلاق ہوگی تو ان کا باہمی نکاح نہیں ہوسکے گا۔

البتہ اگر ایسا ہو کہ مطلقہ عورت کسی دوسری جگہ نکاح کرلے، اور اس کے بعد اسے طلاق مل جائے یا وہ بیوہ ہو جائے، تو ان سابقہ میاں بیوی کو اجازت ہے کہ اگر وہ بطیب خاطر، باہمی رضامندی سے چاہیں، تو آپس میں نکاح کر سکتے ہیں۔ اس میں صرف اجازت ہے۔ مجبوری نہیں، تیسری طلاق تو ایک طرف، اگر یہ پہلی طلاق کے بعد بھی باہمی رضامندی سے آپس میں نکاح نہ کرنا چاہیں، تو انہیں اس پر کوئی مجبور نہیں کرسکتا۔

جواب (۷) ہم اس کی مصلحت یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن کریم کی رُو سے، تقسیم کاریوں ہے کہ بال بچوں کی روزی مہیا کرنے کا ذمہ دار مرد ہے۔ اس لئے اسے زیادہ حصہ ملنا چاہیئے۔ ہاں، اگر کوئی باپ دیکھے کہ حالات ایسے ہیں کہ بیٹی کو زیادہ حصہ ملنا چاہیئے، تو وہ اس کے لئے وصیّت کرسکتا ہے۔ وہ سارے کا سارا مال بیٹی کو دے سکتا ہے۔

جواب (۸) جہیز، محض ایک رسم ہے۔ قرآنِ کریم میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔

جواب (۹) قرآنِ کریم کی رُو سے کسی کو لونڈی رکھنے کی اجازت نہیں۔ اسلام نے غلامی کو یکسر ختم کردیا ہے۔ قرآنِ کریم میں جن غلاموں اور لونڈیوں کا ذکر آتا ہے۔ وہ، وہ ہیں جو زمانہ نزولِ قرآن کے وقت عربوں کے معاشرہ میں موجود تھے۔ قرآن کریم نے انہیں آزاد کرا دیا یا رفتہ رفتہ معاشرہ کا جزو بنا دیا، اور آئندہ کے لئے غلامی کا دروازہ بند کردیا۔

جواب (۱۰) سب سے پہلے تو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے، ایک سے زیادہ بیویوں کی اجازت صرف اس صورت میں ہے جب بیوہ عورتوں اور یتیم بچوں کا سوال در پیش ہو۔ ورنہ اجازت نہیں۔ اب رہا عدل کا سوال۔ سو اس نے کہا ہے کہ جہاں تک مختلف بیویوں میں جذباتی مساوات کا سوال ہے ایسا کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے اس عدل کا تقاضا نہیں کیا جاسکتا۔ جس عدل کا تقاضا ہے وہ حسنِ معاشرت، سلوک اور برتاؤ کا عدل ہے۔ یہ ممکن ہے۔

جواب (۱۱) قرآنِ کریم میں نبی اکرمؐ کی ایک سے زیادہ ازدواجِ مطہراتؓ کا تو ذکر ہے، لیکن ان کی تعداد مذکور نہیں۔ نہ ہی اس کی تصریح ہے کہ بیک وقت حضورؐ کے عقد میں کتنی ازدواجِ مطہراتؓ تھیں۔ اگر بیک وقت چار سے زیادہ تھیں، تو اسے تسلیم کرنا ہوگا کہ واقعہ چار کی تحدید سے پہلے کا ہے۔ تاریخی واقعات کے متعلق اس اصول کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیئے کہ اگر تاریخ میں کوئی ایسا واقعہ نبی اکرمؐ کی طرف منسوب کیا گیا ہو جو قرآنِ کریم کے خلاف ہے، تو ہمیں سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ تاریخ کی غلطی ہے اس لئے کہ ہمارا ایمان ہے کہ نبی اکرمؐ کا کوئی ارشاد

گرامی یا عمل، قرآنِ کریم کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

جواب (۱۲) منہ بولی "ماؤں" سے نکاح کی ممانعت کہیں نہیں آئی۔ اگر کوئی شخص کسی ایسی عورت کو، جس سے، قرآن کی رو سے، اس کا نکاح ہو سکتا ہے، احتراماً ماں کہہ دے تو اس سے نکاح حرام نہیں ہو جاتا۔ اگر ایسا ہو تو سینکڑوں رشتے ناجائز قرار پا جائیں، مثلاً، ہم چھوٹی لڑکیوں کو عام طور پر بیٹی کہہ کر پکارتے ہیں۔ برابر کی عورتوں کو بہن۔ اور بڑی عورتوں کو ماں۔ اس سے وہ سچ مچ کی بیٹیاں، بہنیں اور مائیں نہیں ہو جاتیں۔ یہ اور بات ہے کہ کوئی شخص انہیں از خود اس قسم کا حقیقی درجہ دے کر، ان سے عقد کا تصور نہ کرے۔ قانونی بندش اور چیز ہے اور اپنے آپ پر بندش عائد کر لینا اور ـــ قرآن کریم نے خود اس کی وضاحت کر دی ہے کہ (مثلاً) بیوی کو ماں کہہ دینے سے وہ ماں نہیں ہو جاتی۔ ۵۸/۲

نبی اکرمؐ کی ازواجِ مطہراتؓ سے نکاح کی ممانعت اس لئے نہیں کی گئی کہ وہ مومنین کی "منہ بولی مائیں" تھیں۔ بلکہ اس لئے کہ اللہ تعالیٰ نے انہیں مومنین کی مائیں قرار دے دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ ان سے تمہارا نکاح نہیں ہو سکتا۔ یہ اس خصوصی حکم کے تحت تھا جس کا اطلاق دوسری عورتوں پر نہیں ہو سکتا۔ خود قرآنِ کریم نے حضورؐ کی ازواجِ مطہراتؓ کے متعلق کہا ہے کہ تم عام عورتوں جیسی نہیں ہو۔ (۳۳/۶ - ۳۳/۵۳ - ۳۳/۳۲)

اسلامی معاشرہ میں جو پوزیشن نبی اکرمؐ کی تھی، اسے سامنے رکھا جائے تو اس خصوصی حکم کی علت بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے۔ وہ پوزیشن نبیؐ کے سوا کسی اور کی نہیں ہو سکتی۔ (نہ ہو سکتی تھی۔ نہ ہو سکتی ہے۔ نہ ہو سکے گی۔) اس لئے قرآنِ کریم کے بعض احکام، حضورؐ کے لئے خاص تھے۔ عام مومنین سے الگ۔

جواب (۱۳) قرآنِ کریم نے اس کے لئے "مصدق" کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا مطلب، ان معنوں میں "تصدیق کرنے والا" نہیں جن معنوں میں ہم اسے بولتے ہیں۔ اس کے معنی ہیں "سچ کر دکھانے والا"۔ اہلِ کتاب کے چند دعاوی تھے۔ کچھ آرزوئیں تھیں۔ آنے والے کا انتظار تھا تاکہ وہ "خدا کی مرضی زمین پر پوری کرے"، حق کا غلبہ ہو۔ باطل کو شکست ہو۔ یہ باتیں ان کی تحریف شدہ کتابوں میں بھی موجود تھیں۔ قرآنِ کریم نے ان سے کہا کہ مجھ پر ایمان لاؤ ـــ میں تمہارے دعاوی کو سچ کر دکھاؤں گا، اور تمہاری آرزوں کو پورا کر دوں گا۔ وہ آنے والا آگیا ہے۔ وہ ان سب باتوں کو عملاً سچ کر دکھائے گا۔ قرآن کے مصدق ہونے کا یہ مطلب ہے۔ (تفصیل ان امور کی "لغات القرآن"۔ باب ص۔ د۔ ق۔ میں ملے گی۔)

جواب (۱۴) قربانی کے متعلق ہم نے، طلوعِ اسلام بابت جولائی ۱۹۵۱ء میں ایک خصوصی مقالہ شائع کیا تھا جس

میں، قرآنِ کریم کی نصوص صریحہ کی رُو سے بتایا گیا تھا کہ جو کچھ اس ضمن میں ہمارے ہاں ہوتا ہے وہ منشائے قرآنی کے مطابق نہیں[1]۔ طلوعِ اسلام کے خلاف جو آپ اس قدر شدید پراپیگنڈہ دیکھ رہے ہیں۔ اس کی ابتدا ہمارے اسی "جرم" سے ہوئی تھی۔ یہ سلسلہ ابھی تک جاری ہے — لیکن اس سے قرآنِ کریم کی بیان کردہ حقیقت تو نہیں بدل سکتی۔ وہ بہرحال آشکارا ہو کر رہے گا۔

والسّلام

(اگست ۱۹۶۱ء)

---

[1] یہ مقالہ "قرآنی فیصلے" جلد اوّل میں شائع ہو چکا ہے۔

[2] دیکھئے صـ۲۷

۱۵

معاشی نظام

۱۔ کمیونزم اور اسلام

سوال :۔ آپ نے ایک مرتبہ کہا تھا کہ ہمارے زمانے میں کمیونزم ایک دین کی حیثیت سے اسلام کے مدِمقابل اُٹھی ہے اور یہی اس وقت اسلام کی سب سے بڑی حریف ہے۔ اس کی وضاحت مطلوب ہے۔

جواب :۔ "دین اس نظام زندگی کا نام ہے جو ایک مخصوص آئیڈیالوجی (نظریہ حیات) کی بنیادوں پر متشکل ہو۔ اگر وہ آئیڈیالوجی، حق ہے تو وہ دین بھی برحق ہوگا۔ اگر وہ بنیاد باطل ہے، تو اس پر استوار، نظام بھی باطل ہو گا۔ اسلام دین الحق ہے۔ کمیونزم دینِ باطل۔"

دنیا میں بہت سے مذاہب ہیں، لیکن ان کی حیثیت ایک نظام زندگی کی نہیں۔ مذاہب کے متعلق عام تصور یہی ہے کہ وہ انسان کا۔ پرائیویٹ عقیدہ ہے۔ جس کا مقصد خدا اور بندے کے درمیان انفرادی تعلق پیدا کرنا ہے ـــــــــــــ اس کا تعلق انسان کی اجتماعی زندگی سے نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مذہب پرست لوگوں کے یہاں مملکت سیکولر بھی ہوسکتی ہے۔ مثلاً انگلستان کے باشندے، عیسائی ہیں، وہاں کے بادشاہ کے لیے بھی عیسائی ہونا ضروری ہے۔ لیکن ان کی مملکت سیکولر ہے۔ ان کا مذہب گرجے کی چار دیواری تک محدود ہے۔ اس سے باہر کی دنیا سے اس کا کچھ واسطہ نہیں۔ یہی کیفیت ہندوستان کی ہے۔ وہاں کے باشندوں کی اکثریت ہندو مذہب کی پیرو ہے۔ لیکن مملکت آئینی طور پر سیکولر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عیسائیت یا ہندومت (وغیرہ) کو ان کے اجتماعی نظام سے کچھ تعلق نہیں۔ لہٰذا یہ دین نہیں مذاہب ہیں اور جب یہ دین نہیں تو ان کا دین (نظامِ زندگی) کی حیثیت سے اسلام کے مدِّمقابل آنے کا

سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں شبہ نہیں کہ اسلام ان مذاہب کو بھی مبنی بر صداقت قرار نہیں دیتا، اس لیے کہ اپنی جس تعلیم کو یہ مذاہب تعلیم خداوندی کہہ کر پیش کرتے ہیں، قرآن کا بیان ہے کہ وہ حقیقی تعلیم خداوندی نہیں۔ اس میں انسانی تصورات کی آمیزش ہو چکی ہے۔ حقیقی تعلیم خداوندی اب صرف قرآن کے اندر ہے۔ اس لیے اگر یہ اہلِ مذاہب چاہتے ہیں کہ تعلیم خداوندی کا اتباع کریں تو ان کے لیے قرآن پر ایمان لانا اور اس کا اتباع کرنا ضروری ہے۔ لیکن چونکہ یہ مذاہب اسلام کے مقابلہ میں ایک متوازی دین (نظام زندگی یا نظام مملکت) کی حیثیت سے کھڑے نہیں ہوتے، اس لیے اسلامی مملکت، ان اہل مذاہب کو، اپنی حدود کے اندر نہ صرف پُرامن زندگی بسر کرنے کی اجازت دیتی ہے بلکہ انہیں مذہبی آزادی دیتی ہے اور ان کی پرستش گاہوں کی حفاظت کا ذمہ لیتی ہے۔

کمیونزم کی پوزیشن ان سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ایک فلسفۂ حیات یا نظریہ زندگی (آئیڈیالوجی) پیش کرتی ہے اور اس آئیڈیالوجی کی بنیادوں پر، ایک اجتماعی نظام متشکل کرتی ہے۔ اس اجتماعی نظام میں اس آئیڈیالوجی کو ایمان کی حیثیت سے تسلیم کیا جاتا ہے۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک شخص کمیونزم کی آئیڈیالوجی پر ایمان نہ لاتے لیکن اس کے معاشی نظام کو تسلیم کر لے، تو اسے کمیونسٹ تصور کر لیا جاتے گا۔ قطعاً نہیں۔ وہ کمیونسٹ برادری کا ممبر نہیں ہو سکتا۔ کمیونزم اسے اپنے دائرہ میں داخل نہیں سمجھے گی۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ کمیونزم کی آئیڈیالوجی پر ایمان لا کر اس کے اجتماعی نظام کو صحیح تسلیم کرے۔ اس سے ظاہر ہے کہ کمیونزم کی پوزیشن نہ تو ایک مذہب کی سی ہے جس میں آئیڈیالوجی (عقیدہ) کو اجتماعی نظام زندگی سے کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اور نہ ہی وہ ایک سیکولر نظام مملکت ہے جو افراد مملکت کے مذہب (نظریہ زندگی) سے کچھ تعلق نہیں رکھتا۔ اس کی حیثیت بالکل "دین" کی سی ہے۔ جس میں نہ آئیڈیالوجی نظام اجتماعی سے الگ ہوتی ہے اور نہ ہی نظام اجتماعی، آئیڈیالوجی سے جدا۔ اس میں "ایمان و عمل" کا چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔

۲۔ اب آئیے آئیڈیالوجی کی طرف۔ اسلام کی آئیڈیالوجی کے اہم عناصر یہ ہیں کہ:۔

(۱) انسان صرف اپنے طبیعی جسم سے عبارت نہیں۔ اس میں طبیعی جسم کے علاوہ ایک اور شے بھی ہے جسے قرآن "روح خداوندی" کہہ کر پکارتا ہے۔ اور جسے بغرض تعارف، انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ انسانی جسم کی مشینری طبیعی قوانین کے تابع چلتی رہتی ہے اور جب یہ مشینری چلنے سے بند ہو جاتی ہے تو انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ لیکن انسانی ذات، نہ تو طبیعی قوانین کے تابع ہے اور نہ ہی جسم کی موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اس کی زندگی، اس کی طبیعی موت کے بعد بھی آگے چلتی ہے۔ اسے اُخروی زندگی کہا جاتا ہے۔

(۲) جس طرح انسان کی طبیعی زندگی کے لیے قوانین مقرر ہیں۔ اسی طرح اس کی ذات کی نشوونما کے لیے بھی قوانین متعین ہیں۔ یہ قوانین خدا کی طرف سے بذریعہ وحی ملتے ہیں۔ وحی، حضرات انبیاء کرامؑ کی وساطت سے دوسرے انسانوں تک پہنچتی تھی۔ اب یہ وحی اپنی آخری اور مکمل شکل میں قرآن کے اندر محفوظ ہے۔

(۳) وحی کی رُو سے عطا شدہ قوانین کو مستقل اقدار کہا جاتا ہے۔ دین نام ہے اس نظامِ حیات کا، جو ان مستقل اقدار کی حدود کے اندر گھرا ہو۔ وہ نظام ان حدود کا پابند بھی ہوتا ہے اور ان کی حفاظت بھی کرتا ہے۔ ان سے تجاوز کرنا تو ایک طرف، وہ ان میں کسی قسم کا تغیر و تبدّل بھی نہیں کر سکتا۔

(۴) انسان کے ہر عمل، حتیٰ کہ اس کے دل میں گزرنے والے خیالات تک کا اثر اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ اس کو اعمال کا نتیجہ کہتے ہیں۔ بالفاظ دیگر انسان اپنے اعمال کے نتائج سے کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکتا۔ خواہ وہ اس دنیا میں سامنے آجائیں یا حیات اُخروی میں۔ اسے قانونِ مکافاتِ عمل کہا جاتا ہے۔ جو عمل وحی کے مقرر کردہ مستقل اقدار کے مطابق ہوگا اس کا نتیجہ خوشگوار ہوگا۔ جو ان کے خلاف ہوگا وہ انسان کے لیے مضرت رساں ہوگا۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں وہ آئیڈیالوجی جس پر دین اسلام (یعنی اسلامی نظام اجتماعیہ) کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ کمیونزم کی آئیڈیالوجی اس کی بالکل ضد اور نقیض ہے۔ اس کی رُو سے:-

۱۔ اِنسان صرف اس کے طبیعی جسم کا نام ہے۔ اِس سے زیادہ کچھ نہیں۔ موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ خدا۔ وحی۔ رسالت۔ مستقل اقدار۔ حیاتِ آخرت وغیرہ عقائد سب فریب ہیں۔

۳۔ چونکہ انسان نام ہے اس کی طبیعی زندگی کا، اس لیے انسان کے سامنے مسئلہ صرف روٹی کا ہے، اس سے آگے کوئی مقصدِ حیات نہیں۔ جس طریق اور جس ذریعہ سے یہ مقصد حاصل ہو جائے، وہ نہ صرف جائز بلکہ مستحسن ہے۔ جو اس کی راہ میں حائل ہو وہ ناجائز اور مذموم۔

مارکس کے الفاظ میں:

> اخلاقیات۔ مذہب۔ مابعد الطبیعیات اور دیگر تمام تصورات سب کے سب حقیقی آزادی کے دشمن ہیں۔

اسی لیے لینن نے نوجوانوں کو مخاطب کرتے ہوئے اپنی ایک تقریر میں کہا تھا کہ:

ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی ما فوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں...... اشتراکین کا اخلاق و شریعت تو صرف اس قدر ہے کہ ڈکٹیٹر کی قوت کا بقا اور استحکام کس صورت سے ہو سکتا ہے۔ اس کے خلاف جو کچھ ہے سب ناجائز ہے چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب۔ دروغ بافی۔ فریب دہی عین حق و صداقت ہے۔

یہ ہے وہ آئیڈیالوجی جس پر کمیونزم اپنے اجتماعی نظام کی عمارت استوار کرتی ہے۔ لہٰذا "دین اشتراکیت"، "دین اسلام" کی ضد اور اس کا حریف ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اقبالؒ نے کہا ہے کہ:

دین آں پیغمبر حق ناشناس بر مساوات شکم دارد اساس

اقبالؒ نے مارکس کو پیغمبر (لیکن پیغمبر حق ناشناس) اور اشتراکیت کو "دین" سوچ سمجھ کر کہا ہے۔ یوں ہی شاعری نہیں کی۔ اس کی اسی نظم کا پہلا شعر ہے:

صاحب سرمایہ از نسل خلیلؑ یعنی آں پیغمبر بے جبرئیلؑ

یعنی کتاب "سرمایہ" (THE CAPITAL) کا یہودی مصنف، کارل مارکس "پیغمبر بے جبرئیلؑ" تھا۔ ایسے دین باطل کا موجد جس کی بنیاد وحیٔ خداوندی پر نہیں تھی۔ باطل پر تھی۔

میرا خیال ہے کہ ان تصریحات سے آپ نے سمجھ لیا ہوگا کہ جب میں نے کہا تھا کہ ہمارے زمانے میں کمیونزم ایک دین کی حیثیت سے اسلام کے مقابلہ میں اُٹھی ہے تو اس کا مطلب کیا تھا۔ اور میرے اس فقرہ کا مفہوم کیا ہے۔ جسے میں اکثر دہرایا کرتا ہوں کہ:

نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے اور نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ۔

کمیونسٹ ایک ایسے "دین" کا قائل ہے جو اسلام کی ضد ہے۔ اس لیے اس "دین" کا ماننے والا مسلمان کیسے ہو سکتا ہے۔ اسی طرح اسلام کا پیرو، کمیونسٹ کیسے ہو سکتا ہے؟

لیکن کمیونزم اور اسلام کے اس قدر کھلے ہوئے تضاد کے باوجود لوگ بالعموم ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ اسلام، نظام سرمایہ داری کا دشمن ہے اور کمیونزم کا معاشی نظام بھی سرمایہ داری کے نظام کا حریف ہے۔ اس سے سطح بین لوگ کہنے لگ جاتے ہیں کہ اسلام اور کمیونزم ایک ہی ہیں۔ یہ وہ نہایت "لطیف فریب" ہے

جس کی طرف اقبالؒ نے یہ کہہ کر اشارہ کیا تھا کہ :

زانکہ حق در باطلِ او مضمر است

کارل مارکس کے "باطل" میں "حق" پوشیدہ ہے۔ یعنی اس کا دین (نظامِ حیات) تو باطل ہے، لیکن اس باطل میں ایک عنصر ایسا بھی ہے جو حق ہے ـــ یعنی نظامِ سرمایہ داری کی مخالفت ـ اس لیے لوگ اس سے دھوکا کھا جاتے ہیں۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی وضاحت کے لیے حضرت علامہؒ نے کہا تھا کہ :

" بالشویت + خدا = اسلام" یعنی کیمونزم کے معاشی نظام کو اگر وحیِ خداوندی (قرآن کی اقدار) کے تابع رکھ دیا جائے تو وہ اسلامی نظام ہو جاتا ہے۔ جس طرح، اگر سیاست میں، جمہوری نظام (شورائیت) کو وحیٔ خداوندی (قرآنی اقدار) کی حدود کے اندر رکھ لیا جائے تو وہ اسلامی نظام ہو جاتا ہے۔

لیکن ہمارے یہاں ایک اور قسم کا دھوکا عام ہو رہا ہے۔ اور وہ یہ کہ جوں ہی کسی نے اسلام کے معاشی نظام کا نام لیا، مخالفین نے جھٹ سے اس پر کمیونسٹ کا لیبل لگا دیا۔ حالانکہ یہ ظاہر ہے کہ جس طرح آپ ایک کمیونسٹ (یعنی وحیٔ خداوندی سے انکار کرنے والے) کو مسلمان نہیں کہہ سکتے، اسی طرح آپ ایک مسلمان (وحیٔ خداوندی پر ایمان رکھنے والے) کو کمیونسٹ نہیں کہہ سکتے۔

میں نے کیمونزم اور اسلام کے اس بنیادی فرق کو، اس مقام پر مختصر الفاظ میں پیش کیا ہے۔ اگر آپ اس کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہوں تو میری کتاب "سلیم کے نام" خطوط (جلد اوّل) میں آٹھویں اور نویں خط کا مطالعہ کیجئے۔ میری تصنیف "نظامِ ربوبیت" اور "انسان نے کیا سوچا" میں معاشیات سے متعلق باب بھی اس موضوع پر کافی معلومات بہم پہنچا سکتے ہیں۔

یہاں تک میں نے، ان ہر دو نظام ہائے حیات ـــ اشتراکیت اور اسلام ـــ کے اصولوں سے بحث کی ہے۔ لیکن ان کا حقیقی فرق وہاں جا کر اُجاگر ہوتا ہے جہاں ان کا مقصود و منتہیٰ سامنے آتا ہے۔ جہاں تک معاشی نظام کا تعلق ہے، دونوں کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کی بنیادی ضروریاتِ زندگی پوری ہوتی رہیں لیکن کمیونزم، ایک فرد کی انفرادیت (INDIVIDUALITY) یا اس کی ذات کو کچل کر اسے روٹی دیتی ہے اور اسلام اسے اس لیئے روٹی کی فکر سے آزاد کرتا ہے کہ وہ اپنی ذات یا انفرادیت کی نشوونما اطمینان سے کر سکے۔ اقبالؒ کے الفاظ میں :

آں خدا نانے دہد، جانے دہد   ایں خدا نانے دہد، جانے بُرد

رونی کے مسئلہ کو منتہیٰ و مقصود قرار دے لینا، حیوانی سطح زندگی ہے۔ انسان کی زندگی کا منتہیٰ و مقصود، انسانی ذات کی نشوونما ہے۔ یعنی جو چیز اشتراکیت میں مقصود بالذات ہے، وہ اسلام میں ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ بلند مقصد ان مستقل اقدار کے اتباع کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا جو وحی کی رو سے ملی ہیں۔ لہٰذا مقصود و منتہیٰ کے اعتبار سے بھی دیکھئے تو کمیونزم کا نظام حیات اسلام کی یکسر نقیض ہے۔

(دسمبر ۱۹۶۲ء)

---

۲ ــــــ اشتراکی نظریۂ زندگی اور اسلام

ذیل کا خط بغور ملاحظہ فرمائیے:

"بندہ ایک سال سے آپ کی تصنیفات کا مطالعہ کر رہا ہے اور طلوعِ اسلام بھی برابر زیرِ نظر ہے۔ آپ نے قرآن حکیم کی تفہیم جس نہج پر و چار کی ہے اپنی نوعیت میں بالکل منفرد ہے۔ تاریک خیال ملاّ کا آپ سے سیخ پا ہونا ایک قدرتی اور فطری امر ہے۔ آپ نے ثابت کیا ہے کہ قرآن حکیم نظام ربوبیت کا داعی ہے۔ اور حضرت علامہ اقبال مرحوم کا کلام بھی آپ کے ہمنوا ہے۔ چونکہ نظامِ ربوبیت اپنے خواص میں انقلابی فطرت کا ہے اور ملاّ ازم فطرتاً اس کی ضد ہے۔ بقول کسے:

ہرگز مگو کہ شیخ شود اہلِ انقلاب   باور مکن کہ ہست در عالم غرابِ سُرخ

پرویز صاحب! نظامِ ربوبیت سے جو آپ کی غایت ہے وہ بالکل درست ہے لیکن ذرائع حصول میں مجھے اختلاف ہے لہٰذا اپنے سوال کا جواب بہ توسل طلوعِ اسلام چاہتا ہوں۔ اگر جواب مذہبی عقیدتمندی کے جذبات سے ہٹ کر مدلل اور تاریخی وجوب و حقائق کا حامل ہو تو میرے لیے زیادہ مؤثر و مسکت ہوگا۔

قدیم اشتراکی نظام سے لے کر آج تک تدریجی ادوار میں ارتقائی قوانین قدرت جاری و ساری ہیں۔ مادی تاریخ ان ادوار کا تعین کرتی چلی آرہی ہے۔ مذہب کی دخیل کاری نے مادی تاریخ کے مادی تقاضوں سے ٹکر لی اور ایک مخصوص خطہ میں ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کی جو سراسر اپنی فطرت کے لحاظ سے اس وقت مادی دور سے جو اس زمانہ کا طبعی تاریخی دور تھا الگ تھلگ تھا یہ پیغمبرِ اسلامؐ کی بے پناہ روحانیت کا کرشمہ تھا

اور تاریخی تجربہ جو ایک معجزہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ لیکن شارعِ اسلام کے رخصت ہوتے ہی چند ماہ و سال کے اندر یہ اسلامی نظام جو تاریخی لحاظ سے قبل از وقت تھا ختم ہو گیا اور "مستثنیات" واقعات کی تعریف میں جگہ پا گیا۔ وہ لوگ جنہوں نے اپنے رسولِ پاکؐ سے بہ نفس نفیس تربیت پائی تھی اور قیصر و کسریٰ کو اس واسطے ختم کیا تھا کہ یہ غیر صالح نظام کے نمائندہ ہیں۔ چند ہی روز کے بعد اسی غیر صالح نظام کے شہنشاہ بن کر جلوہ نما ہوئے اور تاریخ کا تیز رو دھارا اسی سمت ہی بہتا رہا جس سمت سے اس کو غیر طبعی طور پر موڑنے کی کوشش کی گئی تھی کیونکہ تاریخ کے ارتقائی مادی تقاضے ہی تاریخ سے عبارت ہیں۔

یہ امر بالکل غیر طبعی اور غیر فطری ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی بڑھاپے کی عمر میں پہنچ جائے اور تیر خوار گی۔ بچپن، عنفوانِ شباب، شباب اور کہولت کے دوروں سے گزرے ہی نہ۔ ایسا ہونا نا ممکنات سے ہے۔ کیونکہ انسان کو ان تمام ارتقائی منزلوں سے گذرنا پڑتا ہے اور بعینہ یہی ارتقائی قوانین انسانی معاشرہ میں بھی موجود ہیں۔ یہاں منزل یہ منزل ایک دور سے دوسرے دور میں داخل ہونا پڑتا ہے جیسے برف کو پانی اور پانی کو بھاپ میں تبدیل ہونے کے لیئے انقلابی عملوں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور ان تینوں یعنی برف پانی اور بھاپ میں اصل ہستی پانی کی ہے جس نے مختلف مدارج میں پہنچ کر اپنی اصل ہستی کو فنا نہیں کیا ہے بلکہ اپنے خواص اور صورتِ نوعیہ میں تبدیلی پیدا کر لی ہے۔ بعینہ اسی طرح یہ کاروانِ زندگی ابتدا میں پھسل پھسل کر اور رینگ رینگ کر چلتا ہے۔ آہستہ آہستہ تاریخی عوامل کے تھپیڑوں کو سہنے کی اپنے اندر قابلیت پیدا کرتا ہے۔ یعنی تنازع للبقا کی قوتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ اور اس کے اندر روانی پیدا ہو جاتی ہے اور اس طرح یہ کارروان اور تاریخی ارتقائی مراحل طے کرتا ہے اور اب یہ ایٹم اور برقیات کے دور میں ہے۔ پانی کی طرح زندگی کے ان مختلف قافلوں کی اصل بھی مادی تاریخ ہی ہے جو مختلف دوروں میں اپنی صورت نوعیہ اور خواص تبدیل کرتی جا رہی ہے۔ اگر کسی سوسائٹی یا مذہب کے خیالات کا رجحان ترقی پسندانہ ہوتا ہے۔ اور وقت کے ساتھ ساتھ اپنے ان اعمال و افعال کی تجدید بھی کرتا جاتا ہے جو نئے مادی تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ تو ایسا نظام ترقی پسندانہ معاشرہ کہلاتا ہے۔ مادی تاریخ کے یہ سائنٹفک اصول ہیں جن کو نہ ماننا حقیقت کا منہ چڑانا ہے۔ اب سوال یہ سامنے آتا ہے کہ کیا ہم جدلی تاریخ کے سائنٹفک مطالعہ کے بغیر مادی تقاضوں اور عوامل کا درست تجزیہ کر سکتے ہیں۔ اور صرف مذہبی پیشوا اس قابل ہیں کہ اپنے مذہبی علوم کے سہارے سے تاریخ کا پہیہ ہمیشہ آگے کو لے جائیں؟ ایسا ہرگز نہیں۔ ان کی تاریخ

رجعت پسندانہ تاریخ ہے۔" آئین نو سے ڈرنا۔ رسم کہن پر اڑنا۔ منزل یہی کٹھن ہے قوموں کی زندگی میں" چونکہ پیغمبر کا ہر فعل خواہ وہ وقتی تقاضے کی مصلحت پر مبنی ہو، مذہب کی اصطلاح میں "سنت" کہلاتا ہے جس کو ترک کرنا مذہب کی اصطلاح میں "کفر" تصور کیا جاتا ہے۔ خواہ پیغمبر کے اس فعل کی افادیت صرف وقتی طور پر ہو۔ اور بعد کے حالات میں اس فعل پر عمل کرنا سراسر ناقابل عمل ہو۔ جیسا کہ حضرت ابو بکرؓ کو ان کی خلافت کے عہد میں یہ مشورہ دیا گیا کہ آپ خزانہ عامرہ کو ہر شام خالی نہ کر دیا کریں۔ بلکہ خزانہ کو باقاعدہ جمع کریں۔ اور کارکنان حکومت کی باقاعدہ ماہانہ تنخواہ مقرر فرمائیں۔ تو آپ نے جواب دیا کہ میں سنت رسولؐ کے خلاف نہیں کر سکتا ہوں۔ بہر حال یہ ایک امر واقع ہے کہ پیغمبر اسلامؐ جن خطوط پر معاشرہ کی تشکیل چاہتے تھے وہ نہ ہوا اور معاشرہ مادی تاریخ کے عوامل کی سنت کا پیرو کار رہا۔ اور مذہبی پیشواؤں نے اس وقت کے صاحب اقتدار طبقہ کی خواہشات کے مطابق جواز نکالنے کا کام سنبھال لیا جو آج بھی جاری ہے۔

محترم پرویز صاحب! آپ اس بستی یعنی پاکستان میں واحد شخص ہیں جو فرماتے ہیں کہ "الارض للہ" اور نظام ربوبیت قائم ہونا چاہیئے۔ دوسری طرف شرق تا غرب تمام مولوی صاحبان یک زبان آپ کے خلاف تکفیر کے فتوے دیتے ہیں۔ ان میں سے بعض تو اسلام کا ماحصل صرف چار نکاحوں تک جانتے ہیں۔ لیکن جماعت اسلامی کے امیر اسلام کا نام لے کر جاگیرداری نظام کا جواز نکالتے ہیں۔ اور اپنی کتاب "سود حصہ دوم" میں فرماتے ہیں۔ ایک مربع گز سے لے کر اگر کسی شخص کے قبضہ میں اس قدر رقبہ ہو جس کی کوئی حد ہی مقرر نہ ہو اگر جائز طریقہ سے قابض ہے تو شریعت کی رو سے درست ہے۔" لیکن آپ فرماتے ہیں کہ زمین اللہ کی ہے اس پر کسی کی ملکیت نہیں ہے۔

دہ خدایا یہ زمین تیری نہیں تیری نہیں تیرے آبا کی نہیں تیری نہیں میری نہیں

آپ بھی جواز اپنے دعوے کا قرآن ہی سے نکالتے ہیں اور مودودی صاحب بھی قرآن ہی سے۔ جن کے نزدیک یہ زمین پاکستان کھوڑوؤں۔ دولتانوں اور ٹوانوں کی ہے۔

خداوندا! یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

کیا یہ ایک حقیقت نہیں ہے کہ حصول پاکستان سے پیشتر کیا وعدے کئے گئے تھے کہ پاکستان بن

جانے کے بعد آپ کے لفظوں میں "نظامِ ربوبیت" قائم کیا جائے گا۔ اور حضرت عمرؓ کا دور لوٹ آئے گا۔ عوام نے ہولناک اور بے مثال قربانیاں دیں۔ پاکستان بن گیا۔ سولہ سال گذر گئے اور ان سولہ سالوں میں ہر صدرِ مملکت اور ان گنت وزیروں نے اور مولوی صاحبان نے یہی کہا کہ ہمارا نظام اسلامی ہونا چاہیئے۔ لیکن مادی تاریخ کہتی ہے کہ نہیں۔ نظام صرف میری سنّت پر چلنا چاہیئے آپ غور فرمائیں کہ ہماری حکومت اور علمائے دین دونوں فریق یہی کہتے ہیں کہ اسلامی نظام ہونا چاہیئے لیکن یہ دونوں فریق اسلامی نظام بنانے سے عاجز ہیں۔ اگر آپ نظام ربوبیت پیش کرتے ہیں تو علمائے دین کے نزدیک کافر ٹھہرتے ہیں۔ ادھر خانہ کعبہ سے بھی اسلامی نظام کی آواز نہیں آتی ہے۔ بلکہ عربوں کا آج ایک ہی محبوب نعرہ ہے (عرب نیشنلزم زندہ باد) لیکن آج زمین میر و سلطان سے بیزار ہو رہی ہے اور ہمارے ملک کا جاگیرداری نظام عالم نزع میں ہے۔ ہمیں آگے بڑھنے کے لیے تاریخ کے مادی اصولوں ہی سے راہنمائی لینی چاہیئے اور اپنے اردگرد کے حالات اور تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ نظامِ ربوبیت تک پہنچنے کے لیے سیدھا راستہ یہی ہے۔"

طلوعِ اسلام

ہم نے اس تفصیلی خط کو بتمامہٖ اس لیے شائع کیا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ اشتراکی فلسفۂ حیات کیا ہے؟ اور اس فلسفہ سے متاثر ذہن کس نہج پر سوچتا ہے۔

ہم اس حقیقت کو متعدد بار واضح کر چکے ہیں کہ ایک چیز ہے اشتراکی نظامِ معاشی اور دوسری چیز ہے اشتراکی فلسفہ زندگی۔ لیکن چونکہ اشتراکی نظامِ معیشت کی عمارت، اشتراکی فلسفہ کی بنیادوں پر استوار ہوئی ہے اس لیے اس نظام کو سمجھنے کے لیے اس فلسفہ کا پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔ بعینہٖ جس اسلامی نہج زندگی کے کسی گوشے کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی فلسفۂ حیات یا نظریۂ زندگی کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ جو نظام یوں ہی ہنگامی طور پر اپنا لیا جائے اس کی صورت کچھ اور ہوتی ہے۔ لیکن جو نظام کسی خاص فلسفۂ حیات کی پیداوار ہو اُسے اس فلسفۂ حیات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے اس فلسفہ کا سمجھنا لاینفک ہوتا ہے۔

۲۔ مشہور جرمنی مفکر ہیگل کا پیش کردہ نظریہ یہ تھا کہ ایک (IDEA) پیدا ہوتا ہے۔ وہ بڑھتا پھولتا۔ پھلتا۔ پروان چڑھتا ہے۔ جب وہ اپنی تکمیل تک پہنچ جاتا ہے تو اس میں سے ایک اور تصور کی نمودار ہوتی ہے جو پہلے تصور کی ضد ہوتا ہے۔ جو کچھ پہلے تصور کے ساتھ ہوتا تھا وہی کچھ اس جدید تصور کے ساتھ ہوتا ہے۔ چنانچہ یہ گردش دولابی شروع سے آج تک جاری ہے اور اسی طرح جاری رہے گی۔ اس

کا نام جدلی عمل (DIALECTIC PROCESS) ہے۔ جب ہیگل سے پوچھا گیا کہ وہ کونسی قوت ہے جو اس عمل کو ایسے ضبط اور نظم کے ساتھ جاری رکھتی ہے، تو اس نے کہا کہ اس مخفی قوت کا نام "روح عالم" (WORLD SPIRIT) ہے وہ اس عمل سے خود اپنی ذات کی تکمیل چاہتی ہے۔

مارکس (MARX) ہیگل کے فلسفہ کا متبع تھا، لیکن اس نے ذرا آگے جا کر، ہیگل سے ایسا اختلاف کیا کہ اس کا یہ اختلافی نظریہ خود ایک الگ فلسفہ بن گیا۔ اس نے کہا کہ جنگ اضداد کا جو تصور ہیگل نے پیش کیا ہے وہ تو درست ہے لیکن یہ جنگ تصورات (IDEAS) میں نہیں ہوتی بلکہ نظام ہائے زندگی (SOCIAL ORDERS) میں ہوتی ہے۔ ایک نظام قائم ہوتا ہے۔ جب وہ اپنے عروج تک پہنچ جاتا ہے تو اس کے اندر سے بعض مخالف قوتیں وجود کوش ہوتی ہیں۔ یہ قوتیں اس نظام کو تباہ کر کے اس کی جگہ ایک جدید نظام کو مسلّط کر دیتی ہیں۔ جو پہلے نظام کی ضد ہوتا ہے۔ اور یہ جنگ اسی طرح آگے بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس سے پہلے، نظام سرمایہ داری دنیا پر مسلّط تھا۔ اب اس کی جگہ، اشتراکی نظام لے رہا ہے۔ جو اس پہلے نظام کی ضد ہے۔ جب اس سے پوچھا گیا کہ یہ جنگ اضداد کون سی قوت کی رُو سے جاری رہتی ہے تو اس نے کہا کہ اسے تاریخی وجوب (HISTORICAL NECESSITY) کہا جاتا ہے۔ یہ قوت اس قدر محکم اور مہیب ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ انسان اس کے سامنے یکسر بے بس اور عاجز ہے۔ جب یہ ایک نظام کو مسلّط کرتی ہے۔ تو انسان اس نظام کو بدل ہی نہیں سکتا۔ اسے اس نظام کو مجبوراً تسلیم اور اختیار کرنا پڑتا ہے۔ اختیار کرنا کیا معنی، اس کے سامنے جھکنا پڑتا ہے۔ اور جب وہ قوت اس نظام کو فنا کرنا چاہتی ہے تو انسانوں کی کوئی تدبیر اسے بچا نہیں سکتی۔ مارکس کے نزدیک انسان کی ساری تاریخ اس کی اس بے بسی اور بے کسی کی داستان ہے۔ خدا وحی، مستقل اقدار، حق و باطل کا تصوّر اس کے نزدیک سب افسانے ہیں اور ذہن انسانی کی تخلیق۔ حقیقت صرف تاریخی وجوب کی ہے۔ مارکس کے اس نظریہ کی عملی تعبیر کا نام، "تاریخ کی مادی تعبیر" (MATERIALISTIC INTERPRETATION OF HISTORY) ہے۔ وہ اس تعبیر کو اس قدر حتمی اور یقینی قرار دیتا ہے کہ اس کے نزدیک، دنیا کی کوئی قوت اس کے دھارے کا رُخ بدل نہیں سکتی۔

۳۔ یہ ہے مختصر الفاظ میں اشتراکی فلسفۂ زندگی۔ اس کی روشنی میں، آپ مندرجہ بالا خط پڑھیں گے تو بات صاف ہو جائے گی کہ اس فلسفہ سے متاثر ذہن کس نہج پر سوچتا ہے۔

اسلام کا نظریۂ حیات، اس فلسفہ کے بالکل برعکس اور اس کی ضد ہے۔ اسلام کا نظریہ یہ ہے کہ حق (TRUTH) ایک ابدی حقیقت ہے، جو ذہن انسانی کی پیداوار نہیں۔ یہ اپنے مقام پر اٹل اور غیر متبدل ہے، اور کسی شے سے اثر پذیر نہیں ہوتا۔ جو تصورات حق کے مطابق ہوں وہ مبنی بر صداقت ہونگے۔ انہیں مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ یہ اقدار، حق پر مبنی ہونے کی وجہ سے ابدی اور غیر متبدّل ہیں۔ یہ وحیٔ خداوندی کی رُو سے (بوساطت حضرات انبیاء کرامؑ) انسانوں کو ملتی ہیں۔ تاکہ وہ ان کے مطابق اپنا نظام زندگی قائم کریں۔ جو نظام ان اقدار کے مطابق قائم ہوتا ہے اسے حق کا نظام کہا جاتا ہے؛ اس نظام کی عملی شکل، زمانے کی ضرورتوں کے لحاظ سے بدلتی رہتی ہے۔ لیکن جن بنیادوں پر استوار ہوتا ہے ان میں کوئی تبدیلی نہیں آسکتی۔

جو تصورات مستقل اقدار کے خلاف ہوں انہیں باطل کے تصورات کہا جاتا ہے جو حق کی نقیض ہے۔ ان دونوں تصورات کی باہمی کش مکش رہتی ہے اور اس کشمکش میں حق، باطل کو شکست دیتا چلا جاتا ہے۔ اس طرح باطل آہستہ آہستہ کمزور ہوتا جاتا ہے۔ تاآنکہ آخر الامر، یہ میدان چھوڑ جائے گا۔ اور حق کا غلبہ مکمل ہو جائے گا۔

حق اور باطل کی یہ کشمکش، خدا کے کائناتی قانون کی رُو سے جاری ہے لیکن چونکہ اس قانون کی رفتار ہمارے حساب و شمار کی پیمائش کے مطابق بہت سُست ہوتی ہے۔ (خدا کا ایک ایک دن، قرآن کے الفاظ میں ہزار ہزار بلکہ پچاس پچاس ہزار سال کے برابر ہوتا ہے) اس لیے اس کشمکش کے نتائج بڑے غیر محسوس اور غیر مرئی ہوتے ہیں۔ لیکن تاریخی نوشتوں پر نگاہ ڈالی جائے تو ان سے اس حقیقت کی شہادت مل سکتی ہے کہ یہ کشمکش جاری ہے۔ اس میں حق (تعمیری تصورِ حیات) باطل (تخریبی نظریہ) پر بتدریج غالب آ رہا ہے۔

اسلام کی رُو سے انسان بے بس اور بے کس۔ مجبور و مقہور مخلوق نہیں۔ یہ صاحب اختیار و ارادہ ہستی ہے۔ اسے اس انتخاب (CHOICE) کی قوت دی گئی ہے کہ وہ اپنا نظام، حق کے مطابق قائم کرے یا باطل کے مطابق۔ جب انسانوں کی کوئی جماعت حق کے مطابق

نظام قائم کرتی ہے تو اس کے تعمیری نتائج مرتب ہونے کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ اتنی تیز کہ کائناتی قانون کی رفتار سے جو نتائج صدیوں میں جا کر محسوس شکل میں سامنے آتے ہیں، وہ اس رفتار کی رُو سے دنوں میں سامنے آجاتے ہیں۔ انسانی تاریخ میں یہ ادوار (خواہ ان کی مدت کتنی ہی مختصر کیوں نہ ہو) نشان منزل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے کہ حق و باطل کی یہ کش مکش "تاریخی وجوب" کی اندھی قوت کی رُو سے جاری نہیں۔ یہ خدائے علیم و حکیم کے متعیّن کردہ پروگرام کے مطابق جاری ہے جس کی رُو سے کائنات بالحق اور بامقصد پیدا کی گئی ہے اور وہ ایک خاص منزل کی طرف رواں دواں جا رہی ہے۔ جب انسان حق کے مطابق نظام قائم کرنے کی کوشش چھوڑ دیتے ہیں تو وہ (حق) پھر کائناتی رفتار سے آگے بڑھنا شروع ہو جاتا ہے۔ مستقل اقدار کی صحیح تعلیم و تربیت سے انسانوں کو ہر زمانے میں اس قابل بنایا جا سکتا ہے کہ وہ حق کا نظام قائم کر سکیں۔ تاریخ کے جن درخشندہ ادوار کی طرف ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے، وہ ادوار تھے جن میں انسانی جماعتوں کو اس قابل بنایا گیا تھا۔ آخری مرتبہ یہ دور محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کے زمانے میں آیا۔ جب تک اس صحیح تعلیم و تربیت کا سلسلہ جاری رہا (جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے) وہ نظام قائم رہا۔ جب لوگوں نے اسے منقطع کر دیا، تو وہ نظام بھی باقی نہ رہا۔ وہ مستقل اقدار حق کے مطابق یہ نظام قائم ہوا تھا اب قرآن کریم کے اندر محفوظ ہیں ان میں یہ صلاحیت موجود ہے کہ وہ ہر زمانے میں عملی نظام کی شکل میں متشکل کی جا سکیں۔ جب اور جہاں بھی ان کی صحیح تعلیم کا سلسلہ جاری ہو گیا وہ نظام متشکل ہو جائے گا۔

۴۔ اس چودہ سو سال کے عرصے میں جب کہ حق کا وہ نظام، جسے انسانی ہاتھوں نے قائم کیا تھا، باقی نہ رہا، حق پر مبنی تصورات، کائناتی رفتار سے باقاعدہ آگے بڑھتے چلے آ رہے ہیں اور انسانی معاشرہ پر غیر شعوری طور پر مسلط ہوتے جا رہے ہیں۔ ملوکیت کا مٹ جانا اور اس کی جگہ شورائیت کے تصور کا عام ہو جانا۔ غلامی کا خاتمہ۔ ذات پات کی تمیز کا دور ہو جانا۔ قومیت کی جگہ عالمگیر انسانی برادری اور وحدتِ نظام انسانیہ کے تصور کا اجاگر ہوتے چلے جانا۔ انسانوں کے بنیادی حقوق کے احساس کا بیدار ہونا۔ زمین داری جاگیرداری، سرمایہ داری کے نظام کا مغضوب بن جانا اور عالمگیر نظام ربوبیت کا مقبول ہوتے چلے جانا وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب قرائن و شواہد اس حقیقت کی دلیل ہیں کہ حق کے مطابق نظریات زندگی، کائناتی قانون خداوندی کے مطابق آہستہ آہستہ متمکن ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ اب دنیا کی کوئی قوت، اُن باطل تصورات کو واپس نہیں لا سکتی جنہیں حق کے تصورات نے شکست دے کر میدان سے بھگا دیا ہے۔ اس وقت اگر انسانوں کی تعلیم و تربیت قرآنی تصورات کے مطابق

کر دی جائے تو صحیح نظامِ عدل وصداقت کے قائم ہونے میں (جسے ہم خدا کے نظامِ ربوبیت کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں) کچھ دیر نہیں لگے گی۔ اس کے لیے کائناتی قانون نے فضا کو بڑا سازگار بنا دیا ہے۔

۵۔ تصریحاتِ بالا سے یہ حقیقت واضح ہو گئی ہو گی کہ اسلام کا نظریۂ حیات اور اشتراکیت کا فلسفۂ زندگی ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یہی وجہ ہے جو ہم اکثر وبیشتر کہتے رہتے ہیں کہ نہ کوئی مسلمان کمیونسٹ ہو سکتا ہے اور نہ کوئی کمیونسٹ مسلمان ہو سکتا ہے۔ عام لوگوں کی غلطی یہ ہے کہ وہ جب اشتراکیت کے معاشی نظام کی بعض جزئیات اور قرآن کے معاشی نظام میں مماثلت دیکھتے ہیں تو جھٹ سے کہہ اٹھتے ہیں کہ اسلام اور اشتراکیت ایک ہی چیز ہے۔ اور یہ غلطی صرف اشتراکی نظام کے بارے میں ہی نہیں کی جاتی۔ ہر نظام کے بارے میں کی جاتی ہے۔ مثلاً جب لوگوں نے دیکھا کہ مغربی جمہوریت بھی ملوکیت کے خلاف ہے اور اسلام بھی ملوکیت کی جگہ نظامِ شورائیت کا حامی ہے تو انہوں نے فوراً اعلان کرنا شروع کر دیا کہ اسلام اور جمہوریت ایک ہی شے ہے۔ حالانکہ مغرب کی جمہوریت، جس مادی نظریۂ حیات کی پیداوار ہے وہ اسلامی نظریۂ زندگی کے یکسر خلاف اور اس کی نقیض ہے۔ اسی قبیل کا یہ نعرہ ہے۔ (جسے آج کل مغربی سیاست خاص طور پر بلند کر رہی ہے) کہ چونکہ عیسائی دنیا بھی خدا کو مانتی ہے اور مسلمان بھی خدا پر ایمان رکھتے ہیں، اس لیے یہ دونوں ایک ہیں۔ حالانکہ عیسائی دنیا جس چیز کو خدا پر ایمان قرار دیتی ہے، قرآن اسے کفر اور شرک سے تعبیر کرتا ہے اور واضح الفاظ میں کہتا ہے کہ جب تک یہ لوگ خدا کو ان تصورات کے مطابق نہ مانیں جنھیں قرآن کریم پیش کرتا ہے، وہ کبھی خدا کے ماننے والے نہیں کہلا سکتے۔ بہرحال یہ جملہ معترضہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ اسلام کا نظریۂ زندگی اور اشتراکی فلسفۂ حیات ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

۶۔ گذشتہ صفحات میں جو کچھ کہا گیا ہے، محترم مستفسر کے استفسارات کا اصولی جواب اسی میں آ گیا ہے۔ لیکن ان کی بعض جزئی باتوں کے متعلق مختصراً ذیل میں عرض کیا جاتا ہے۔

(۱) انہوں نے کہا کہ اسلام نے اپنے ابتدائی ایام میں تاریخ کے مادی تقاضوں سے ٹکر لی۔ اور ایک مخصوص خطہ میں ایسا نظام قائم کر دکھایا جو اس زمانے کے طبعی تاریخی دور سے الگ تھا اس کے متعلق وہ کہتے ہیں کہ "یہ پیغمبرِ اسلام کی بے پناہ روحانیت کا کرشمہ تھا اور ایک معجزہ"

محترم مستفسر یا تو پورے طور اشتراکی فلسفہ کے قائل نہیں۔ یا (معاف بفرمائید) انہیں پورے طور پر اس کا علم نہیں۔ اشتراکی فلسفہ کی رُو سے نہ "روحانیت" کوئی شے ہے اور نہ ہی اس پر مبنی معجزہ کا کوئی وجود۔

جب تاریخ کی تعبیر یکسر مادی ہے تو اس میں روحانیت کا ذکر ہی کیا۔ مارکس اس قسم کے تصورات کو انسانی اوہام کی پیداوار قرار دیتا ہے۔ پھر یہ چیز بھی قابل غور ہے کہ جب تاریخی وجوب کی قوت ایسی بے پناہ ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اس کے دھارے کو نہیں روک سکتی، دنیا کے کسی ایک ...... خطہ ہی میں سہی اور تھوڑے سے وقت کے لیے ہی سہی، جب اس دھارے کا رُخ موڑ دیا گیا اور اس کے علی الرغم ایک اور نظام قائم کر کے دکھا دیا گیا تو وہ بنیاد ہی منہدم ہو گئی جس پر اشتراکی فلسفہ کی عمارت اُستوار ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ذرا عام روش سے ہٹ کر سوچا جائے تو یہ بات اُبھر کر سامنے آ جائے گی کہ جسے "تاریخی وجوب" کہا جاتا ہے، اس کی اصل ہی کچھ نہیں۔ وہ تو قرآن کے الفاظ میں" ان ناموں میں سے ایک نام ہے، جنہیں تم نے یا تمہارے آباؤ اجداد نے وضع کر لیا تھا" — محض ایک نام — تاریخ، انسانوں کے اختیار و ارادہ اور اعمال و کردار کی داستان کا نام ہے۔ اسے ایک ایسی مہیب قوت سمجھ لینا جس کے سامنے انسان بے دست و پا اور محکوم و مقہور بن کر رہ جائے، پتھر کو دیوتا بنا لینے والی بات ہے۔ مارکس نے خدا سے انکار کیا — اور اس کا مذہب اسے جس خدا کا ستار بنانا چاہتا تھا وہ خدا تھا ہی اس قابل کہ اس سے انکار کیا جاتا — اس خدا سے اس نے انکار کیا اور حقیقی خدا کا تصور اس کے سامنے کسی نے پیش نہ کیا۔ نتیجہ یہ کہ اس کے ذہن میں خلا پیدا ہو گیا۔ لیکن چونکہ خلا کا قائم رہنا ناممکنات سے ہے، اس لیے اس خلاء کو پورا کرنے کے لیے ایک "خدا" وضع کرنا پڑا۔ یہ خدا ہے "تاریخی وجوب" جو محض ایک موہوم نام ہے۔ اس کی اصل و حقیقت کچھ بھی نہیں۔ کوئی کمیونسٹ آج تک یہ نہیں سمجھا سکا کہ "تاریخی وجوب" ہے کیا؟ نہ ہی خود مارکس کے ہاں اس کی تشریح ملتی ہے۔

باقی رہا یہ کہ جو نظام رسول اللہ نے قائم فرمایا تھا وہ تھوڑے عرصے کے بعد جاری کیوں نہ رہا۔ سو اس کے متعلق گذشتہ صفحات میں مختصراً بتایا جا چکا ہے۔ (تفصیلاً دیکھنا ہو تو سلیم کے نام خط کی تیسری جلد میں وہ خط دیکھئے جس کا عنوان ہے "اسلام آگے کیوں نہ چلا")

اس مقام پر اتنا اور بتا دینا ضروری ہے کہ جو نظام نبی اکرمؐ نے قائم فرمایا تھا۔ وہ نہ معجزہ تھا۔ نہ "روحانیت" کا کرشمہ۔ وہ اس پروگرام کا فطری نتیجہ تھا۔ جسے قرآن کریم نے اس نظام کے قیام کے لیے تجویز کیا ہے یعنی صحیح تعلیم و تربیت سے مستقل اقدار کی اہمیت کو اس قدر دلوں میں جاگزیں کر دینا کہ وہ انسانی زندگی کا نصب العین بن جائیں اور اس طرح انسان ان کے تحفظ کی خاطر ہر قسم کی مادی

قربانی کے لیے بطیب خاطر تیار ہو جائے۔ اس پروگرام پر جب بھی عمل کیا جائے گا اس کا نتیجہ وہی برآمد ہو گا جو نبی اکرمؐ کے زمانے میں پیدا ہوا تھا یہ بھی واضح رہے کہ قرآن کریم نے اس نظام کے اصول دیے ہیں جو غیر متبدل ہیں۔ اس کی جزئیات خود متعین نہیں کیں۔ انہیں ہر زمانے کے انسانوں پر چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ انہیں اپنے حالات کے مطابق خود متعین کریں۔ اس لیے محترم مستفسر کا یہ سمجھنا کہ کسی ایک زمانے کی متعین کردہ جزئیات بھی ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رہیں گی، قرآنی تصورِ نظام سے ناواقفیت پر مبنی ہے۔ خود نبی اکرمؐ کے جانشینوںؓ (خلفائے راشدینؓ) کے زمانے میں کئی ایک جزئیات ہیں سے جو علیٰ حالہ رہنے دی گئیں تو اس لیے کہ ان میں سے کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں سمجھی گئی۔

(۱۱) محترم مستفسر نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ناممکن ہے کہ بچہ پیدا ہوتے ہی بڑھاپے کی عمر میں پہنچ جائے تدریجی ارتقاء فطرت کے اصولوں میں سے ہے۔

یہ درست ہے لیکن اس اصول کا اطلاق انہی امور پر ہو سکتا ہے۔ جو انسانی ذہن کے پیدا کردہ ہوں۔ آج سے چھ ہزار سال پہلے کا انسانی ذہن وہ باتیں نہیں سوچ سکتا تھا جو آج کا ذہن سوچ سکتا ہے۔ لیکن وحیٔ خداوندی انسانی ذہن کی تخلیق نہیں ہوتی۔ اس کا سرچشمہ علم خداوندی ہے۔ جو ماحول کے اثرات سے بلند ہے۔ وحی، انسان کو ابدی حقائق دیتی ہے جو مستقل بالذات اور غیر متبدل ہیں۔ وحی نے سب سے پہلے نبی سے بھی یہی کہا تھا کہ لوگوں سے کہہ دو کہ ذرائع رزق، انسانی نشو و نما کے لیے ہیں۔ انہیں افراد اور مخصوص گروہوں کی مفاد پرستیوں کے لیے محدود نہیں کیا جا سکتا۔ ذہن انسانی اور وحی میں بنیادی فرق یہ ہے کہ ذہن انسانی کا طریق، تجرباتی ہے۔ اس لیے وہ تدریجاً حقیقت تک پہنچتا ہے۔ لیکن وحیٔ خداوندی پہلے ہی دن حقیقت کو سامنے لے آتی ہے، البتہ اس حقیقت کو عملی نظام میں متشکل کرنے کے لیے ہر دور کے تقاضوں کو سامنے رکھا جائے گا اور یہ سب کچھ انسانی جدوجہد کی رُو سے ہو گا۔ جیسا کہ پہلے بھی کہا جا چکا ہے وحی کی رُو سے اس نظام کے اصول ملتے ہیں، جزئیات نہیں ملتیں۔ تدریجی ارتقاء کا عمل انسانی زندگی کی جزئیات میں ہوتا ہے اصولوں میں نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ بچے کی مختلف قوتوں کی نشو و نما تدریجاً ہوتی ہے لیکن جن اصولوں پر انسانی زندگی کا دارومدار ہے، وہ بچپن، جوانی اور بڑھاپے میں یکساں رہتے ہیں۔ مثلاً زندگی کا دارومدار سانس پر ہے تو یہ چیز زندگی کے پہلے دن سے آخری دن تک یکساں طور پر کارفرما رہتی ہے۔ اسی طرح زندگی اور صحت سے متعلق دوسرے اصولوں کی کیفیت

ہے یہ اصول تدریجاً مرتّب نہیں ہوتے۔ جس نے زندگی دی ہے، اسی نے ان اصولوں کو مستقل طور پر متعین کر دیا ہے۔ جو ان اصولوں میں تغیر و تبدل کرتا ہے وہ نقصان اٹھاتا ہے۔

جس طرح زندگی کے خالق نے طبعی زندگی کے لیے اصول دیے ہیں، اسی طرح اس نے انسان کی تمدّنی زندگی کے لیے بھی اصول دیے ہیں۔ یہ اصول بھی اسی طرح غیر متبدل ہیں جس طرح طبعی زندگی سے متعلق اصول۔ تدریجی ارتقاء کا سوال نہ ان میں ہے نہ ان میں، پھر جس طرح طبعی زندگی سے متعلق اصول انسانی ذہن کی پیداوار نہیں اسی طرح اس کی تمدّنی زندگی سے متعلق اصول بھی اس کے ذہن کی پیداوار نہیں ہو سکتے۔ کائنات کی کسی چیز نے بھی اپنے لیے اصول آپ وضع نہیں کئے سب "وحی" کی رُو سے ملے ہیں۔

(iii) محترم مستفسر نے، اشتراکی فلسفہ کی ایک بنیادی کمزوری کو نظر انداز کر دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب (مثلاً) تاریخی وجوب کی رُو سے اب وقت آگیا ہے کہ سابقہ نظام سرمایہ داری کی جگہ اشتراکی نظام دنیا پر مسلط ہو جائے تو اس کے لیے نہ کسی جدوجہد کی ضرورت ہے نہ کدو کاوش کی حاجت۔ "تاریخی وجوب" کی بے پناہ قوت اس جدید نظام کو خود بخود مسلّط کر دے گی۔ دنیا کی کوئی طاقت اس کے دھارے کے سامنے روک بن کر کھڑی نہیں رہ سکتی۔ یہ اسے خس و خاشاک طرح بہا کر لے جائے گی۔

جب صورتِ حال یہ ہے تو پھر اشتراکی ممالک، اشتراکیت کو پھیلانے اور مسلّط کرانے کے لیے اس قدر نعل بر آتش کیوں رہتے ہیں۔ یہ اس قدر پراپیگنڈے کا طوفان، مختلف ممالک میں دہشت پسند جماعتیں، سرمایہ دارانہ نظام کی حامل سلطنتوں کے خلاف سرد اور گرم جنگ کا سلسلہ، اس قدر سپاہ، اتنا عظیم سامانِ جنگ، ایٹمی بم وغیرہ وغیرہ کس مقصد کے لیے ہیں۔ کیا "تاریخی وجوب" اس قدر کمزور ہو چکی ہے کہ اسے ان سہاروں کی ضرورت پڑ رہی ہے۔ اور ضرورت پڑ رہی ہے ان انسانوں کے مقابلے کے لیے جو اشتراکی فلسفہ کے مطابق نہایت بے بس اور مجبور ہیں۔

اس فلسفہ کی دوسری کمزوری یہ ہے کہ (مثلاً) آج کل جدلی جنگ کی رُو سے اشتراکی نظام کے مسلّط ہونے کی باری ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے بعد جب اسی جنگ کے مطابق اشتراکی نظام کی ضد، دوسرے نظام (یعنی نظام سرمایہ داری) کے مسلّط ہونے کی باری آئے گی۔ تو اس وقت اس فلسفہ کے معتقدین کا طرزِ عمل کیا ہوگا؟ ظاہر ہے کہ اس وقت انہیں نظام سرمایہ داری کا حامی ہونا پڑے گا۔ اور اشتراکی نظام کے خلاف وہی کچھ کرنا ہوگا جو کچھ وہ اسوقت نظام سرمایہ داری کے خلاف کر رہے ہیں۔ اس وقت وہ تمام لٹریچر جس میں

نظام سرمایہ داری کو نوعِ انسان کے لیے لعنت قرار دیا گیا ہے، نذرِ آتش کر دینا پڑے گا اور وہ تمام دلائل جو اس وقت نظامِ اشتراکی کے حق میں دئے جاتے ہیں۔ خود ان کی تردید کرنی پڑے گی۔ اس وقت سب سے بڑا سرمایہ دار، سب سے زیادہ مستحقِ تبریک و تہنیت قرار دیا جائے گا۔

پھر اسی نقشہ کو ذرا پیچھے کی طرف الٹیے۔ موجودہ دور سے پہلے، نظامِ سرمایہ داری، تاریخی وجوب کے تقاضے کے عین مطابق تھا سوال یہ ہے کہ آپ اس دور کے سرمایہ پرستوں کو موجبِ لعنت و ملامت کیوں قرار دیتے ہیں ؟ ان کی شان میں قصائد کیوں نہیں لکھتے۔ آپ اس "مذہب" کو "افیون" کیوں قرار دیتے ہیں۔ جو اُس وقت اُس نظام کی تائید کرتا تھا۔

آپ دیکھتے ہیں کہ آپ کا طرزِ عمل کس طرح فلسفۂ وجوبِ تاریخی کے خلاف ہے ؟ اگر آپ اس فلسفہ کو فی الواقعہ سچا سمجھتے ہیں تو آپ کو سابقہ دور کے سرمایہ پرستوں کی مدح میں قصیدے پڑھنے چاہئیں کہ انہوں نے تاریخی وجوب کا ساتھ دیا تھا۔ نیز اس زمانے کے مذہب کو سچا مذہب قرار دینا چاہیئے، جس نے تاریخی وجوب کی تائید کی تھی؛ اسی طرح آپ کو اس دور کے بعد بھی اس مذہب کو حق و صداقت کا مذہب سمجھنا چاہیئے جو نظامِ سرمایہ داری کی تائید کرے۔ کیونکہ اس وقت تاریخی وجوب کا یہی تقاضا ہوگا۔

آپ مذہب پرست طبقہ کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ عقل و فکر سے کام نہیں لیتے، آنکھیں بند کئے اپنے معتقدات پر جمے رہتے ہیں۔ اور جو شخص ان کے خلاف کچھ کہے اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ اس کا نام آپ کے نزدیک مذہبی جنون (FANATICISM) ہے۔ سوال یہ ہے کہ آپ جو مانتے ہیں کہ نظامِ اشتراکیت بہترین نظام ہے تو کیا آپ اس نتیجہ پر عقل و فکر کی رُو سے پہنچے ہیں ؟ ہرگز نہیں۔ یہ محض اتفاق ہے کہ آپ اس دور میں پیدا ہوئے جب تاریخی وجوب کی رُو سے اشتراکی نظام کی باری آئی۔ آپ نے اس نظام کی تائید شروع کر دی۔ اگر آپ چند صدیاں پہلے پیدا ہوتے تو تاریخی وجوب کے معتقد کی حیثیت سے آپ نظامِ سرمایہ داری کو عین حق و صداقت کے مطابق نظام قرار دیتے۔ سوچئے یہ مذہبی جنون نہیں تو اور کیا ہے ؟ اور جنون بھی اس شدت کا کہ جو شخص آپ کے اس عقیدہ سے متفق نہیں آپ اسے زندہ رہنے کا حق تک دینے کے لیے تیار نہیں۔

اسکے مقابلہ میں دینِ خداوندی کو دیکھئے کہ اس نے پہلے دن سے ایک نظام (ربوبیت) کو حق و صداقت کا نظام قرار دیا۔ اور آج تک اسی کو حق و صداقت کا نظام قرار دیئے چلا جاتا ہے اور ہمیشہ تک اسے

ہی حق و صداقت پر مبنی نظام قرار دے گا۔ آپ سوچیئے کہ جو لوگ اس نظام کے موئید ہیں ان کا مؤقف علم و بصیرت اور دلائل و براہین پر مبنی سمجھا جائے گا یا تاریخی وجوب کے معتقدین کا، جنہیں ہر دور میں اپنے سابقہ مؤقف کے خلاف کہنا اور کرنا پڑے گا۔ یہ فرق ہے وحیٔ خداوندی اور انسانی ذہن کے وضع کردہ نظریاتِ حیات میں!

(۷) محترم مستفسر یہ بھی کہتے ہیں کہ اسی قرآن سے پرویز صاحب نظام ربوبیت ثابت کرتے ہیں۔ اور اسی سے مودودی صاحب، نظامِ سرمایہ داری کی تائید لاتے ہیں۔ اس کے بعد وہ ٹھنڈی سانس بھر کر کہتے ہیں کہ:-

خداوندا یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں

محترم مستفسر جس خدا سے پوچھتے ہیں کہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں، اس خدا نے ان سادہ دل بندوں کو پہلے ہی بتا رکھا ہے کہ وہ کدھر جائیں۔ اس نے کہا ہے کہ تم نہ دیکھو کہ پرویز کیا کہتا ہے اور نہ یہ کہ مودودی کیا کہتا ہے؟ میری کتاب "گیت و دیا" نہیں کہ کسی کی سمجھ میں ہی نہ آئے تم اس کتاب کو اپنی عقل و فکر کی رُو سے دیکھو اور سمجھو بات صاف ہو جائے گی۔ اسی سے یہ بات بھی واضح ہو جائے گی کہ مسلمانوں کے ممالک میں اس وقت کیا ہو رہا ہے۔ اور جو کچھ ہو رہا ہے اس کی ذمہ داری قرآن کی تعلیم پر ہے یا انسانوں کے خود ساختہ مذہب پر جسے بدقسمتی سے اسلام کا نام دے دیا گیا ہے۔

(۷) محترم مستفسر نے کہا ہے کہ "ہمیں آگے بڑھنے کے لیے تاریخ کے مادی اصولوں ہی سے راہ نمائی لینی چاہیئے اور اپنے ارد گرد کے حالات سے اور تجربوں سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ نظام ربوبیت تک پہنچنے کے لیے سیدھا راستہ یہی ہے"

ہم سمجھ نہیں سکے کہ اس سے ان کا مطلب کیا ہے؟ یہ بات اگر وہ اس مذہب پرست طبقہ سے کہتے جو نظام سرمایہ داری کو مقدس سمجھتا ہے تو قابلِ فہم ہوتی۔ لیکن نظام ربوبیت کے داعیان سے یہ کہنا، کچھ سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ ہمارا خیال ہے کہ اس سے ان کی مراد وہ چیز ہے جسے وہ اپنے خط کے شروع میں بیان کر چکے ہیں۔ یعنی یہ کہ "نظام ربوبیت سے جو آپ کی غایت ہے وہ بالکل درست ہے۔ لیکن ذرائع حصول میں مجھے اختلاف ہے"۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ان کے نزدیک اس مقصد کے حصول کے ذرائع کیا ہیں۔ نہ ہی ہمیں ایسا فرض کر لینے کا حق حاصل ہے کہ یہ صاحب واقعی

اشتراکی ہیں اس لیے ان کے پیش نظر وہی ذرائع ہیں جنہیں اشتراکی لیڈر اختیار کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ممکن ہے ان کے پیش نظر کوئی اور ذریعہ ہو لیکن جہاں تک اشتراکی نظام کا تعلق ہے' اس کے نزدیک اپنے مقصد کے حصول کے جو ذرائع ہیں وہ ہمارے سامنے ہیں۔ لینن اس باب میں کہتا ہے کہ؛

> ہم ان تمام اخلاقی حدود و شرائع کی مذمت کرتے ہیں جو کسی مافوق الفطرت عقیدہ کا نتیجہ ہوں۔
> ہمارے خیال میں اخلاق کا نظریہ ہمیشہ جماعت کے مفاد کی جنگ کے ماتحت ہونا چاہیئے۔ ہر وہ حربہ جو قدیم غاصبانہ نظام معاشرت کے خلاف اور مزدوروں کی تنظیم کی تائید میں ضروری سمجھا جائے عین اخلاق ہے چنانچہ جماعتی مفاد کی خاطر جرائم کا ارتکاب، دروغ بافی، فریب دہی، عین حق و صداقت ہے"۔

اب رہا طریق کار۔ سو اس کے متعلق لینن لکھتا ہے کہ:۔

> سرمایہ دارانہ نظام حکومت کی جگہ اشتراکی حکومت کا برسر اقتدار آجانا تشدد آمیز انقلاب کے بغیر ناممکن ہے۔ [1]

ظاہر ہے کہ اسلام کی رُو سے ان ذرائع کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقی حدود وہ مستقل اقدار ہیں جنہیں کسی حالت میں بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ اسلام، ذریعہ اور مقصد میں فرق ہی نہیں کرتا۔ اس کے نزدیک غلط راستہ کبھی صحیح منزل تک نہیں پہنچا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ نظام ربوبیت بھی اس کے نزدیک مقصود بالذات نہیں، بلکہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے اور وہ مقصد ہے انسانی ذات کی نشوونما۔ اور انسانی ذات کی نشوونما کی صورت یہ ہے کہ جہاں کوئی مستقل قدر ہاتھ سے چھوٹی، نشوونما رک گئی۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ "زندگی کی بعض ضروریات کے لیے جھوٹ بولنا شرعاً جائز ہی نہیں بلکہ واجب ہے" تو یہ خالص میکیاؤلی سیاست ہے جسے شریعتِ خداوندی سے کوئی واسطہ نہیں۔
باقی رہا تشدد کے ذریعہ انقلاب لانا تو قرآن کی رُو سے، اس طرح فساد تو برپا کیا جا سکتا ہے، انقلاب نہیں لایا جا سکتا۔ اس کے نزدیک خارج میں انقلاب نہیں آسکتا جب تک انسان کے قلب میں انقلاب پیدا نہ ہو، اور قلب میں انقلاب صحیح تعلیم و تربیت کے ذریعہ پیدا ہو سکتا ہے۔ نبی اکرمؐ جو انقلاب لائے تھے تو اس کا ذریعۂ تعلیم کتاب و حکمت ہی تھا۔ اس سے حضورؐ نے اپنی جماعت کے قلب و نگاہ میں ایسا

---

[1] حوالوں کے لیے دیکھئے سلیم کے نام خطوط جلد اوّل۔ آٹھواں خط

انقلاب پیدا کر دیا جس سے ان کی نظروں میں زندگی کی اقدار بدل گئیں۔ تشدد کے ذریعے جس قسم کا انقلاب آتا ہے اس کا مزہ خود روس نے چکھ لیا ہے.........

اسٹالن کا دور، تشدد کا سخت ترین دور تھا، اب روس میں اس دور کے ہیرو اسٹالن کی لاش تک کو اکھاڑ کر پھینک دیا گیا ہے۔ اور اس دور کے تشدد کی ہولناک داستانوں کو بار بار دہرا کر لوگوں کے دل میں اس کے خلاف نفرت و انتقام کے جذبات بھڑکائے جاتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ مادی نظریۂ حیات کی رُو سے، انقلاب کے لیے تشدد کے علاوہ اور کوئی ذریعہ کارگر ہو نہیں سکتا قرآنی نظریۂ زندگی کی رُو سے احترامِ انسانیت، انسانی ذات پر ایمان کا بنیادی تقاضا ہے۔ یہ، ظلم و استبداد کی قوتوں کی دراز دستیوں کو روکنے کے لیے تو قوت کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ نظریہ زندگی کی تبدیلی کے لیے قوت کے استعمال کی اجازت نہیں دیتا۔ اس لیے کہ قوت کے استعمال سے نظریہ میں تبدیلی نہیں آسکتی۔ یہ تبدیلی یقین (CONVICTION) سے آتی ہے اور (CONVICTION) کی بنیاد، دلائل و براہین کی رُو سے دل و دماغ کے اطمینان پر ہے۔ اسی کو قرآن کی اصلاح میں ایمان کہتے ہیں۔ یہی ایمان وہ جذبۂ محرکہ (INCENTIVE) عطا کرتا ہے جو انسان کو اس پر آمادہ کر دیتا ہے کہ وہ خون پسینہ ایک کر کے زیادہ سے زیادہ کمائے اور اس میں سے بقدرِ اپنی ضروریات کے لے کر باقی سب، بطیب خاطر دوسروں کی نشوونما کے لیے دے دے۔ مادی تاریخ، انسان کے اندر اس قسم کا جذبہ پیدا کر ہی نہیں سکتی۔ اور یہی وہ چٹان ہے جس پر اشتراکیت کی کشتی اس بُری طرح ٹوٹی ہے کہ انہیں اس کی شکست و ریخت کو دنیا کی نگاہوں سے پوشیدہ رکھنے کے لیے وہاں آہنی پردے لٹکانے پڑ گئے ہیں۔ اس کے برعکس جب اسلامی نظام قائم ہوتا ہے تو وہ دنیا بھر کے انسانوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اس کے مرکز (کعبہ) میں آئیں۔ (لیشھدوا منافع لھم) اور اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ وہ ان کی نفع بخشیوں کے لیے کیا کچھ کرتا ہے۔

یہ ہے فرق اسلام کے طریق کار اور اشتراکیت کے طریق کار میں۔

(۱۷) محترم مستفسر نے لکھا ہے کہ اس وقت دنیا کے تمام مسلم ممالک، اسلامی نظام کی مخالف سمت کو جا رہے ہیں۔ اس سے یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ اسلامی نظام صحیح نہیں ہو سکتا۔ اس نتیجہ کے اخذ

کرنے کے لیے یہ دلیل جس قدر کمزور ہے وہ ظاہر ہے۔ محترم مستفسر اس سے متفق ہوں گے کہ اس وقت دنیا کی اکثریت، اشتراکی نظام کی مخالف ہے۔ کیا وہ اسے ماننے کے لیے تیار ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اشتراکی نظام صحیح نہیں۔ کسی نظام کے صحیح یا غلط ہونے کی یہ دلیل نہیں کہ کتنے لوگ اس کے موافق ہیں اور کتنے مخالف۔ اس بات کے پرکھنے کا صحیح طریق یہ ہے کہ اس نظام پر علم و بصیرت کی رُو سے غور کیا جائے اور دلائل و براہین کی رُو سے کسی نتیجہ پر پہنچا جاتے۔ قرآن اپنے ہر دعوے کو علیٰ وجہ البصیرت پیش کرتا ہے اور دلائل کی رُو سے منواتا ہے۔ وہ اپنے مخالفین سے بھی یہی کہتا ہے کہ تم اپنے دعوے کی تائید میں دلائل پیش کرو۔ ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن کریم کا پیش کردہ نظام ربوبیت، نوع انسان کی منفعت کا ضامن ہے اور اس کے سوا دنیا کا کوئی نظام یہ نتیجہ نہیں پیدا کر سکتا۔ ہم اپنے اس دعوے کو علم و بصیرت کی رُو سے پیش کرتے ہیں۔ اور اگر کوئی اس سے انکار کرتا ہے تو اس سے ہمارا مطالبہ یہ ہے کہ وہ اپنے دعوے کو علم و بصیرت کی رو سے پیش کرے۔

آخر میں ہم محترم مستفسر کی خدمت میں گذارش کریں گے کہ اسے حسنِ اتفاق سمجھئے کہ اس وقت آپ کے خیال کے مطابق تاریخی وجوب کا تقاضا بھی وہی ہے جس کی طرف قرآن دعوت دیتا ہے۔ سوال اس فلسفۂ زندگی کے اختلاف کا ہے جس پر یہ دونوں نظام متفرع ہیں۔ اگر آپ اس نظام کو قرآنی فلسفۂ زندگی کی رُو سے اختیار کریں گے تو اس سے کم از کم اتنا فائدہ تو ضرور ہو گا کہ کل کو جب، تاریخی وجوب کی اٹل گردش کے مطابق، پھر سے نظام سرمایہ داری کی باری آگئی تو اس وقت آپ کو یہ خفت نہیں اٹھانی پڑے گی کہ جس اشتراکی نظام کو آپ کل تک نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کا ضامن قرار دیتے تھے، اسے نوعِ انسانی کی تباہی و بربادی کا موجب ٹھہرانا پڑے۔ قرآن یہ کبھی نہیں کرے گا کہ جس بات کو وہ آج نوعِ انسان کی منفعت کا موجب بتائے اسے کل کو، انسانیت کی تباہی کا باعث قرار دیدے۔ اس کے اصول ابدی اور غیر متبدل ہیں۔ وہ "تاریخی وجوب" کی گردشِ دولابی سے ہر زمانے میں بدلتے نہیں رہتے۔ اس نکتہ کو ذرا اشتراکی نظام کی تاریخ کی روشنی میں دیکھیے۔ مارکس نے اپنے تصوّر کو ایک عالمگیر نظام کی حیثیت سے پیش کیا اور لینن کے زمانے تک اسے ایسا ہی سمجھا جاتا رہا۔ لیکن اسٹالن نے اس کی عالمگیر حیثیت کو ختم کر کے قومی حیثیت دے دی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب یہ نظام روس کا قومی نظام بن کر رہ گیا۔ اب اس نظام کی جنگ دوسرے نظاموں سے نہیں رہی۔ اب روس کی جنگ دیگر ممالک سے ہوتی ہے۔ یہی

وجہ ہے کہ روس کو انہی سرمایہ دارانہ نظام کے حامل ممالک سے دوستی کے معاہدات کرنے پڑ رہے ہیں۔ جس نظام کے خلاف اشتراکی نظام صدائے احتجاج بن کر اُٹھا تھا اور اس کے خلاف ان ممالک سے تعلقات منقطع کرنے پڑ رہے ہیں، جو خود اشتراکی نظام کے داعی ہیں۔ یہ نتیجہ ہے مستقل اقدار پر ایمان نہ ہونے کا۔ اس کے برعکس قرآن کریم زندگی کا جو نظام پیش کرتا ہے اس کے بنیادی اصول یہ ہیں کہ (۱) ہر انسان، محض انسان ہونے کی حیثیت سے واجب التکریم ہے (۲) نظام وہی حق و صداقت پر مبنی سمجھا جاسکتا ہے جس کے پیشِ نظر کسی خاص ملک، خاص قوم، خاص گروہ اور خاص پارٹی کا مفاد نہ ہو بلکہ پوری کی پوری انسانیت کا مفاد ہو۔ (۳) دنیا میں "اپنوں" اور "بیگانوں" کی تمیز اور تفریق کا معیار یہ ہے کہ جو لوگ قرآنی نظام کی صداقت پر ایمان رکھیں وہ اپنے ہیں، جو اس کے مخالف ہوں وہ بیگانے — خواہ وہ روس کے اشتراکی ہوں یا امریکہ کے جمہوریت نواز۔ (۴) اس نظام کی بنیاد اس ایمان پر ہے کہ زندگی اسی دنیا کی زندگی نہیں۔ موت کے بعد بھی آگے چلتی ہے اور انسان کا ہر ارادہ اور عمل اپنا نتیجہ پیدا کر کے رہتا ہے — خواہ وہ اس زندگی میں سامنے آئے یا اس کے بعد۔ اسی تصور کو بالفاظ دیگر یوں بیان کیا جاتا ہے کہ انسان اپنے ہر عمل بلکہ ہر ارادہ تک کے لیے خدا کے سامنے جواب دہ ہے۔

یہ اصول غیر متبدل ہیں۔ اور کسی دور کے کسی "اسٹالن" کو اس کا اختیار نہیں کہ ان میں کسی قسم کی تبدیلی کر سکے۔ ہم پوچھنا چاہتے ہیں جناب مستفسر سے کہ کیا نوعِ انسان کے امن و فلاح کا ضامن اس قسم کا نظام ہو سکتا ہے یا اشتراکی نظام! (جنوری ۱۹۶۴ء)

---

(۳) کیا سود لینا جائز ہے

ہمارے ہاں ایک عرصہ سے یہ مسئلہ زیرِ بحث ہے کہ کیا بنک کا سود جائز ہے۔ اسی سلسلے میں یہ سوال سامنے آگیا کہ سود (ربو) کہتے کسے ہیں۔ اسلامک ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کراچی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے اس موضوع پر ایک مبسوط مقالہ لکھا جو ماہنامہ فکر و نظر کی نومبر ۱۹۶۳ء کی اشاعت میں شائع ہوا۔ اس میں انہوں نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ

قرآن کریم کی رو سے ربوا کی صرف وہ شکل حرام ہے جو اضعافاً مضعفہ ہو جائے۔ اس پر طلوع اسلام نے ایک تبصرہ لکھا۔ جس میں بتایا کہ ڈاکٹر صاحب جس نتیجے پر پہنچے ہیں وہ صحیح نہیں۔ اور اس کے ساتھ ہی اس امر کی وضاحت کی کہ قرآن کی رُو سے ربوا کسے کہتے ہیں۔ وہ تبصرہ حسب ذیل ہے:۔

طلوع اسلام کا تبصرہ

محترم ڈاکٹر صاحب کا یہ مقالہ بڑی تحقیق اور کاوش سے لکھا گیا ہے۔ جس کے لیے ہم انہیں مستحق مبارکباد سمجھتے ہیں۔ لیکن حیرت ہے کہ قرآن کی رُو سے ربٰو کی واضح تعریف، جو ان کے بالکل سامنے پڑی تھی ان کی نگاہوں سے اوجھل رہی جس کی وجہ سے وہ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے کہ قرآن نے صرف (مروجہ الفاظ میں) سود در سود یا سود مرکب) کو حرام قرار دیا ہے۔ سادہ سود کو نہیں۔

قرآن کی رُو سے ربٰو کی تعریف قرآن کی رُو سے ربٰو کی جامع اور مانع تعریف ان چار الفاظ کے اندر موجود ہے جو سورۂ بقرہ کی آیت ۲۷۹ میں آئے ہیں اور جنہیں ڈاکٹر صاحب نے بھی درج کیا ہے یعنی

وَ إِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ

اگر تم توبہ کرو تو تمہارے لیے تمہارا راس المال ہے۔

سابقہ آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر تم ربٰو لینے سے باز نہ آئے تو اسے خدا اور رسول کے خلاف بغاوت سمجھا جائے گا۔ اس کے بعد مندرجہ بالا آیت میں کہا ہے کہ اگر تم ربٰو لینے سے باز آجاؤ اور توبہ کرو تو تم اپنا اصل زر واپس لے لو اس کے بعد ہے۔ لَا تَظْلِمُوْنَ وَلَا تُظْلَمُوْنَ (۲/۲۷۹) اس سے نہ تم کسی پر ظلم کرو گے نہ تم پر ظلم ہوگا۔ اس سے واضح ہے کہ:۔

(۱) اگر صرف اصل زر واپس لیا جائے تو اس سے مقروض پر ظلم نہیں ہوتا۔

(۲) اگر اصل زر سے کچھ بھی زیادہ لیا جائے یہ مقروض پر ظلم ہوگا۔ اسی کا نام ربٰو ہے۔ یعنی زرِ اصل سے کچھ بھی زیادہ لینا۔ کہیے کہ اس میں کوئی الجھاؤ۔ کسی قسم کا التباس۔ کوئی شک و شبہ کوئی دشواری یا مشکل ہے؟

۲۔ ڈاکٹر صاحب نے جو یہ کہا ہے کہ سود در سود (سود مرکب) تو حرام ہے لیکن سود مفرد حرام نہیں، تو یہ نتیجہ بوجوہ غلط ہے۔ یہ نتیجہ انہوں نے حسب ذیل آیت سے نکالا ہے:۔

یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْکُلُوا الرِّبٰوا اَضْعَافاً مُّضٰعَفَۃً (۳/۱۳۰)۔

اس کا ترجمہ انہوں نے کیا ہے:۔

اے ایمان والو! یہ دو چند سہ چند ہونے والا ربٰو کھانا چھوڑ دو۔ امام راغب نے کہا ہے کہ اس آیت میں "مُضَاعَفَۃً" دراصل ضَعُفَ سے ہے جس کے معنی "کم کرنے" کے ہیں۔ ضِعفٌ سے نہیں جس کے معنی بڑھانے کے ہیں۔ لہذا آیت کے معنی یہ ہیں کہ ربٰو، جسے تم سمجھ رہے ہو کہ اپنے روپے کو بڑھانا ہے، بڑھاتا نہیں بلکہ درحقیقت (ضَعُفَ) کم کرتا ہے۔ ربٰو سے معاشرہ کی دولت کم ہوتی ہے۔ اور سود خور کی کمانے کی صلاحیتوں اور قوتوں میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ اس سے قومی معیشت بہت گھٹ جاتی ہے۔ بڑھتی نہیں۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کے لیے کسی دلیل اور شہادت کی ضرورت نہیں۔ ربٰو سے افراد کی کمانے کی صلاحیتیں مفلوج ہو جاتی ہیں۔ اور قومی دولت میں کمی آجاتی ہے۔

لیکن اگر اضعافًا مُّضٰعَفَۃً" کے معنی "دو چند۔ سہ چند" بھی لئے جائیں تو بھی اس کا مطلب یہ نہیں ہوگا۔ کہ قرآن کریم صرف مرکب سود (ربٰو) کو حرام قرار دیتا ہے۔ مفرد ربٰوا کو جائز ٹھہراتا ہے قرآن کا

قرآن کا انداز

انداز یہ ہے کہ وہ ممنوع چیزوں کی شدید ترین شکل کو سامنے لا کر ان سے باز رہنے کا حکم دیتا ہے۔ اس سے اس کا مقصد ان چیزوں کی ہر شکل سے اجتناب ہوتا ہے۔ مثلاً سورۂ حج میں ہے کہ وَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (۲۲/۳۰) "تم بتوں کی گندگی سے بچو"۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم صرف بتوں کی گندگی سے بچو اور باقی ہر قسم کی گندگی سے بے شک ملوث ہوتے رہو۔ یا سورۂ بقرہ میں ہے۔

فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِی الْحَجِّ (۲/۱۹۷)۔

حج میں، فحش کلامی۔ گناہ کے کام۔ اور لڑائی جھگڑا مت کرو۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ ان باتوں سے صرف حج کے ایام میں باز رہو۔ سال کے باقی حصوں میں یا دوسرے مقامات پر یہ سب کچھ کرتے رہو۔ ظاہر ہے کہ حیائی اور گناہ کی باتیں بہر حال ناجائز ہیں۔ ان کی کسی حالت اور کسی وقت میں بھی اجازت نہیں۔ قرآن

نے حج کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا کہ ایسے اجتماع میں ان امور شنیعہ سے اجتناب اشد ضروری ہے
یا اس لیے کہ اس زمانے میں لوگ حج کے اجتماع میں بھی ان باتوں سے باز نہیں آتے ہوں گے۔
دونوں صورتوں میں مفہوم یہ ہے کہ یہ باتیں ہر حال میں معیوب اور ناپسندیدہ ہیں۔ لیکن ان اجتماعات
میں ان سے اجتناب اور بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ یہی صورت اضعافاً مضٰعفۃ کی ہے۔ یعنی ربوٰ تو
ہر شکل میں ناجائز ہے لیکن جب وہ مرکب سود کی شکل اختیار کر جائے تو وہ اور بھی زیادہ شدید طور پر
خطرناک ہو جاتا ہے۔ اگر (جیسا کہ ڈاکٹر صاحب نے سمجھا ہے) ممانعت صرف سود مرکب کی ہوتی تو
سورۂ بقرہ کی جس آیت میں کہا گیا ہے کہ اگر تم توبہ کرو تو تمھارے لیے صرف اصل زر واپس لینا
جائز ہے۔ وہاں یہ کہنا چاہیئے تھا کہ تم اصل زر کے ساتھ اتنا اور لے سکتے ہو جتنا سود مفرد کے
حساب سے بنتا ہے۔ اس سے مقروض پر ظلم نہیں ہوگا لیکن قرآن نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے صرف
اصل زر واپس لینے کی اجازت دی ہے۔ اس پر ایک پائی بھی زیادہ لی جائے گی تو وہ ظلم ہوگا۔ اسی
طرح اس سے پہلی آیت میں جو اس نے کہا ہے کہ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا (۲/۲۷۸) "جو ربوٰ تم
نے ابھی تک وصول نہیں کیا اسے چھوڑ دو" تو ڈاکٹر صاحب کے قول کے مطابق کہنا یہ چاہیئے تھا
کہ سود مفرد کے حساب سے جس قدر رقم بنتی ہے اسے مجرا لیکر بقایا چھوڑ دو۔ قرآن نے ایسا نہیں کہا
اس سے بھی واضح ہے کہ اس کے نزدیک مطلق ربوٰ حرام ہے۔

قرآن کی رُو سے ربوٰ کے معنی ہوئے، اصل زر سے کچھ زیادہ لینا۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ
خیال کیا جاتا ہے کہ اس زیادتی کا تعلق صرف قرض کے معاملات سے ہے۔ یہ صحیح نہیں۔ یہ ایک جامع
اصول ہے اور قرآنی نظامِ معیشت کی پوری عمارت اسی بنیاد پر اٹھتی ہے۔ اصل سوال یہ ہے کہ کیا
معاوضہ، محنت (LABOUR) کا ہے یا سرمایہ (CAPITAL) کا بھی۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے

معاوضہ کس چیز کا جائز ہے

کہ لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى۔ (۵۳/۳۹) انسان صرف
اپنی محنت کے معاوضہ کا حقدار ہے۔ سرمایہ کوئی ایسی چیز نہیں جس کا معاوضہ طلب کیا جائے۔ لہٰذا
لین دین کے جس معاملہ میں محنت کے بغیر محض سرمایہ کا معاوضہ لیا جائے، خواہ اس کی شکل کوئی بھی

کیوں نہ ہو۔ وہ ربوٰ ہے۔ قرآن کریم کی رُو سے حرام ہے۔ اور خدا اور رسول کے خلاف اعلانِ جنگ کے مترادف۔ آپ غور کیجئے کہ ایک کاشتکار آپ سے ایک ہزار روپیہ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ ایک قطعہ اراضی خرید

ربوا کی مختلف شکلیں

کر اس میں کاشت کرے اور اس کی آمدنی سے اپنا پیٹ بھی پالے اور آہستہ آہستہ آپ کا قرضہ بھی ادا کرے۔ آپ اسے ایک ہزار روپیہ قرض نہیں دیتے لیکن اسی روپے سے وہ قطعہ اراضی خرید کر اسے بٹائی یا پٹہ پر دے دیتے ہیں۔ وہ اس میں سال بھر محنت کر کے فصل بوتا ہے اور اس میں سے نصف پیداوار آپ لے جاتے ہیں۔ یہ ہر سال ہوتا ہے اور اس کے باوجود آپ کا قرض اس کے ذمہ بدستور باقی رہتا ہے کیا یہ ربوٰ نہیں ؟

یا ایک دکان دار آپ سے کچھ قرض مانگتا ہے تاکہ وہ اس سے اپنے روزگار میں کچھ اضافہ کر سکے۔ آپ اسے روپیہ دے دیتے ہیں لیکن بطور قرض نہیں بلکہ بطور حصہ دار۔ وہ دن رات کی محنت شاقہ سے کاروبار کرتا ہے لیکن اس کے منافع میں آپ برابر کے شریک ہو جاتے ہیں وہ آپ کو منافع کا حصہ دیئے چلا جاتا ہے لیکن آپ کا اصل زر اس کے ذمہ بدستور باقی رہتا ہے۔ کیا یہ ربوٰ نہیں ؟

یا آپ اس کاروباری آدمی کو براہ راست قرض نہیں دیتے۔ آپ اپنا روپیہ بنک میں جمع کر دیتے ہیں اور بنک والے اس روپے کو بطور قرض، اس کاروباری آدمی کو دے دیتے ہیں۔ وہ اس قرض پر جو سود ادا کرتا ہے اس میں سے ایک متعین حصہ آپ کو ملتا رہتا ہے۔ اور آپ کا اصل زر بنک کے پاس محفوظ رہتا ہے۔ کیا یہ ربوٰ نہیں ؟ یہ سب ربوٰ ہے اور قرآن کی رُو سے ناجائز۔ خواہ اسے سود مفرد کے حساب سے شمار کیا جائے یا سود مرکب کے حساب سے۔

جو کچھ ہم لیتے ہیں

آپ غور کیجئے تو بادنیٰ تعمق یہ حقیقت سمجھ میں آجائے گی کہ جو کچھ ہم دوسروں سے لیتے ہیں اس کی مختلف شکلیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً

(۱) عطیہ۔ اس میں نہ محنت کرنی پڑتی ہے نہ سرمایہ لگانا پڑتا ہے۔ دینے والا اسے واپس لینے کے خیال کے بغیر تحفتہً دیتا ہے۔ لہذا اسے لین دین کی مد میں شمار نہیں کیا جا سکتا۔ یہی صورت اس "صدقہ" کی ہے جسے کسی ضرورت مند کی مدد کے لیے حسبۃً للہ دیا جاتا ہے۔

قرآن کی رُو سے وہ ضرورت مند اس امداد کو معاشرہ سے بطور اپنے حق کے طلب کر سکتا ہے۔ اس لیے اس میں بھی لین دین کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(۲) اُجرت۔ یہ محنت کا معاوضہ ہوتا ہے اس میں سرمایہ کچھ نہیں لگایا جاتا۔

(۳) ربٰو۔ اس میں دوسرے کو سرمایہ دیا جاتا ہے اور اس سرمایہ پر اصل سے زائد وصول کیا جاتا ہے۔ سرمایہ دینے والا، محنت نہیں کرتا۔ بلکہ دوسرے کی محنت کا ایک حصہ وصول کر لیتا ہے۔

(۴) منافع (تجارت میں)۔ اس میں سرمایہ بھی لگایا جاتا ہے۔ اور محنت بھی کی جاتی ہے۔

(۵) قمار (جُوا) س میں نہ سرمایہ لگایا جاتا ہے نہ محنت کی جاتی ہے۔ (شقِ اول کو چھوڑ کر) آپ باقی شکلوں کو دیکھیے جہاں معاوضہ محنت کا نہیں، اسے قرآن جائز قرار نہیں دیتا۔ اسکا اصول یہ ہے کہ معاوضہ محنت کا ہے۔ چونکہ یہ اصول لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل تھا اس لیے

معاوضہ محنت کا ہے

ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی تھی کہ بیع کے منافع اور ربٰو میں کیا فرق ہے؟ ایک شخص سو روپے کی چیز خرید کر ایک سو دس روپے میں بیچتا ہے اسے دس روپے اصل زر سے زائد وصول ہو جاتے ہیں۔ دوسرا شخص کسی کو سو روپیہ قرض دے کر اس سے ایک سو دس روپے وصول کرتا ہے اس سے اُسے بھی دس روپے اصل زر سے زیادہ ملتے ہیں۔ وہ کہتے تھے کہ جب یہ دونوں، اصل زر پر زائد ہیں تو ان میں فرق کیا ہے؟

ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا (۲/۲۷۵) وہ بیع اور ربٰو کو ایک جیسا سمجھتے تھے لیکن قرآن کریم نے کہا کہ یہ ان کی بھول ہے۔ یہ دونوں ایک نوعیت کا معاملہ نہیں۔ بیع میں سرمایہ اور محنت دونوں صرف ہوتے ہیں۔ سرمایہ کے بدلے میں سرمایہ واپس آ جاتا ہے اور دکان دار کو اس کی محنت کا معاوضہ، سرمایہ کے علاوہ ملتا ہے، یہ

بیع اور ربٰو میں فرق

حلال ہے کیونکہ یہ اس کی محنت کا معاوضہ ہے۔ لیکن ربٰو میں صرف سرمایہ لگتا ہے۔ محنت کچھ صرف نہیں ہوتی۔ لہٰذا اس میں جو کچھ زائد ملتا ہے وہ سرمایہ کا معاوضہ ہے۔ جو حرام ہے۔ اس لیے کہ قرآن کریم کی رُو سے اصول یہ ہے کہ :-

(۱) محنت کا معاوضہ لینا حلال ہے اور

(۲) سرمایہ پر زائد لینا حرام۔

اگر تجارت میں بھی کوئی شخص، اپنی محنت سے زائد منافع لیتا ہے۔ تو وہ ربٰو ہے۔ کیونکہ یہ سرمایہ کا معاوضہ ہوگا۔ محنت کا نہیں۔ اس بات کا تعین معاشرہ کرے گا کہ اس شخص کی محنت کا معاوضہ کیا ہونا چاہیئے۔ وہ اس معاوضہ سے زیادہ منافع نہیں لے سکتا۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ بیع (تجارت) میں انسان (RISK) لیتا ہے یعنی اس میں نفع اور نقصان دونوں کا احتمال ہوتا ہے۔ اور ربٰو میں (RISK) نہیں ہوتا۔ لیکن حلت اور حرمت کے لیئے یہ معیارِ تفریق صحیح نہیں۔ اگر کسی آمدنی کو حلال قرار دینے کی شرط (RISK) ہی ہو تو جوا عین حلال ہونا چاہیئے۔ کیونکہ اس میں تو ہر داؤ میں (RISK) ہوتا ہے۔ بیع اور ربٰو میں فرق وہی ہے جسے اوپر بیان کیا گیا ہے۔ بیع میں راس المال + محنت کا معاوضہ واپس ملتا ہے۔ اور ربٰو میں صرف راس المال کا معاوضہ ملتا ہے۔ محنت کا معاوضہ حلال ہے۔ راس المال کا معاوضہ حرام۔

دشواریاں کیوں پیش آتی ہیں؟

آپ نے غور فرمایا کہ قرآن کریم کی رُو سے ربٰو کا مسئلہ کس قدر آسانی سے سمجھ میں آجاتا ہے۔ اس میں جو دشواریاں آج کل پیش آرہی ہیں، ان کی وجہ یہ ہے کہ:۔

(۱) ربٰو کی بہت سی شکلیں ایسی ہیں جنہیں قرآن کریم حرام قرار دیتا ہے۔ لیکن (بدقسمتی سے) ہماری مروجہ شریعت اسے حلال قرار دیتی ہے۔ (مثلاً زمین کی بٹائی یا مضاربت۔ یعنی کاروبار میں ایسی شراکت جس میں ایک پارٹی محض سرمایہ پر منافع وصول کرتی ہے۔ یا تجارت میں جس قدر بھی منافع لیا جاسکے وغیرہ) ہمارے ارباب شریعت اسے برداشت ہی نہیں کرسکتے کہ وہ اپنی غلطی کو تسلیم کرلیں۔ اس لیے وہ ربٰو کی تعریف ایسی کریں گے جس کی رُو سے یہ شکلیں ربٰو کی شق میں نہ آسکیں۔

(۲) سرمایہ دار طبقہ، بلامحنت روپیہ حاصل کرنے کا اس قدر خوگر ہوچکا ہے کہ محنت کے تصور سے انہیں پسینہ آجاتا ہے اس لیے وہ ربٰو کے قرآنی تصور کی طرف آنا ہی نہیں چاہتے۔

(۳) اور سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا موجودہ معاشی نظام غیر قرآنی ہے۔ بجائے اس کے کہ ہم اس نظام کو قرآنی نظام سے بدلیں، چاہتے یہ ہیں کہ اس میں پیوند لگا کر اپنے آپ کو دھوکا دے لیں کہ یہ قرآنی ہوگیا ہے۔

پیوند سازی سے کام نہیں چلے گا

لیکن وہ پیوند اصل کے ساتھ فٹ نہیں بیٹھتا۔ اس لیے ہم کوشش یہ کرتے ہیں کہ اس میں کچھ کتر بیونت کرکے اسے کسی نہ کسی طرح اصل کے ساتھ چپکا دیا جائے۔ لیکن یہ کوشش

کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ قرآنی نظام ایک غیر منقسم وحدت ہے۔ اس میں غیر قرآنی پیوند کبھی فٹ بیٹھ ہی نہیں سکتا۔ قرآن کے معاشی نظام کی رُو سے:۔

(ا) زمین ذریعہ رزق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے (ہوا۔ پانی۔ روشنی کی طرح) نوع انسان کی پرورش کے لیے بلا مزد و معاوضہ عطا کیا ہے۔ اس پر ذاتی ملکیت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ اُمت کی تحویل میں رہے گی۔ تاکہ وہ اس سے تمام افراد کو رزق پہنچانے کا انتظام کرے۔ زمین سے مراد ہے ہر وہ چیز جو زمین سے برآمد ہو۔ اس میں اناج اور مصنوعات کے لیے خام مسالہ سب آجاتے ہیں۔

(ب) اس نظام میں کسی کے پاس ضرورت سے زیادہ دولت (SURPLUS MONEY) رہ نہیں سکتی۔ اس لئے افراد کے لیے جائدادیں کھڑی کرنے یا ویسے ہی روپیہ (INVEST) کرنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

(ج) اس میں تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری نظام پر عائد ہوتی ہے۔ اس لیے کسی کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے کسی کا دست نگر نہیں ہونا پڑتا۔ لہٰذا اس میں سودی لین دین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

(د) حتیٰ کہ اس میں انفرادی تجارت کا بھی سوال نہیں پیدا ہوتا۔ اس میں دکاندار اشیائے ضروریات تقسیم کرنے کی ایجنسی ہوگا اسے نفع اندوزی کا ذریعہ نہیں بنایا جائے گا۔ اس کی محنت کا معاوضہ نظام کی طرف سے ملے گا۔ آپ نے غور فرمایا کہ اس نظام میں ربوٰ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ ربوٰ سود کا نام نہیں۔ یہ ترجمان ہے اس معاشی نظام کا جو قرآن کے معاشی نظام کی یکسر ضد ہے۔

دو متضاد نظام

قرآنی نظام میں ہر فرد زیادہ سے زیادہ محنت کرکے، کم از کم اپنے پاس رکھ کر زیادہ سے زیادہ دوسروں کو دیتا ہے غیر قرآنی نظام میں، ہر فرد کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ محنت دوسرے کریں اور اسے بلا محنت زیادہ سے زیادہ ملتا جائے۔ یہ دونوں نظام اس قدر ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ قرآن نے اس نظام کو "خدا اور رسولؐ کے خلاف اعلان جنگ" قرار دیا ہے یہ نظام فی الواقعہ قرآنی نظام سے بغاوت ہے۔ اب اس کے بعد آپ سوچئے کہ کیا یہ کسی طرح ممکن ہے کہ ہمارا نظام تو غیر قرآنی رہے اور ہم اس کے اندر رہتے ہوئے ربوٰ کا مسئلہ کا کوئی اطمینان بخش حل تلاش کرلیں۔ اسی قسم کی کوشش ہم نے

اس سے پہلے اپنے جاگیرداری اور زمینداری دور (عہد عباسیہ) میں کی تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے زمین کی بٹائی۔ مضاربت، تجارت میں غیر محدود منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب دے لیا۔ جو کوشش اب ہو رہی ہے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم بینکوں کے سود یا صنعتی اداروں کے حصوں پر منافع وغیرہ کو جائز قرار دے کر اپنے آپ کو فریب در فریب میں مبتلا کر لیں گے۔

بینکوں کے سود کی مخالفت

بینکوں کے سود وغیرہ کے سلسلے میں اس وقت جو مخالفت قدامت پرست طبقہ کی طرف سے ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ نہیں کہ یہ حضرات اسے اسلامی نظام معیشت کے خلاف پاتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ بینکوں کے سود کا مسئلہ اس وقت موجود نہیں تھا جب ہماری فقہ مرتب ہوئی ہے۔ اسے اب "جائز" کی فہرست میں داخل کرنا ان کے نزدیک "بدعت" ہے۔ اگر یہ شکل اس وقت موجود ہوتی تو جس طرح زمین کی بٹائی اور مضاربت وغیرہ جائز قرار دے دی گئی تھیں، ممکن ہے یہ بھی اسی فہرست میں شامل ہو جاتا۔ بینک کا سود تو بٹائی وغیرہ کے مقابلے میں استحصال (EXPLOITATION) کی بہت نرم شکل ہے۔

اشتراکیت کی آڑ

لیکن اس سلسلے میں سب سے بڑی دشواری ایک اور ہے اور وہ یہ کہ ہمارے زمانے میں اشتراکیت (کمیونزم) نے ایک ایسے نظام کی طرح ڈالی ہے جو نظام سرمایہ داری کی ضد ہے۔ اور چونکہ قرآنی نظام بھی سرمایہ داری کی ضد ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اشتراکی نظام اور اسلامی نظام کی بعض جزئیات کی باہمی مماثلت (یعنی ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہونا) فطری ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی یہ بھی حقیقت ہے کہ اشتراکی فلسفۂ زندگی اسلامی فلسفۂ حیات کی ضد ہے[1]۔ اس چیز کو ہمارا قدامت پرست مذہبی طبقہ ایک مؤثر حربہ کے طور پر استعمال کرتا ہے۔ تفصیل اس اجمال کی یوں ہے کہ:-

(۱) مذہبی پیشوائیت اور نظام سرمایہ داری کا گٹھ جوڑ شروع سے چلا آرہا ہے۔ مذہبی پیشوائیت بجائے خویش، نظام سرمایہ داری ہی کی ایک شاخ ہے۔ نظام سرمایہ داری کی اصل و بنیاد یہ ہے کہ محنت کئے بغیر دولت حاصل ہو جائے۔ محنت نہ مذہبی پیشوا کرتے ہیں، نہ سرمایہ دار، سرمایہ دار تو

---

[1] اس نکتہ کی وضاحت سابقہ عنوان میں کی جا چکی ہے۔

پھر بھی روپیہ لگا کر روپیہ حاصل کرتے ہیں، مذہبی پیشوا بغیر روپیہ لگائے دوسروں کی کمائی بٹور لیتے ہیں۔ یہ سرمایہ داری کی شدید ترین شکل ہے۔ لہٰذا مذہبی پیشوائیت کی طرف سے قرآنی نظام معاشی کی مخالفت فطری امر ہے۔

(۲) لیکن ان میں اتنی جرأت ہے نہیں کہ یہ کھلے بندوں قرآنی نظام کی مخالفت کریں۔ نہ ہی ان کے پاس ایسے دلائل ہیں جن کی رُو سے یہ اس نظام کو خلاف اسلام قرار دے سکیں۔ لہٰذا یہ کرتے یہ ہیں کہ

(۳) جوں ہی کسی نے قرآن کے معاشی نظام کا ذکر کیا انہوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ یہ کمیونسٹ ہے۔ اور چونکہ (جیسا کہ اوپر بتایا گیا ہے) قرآنی نظام اور اشتراکی نظام کی بعض جزئیات میں مماثلت ہے۔ اس لیے عوام اور سطح بین پڑھے لکھے لوگ فوراً ان کے فریب میں آ جاتے ہیں۔ اور ایسا کہنے والے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ چنانچہ ان کے اس پراپیگنڈے کا اثر یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ سینے میں درد مند دل رکھنے والے لوگ یہ کہتے ہوئے بھی ڈرتے ہیں کہ ملک میں بھوک اور افلاس کا علاج ہونا چاہیئے کہ مبادا وہ کمیونسٹ نہ ٹھہرا دیے جائیں۔ قرآنی نظام کی مخالفت کے لیے، مذہبی پیشوائیت کا یہ حربہ بڑا کارگر ثابت ہو رہا ہے۔ عوام کی نگاہیں ظاہر بیں ہوتی ہیں۔ انہیں یہ سمجھانا مشکل ہو جاتا ہے کہ اسلام کے معاشی نظام اور اشتراکیت کے معاشی نظام کی بعض جزئیات میں مماثلت ہے۔ ان جزئیات کو پیش کرنے والا ضرور نہیں کہ اشتراکی ہو۔ وہ سچا مسلمان بھی ہو سکتا ہے۔ بنیادی فرق، اسلام کے فلسفۂ زندگی اور اشتراکی فلسفۂ حیات میں ہے۔ اشتراکی فلسفۂ حیات کا ماننے والا بیشک مسلمان نہیں ہو سکتا۔ اگر اسلام کے معاشی نظام اور اشتراکیت کے معاشی نظام کے کسی جزء کا باہمدگر مماثل ہونا، اسلامی نظام کے پیش کرنے والے کو کمیونسٹ بنا دیتا ہے تو اس اعتبار سے ہمارے تمام علمائے کرام کمیونسٹ ہیں۔ اس لیے کہ کمیونزم میں بھی سود ناجائز ہے اور یہ حضرات بھی سود کو ناجائز قرار دے دیتے ہیں۔ اس سے یہ حضرات تو کمیونسٹ قرار نہیں پاتے لیکن اگر کوئی شخص یہ کہہ دے کہ زمین پر ذاتی ملکیت نہیں ہو سکتی تو وہ ان حضرات کے نزدیک فوراً کمیونسٹ قرار پا جائے گا۔ اس لیے نہیں کہ زمین پر ذاتی ملکیت کی نفی اسلام کے خلاف ہے۔ بلکہ اس لیے کہ یہ حضرات اس پر ذاتی ملکیت کر جائز سمجھتے ہیں۔

یہ ہے سب سے بڑی دشواری جو اس وقت ان مسائل کے صحیح حل کے راستے میں حائل ہو رہی ہے۔

اسلام اور اشتراکیت اگر اسلام اور اشتراکیت کے نظریہ ہائے حیات کے فرق کو پیش نظر رکھ کر ان کے معاشی نظاموں کا مطالعہ کیا جائے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے جب سر فرانس ینگ ہسبنڈ کو لکھا تھا کہ

اشتراکیت کا معاشی نظام + خدا = اسلام

تو اس سے ان کی یہی مراد تھی اور جب انہوں نے قائد اعظم سے کہا تھا کہ ہندو اگر اشتراکی نظام معیشت کو اپناتا ہے تو اسے ہندومت سے ہاتھ دھونے پڑتے ہیں۔ لیکن اگر مسلمان اسے اپناتا ہے تو اس کا یہ اقدام اس خالص اسلام کی طرف جانے کے مترادف ہو گا۔ جو چودہ سو سال پہلے ظہور میں آیا تھا۔ تو اس سے بھی ان کا یہی مطلب تھا۔

معاشی نظام اور فلسفۂ زندگی کے فرق کو نظر انداز کر دینے کا نتیجہ ہے کہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب کو یہ کہنا پڑا کہ:۔

" اگر ہم نے اشتراکی نظام معیشت اختیار کیا تو اس کی پابندیاں اور اس کا جبر بھی قبول کرنا ہو گا جس کے لیے شاید ہم میں سے اکثر تیار نہ ہوں "۔

یہ " جبر " اشتراکی فلسفۂ زندگی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اگر اس نظام کو اسلامی فلسفۂ زندگی کے تابع اختیار کیا جائے تو اس میں جبر و استبداد کا شائبہ تک نہیں ہو سکتا۔ اس کی عمارت انسانی ذات، اُسے نشو و نما دینے والی مستقل اقدار، قانون مکافاتِ عمل اور اُخروی حیات پر ایمان کی بنیادوں پر اٹھتی ہے اور ایمان میں جبر و اکراہ کا کوئی سوال نہیں ہوتا۔ وہ دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے۔ اسی ایمان کے تصور کا فقدان ہے جس سے اشتراکیت اور جبر و تشدد لازم و ملزوم ہو جاتے ہیں۔

اسلام میں جبر نہیں اشتراکیت خدا کے معنی یہ ہیں کہ اس معاشی نظام کو وحیٔ خداوندی کی بنیادوں پر استوار اور ایمان کے ذریعہ قبول اور اختیار کیا جائے۔ اس سے وہ " جذبۂ معاونت " پیدا ہوتا ہے جسے ڈاکٹر فضل الرحمٰن صاحب نے نظام سرمایہ داری کو کالعدم کر دینے کے لیے بنیادی شرط قرار دیا ہے۔

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس کی روشنی میں ہمارے نزدیک ہمارے معاشی مسائل کے حل کا طریق یہ نہیں کہ کبھی ملکیت زمین کے سوال کو زیر بحث لے آئے اور کبھی بینک کاری پر گفتگو

کرنے کا کام | کرنے لگ گئے۔ اس کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ سب سے پہلے:۔

یہ متعین کیا جائے کہ اسلام کا معاشی نظام ہے کیا۔

یہ کام ہمارے قدامت پرست طبقہ کے بس کا نہیں۔ اس لیے کہ:۔

(۱) ان کے نزدیک وہ معاشی نظام جو عباسی ملوکیت کے زمانے میں مرتب ہوا تھا عین اسلامی نظام ہے۔

(۲) ان کی ذہنیت یہ قرار پا چکی ہے کہ جو بات اسلام کے نام سے متعارف ہو کر چلی آرہی ہے اس پر نظر ثانی نہیں کی جا سکتی۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ

(۳) ان کے نزدیک قرآن کریم، دین میں واحد اور آخری سند نہیں۔

یہ کام ان لوگوں کے کرنے کا ہے جو قرآن کریم کو آخری سند اور حجت تسلیم کریں اور عصر حاضر کے اقتصادی تقاضوں پر ان کی نگاہ ہو۔

جب اس طرح پہلے یہ متعین ہو جائے۔ کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے تو اس کے بعد یہ دیکھا جائے کہ ہم اپنے موجودہ نظام سے، اسلامی نظام تک کس طرح تدریجاً پہنچ سکتے ہیں۔ یعنی پہلے منزل کا تعین کر لیا جائے اور اس کے بعد اس تک بتدریج پہنچنے کے طریق و وسائل پر غور کر کے چلنا شروع کر دیا جائے۔ اس کے لیے ضروری ہو گا کہ اسلامی نظام اور اس کی حکمت بالغہ۔ اس کی انفرادیت اور اس کے بے مثل و بے نظیر ہونے کے دعوے کی صداقت کو تعلیم کے ذریعے آنے والی نسلوں کے دل و دماغ میں اسطرح جاگزیں کیا جائے کہ اس کا مطالبہ ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے اور وہ اس کے مطابق زندگی بسر کرنے کے لیے اس طرح مضطرب و بے تاب ہوں جس طرح مچھلی پانی میں جانے کے لیے بے قرار ہوتی ہے۔

اگر ایسا نہ کیا گیا اور ہم ان مسائل کو فرداً فرداً لے کر انہیں اسی طرح بحث و نظر کا موضوع بناتے رہے جس طرح اب تک بناتے چلے آرہے ہیں۔ تو اس کا نتیجہ، اس کے سوا کچھ نہیں ہو گا کہ ہم اپنے وقت اور توانائیوں کو ضائع کرتے رہیں۔ ان لوگوں کی طرح جن کے متعلق کہا گیا ہے کہ

فحبطت اعمالهم فلا نقيم لهم يوم القيمة وزنا........

ویحسبون انھم یحسنون صُنعاً۔ (۱۰۴-۱۰۵/۱۸)

اور اصل مسئلہ جوں کا توں رہے۔ بنک کے سود کے مسئلہ ہی کو لیجیے۔ اگر آپ اس سود کو جائز قرار دیتے ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ "بے محنت کی کمائی" کی اس فہرست میں ایک اور شق کا اضافہ کر دیتے ہیں جو قرآنی اصولِ معیشت کے علی الرغم ہمارے ہاں پہلے سے رائج چلی آ رہی ہے۔ مثلاً زمین کی پیداوار کی بٹائی، مضاربت وغیرہ۔ اور اگر آپ بٹائی، مضاربت وغیرہ کو جائز رکھ کر بنک کے سود کو ناجائز قرار دیتے ہیں تو آپ کا بینکنگ سسٹم ختم ہو جاتا ہے۔ کیونکہ سرمایہ دار طبقہ اپنا روپیہ بنک کے کاروبار میں لگائے گا ہی نہیں۔ لیکن اگر آپ قرآن کا معاشی نظام اختیار کر لیتے ہیں تو اس قسم کی کوئی مشکل پیش ہی نہیں آئے گی۔ اس وقت افراد کے پاس فالتو دولت (SURPLUS MONEY) رہے گی ہی نہیں جو اس پر نفع کمانے کا سوال پیدا ہو۔ دولت، ملت کی تحویل میں رہے گی۔ اور وہیں سے تمام ضرورت مندوں کی ضروریات پوری ہوتی رہیں گی۔ ان ضرورت مندوں کی احتیاج سے فائدہ اٹھا کر نفع کمانے کا تصور تک بھی باقی نہیں رہے گا۔

یہ ہے اس مسئلہ کا اصلی حل۔ (فروری ۱۹۶۴ء)

قرآن کا معاشی نظام

السلام وعلیکم۔ چند ایک نکات پر آپ سے رہنمائی چاہتا ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے لیے تھوڑا بہت وقت نکال سکیں گے۔

نمبرا اسلامی معاشی نظام میں ایک لامحدود ذاتی ملکیت کا حق تسلیم کیا جاتا ہے۔ اگر ایک شخص کے پاس ایک دفعہ کسی طرح سے سرمایہ آجائے تو پھر وہ سرمایہ عموماً بڑھتا ہی رہتا ہے۔ بیشتر حالات میں نفع اور نقصان کے بعد حساب کرنے پر نفع کا پلڑا عموماً بھاری ہی رہتا ہے اور پھر نتیجۃً سرمایہ اپنی اصلی مقدار سے دُگنا، سہ گنا اور کئی ہزار گنا تک ہو جاتا ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ

(۱) کیا سرمایہ میں یہ زیادتی محض اس سرمایہ اور محنت کا بدلہ ہے جو شروع میں لگایا جاتا ہے۔

(۲) یا محض اس دیکھ بھال (SUPERVISION) کا انعام ہے۔ جو ایک بڑا سرمایہ دار اپنے بند کمرے میں بیٹھ کر ٹیلیفون اور ریڈیو کے ذریعہ کرتا ہے۔

اگر یہ کہا جائے کہ آخر سرمایہ دار نے بھی تو اپنے جسم و ذہن سے محنت کی ہے۔ اس کا بدلہ اسے بھی ملنا چاہیئے لیکن تب بھی یہ چیز سامنے آتی ہے کہ آیا ایک شخص کی ذہنی و جسمانی محنت کی قیمت دوسرے انسانوں کے مقابلہ میں اسی لیے کئی سو گنا ہو گئی کہ اس کے پاس سرمایہ ہے۔ مثلاً ایک سرمایہ دار کے پاس دس لاکھ روپے کا کاروبار ہے اگر آپ اسے ایک ماہ میں صرف ایک فیصدی منافع لینے کی اجازت دیں تب بھی اسے دس ہزار روپے ماہوار بچے گا۔ جو آپ کے ایک بہترین معاشی نظام میں کم از کم دس آدمیوں کی آمدنی کے برابر ہو گا۔ صاف ظاہر ہے کہ سرمایہ دار کو جس چیز نے مالی طور پر دس آدمیوں کے برابر بنایا ہے وہ صرف لامحدود (یا بہ نسبت زیادہ) سرمایہ ہے۔ بڑے سرمایہ داروں کی حدِ منافع بھی زیادہ ہوتی ہے۔ اس لیے ظاہر ہے کہ اس لامحدود ملکیت کے تصور نے معاشی توازن کو کتنا بگاڑ دیا ہے۔

لیکن اگر اس کے مقابلہ میں بڑی صنعتوں کو تمام لوگوں کے اجتماعی کنٹرول (حکومت) میں دے دیا جائے اور چھوٹے پیمانے پر عام آدمی کو کاروبار کرنے کی اجازت ملے تو سرمایہ دار اور مزدور کی آمدنی کا فرق معقول حد تک گھٹ جائے گا۔

نمبر ۲ ایک شخص نے محنت کی اور اسے اس کا بدلہ مل گیا۔ لیکن یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ ایک انسان کو کروڑوں روپے محض اسلیئے مل جائیں کہ وہ ایک کروڑپتی کے گھر پیدا ہوا تھا۔ اور اس کے مقابلہ میں ایک انسان کو ہوش آتے ہی سب سے بڑی فکر اپنی روٹی کی ہو تو کیا یہ محض اس لیے کہ اس کا باپ ایک غریب انسان تھا۔ (کسی امیر یا غریب کے گھر پیدا ہونا کوئی اختیاری فعل تو ہے نہیں کہ جس کے سلسلے میں کوئی انعام یا سزا دی جا سکے) اسلام کا وراثت کا قانون بھی اس مسئلہ کا مکمل حل نہیں۔ یہ درست ہے کہ قانون وراثت سے جائداد کئی حصوں میں بٹے گی لیکن ایک بڑی جائداد کے اگر دو چار حصے ہو بھی جائیں اور پھر یہ علیحدہ علیحدہ کاروبار میں لگ کر منافع کمانا شروع کر دیں۔ جس منافع میں سرمایہ کے مقابلہ میں محنت کا حصہ بعض اوقات تقریباً نظر انداز کر دینے کے قابل ہو جاتا ہے — تو تھوڑے ہی عرصے بعد

اصل جائداد سے کئی گنا بڑی جائداد پھر بن جائے گی۔

صورتِ حال خواہ کچھ بھی ہو مگر وہ اعتراض بہر حال وہیں ہے کہ ایک شخص کو ورثہ میں دس لاکھ روپیہ ملے اور دوسرے کو دس روپے محض اس بنا پر کہ ایک کے باپ کی چالیس لاکھ کی جائداد تھی اور دوسرے کی صرف چالیس روپے کی۔ ورثہ میں مقدار کے فرق کے علاوہ سوال یہ ہے کہ آخر ایک انسان کو کس حق کی بنا پر کچھ دیا جائے۔ محنت نہیں کی تو آخر بدلہ کس چیز کا۔ ؟

نمبر۳ اس چیز کے نتیجہ میں جو چیز ظہور پذیر ہو گی وہ اس اصول کو ہی ختم کر دے گی کہ ہر شخص کو زندگی کی دوڑ میں مساوی مواقع ملنے چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ پہلا شخص تو آسانی سے اپنا کام شروع کر سکے گا۔ لیکن دوسرے کو سوائے مصائب و مشکلات کے اور کوئی چیز نظر نہیں آئے گی۔ کیا اسلام کوئی ایسا متوازی نظام پیش کرتا ہے جس میں اس چیز کا ازالہ کیا گیا ہو ؟ اور ہر شخص کو بنیادی طور پر زندگی کی دوڑ میں ہر طرح کے مساوی مواقع ملیں۔

اور اگر نہیں تو کیوں نہ ہر شخص کو ورثہ میں ملنے والی جائداد کو اتنا گھٹایا یا بڑھایا جائے کہ ایک متوازن صورتِ حال پیدا ہو جائے۔ ضرورت سے زیادہ ورثہ کو "جنرل کنٹرول" میں دے دیا جائے اور اگر ورثہ ضرورت سے کم ہو تو جنرل کنٹرول سے ہی پورا کر لیا جائے۔ میرے ذہن میں یہ چند اشکالات ہیں۔ جن کا حل مقصود ہے کوئی بحث کھڑی کرنا مقصد نہیں۔

والسلام

جواب

قرآن کریم جس معاشی نظام کا تصور پیش کرتا ہے اس میں وہ مشکلات خود بخود حل ہو جاتی ہیں جن کی طرف آپ نے اشارہ کیا ہے۔ اس نظام کی نمایاں خصوصیات حسبِ ذیل ہیں:۔

(۱) ایک چیز ہے سرمایہ اور دوسری چیز ہے محنت۔ قرآن کریم کی رُو سے معاوضہ، محنت کا مل سکتا ہے (لیس للانسان الا ما سعیٰ (۵۳/۳۹)

جو نفع محض سرمایہ پر حاصل ہوا سے ربوٰ کہا جاتا ہے اور ربوٰ قرآن کریم کی رُو سے حرام ہے۔ ایسا حرام کہ اسے "خدا اور رسولؐ کے خلاف اعلانِ جنگ" سے تعبیر کیا گیا ہے۔(۲/۲۷۹) تجارت ہو یا صنعت، زمینداری ہو یا جائداد اندوزی۔ جہاں اور جتنا منافع صرف سرمایہ پر حاصل ہو گا۔ اس کا شمار

ربوآ میں ہو جائے گا۔

(۲) قرآنی نظام میں تمام افرادِ مملکت کی بنیادی ضروریاتِ زندگی مہیا کرنے کی ذمہ داری معاشرہ (مملکت) کے سرپر ہوتی ہے (۶/۱۵۲) ظاہر ہے کہ مملکت اپنی اس عظیم ذمہ داری سے اسی صورت میں عہدہ برآ ہو سکتی ہے کہ وسائلِ پیداوار اس کے زیرِ اقتدار ہوں۔ جب شکل یہ ہوگی تو کسی کو جائدادیں نے اور دولت سمیٹ کر رکھنے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ اسی لیے قرآن کریم نے کہا ہے کہ جو کچھ کسی کی ضروریات سے زائد ہے وہ نوعِ انسان کی عام پرورش کے لیے کھلا رہنا چاہیئے (۲/۲۱۹)۔ اس کی رُو سے دولت کے انبار جمع کرنا۔ جہنم کا عذاب مول لینا ہے۔ ($\frac{9}{34-35}$)

(۳) جب اس نظام میں جائدادیں کھڑی کرتے یا دولت کے انبار جمع کرنے کی اجازت (یا ضرورت) ہی نہیں ہوگی، تو وراثت میں اتنا کچھ چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوگا۔ لہٰذا زندگی کے میدان میں ہر انسانی بچہ ایک ہی مقام سے دوڑ کی ابتدا کرے گا اور چونکہ ہر ایک کے لیے سامانِ نشوونما کا مہیا کرنا معاشرہ کے ذمہ ہوگا۔ اس لیے وہ راستے میں بھی کسی مقام پر اس لیے نہیں رُک جائے گا کہ اسے آگے بڑھنے کا سامان میسر نہیں۔

(۴) لیکن قرآن دنیا میں مروج غلط نظام سے اپنے اس مثالی[۱] نظام تک بتدریج لے جانا چاہتا ہے۔ اس کے لیے وہ سب سے پہلے تعلیم و تربیت سے انسانی قلب و دماغ کی اصلاح کرتا ہے اور اس کے دل میں اس یقین کو راسخ کرتا ہے کہ جو انسان زیادہ سے زیادہ محنت کر کے اپنی ضروریات سے زائد سامانِ زیست (دولت وغیرہ) کو دوسرے انسانوں کی ضروریات کے لیے دے دیتا ہے، اس سے اس کی ذات کی نشوونما ہوتی ہے۔ اور وہ اس دنیا سے اگلی دنیا میں سرفرازی اور خوشگواری (جنّت) کی زندگی بسر کرتا ہے۔ یہ ایمان وہ بنیاد ہے جس پر اس نظام کی ساری عمارت استوار ہوتی ہے۔

اس کے ساتھ ہی وہ بتدریج موجودہ معاشی نظام کو اپنے نظام میں بدلتا چلا جاتا ہے۔ اس کے لیے وہ کہیں حکم دیتا ہے کہ دولت کی گردش اوپر کے طبقہ میں ہی نہیں رہنی چاہیئے ($\frac{59}{7}$) اسے سارے معاشرہ میں یوں رواں دواں رہنا چاہیئے جس طرح انسانی جسم میں خون گردش کرتا ہے۔ کہیں

---

[۱] قرآن کے معاشی نظام کی تفصیلات پرویز صاحب کی کتاب "نظامِ ربوبیت" میں ملیں گی۔

وہ زمین کو بڑے بڑے سرداروں کے ہاتھوں سے لے کر ذاتی املاک کو کم کئے جاتا ہے (۱۳/۱۴)
دوسری طرف وہ صدقہ اور خیرات اور احسان و ایثار کی ترغیب سے، بہ طیب خاطر، دولت کو ضرورت
مندوں کی طرف منتقل کرنے کی صورتیں پیدا کرتا ہے۔ وراثت کے احکام بھی اسی ضمن میں آتے
ہیں۔ اس طریق سے وہ رفتہ رفتہ معاشرہ کو اپنے معیاری نظام کی طرف لے جاتا ہے۔ اس
نظام کے قیام کے بعد ان اقدامات کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ جب معاشرہ میں کوئی محتاج ہی نہیں
رہے گا تو خیرات کسے دی جائے گی۔ جب کسی کی جائیداد ہی نہیں ہوگی تو ورثہ میں کیا تقسیم ہوگا۔

(۵) رسول اللہ کی زندگی اس مثالی نظام کا بہترین نمونہ تھی۔ (حضورؐ کی حیاتِ طیبہ، امت ہی
کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے اسوۂ حسنہ۔ بہترین نمونہ ہے) رسول کرتا یہ ہے کہ معاشرہ
کو بتدریج منتہیٰ تک لے جاتا ہے اور اس منتہیٰ کا نمونہ خود بن کر دکھاتا ہے۔ آپ، حضورؐ کی زندگی
کو دیکھئے۔ آپؐ نے تمام عمر ایک پائی بھی ضرورت سے زیادہ اپنے پاس نہیں رکھی۔ حتیٰ کہ دوسروں
کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے رہے (۵۹/۹) آپؐ نے ایک پیسہ کی جائداد تک
نہیں کھڑی کی۔ وفات کے وقت گھر میں سات دینار تھے۔ جب تک انہیں منفعت عامہ کے لیے
دے نہیں دیا۔ دنیا سے رُخصت نہیں ہوئے۔ دنیا سے رُخصت ہوئے تو اپنے ورثا میں کچھ
بھی نہ چھوڑا۔ جو استعمال کی چیزیں چھوڑیں ان کے متعلق بھی فرما دیا کہ وہ عام مسلمانوں کے لیے
کھلی رہیں گی۔ ورثہ میں تقسیم نہیں ہوں گی۔ اور یہ اس زمانے کی بات ہے جب ایک وسیع مملکت
وجود میں آچکی تھی اور حضورؐ اس مملکت کے سربراہ تھے۔ قرآن کریم نے بعض احکام کے متعلق کہا
ہے کہ وہ صرف حضورؐ کی ذات تک محدود تھے۔ دوسرے مسلمانوں کے لیے نہیں تھے۔ مثلاً حضورؐ
کی ازواج مطہرات کسی اور کے نکاح میں نہیں آسکتی تھیں۔ لیکن حضورؐ نے جو معاشی زندگی بسر فرمائی اس
کے متعلق کہیں یہ نہیں آیا کہ وہ صرف حضورؐ تک محدود تھی۔ وہ زندگی قرآن کریم کے پیش کردہ معاشی نظام
کا سمٹا ہوا عکس تھی اور پکار پکار کر کہہ رہی تھی کہ جب یہ نظام اپنی مکمل شکل میں قائم ہوگا تو اس میں افرادِ
معاشرہ کی یہی زندگی ہوگی۔

اور یہی وہ نظام ہے جو نوع انسان کو اس عذاب سے نجات دلا سکتا ہے جس میں وہ اس وقت
بُری طرح سے مبتلا ہے اور جس کے ذمہ وار یورپ کا قدیم غاصبانہ معاشی نظام اور روس کا جدید

مستبدانہ نظام دو نوں ہیں۔ بنیاد ان دونوں کی باطل پر ہے اور جو نظام بھی باطل کی بنیادوں پر اُٹھے گا۔ وہ انسانیت کے لیے کبھی تعمیری نتائج مرتب نہیں کر سکے گا۔ حق کی بنیادیں صرف وحیٔ خداوندی مہیا کر سکتی ہے اور وحی خداوندی نہ یورپ اور امریکہ کے ہاں ہے نہ روس کے۔ یہ صرف قرآن کی دفتین میں محفوظ ہے۔ (دسمبر ۱۹۶۴ء)

۵ــــــ حضورؐ نے کچھ جمع نہیں کیا

حضورؐ کا اُسوۂ حسنہ

سوال:۔ کیا رسول اللہؐ کے اُسوۂ حسنہ کا اتباع ہمارے لیے ضروری نہیں۔ جب رسول اللہؐ نے ایک پیسہ بھی جمع نہیں کیا اور نہ ہی کچھ ورثہ چھوڑا ہے تو کیا ہمارے لیے یہی اُسوہ نہیں؟ اور اگر یہی ہے تو پھر قرآن میں ترکہ اور وراثت کے احکام کیوں ہیں؟

جواب:۔ رسول اللہؐ کی حیاتِ طیبہ ہمارے لیے اسوۂ حسنہ ہے۔ قرآن، مومن کی زندگی کا جو تصور پیش کرتا ہے اس کی مکمل ترین مثال حضورؐ کی سیرت تھی۔ اسی لیے وہ ہمارے لیے نمونہ بنتی ہے۔ حضورؐ نے اس کی مثال قائم کی۔ اور جماعتِ مومنین بتدریج اس منتہیٰ کی طرف بڑھتی گئی۔ لیکن اس قسم کی زندگی اس نظام کے اندر ہی ممکن ہے جو قرآنی خطوط کے مطابق قائم کیا جائے۔ یہی وہ نظامِ معاشرہ تھا جس کے اندر یہ جماعت اس منتہیٰ کی طرف بڑھتی گئی تھی۔ اس نظام میں کسی فرد کو ضرورت ہی نہیں رہتی کہ وہ مال جمع کرے اور اپنے ورثا کے لیے جائدادیں چھوڑے۔ لیکن یہ نظام بتدریج قائم ہوتا ہے۔ جب تک یہ قائم نہ ہو، لوگوں کے پاس مال بھی جمع ہوتا ہے۔ اور وہ ترکہ بھی چھوڑتے ہیں۔ اور یہ ترکہ وراثت کے احکام کے مطابق تقسیم ہوتا ہے۔ اس نظام کے قیام کے بعد، نہ کوئی ترکہ چھوڑتا ہے نہ اس کی تقسیم کا سوال پیدا ہوتا ہے۔ یہی اسلامی زندگی کی آخری شکل ہے جس کی مثال حضورؐ نے قائم کر کے دکھائی۔ لیکن ہماری حالت عجیب ہے۔ ہمارے ہاں سنتِ رسول اللہؐ کے

اتباع پر اس قدر زور دیا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ہی اس طرز زندگی کو عین اسلامی بھی بتایا جاتا ہے جس میں لوگ دھڑا دھڑ مال جمع کرتے جائیں۔

صحابہ کبارؓ کی زندگی

سوال: تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ بڑے بڑے اولوالعزم صحابہؓ کے پاس دولت کے انبار ہوتے تھے۔ اس کی کیا وجہ تھی؟

جواب: اگر تاریخ کا یہ بیان صحیح ہے تو یہ اس زمانے کی بات ہو سکتی ہے جب اسلامی نظام ہنوز اپنی مکمل شکل میں قائم نہیں ہوا تھا۔ ورنہ آپ خیال کر سکتے ہیں کہ قرآن کریم، دولت کے انبار جمع کرنے کو اتنی سختی سے روکے۔ نبی اکرمؐ، قرآن کی اس تعلیم پر عمل کر کے نمونہ پیش کریں۔ اور صحابہ کبارؓ (معاذ اللہ) اس کے خلاف زندگی بسر کریں! اس کا تو تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

اس ضمن میں ایک اصول یاد رکھیے۔ صحابہ کبارؓ رسولؐ اللہ کے سچے متبع تھے اور رسول اللہ کی زندگی عین مطابق قرآن تھی۔ اس لیے اگر ہمیں تاریخ میں صحابہ کبارؓ (یا خود نبی اکرمؐ) کے متعلق کوئی ایسی بات ملے جو قرآن کے خلاف ہو تو ہمیں بلا تامل کہہ دینا چاہیے کہ تاریخ کا وہ بیان صحیح نہیں۔ رسولؐ اللہ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی، کے مطابق قرآن ہونے کی شہادت خود قرآن دیتا ہے۔ جب ایک طرف قرآن کی شہادت ہو (جو خود خدا کی شہادت ہے) اور دوسری طرف تاریخ کا بیان ہو (جو بہر حال انسانوں کی جمع اور مرتب کردہ ہے) تو قرآنی شہادت کو بہر حال قبول کیا جائے گا، اور جو کچھ اس کے خلاف ہو اسے مسترد کر دیا جائے گا۔ اگر ہم اپنی تاریخ کا مطالعہ اس اصول کے مطابق کریں گے تو عہد محمدؐ رسول اللہ والذین معہٗ کا صحیح تصور ہمارے سامنے آجائے گا۔

(سنہ ۱۹۶۳ء)

---

۶ —— قومی ملکیت

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں۔

جہاں تک میں سمجھ سکا ہوں۔ طلوع اسلام اس نظریہ کا داعی ہے کہ قرآن کریم کی رُو سے اسلامی معاشرہ کی مکمل شکل اس وقت وجود میں آتی ہے۔ جب زمین اور دیگر ذرائع پیداوار اجتماعی نظام کی

تحویل میں دے دیئے جائیں۔ اور وہ تمام افرادِ مملکت کی پرورش کی ذمہ داری اپنے سر لے۔ اس کے برعکس سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی اپنی کتاب مسئلہ ملکیت زمین میں اس نظریہ کے متعلق لکھتے ہیں:۔

ذرائع پیداوار کو قومی ملکیت بنانے کا تخیل بنیادی طور پر اسلام کے نقطۂ نظر کی ضد ہے۔ لہٰذا اگر ہمیں اسلامی اصولوں پر زمین کے بندوبست کی اصلاح کرنی ہو تو ایسی تمام تجویزوں کو پہلے قدم ہی پر لپیٹ کر رکھ دینا چاہیئے۔ جن کی بنیاد میں قومی ملکیت کا نظریہ۔ اصول یا نصب العین کی حیثیت سے موجود ہو بات صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ اسلام زبردستی مالکان زمین کی ملکیتیں چھین لینے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور بات صرف اتنی بھی نہیں ہے کہ وہ ایسے قوانین بنانے کی اجازت نہیں دیتا جن کے ذریعہ سے کسی شخص یا گروہ کو اپنی ملکیت حکومت کے ہاتھ بیچنے پر مجبور کیا جا سکے۔ بلکہ درحقیقت اسلامی نظریہ تمدّن و اجتماع سرے سے اس تخیل کا مخالف ہے کہ زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار حکومت کی ملکیت ہوں۔ اور پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمران گروہ کی غلام بن کر رہ جائے جو ان ذرائع پر متصرف ہو۔ جن ہاتھوں میں فوج، پولیس، عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہیں انہیں ہاتھوں میں اگر سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا ہے۔ اس لیے یہ خیال کرنا صحیح نہیں ہے کہ اگر غاصبانہ طریقوں سے زمین پر قبضہ نہ کیا جاتے بلکہ پورے پورے معاوضے دے کر حکومت تمام زمینوں کو ان کے مالکوں سے برضا و رغبت خرید لے۔ تو اسلامی نقطۂ نظر سے اس میں کوئی قباحت نہیں۔ جزئیات شرع کے لحاظ سے چاہے اس میں قباحت نہ ہو۔ مگر کلیات شرع کے لحاظ سے یہ تخیل ہی غلط ہے کہ عدل اجتماعی کی خاطر زمین اور دوسرے ذرائع پیداوار کو انفرادی ملکیتوں سے نکال کر قومی ملکیت بنا دیا جائے۔ یہ انصاف کا اشتراکی تصور ہے، نہ کہ اسلامی تصور۔ اور اس تصور کی بنیاد پر ایک اشتراکی معاشرہ پیدا ہوتا ہے، نہ کہ اسلامی معاشرہ۔ اسلامی معاشرہ کے لیے تو یہ نہایت ضروری

ہے کہ اس کے اگر سب نہیں تو اکثر افراد اپنی معیشت میں آزاد ہوں اور اس غرض
کے لیے ناگزیر ہے کہ ذرائع پیداوار افـــراد ہی کے ہاتھوں میں رہیں۔"

یعنی ان کے نزدیک اس طرح ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہوتا ہے۔ جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔ ہم حیران ہیں کہ ہم اسے کیا سمجھیں کیا آپ براہ کرم اس پر روشنی ڈالیں گے ؟

جواب۔

قومی ملکیت کے مسئلہ پر جو کچھ طلوع اسلام میں آیا ہے۔ اس کے متعلق قرآنی دلائل دیے گئے تھے۔ مودودی صاحب نے اس فتویٰ میں کسی قرآنی دلیل اور برہان کی ضرورت نہیں سمجھی۔ باقی رہی ان کی وہ ادیبانہ دلیل جو انہوں نے اس اقتباس میں پیش کی ہے۔ سو وہ تلبیس حق و باطل کی ایک بڑی دلچسپ مثال ہے۔ سوال پیش نظر یہ تھا کہ اسلامی نظام معاشرت و تمدن میں ذرائع پیداوار مرکزی تحویل میں دیئے جائیں گے یا افراد کے پاس رکھے جائیں گے۔ یہ حقیقت واضح ہے اور خود مودودی صاحب اور ان کی جماعت آج تک یہی پکارتی چلی آ رہی کہ اسلام کے نظام حکومت میں نظم ونسق ان لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا جو نہایت متدین، متشرع، متقی پرہیز گار، خدا ترس یعنی بہمہ وجوہ خدا اور رسول کے رنگ میں رنگے ہوئے ہوں گے۔ اور وہ حکومت کو علیٰ منہاج نبوت و منہاج خلافت راشدہ قائم کریں گے۔ اب مودودی صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اگر اسلامی نظام حکومت میں ذرائع پیداوار کو نظام کی تحویل میں دے دیا جائے تو اس سے پوری سوسائٹی اس مختصر سے حکمراں گروہ کی غلام بن کر رہ جائے گی جو ان ذرائع پر متصرف ہوگا۔ جن کے ہاتھوں میں فوج اور پولیس اور عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہوں گی، انہی ہاتھوں میں اگر سوداگری اور کارخانہ داری اور زمینداری بھی سمٹ کر جمع ہو جائے تو اس سے ایک ایسا نظام زندگی پیدا ہو جائے گا جس سے بڑھ کر انسانیت کش نظام آج تک شیطان ایجاد نہیں کر سکا۔ گویا مودودی صاحب کے نزدیک اسلامی نظام حکومت میں۔

(۱) پورا اقتدار سمٹ کر ایک مختصر حکمراں گروہ کے ہاتھ میں آجائے گا۔

(۲) ملّت اس حکمراں گروہ کی غلام ہو گی۔

(۳) اس حکمراں گروہ کے ہاتھوں میں فوج، پولیس، عدالت اور قانون سازی کی طاقتیں ہوں گی جو

وہ دوسروں کو غلام بنانے کے لیے استعمال کر سکیں گے۔

لہٰذا

(۴) سوداگری، کارخانداری اور زمینداری بھی سمٹ کر انہی کے ہاتھوں میں آ گئی تو اس شیطانی نظام کے ہاتھوں انسانیت ذبح ہو جائے گی۔

اگر اسلامی نظام حکومت کے ارباب حل و عقد کی بھی یہی حالت ہو گی کہ اگر ان کے ہاتھ میں رزق کے سرچشمے چلے گئے تو وہ انسانیت کا گلا گھونٹ دیں گے۔ تو فرمائیے کہ فرعونی نظام اور ایک اسلامی نظام میں پھر فرق کیا ہو گا؟ اگر حالت یہی ہونی ہے۔ تو پھر اس اسلامی نظام میں کیا خوبیاں ہیں جن کی خاطر موجودہ نظاموں کو الٹ دینے کی ہر کوشش کا نام جہاد رکھا جاتا ہے؟ اگر اسلامی نظام میں بھی بعض انسانوں کو دوسرے انسانوں کا محکوم بننا ہے۔ اگر اس میں بھی پولیس، فوج، عدالت اور قانون سازی کی طاقتوں نے حکمراں گروہ کے مفاد ہی کا تحفظ کرنا ہے۔ اگر انہوں نے بھی ذرائع پیداوار پر سانپ بن کر بیٹھ جانا ہے۔ تو پھر موجودہ نظاموں میں کون سی خرابی ہے کہ اس نظام میں نہیں ہو گی۔

یہ ہے وہ دلیل جس کی بنا پر مودودی صاحب نے قومی ملکیت کو شیطانی نظام قرار دیا ہے۔ یعنی بات اسلامی نظام کی ہو رہی ہے اور اس مسئلہ کے خلاف خرابیاں وہ گنا رہے ہیں جن کا موجودہ غیر اسلامی نظام حکومت میں پیدا ہو جانے کا احتمال ہے ہم پوچھتے یہ ہیں کہ جب حضرت عمرؓ نے شام اور عراق اور دیگر مفتوح ممالک کی زمینوں کے متعلق یہ انتظام فرمایا تھا کہ انہیں افراد میں تقسیم کرنے کی بجائے تمام مسلمانوں کی اجتماعی ملکیت قرار دیا جائے اور اس کا انتظام مسلمانوں کی طرف سے نیابتہً نظام حکومت کرے۔ تو کیا یہ فیصلہ (معاذ اللہ) شیطان کی ایجاد تھا؟ اور کیا اس انتظام سے وہ تمام خرابیاں رونما ہو گئی تھیں جنہیں مودودی صاحب اس نظام کے خلاف بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔

اس تصور کے خلاف کہ زمین افراد کی ملکیت نہ ہو بلکہ قوم یا اسٹیٹ کی ملکیت ہو۔ مودودی صاحب نے اپنے رسالہ "مسئلہ ملکیت زمین" میں ایک عجیب طنزیہ تنقید کی ہے وہ فرماتے ہیں۔

> آجکل کے اشتراکیت زدہ مجتہدین نے قرآن سے ایک فقرہ یوں نکالا ہے۔ "الارض للہ" اور انہوں نے اس پر قیاسات کا ایک پورا کر مکمل تعمیر کر ڈالا ہے۔

اس کے بعد وہ فرماتے ہیں:۔

اس طرح کی من مانی تاویلیں کرنے پر کوئی اتر آئے تو کہہ سکتا ہے کہ سرے سے دنیا کی کوئی چیز بھی شخصی ملکیت نہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اللہ میاں نے صاف کہہ دیا ہے کہ للہ ما فی السموات وما فی الارض (آسمانوں اور زمینوں میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے۔)

قطع نظر اس کے کہ الارض للہ زمین کی ملی ملکیت کی تائید میں کوئی اہم دلیل بن سکتی ہے یا نہیں، ہم یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مودودی صاحب ایک ہی قسم کی آیات سے ایک مفہوم اپنے مطلب کے مطابق لیتے ہیں۔ اور اسی قسم کی دوسری آیات کا مفہوم جب ان کی مصلحت کے خلاف جاتا ہے تو اسے مردود قرار دیتے ہیں۔ آپ کو معلوم ہی ہے کہ اسلامی جماعت کے تمام دعاوی کا مدار اس اصولی دعوے پر ہے کہ حکومت کا حق صرف خدا کے لیے ہے۔ کسی فرد کو حق حکومت حاصل نہیں۔ اور "خدا کی حکومت" سے ان کی مراد یہ ہے کہ حکومت ان لوگوں کے ہاتھ میں ہو جو (بقول ان کے) خدا کی نیابت کے طور پر اس کی منشا کے مطابق حکومت چلائیں۔ اس دعوے کی بنیاد الحکم للہ (ان الحکم الا للہ) ہے۔ یعنی "خدا کی حکومت"۔ اب ذرا سوچئے کہ مودودی صاحب نے الحکم للہ سے قیاسات کا یہ سارا کریملن اپنے حق میں تعمیر کر لیا کہ حکومت کا حق افراد کو نہیں پہونچتا۔ بلکہ اس کا حق ملت کو پہنچتا ہے جو منشائے خداوندی کے مطابق حکومت چلائے لیکن اگر کوئی شخص الارض للہ سے بعینہٖ اس قسم کا مفہوم لے یعنی وہ کہے کہ زمین پر افراد کو ملکیت کا حق حاصل نہیں ہے۔ یہ ملت کی ملکیت ہے اور ملت ہی کو حق پہونچتا ہے کہ وہ منشائے خداوندی کے مطابق اس کا انتظام کرے۔ تو مودودی صاحب کے نزدیک یہ "من مانی تاویل" بن جاتی ہے۔ یعنی الحکم للہ کی وہی تاویل عین قرآنی ہے۔ اور الارض للہ کی اس قسم کی تاویل من مانی ـــ الارض للہ کے خلاف مودودی صاحب کی دلیل یہ ہے۔ کہ قرآن میں تو یہ بھی آیا ہے کہ للہ ما فی السموات وما فی الارض لیکن ہم کہتے ہیں کہ اسی طرح سے الحکم للہ کے ضمن میں بھی تو ان میں آیا ہے کہ ملکوت کل شئی خدا کے لیے ہے اور ملکوت السموٰت والارض اسی کے لیے ہے۔

مودودی صاحب نے بڑے طعن آمیز انداز میں فرمایا ہے کہ اس طرح تو سرے سے دنیا کی کوئی چیز بھی شخصی ملکیت میں نہ ہونی چاہیئے۔ کیونکہ اللہ میاں نے صاف کہہ دیا ہے کہ جو کچھ زمین آسمان میں ہے اللہ کا ہے۔ یعنی ان کے نزدیک اللہ میاں (معاذ اللہ) بیٹھے بیٹھے یونہی شاعری کرتے رہتے ہیں اس لیے جو کچھ وہ

کتنے ہیں اسے سچ مچ نہیں سمجھ لینا چاہیئے۔ انہیں کون سمجھائے کہ قرآن میں اللہ نے شاعری نہیں کی۔ جو کچھ کہا ہے سچ مچ ٹھیک کہا ہے۔ قانون خداوندی کے مطابق قائم کردہ نظام میں "افراد کی ملکیت" کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس میں افراد کا فریضۂ زندگی نوع انسانی کی ربوبیت (نشوونما) ہوتا ہے۔ چونکہ نوع انسانی میں وہ خود بھی شامل ہوتے ہیں۔ اس لیے اس میں ان کی اپنی ربوبیت بھی شامل ہوتی ہے ان کی ربوبیت کے لیے کچھ چیزیں ان کے تصرف میں بھی دیدی جاتی ہیں۔ اور یہ سب کچھ اس آئین و ضابطہ کے مطابق ہوتا ہے۔ جو نوع انسانی کی ربوبیت عامہ کے اصول کلی کی روشنی میں مدون کئے جاتے ہیں۔

علاوہ بریں قرآن کریم کے اس معاہدہ کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیئے جس کی رُو سے اس نے کہہ دیا ہے کہ اللہ نے مومنین سے ان کا جان اور مال بعوض الجنۃ خرید لیا ہے"۔ اور یہ خرید، محض تصور ہی تصور میں نہیں ہوتی۔ عملاً واقع ہوتی ہے۔ خدا کے (BEHALF) پر مومن اپنی جان اور مال اس نظام کے ہاتھوں فروخت کر دیتے ہیں جو دنیا میں حکومت خداوندی کے قائم کرنے کے لیے متشکل ہوتا ہے۔ اس اعتبار سے بھی دیکھئے تو جماعت مومنین میں کوئی شے بھی کسی کی ذاتی ملکیت میں نہیں رہتی۔

(۱۹۵۳ء)

۷ــــ نظام یوسفیؑ

ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ قرآن میں یہ تو لکھا ہے کہ جب مصر میں قحط پڑا تو حضرت یوسفؑ نے انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ لیکن اس کی تفسیر کہیں نہیں ملتی کہ آپ اس مقصد کے لیے کیا تدابیر عمل میں لائے تھے کیا اس کی تفسیر کہیں سے مل سکتی ہے!

جواب:۔

قرآن میں تو اتنا ہی ہے کہ حضرت یوسفؑ نے فرعون سے کہا کہ اس مقصد کے لیے خزائن الارض (زمین کے خزانے) میری تحویل میں دے دو اس لیے کہ انی حفیظ علیم میں یہ بھی جانتا ہوں کہ انہیں کس طرح حفاظت میں رکھا جاتا ہے اور یہ بھی کہ ان کا بہترین مصرف کیا ہے حضرت یوسفؑ نے غلہ کی گرانی کو دور کرنے کے لیے کیا طریق عمل اختیار کیا اس کی تفصیل تورات میں ملتی ہے۔ چنانچہ

کتاب پیدائش باب ۴۷ میں اس تفصیل کا ذکر ان الفاظ میں آیا ہے۔

اور وہاں تمام زمین پر کہیں روٹی نہ تھی اس لیے کہ کال ایسا سخت تھا کہ مصر کی سرزمین اور کنعان کی زمین کال کے سبب سے تباہ ہو گئی تھی حضرت یوسفؑ نے ساری نقدی جو ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں موجود تھی اس غلّہ کے بدلے میں جو لوگوں نے مول لیا، جمع کی۔ اور یوسفؑ اس نقدی کو فرعون کے گھر لایا۔ اور جب ملک مصر اور کنعان کی سرزمین میں نقدی کم ہوئی تو سارے مصریوں نے آکر یوسفؑ سے کہا کہ ہم کو روٹی دے کہ ہم تیرے ہوتے ہوئے کیوں مریں ؟ کیونکہ نقدی چُک گئی۔ یوسفؑ نے کہا کہ اپنے چوپائے دو اگر نقدی چُک گئی کہ میں تمھارے چوپایوں کے بدلے تمھیں روٹی دونگا۔ وہ اپنے چوپائے یوسفؑ کنے لائے اور یوسفؑ نے گھوڑوں اور بھیڑ بکری اور گائے بیل کے گلّوں اور گدھوں کے بدلے ان کو روٹیاں دیں۔ اور اس نے ان کے سب چوپایوں کے بدلے میں انہیں اس سال پالا۔ جب وہ سال گذر گیا۔ وہ دوسرے سال اس کے پاس آتے اور اسے کہا کہ ہم اپنے خداوند سے نہیں چھپاتے کہ ہمارا نقد ختم ہو چکا۔ ہمارے خداوند نے ہماری چوپاؤں کے گلّے بھی لے لیئے سو ہمارے خداوند کی نگاہ میں ہمارے بدنوں اور زمینوں کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ پس ہم اپنی زمین سمیت تیری آنکھوں کے سامنے کیوں ہلاک ہوں۔؟ ہم کو اور ہماری زمین کو روٹی پر مول لے لو اور ہم اپنی زمین سمیت فرعون کی غلامی میں رہیں گے۔ اور دانہ دے تاکہ ہم جئیں اور نہ مریں کہ زمین ویران نہ ہو جائے اور یوسفؑ نے مصر کی ساری زمین فرعون کے لیے مول لی۔ کیونکہ مصریوں میں سے ہر شخص نے اپنی زمین بیچی کہ کال نے ان کو نپٹ تنگ کیا تھا۔ سو زمین فرعون کی ہوئی۔ رہے لوگ سو اس نے انہیں شہروں میں مصر کی اطراف کی ایک حد سے دوسری حد تک بسایا۔ اسنے صرف کاہنوں کی زمین مول نہ لی۔ کیونکہ وہ کاہن فرعون کی دی ہوئی جاگیر رکھتے تھے۔ اور اپنی جاگیر جو فرعون نے انہیں دی تھی کھاتے تھے۔ اس لیے انہوں نے اپنی زمینوں کو نہ بیچا۔

تب یوسفؑ نے لوگوں سے کہا کہ دیکھو میں نے آج کے دن تم کو اور تمہاری زمین کو فرعون کے لیے مول لیا۔ لو یہ بیج تمہارے لئے ہے، کھیت بوؤ اور جب یہ زیادہ ہو تو یہ ہو گا کہ تم پانچواں حصہ فرعون کو دو گے۔ اور چار حصے کھیت میں بیج بونے کو اور تمہاری خوراک اور ان کی جو تمہارے گھرانے کے ہیں اور تمہارے بچوں کی خوراک کے لیے ہوں گے۔ وہ بولے کہ تو نے ہماری جانیں بچائیں۔ ہم اپنے خداوند کی نظر میں مورد رحم ہوں۔ اور ہم فرعون کے خادم ہوں گے۔ اور یوسفؑ کے ساری مصر کی زمین کے لیے یہ آئین جو آج کے دن تک مقرر ہے کہ فرعون پانچواں حصہ لے گا۔ مگر صرف کاہنوں کی زمین فرعون کی نہ ہوئی۔

اقتباس بالا سے ظاہر ہے کہ حضرت یوسفؑ نے جب علت مرض پر غور کیا تو انہوں نے دیکھا کہ ملک کی معاشی بدحالی کا سبب یہ ہے کہ زمین پر بڑے بڑے زمیندار قابض ہیں۔ انہوں نے ایسے حالات پیدا کر دیئے جس سے وہ زمیندار مجبور ہو گئے کہ زمینیں حکومت کے ہاتھ فروخت کر دیں۔ اس طرح تمام مزروعہ زمین انفرادی ملکیت سے نکل کر حکومت کی ملکیت میں آ گئی۔ اس کے بعد حضرت یوسفؑ نے اس زمین کو کاشت کاروں میں تقسیم کر دیا اور انہیں آسانیاں بہم پہونچا دیں تاکہ وہ خود کاشت کر سکیں۔ اب یہ کاشت کار اپنی محنت کے۔ ماحصل کے آپ مالک تھے۔ زمیندار کاشتکار کی محنت کے ماحصل میں شریک نہیں تھے۔ اس طرح حضرت یوسفؑ نے ان موٹی موٹی گایوں کو ذبح کر دیا، جو دبلی گایوں کو کھاتے جا رہی تھیں (۱۹۵۳ء)

---

۸ — انفرادی مفاد پرستی

کراچی سے ایک طالب علم کا سوال ہے۔ کیا قرآنی نظام میں انفرادی مفاد (INDIVIDUAL ENTERPRISE) کی گنجائش ہو گی؟

جواب۔

"انفرادی مفاد" سے مفہوم یہ ہے کہ ایک شخص ذاتی سرمایہ لگا کر کوئی کاروبار کرے اور اس کاروبار کے منافع کا مالک سمجھا جائے۔ اس سوال کے جواب کے لیئے روپیہ کے متعلق قرآن کا نظریہ سامنے رکھیے بات خود بخود صاف ہو جائے گی۔

قرآن کی رُو سے

(الف) زمین کی انفرادی ملکیت جائز نہیں۔ اس لیے فاضلہ روپے سے زمین نہیں خریدی جا سکتی۔

(ب) جب زمین نہیں خریدی جا سکتی تو ظاہر ہے جائیداد کی غرض سے مکانات بھی نہیں بنائے جا سکتے۔ قرآن کی رُو سے معاشرہ پر لازم ہے کہ وہ تمام افراد کے لیے سکنی مکانات مہیا کرے۔ اس لحاظ سے بھی مکانات کرایہ پر دینے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔

(ج) روپیہ کو جمع نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ قرآن کی رُو سے چاندی اور سونے کا اکتناز ممنوع ہے اور دولت جمع کر کے گنتے رہنے والوں کے لیے بڑی تہدید آئی ہے۔

(د) کوئی شخص بلاضرورت روپیہ خرچ نہیں کر سکتا اسے تبذیر کہتے ہیں، جس کی قرآن میں سخت ممانعت ہے۔

(ہ) نہ ہی کوئی شخص ضرورت سے زیادہ خرچ کر سکتا ہے۔ اسے اسراف کہتے ہیں اور قرآن کی رُو سے اسراف بھی منع ہے۔

اب فرمائیے کہ ایک شخص ذاتی کاروبار سے منافع حاصل کر کے اس روپیہ کو کرے گا کیا۔ وہ روپیہ تو اس کے لیے وبالِ جان ہو جائے گا۔ اس کے پاس اس روپیہ کو رکھنے کے لیے کوئی جگہ نہیں ہو گی۔ وہ نہ تو اسے جمع رکھ سکے گا نہ زائد از ضرورت خرچ کر سکے گا۔

اندریں حالات قرآنی نظام میں (INDIVIDUAL ENTERPRISE) کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ روپیہ کی ذاتی ملکیت کا تصور اس دور کا پیدا کردہ ہے جب مسلمانوں میں ملوکیت، پیشوائیت اور سرمایہ داری آ چکی تھی۔ اگرچہ اس کے مفاد پرستانہ استبداد نے عہدِ رسالتمآبؐ کے صحیح واقعات ہم تک پہنچنے نہیں دیئے لیکن پھر بھی کہیں کہیں ایسی کرن نظر آ جاتی ہے کہ اس دور میں

روپیہ پاس رکھنے کا تصور تک بھی نہیں آتا تھا۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق اس قسم کے واقعات تاریخ میں باقی رہ گئے ہیں کہ آپ کے پاس جو کچھ آتا تھا۔ آپ اسے رات ہونے سے پہلے پہلے تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ وفات سے چند لمحات پہلے آپ نے حضرت عائشہؓ سے پوچھ لیا کہ گھر میں کوئی روپیہ تو نہیں رکھا۔ جو چند دینار موجود تھے جب تک انہیں بھی ضرورت عامہ کے لیے نہیں دے دیا اطمینان نہیں ہوا۔ کتب تاریخ میں حضورؐ کا یہ ارشاد بھی باقی رہ گیا ہے کہ انبیاءؑ کی جماعت کسی کو اپنا وارث نہیں چھوڑا کرتی۔ یعنی ان کے پاس جو کچھ ہوتا ہے وہ ربوبیت عامہ کے لیے وقف ہوتا ہے۔ ان کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتا۔ یہ چیز بھی کتب روایات میں موجود ہیں۔ لیکن ہمارے مولوی صاحبان رسولؐ اللہ کی اس سنت کی طرف کبھی توجہ نہیں دلاتے۔ وہ اس قسم کی روایات بیان کرتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کے پاس اتنے لاکھ دینار تھے، اور حضرت عبدالرحمٰنؓ بن عوف کے پاس مال ومتاع کے لدے ہوئے اتنے اونٹ تھے ایسا بیان کرنے میں وہ کبھی نہیں سوچتے کہ ایک طرف تو صحابہؓ کے متعلق یہ بتایا جاتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے کہ وہ رسولؐ اللہ کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے (جو رنگ درحقیقت قرآن کا رنگ ہے) اور دوسری طرف وہ یہ بتاتے ہیں کہ روپے پیسے کے معاملہ میں رسولؐ اللہ کا عمل اور تھا اور ان صحابہ کا عمل اور۔ ہمارے نزدیک رسولؐ اللہ اور آپؐ کے صحابہؓ کے عمل کے پرکھنے کا صحیح معیار قرآن ہے۔ کتبِ روایات میں ان بزرگوں کی طرف جس قدر ایسے واقعات منسوب کئے گئے ہیں جو قرآن کی تعلیم کے خلاف ہیں۔ وہ سب وضعی ہیں اور انہیں ملوکیت اور سرمایہ داری کے دور کی پیداوار جیسی اپنی زراندوزی اور جاگیرداری کے نظام کے لیے اس قسم کی سندات کی ضرورت تھی۔

(سنہ ۱۹۵۳ء)

۹ —— رہن باقبضہ

رسالپور سے ایک صاحب دریافت فرماتے ہیں کہ :-

رہن کے متعلق قرآنی احکام کیا ہیں۔ مجھے تو سود ہی کی ایک صورت نظر آتی ہے۔ ہمارے ہاں رہن

رکھ کر روپیہ لینے کا عام دستور ہے۔

جب تک مقروض اپنا قرض بے باق نہیں کرتا، قرض دینے والا اس زمین سے استفادہ کرتا رہتا ہے۔

جواب:۔ سورۂ بقرہ آیت ۲۸۲/۲ میں یہ حکم ہے کہ جب تم آپس میں قرض کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو۔ اس کے بعد آیت کے باقیماندہ حصہ میں پوری تفصیل دی گئی ہے کہ تحریر کی شکل کیا ہو گی، گواہیاں کیسی ہوں گی وغیرہ وغیرہ۔ اس کے بعد اگلی آیت میں ہے۔ وان کنتم علی سفر ولم تجدوا کاتبا فرھان مقبوضۃ یعنی اگر تم حالتِ سفر میں ہو اور وہاں لکھنے والا نہ ملے تو پھر تم کوئی چیز بطور ضمانت اپنے قبضہ میں رکھ لیا کرو۔ اس کا نام ہے رہن با قبضہ۔ یعنی جب کبھی ایسی صورت ہو جاتے کہ قرضہ کا معاملہ لکھنے میں نہ آسکے۔ (اس زمانہ کے عرب میں تو ایسی صورتیں اکثر و بیشتر پیش آسکتی تھیں لیکن ہمارے ہاں اب شاذ ہی کوئی ایسی صورت ہو سکتی ہے کہ کوئی شخص کسی کو قرضہ دے اور اس بات کو لکھنے والا نہ ملے۔ لیکن اگر ایسی صورت پیدا ہو جائے) تو قرض لینے والے کی کسی ایسی چیز کو بطور ضمانت رکھ لیا جائے جو اس قرض کی رقم کے برابر یا اس سے زیادہ ہو۔ مقصد صرف ضمانت ہے اور اس کی تشریح آیت کے باقی ٹکڑے نے کر دی ہے۔ جہاں یہ کہا گیا ہے کہ فان امن بعضکم بعضا۔ اگر تم میں سے ایک دوسرے کا اعتماد کرے فلیؤد الذی اؤتمن امانتہ تو جس شخص پر اعتماد کیا گیا ہے اسے چاہیئے کہ قرضہ دینے والے کی امانت (زرِ قرضہ) کو واپس کر دے۔ اس سے بات صاف ہو گئی کہ قرض کے معاملہ میں تحریر کی عدم موجودگی میں، قرض لینے والا جو چیز اپنے قبضہ میں لے گا، وہ محض ضمانت کے طور پر ہو گی، نہ اس لیے کہ یہ شخص اس کی آمدنی کھائے۔ قرآن میں ربٰو کو حرام قرار دیا گیا ہے اور ربٰو کے معنی زرِ اصل سے زیادتی کے ہیں۔ لہٰذا زرِ اصل سے زیادہ لینے کی کوئی شکل بھی ہو، وہ ربٰو میں داخل ہو گی اور حرام قرار پائے گی بنا بریں کسی کا مکان گرِو رکھ کر کرایہ وصول کرتے جانا یا زمین رہن رکھ کر اس کی آمدنی کھاتے جانا (اور مکان کے کرایہ اور زمین کی آمدنی کو زرِ اصل میں محسوب نہ کرنا) ربٰو ہے جو نصوص قرآنی کی رُو سے حرام ہے۔

مندرجہ بالا آیت سے یہ واضح ہے کہ قرآن کی رُو سے تحریر کافی ضمانت سمجھی جاتی ہے اور کسی چیز کا بطورِ ضمانت اپنے قبضہ میں لے لینا اسی وقت ہو گا جب تحریر ممکن نہ ہو۔ اس شکل میں بھی اگر

قرض دینے والا، اعتماد کرے تو پھر کسی چیز کو بطور ضمانت رکھ لینے کا بھی سوال پیدا نہیں ہوگا۔ لیکن آج کل تو قرضہ کی تحریریں نہیں، رہن یا قبضہ کی باقاعدہ تحریریں ہوتی ہیں اور انہیں رجسٹری بھی کرایا جاتا ہے اور ان کا نفع لینا شیرِ مادر کی طرح حلال سمجھا جاتا ہے۔ (۱۹۵۴ء)

---

۱۰ ـــــ قانونِ وصیّت

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ آپ نے ستمبر کے طلوعِ اسلام میں قانونِ وصیّت کے سلسلے میں لکھا ہے کہ ہر شخص کو حق حاصل ہے، کہ وہ اپنی جائداد کے متعلق جس قسم کی وصیّت چاہے کر جائے۔ کیا اس سے اس کے وارثوں کا حق غصب نہیں ہو جاتا۔ یہ ان پر صریح ظلم ہے جس کی اجازت اسلام نہیں دے سکتا۔

طلوعِ اسلام قانونِ وصیّت کے سلسلہ میں ہم نے اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا تھا صرف قرآن کریم کا حکم نقل کیا تھا جس میں اس نے واضح طور پر کہا ہے کہ اپنے ترکہ کے لیے وصیّت کرنا ہر مسلمان پر خدا کی طرف سے فرض قرار دے دیا گیا ہے (سورۂ بقرہ۔ آیت نمبر ۱۸۰) اور یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ ترکہ کے اتنے حصّے سے زیادہ وصیّت نہیں کی جا سکتی، نہ ہی یہ کہ وصیّت وارثوں کے لیے نہیں کی جا سکتی۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ترکہ کے لیے وصیّت کرنا ظلم ہے تو آپ سوچئے کہ اس اعتراض کی زد کس پر جا کر پڑتی ہے؟

آپ نے اس اعتراض کی بنیاد غلط مفروضہ پر رکھی ہے اور وہ غلط مفروضہ یہ ہے کہ کسی شخص کی املاک میں، اس کے وارثوں کا حق ہوتا ہے۔ ہر شخص کو اپنی ملکیت پر پورا پورا حق ہوتا ہے اور اس کے وارث، اس میں سے، بطور حق کے کچھ بھی طلب نہیں کر سکتے۔

بات یوں سمجھ میں آ جائے گی۔ مثلاً

(۱) ایک شخص اپنی کمائی ساری کی ساری خرچ کر ڈالتا ہے۔ اس میں سے کچھ بچتا نہیں۔ ظاہر ہے

کہ اس کے ہونے والے وارث یہ کہہ کر اسے اس سے نہیں روک سکتے کہ تم ہمارا حق غصب کر رہے ہو؟
جو اپنی ساری کمائی خود ہی خرچ کر ڈالتے ہو۔ ہمارے لیے بچا کر کچھ بھی نہیں رکھتے۔
(iii) ایک شخص اپنی زندگی میں اپنی ساری جائیداد، اپنی صوابدید کے مطابق کسی کو دے دیتا ہے۔
اس کے وارث یہ مطالبہ نہیں کرسکتے کہ وہ ان کا حق مار کر دوسروں کو کیوں دے رہا ہے!
اب ظاہر ہے کہ اگر وہ اپنی زندگی میں ایسا کرسکتا ہے تو اس بات کی وصیت کیوں نہیں کرسکتا کہ اس کے مرنے کے بعد، اس کی جائیداد کی یوں تقسیم ہو گی؟ قرآن کریم نے وارثوں کے جو حصّے مقرر کئے ہیں ان کے ضمن میں، بار بار اس حقیقت کو دہرایا گیا ہے کہ متوفی کی وصیت پوری کرنے کے بعد اگر کچھ باقی بچے، تو یہ تقسیم اس صورت میں ہو گی۔ لہٰذا وارثوں کا یہ کہنا کہ چونکہ قرآن نے ہمارے حصّے مقرر کر دیئے ہیں، اس لیے متوفی کی وصیت کو کالعدم قرار دیا جائے کیونکہ اس سے ہماری حق تلفی ہوتی ہے، بے بنیاد دعوےٰ اور قرآن کے خلاف مطالبہ ہے، یہی وجہ ہے کہ جو لوگ وصیت کو ایک تہائی تک مقید کرتے ہیں اور اسے صرف غیر وارثوں کے لیے جائز سمجھتے ہیں، وہ وصیت کے متعلق قرآن کی آیت کو منسوخ کر دیتے ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ کہ قرآن کی اس آیت کی موجودگی میں، کسی کے حق وصیت پر کسی قسم کی پابندی نہیں لگائی جا سکتی۔
آپ ذرا عملی زندگی کی طرف آیئے، اور غور کیجئے کہ اس میں کس کس قسم کی مشکلیں سامنے آتی ہیں۔ ایک شخص کے بھائی ہیں جو ساری عمر اس سے مقدمہ بازی کرتے رہے ہیں۔ وہ اس کی جان کے دشمن ہیں اور خون کے پیاسے ہیں۔ اس کی بیوی کے ساتھ بھی ان کی مخالفت کی یہی کیفیت ہے۔ وہ اس احساس کے ماتحت کہ اس کے بھائی، اس کے مرنے کے بعد، اس کی بیوہ کے ساتھ کس قسم کا سلوک کریں گے (کیونکہ اس کی اولاد کوئی نہیں اور وہ بے چاری لاوارث رہ جائے گی) اپنی جائداد کی وصیت اس کے نام پر کر جاتا ہے لیکن اس کی آنکھیں بند ہوتے ہی یہ بھائی دندناتے ہوئے آ جاتے ہیں اور متوفی کے ترکہ میں اپنا حق طلب کرتے ہیں۔ چنانچہ آپ کے موجودہ قانون شریعت کی رُو سے (جو سراسر قرآن کے خلاف ہے) اس کی وصیت کالعدم قرار دے دی جاتی ہے۔ اور وہ اس کے عمر بھر کے دشمن، اس کی جائیداد سے اپنا حق لے جاتے ہیں۔ کیا آپ خیال کرتے ہیں کہ اس شخص نے جو وصیت کی تھی اس سے ان بھائیوں کی حق تلفی ہوتی تھی اور اب جو کچھ وہ لے گئے ہیں وہ بالکل جائز اور "حق بحق دار رسید"

کے اصول کے مطابق ہے ؟

یا ایک شخص اپنی اولاد کو روزگار پر لگا کر، اپنے ترکہ کو منفعت عامہ کے لیے دے جاتا ہے۔ لیکن اس کے مرنے کے بعد، اس کی اولاد راستے میں کھڑی ہو جاتی ہے کہ وہ ایک تہائی سے زیادہ کے لیے وصیت نہیں کر سکتا تھا۔ ترکہ کا دو تہائی ہمارا حق ہے۔ وہ ہمیں ملنا چاہیئے۔

یہ تمام دعاوی اس غلط مفروضہ کے پیدا کردہ ہیں کہ ایک شخص کی املاک میں اس کے رشتہ داروں کا حق ہوتا ہے۔ قرآن اس حق کو تسلیم نہیں کرتا۔ وہ جب والدین یا دیگر اقربا کی مدد کرنے کی تائید کرتا ہے تو اسے احسان کہتا ہے۔ ان کا حق نہیں کہتا (وبالوالدین احسانا و بذی القربیٰ) اور ظاہر ہے کہ وہ جب کسی کی زندگی میں کسی کو اس کے مال کا حقدار قرار نہیں دیتا، تو یہ کس طرح روا ہو گا کہ اس کی موت کے بعد، یہ لوگ، اس کے حقِ وصیت کو برطرف کرتے ہوئے، اس کے ترکہ کا بطور اپنے حق کے مطالبہ کریں۔ ہاں! اگر وہ وصیت نہیں کرتا - یا اس کی وصیت کے بعد کچھ باقی بچ جاتا ہے، تو اس کے حقدار یہ لوگ ضرور ہو جائیں گے کیونکہ جو اس کا مالک تھا اس نے (وصیت نہ کرنے کی وجہ سے) اپنے حق کو آزاد چھوڑ دیا تھا۔ اور ایسی شکل میں قرآن نے ان لوگوں کے حصے مقرر کر دیے تھے۔

قرآن کی رُو سے مسلمان کے مال میں حق صرف محتاجوں اور ضرورت مندوں کا ہے (محض رشتہ دار ہونے کی بنا پر حق نہیں ہے)۔

اس کا ارشاد ہے کہ:-

فِیْٓ اَمْوَالِہِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ ——— ($\frac{۷۰}{۲۴ - ۲۵}$)

"وہ ان کے مال میں ان لوگوں کا حق ہے اور حق بھی ایسا جس کا ہر ایک کو علم ہے جن کی ضروریات ان کی کمائی سے پوری نہیں ہوتیں یا جو کمانے سے یکسر معذور ہو چکے ہیں اور اس طرح وہ ضروریاتِ زندگی سے محروم رہ جاتے ہیں۔" ظاہر ہے کہ جب ان ضرورت مندوں کی ضروریات کو انفرادی طور پر پورا کیا جائے گا تو اس کی ابتداً ہر شخص کے قریبی دائرے سے ہو گی۔ رشتے دار اگر ضرورت مند ہیں تو ضرورت مند ہونے کی حیثیت سے ان کا حق ہے، محض رشتے دار ہونے کی بنا پر حق نہیں۔ آیت ($\frac{۱۷}{۲۶}$) میں جہاں رشتہ داروں کے حق کا ذکر ہے تو وہاں انہیں مساکین کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ یعنی مسکین رشتے داروں کا حق۔ اگر اس کی وصیت سے کسی ایسے محتاج کی حق تلفی ہوتی ہے، تو قرآن نے اس کی گنجائش رکھی ہے کہ مناسب

طریق سے دجسے معاشرہ طے کرے) اس کا ازالہ کر دیا جائے۔ چنانچہ جس آیت میں وصیت کا حکم دیا گیا ہے اس سے آگے ہے کہ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَیْنَھُمْ فَلَآ اِثْمَ عَلَیْہِ ... (۲/۱۸۲) یعنی اگر کوئی شخص یہ محسوس کرے کہ وصیت کرنے والے نے انصاف سے کام نہیں لیا، وہ کسی کی طرف جھک گیا ہے اور اس سے کسی حقدار کی حق تلفی ہوتی ہے، تو اسے چاہیئے کہ متعلقین میں مصالحت کی صورت پیدا کر دے۔ یہ چیز، وصیت بدل دینے کے مترادف نہیں ہوگی جو جرم ہے۔

آخر میں اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ وصیت اور وراثت کے یہ احکام اس دور سے متعلق ہیں جب قرآنی نظام معاشرہ اپنی مکمل شکل میں ہنوز قائم نہ ہوا ہو۔ جب وہ نظام قائم ہو جائے گا تو اس وقت نہ ذاتی جائدادیں کھڑی کی جائیں گی نہ ان کی تقسیم کا سوال پیدا ہوگا۔ جیسے نبی اکرمؐ نے نہ کوئی جائداد چھوڑی، نہ اس کے لیے وصیت کی ضرورت پڑی۔ جو کچھ آپ کے مصرف کے لیے تھا، وہ بیت المال کی طرف لوٹ گیا تاکہ وہ دوسرے ضرورت مندوں کے کام آسکے۔ (سلیمٰ ۱۹۶۳ء)

---

۱۱ — ترکہ اور وصیت

ایک صاحب رقم طراز ہیں۔

آپ نے کئی مرتبہ لکھا ہے کہ قرآن کریم کے احکام .... ہمارے وقتی مصالح اور مقتضیات کی رعایت رکھتے ہوئے ہمیں اجازت دیتے ہیں کہ ہم اپنے حالات کے مطابق فیصلے کرلیں لیکن اس باب میں ایک اہم سوال سامنے آتا ہے جس کا جواب میری سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ قرآن کریم انسان کو اس کی ملکیت کی چیزوں پر تصرف کا حق دیتا ہے لیکن اِن کی تقسیم کے لیے اس کے مقتضیات کی کوئی رعایت نہیں رکھتا بلکہ تقسیم وراثت کے ایسے حصے مقرر کرتا ہے جن میں تغیّر وتبدّل کا اسے کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ مثال کے طور پر لیجیئے۔ ایک شخص نے اپنے بڑے بیٹے کو لکھایا پڑھایا۔ ولایت تک پاس کرایا۔

اب وہ نہایت معقول ملازمت میں ہے۔ ہزاروں روپے کی آمدنی رکھتا ہے۔ خود صاحب جائداد بھی ہے۔ اس شخص کا دوسرا لڑکا ابھی ایک سال کا بھی نہیں ہوا کہ اس کی موت کا وقت قریب آجاتا ہے۔ حالات کا تقاضہ ہے کہ اس ننھے سے یتیم کی کفالت کے لیے ترکہ الگ کر دیا جائے لیکن اسے اس پر کچھ اختیار نہیں۔ قرآن کی رُو سے بڑا بیٹا برابر کا حصہ لے جائے گا۔ میرا خیال ہے کہ اس قسم کی مجبوریاں تھیں جن کی وجہ سے پنجاب کی زراعت پیشہ اقوام نے زمین میں سے لڑکیوں کو حصہ دینا بند کر دیا تھا۔ ایک شخص کی تھوڑی سی اراضی ہے۔ اس کی لڑکی پچاس میل کے فاصلے پر کسی گاؤں میں بیاہی ہوئی ہے۔ اس شخص کے ورثہ میں سے اس لڑکی کا حصہ نکالیے تو چپہ بھر زمین نہ لڑکی کے کسی کام کی نہ اس کے بیٹے کے۔ اسی طرح کی اور مثالیں ہیں۔ کیا آپ تحریر فرمائیں گے کہ ان امور میں ذاتی مصالح اور مقتضیات کا لحاظ کیسے رکھا جائے گا۔

جواب۔

آپ نے جن دقّتوں کا فرمایا ہے وہ وراثت کے اس قانون کی پیدا کردہ ہیں جو ہمارے ہاں صدیوں سے مروّج چلا آرہا ہے۔ لیکن جو بدقسمتی سے قرآن کے خلاف ہے۔ یہ مشکلات اس بنا پر پیش آتی ہیں کہ ہم نے یہ سمجھ رکھا ہے (اور یہی ہمارے ہاں کا مروّجہ قانون وراثت ہے) کہ کسی شخص کو اپنے مال اور جائیداد میں وصیّت کا حق نہیں۔ قرآن نے جو حصے مقرر کر رکھے ہیں اس کا ترکہ بالکل انہی حصّوں کے مطابق تقسیم ہوگا۔ یہ غلط ہے اور قرآن کی تعلیم کے صریحاً خلاف، قرآن نہ صرف وصیت کی اجازت ہی دیتا ہے بلکہ اسے فرض قرار دیتا ہے سورۃ بقرہ میں ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ
لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ (۲/۱۸۰)

مسلمانو! یہ بات تم پر فرض کر دی گئی ہے کہ جب تم میں سے کوئی آدمی محسوس کرے کہ اس کے مرنے کی گھڑی آگئی ہے اور وہ اپنے مال و متاع میں سے کچھ چھوڑ جانے والا ہے، تو وہ اپنے ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے وصیت کر جائے جو متقی انسان ہیں ان کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔

اس آیۂ مبارکہ پر غور کیجئے اور دیکھیے کہ اس سے زیادہ واضح اور صریح حکم اور بھی کوئی ہو سکتا تھا؟

آیت کی ابتداء اس سے ہوتی ہے کہ تم پر وصیّت فرض قرار دی گئی ہے۔ اور انتہا اس پر کہ یہ وصیّت متقیوں کے لیے نہایت ضروری ہے۔ پھر سورۂ مائدہ آیات (۱۰۷ – ۱۰۶) میں یہ تاکید آئی ہے کہ اس وصیت کے لیے گواہ بھی مقرر کئے جائیں۔ اور ان گواہوں کی شہادت مشکوک نظر آئے تو پھر کیا کیا جائے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب مسلمان کو اس کے ترکہ کی تقسیم کے لیے وصیت کی اجازت (بلکہ تاکید) ہے۔ تو پھر قرآن کریم نے تقسیم وراثت کے حصے کس لئے متعین کئے ہیں۔ اس سوال کا جواب خود قرآن ہے اور ان آیات کے اندر جن میں وراثت کے حصے متعین کئے گئے ہیں۔ احکام وراثت سورۂ نساء کے شروع میں آتے ہیں۔ آیات نمبر ۱۱ تا آیت نمبر ۱۳ کو دیکھیے۔ "پہلے اولاد، والدین اور بہن بھائیوں کے حصوں کا ذکر ہے اور اس کے بعد فرمایا ہے مِنۢ بَعْدِ وَصِيَّةٍ يُوصِي بِهَآ أَوْ دَيْنٍ (۴/۱۱) یہ حصے اس وصیت کے بعد تقسیم ہوں گے جو میّت نے کی ہو یا جو کچھ اس نے قرض چھوڑا ہو اس کی ادائیگی کے بعد" اس کے بعد پھر ارشاد ہے کہ یہ تقسیم، وصیت کی تعمیل اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوگی۔ پھر تیسری مرتبہ بھی یہی ارشاد فرمایا ہے اس کے بعد باقی ماندہ حصّوں کا ذکر ہے۔ اور اس کے بعد پھر چوتھی مرتبہ وہی ارشاد ہے کہ یہ تقسیم میّت کی وصیّت اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوگی اور اس کے بعد فرمایا کہ وَصِيَّةً مِّنَ اللَّهِ (۴/۱۲) یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے۔ ان الفاظ پر احکامِ وراثت کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔

اب آپ سوچ لیجئے کہ بات کس قدر واضح ہے یعنی ہر مسلمان پر وصیت فرض کی گئی ہے۔ اسے اپنی جائداد واموال کی تقسیم میں پورا پورا اختیار ہے کہ اپنے مصالح ومقتضیات کے مطابق جسے جی چاہے اور جتنا جی چاہے دے دے۔ لیکن اگر اتفاق ایسا ہو جائے کہ کسی وجہ سے انسان وصیّت نہ کر سکا ہو۔ یا اس کا ترکہ وصیّت سے بڑھ جائے تو اس صورت میں اللہ تعالیٰ نے اس کے ورثے کی تقسیم اس کے وارثوں پر نہیں چھوڑی بلکہ اس کے حصے خود مقرر کر دیئے ہیں۔ یہ ہیں وہ حصے جو غیر متبدّل ہیں۔

لیکن جائداد کے اس اختیار کو بھی "بے لگام" نہیں چھوڑا گیا کہ انسان مستحقین کو محروم کر دے اور اپنی جائداد میں ناانصافی سے کام لے۔ اس لیے جہاں وصیّت اور قرضہ کا ذکر فرمایا۔ وہاں یہ بھی ارشاد فرمایا کہ غَيْرَ مُضَآرٍّ (۴/۱۲) بشرطیکہ وصیّت اور قرضہ سے مقصود (حقداروں کو) نقصان پہنچانا نہ ہو۔ اگر اگر کسی نے ایسا کیا ہے اور اس کا علم اس کی زندگی میں ہو گیا ہے تو جماعت کو حق دیا گیا ہے کہ وہ اصلاحِ حال کی صورت پیدا کر دے۔

فَمَنْ خَافَ مِنْ مُّوْصٍ جَنَفًا اَوْ اِثْمًا فَاَصْلَحَ بَیْنَھُمْ (۲/۱۸۲)

اگر کسی شخص کو وصیّت کرنے والے سے بے جا رعایت کرنے یا کسی معصیت (بے انصافی) کا اندیشہ ہو تو (اسے چاہیئے کہ) وہ بروقت مداخلت کرکے اور وارثوں کو (سمجھا بجھا کر) ان میں مصالحت کرا دے۔

اور اگر یہ صورت اس کی موت کے بعد واقع ہو تو اس کی وصیّت میں ضروری ردّو بدل کرا دیا جائے۔ لیکن یہ اختیار صرف اسلامی عدالت کو حاصل ہوگا۔ افراد کو نہیں۔

یہ ہیں وصیّت اور ترکہ کی تقسیم کے بارے میں قرآن کے احکام۔ غور کیجئے کہ کس قدر واضح اور غیر مبہم ہیں یہ احکام۔ لیکن اس کے باوجود مقامِ صد حیرت ہے کہ مسلمانوں کا "مسلّمہ" قانونِ وراثت کس قدر قرآن کے خلاف ہے۔ اور یہ حیرت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ یہ قانونِ وراثت ہم میں صدیوں سے چلا آرہا ہے۔ اس پر سوائے اس کے کہ انسان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ جائے اور کیا کرے۔ اس قانون میں یا تو سرے سے وصیّت کی اجازت ہی نہیں۔ اور اگر اجازت ہے تو صرف تہائی مال میں اور وہ بھی وارثین کے لیے نہیں۔ اور یا للعجب! کہ اس قانون کو منسوب کیا جاتا ہے اس ذاتِ گرامیؐ کی طرف جس کی حیاتِ طیبہ کا ایک ایک سانس قرآن کے اتباع میں گزرا۔ اور یہ صرف اس لیے کہ بدقسمتی سے ہمارے مجموعۂ روایات میں ایک روایت اس قسم کی شامل ہو گئی ہے۔ اب روایت پرستی کا تقاضا ہے کہ اس روایت کو صحیح سمجھا جائے خواہ اس سے قرآن کریم کے صریح احکام کی مخالفت ہی کیوں نہ ہوتی ہو اور خواہ اس سے حضور صاحبِ قرآن (علیہ التحیہ والسلام) کی ذاتِ اقدس پر طعن بھی کیوں نہ آئے۔ آپ اس کا خیال بھی کر سکتے ہیں کہ قرآن کریم وصیّت کو فرض قرار دے۔ اور بلا مشروط یعنی پورے مال میں وصیت کا حق دے۔ (اور اس کی تاکید کرے) اور رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ فرمائیں کہ نہیں! وصیت صرف ایک تہائی مال میں ہو سکتی ہے۔ اور وہ بھی غیر وارثین کے لیے، خدا کے حکم میں ایسا ردّو بدل یقیناً رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وسلم) کی شانِ اقدس کے خلاف ہے۔ لیکن بایں ہمہ ہمارے یہاں یہ قانون موجود ہے اور صدیوں سے اس پر امّت کا عمل ہوتا چلا آرہا ہے۔

امید ہے کہ آپ کے وہ شکوک اب رفع ہوگئے ہیں جن کا ذکر آپ نے اپنے خط میں فرمایا

ہے۔ لیکن ایک بات قابل گذارش اور ہے۔ اور وہ زمین کے ترکہ کے ضمن میں ہے، جس کا ذکر آپ نے اپنے خط کے آخری حصہ میں فرمایا ہے۔ قرآن کی رُو سے زمین پر کسی کی انفرادی ملکیت جائز نہیں اس لیے زمین کی تقسیم وراثت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ زمین رزق کا سرچشمہ ہے۔ اس کی خرید و فروخت، اجارہ داری، زمین داری، یا تقسیم بطور ترکہ خارج از بحث ہے (لیکن یہ سوال الگ ہے اور جدا گانہ تفصیل کا محتاج)۔

آخر میں اتنی وضاحت اور بھی ضروری ہے کہ ہم اپنے مصالح اور مقتضیات کے مطابق جزئیات متعین کرنے کے لیے صرف انہی امور میں مجاز ہیں جن کی جزئیات قرآن کریم نے خود متعین نہیں کیں۔ جن جزئیات کو قرآن نے خود متعین کر دیا ہے ان میں کسی کو ردّ و بدل کا حق نہیں۔ اور قرآن کریم نے اگر ان کے ساتھ خود ہی بعض شرائط بھی لگا دی ہیں تو ان شرائط کی پابندی بھی ضروری ہے (تقسیم وراثت کے احکام مشروط ہیں وصیّت کے ساتھ)۔ (۱۹۵۳ء)

---

۱۲ —— یتیم پوتے کا حصّہ

کچھ عرصہ سے ہمارے پاس قرآن کریم کے قانون وراثت سے متعلق بہت سے استفسارات پہنچ رہے ہیں۔ ان میں سب سے نمایاں سوال یہ پوچھا جا رہا ہے کہ ہمارا مروّجہ فقہی قانون جس کی رُو سے یتیم پوتے کو دادا کے ترکہ سے محروم کر دیا جاتا ہے، قرآن کی رُو سے کیسا ہے؟

جواب

حقیقت یہ ہے کہ قرآن کریم نے اپنی چار مختصر سی آیات میں پورے کا پورا قانون وراثت جس حسن و خوبی اور جامعیت و اکملیت کے ساتھ بیان کر دیا ہے۔ جب نگہِ بصیرت اس پر غور کرتی ہے تو انسان قرآن کے اس اعجاز پر وجد کرنے لگ جاتا ہے۔ لیکن جب اس کی نگاہ اُس قانون پر پڑتی ہے۔ جو ہمارے فُقہا نے مرتّب کیا ہے۔ اور ہزاروں سال سے مسلمانوں میں مروّج چلا آرہا ہے۔ تو

ورطۂ حیرت میں ڈوب جاتا ہے کہ یہ کس قسم کا قانون ہے۔ اس مروّجہ قانون میں نہ صرف یہ کہ باہمد گر متضاد شقیں موجود ہیں۔ بلکہ اس میں قرآنی اصول کی صریح مخالفت بھی ہے۔ جنہیں قرآن وارث قرار دیتا ہے۔ یہ قانون انہیں وراثت سے محروم کر دیتا ہے۔ قرآن ان کے لیے کچھ حصہ مقرر کرتا ہے۔ یہ قانون اس کے خلاف کچھ اور ہی دیتا ہے۔ کہیں ایک ہی درجہ کے دو رشتہ داروں میں ایک وارث قرار پاجاتا ہے اور دوسرا محروم ہو جاتا ہے۔ وقس علیٰ ھذا۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مروّجہ قانون وراثت کا قرآن کی روشنی میں جائزہ لیا جائے اور اس میں جہاں جہاں کوئی غلطی نظر آئے اسے درست کر لیا جائے۔ اس وقت ہم قانون کے اس ایک گوشہ کو سامنے لائیں گے۔ جس کے متعلق نمایاں طور پہ استفسارات موصول ہوتے ہیں۔ یعنی یتیم پوتے کی وراثت کا سوال۔

قانون وراثت چونکہ ایک فنی (TECHNICAL) مسئلہ ہے۔ اس لیئے اسے سمجھنے کے لیے ذرا دقّتِ نظر کی ضرورت ہو گی۔ ہم کوشش کریں گے کہ اصطلاحات سے بچ کر اسے عام فہم اور سلیس انداز میں پیش کریں۔ لیکن اس کے باوجود آپ کے لیے ضروری ہو گا کہ آپ اسے یونہی رواں نہ پڑھتے جائیں بلکہ ایک ایک ٹکڑے کو سمجھ کر آگے بڑھیں۔

وماتوفیقی الا باللہ العلی العظیم۔

سب سے پہلے یہ دیکھئے کہ اصل مسئلہ ہے کیا۔ یہ اس طرح سمجھ میں آئے گا۔

زید

بکر (زید کی زندگی میں فوت ہو گیا) — خالد (زندہ ہے)

عمر (زید کی وفات کے وقت زندہ ہے) — حامد (زندہ ہے)

خالد اور حامد دونوں زید کے حقیقی پوتے ہیں۔ خالد یتیم ہے، اس کا باپ (بکر) زید کی زندگی میں فوت ہو چکا ہے۔ حامد زندہ ہے اور حامد کا باپ بھی زندہ ہے۔ زید کی وفات پر اس کی جائیداد کی تقسیم کا سوال پیش آتا ہے۔ ہمارا فقہی قانون وراثت کہتا ہے کہ اس جائیداد میں خالد (جو یتیم ہے) کچھ حصہ نہیں پائے گا۔ جائیداد عمر کو ملے گی (اور اس کی وساطت سے اس کے بیٹے حامد کو) اگر محض عقل عامہ

کی رُو سے بھی دیکھا جائے تو یہ فیصلہ سراسر ناانصافی پر مبنی دکھائی دے گا۔ خالد یتیم ہے۔ اس کے سر پر باپ کا سایہ نہیں۔ لیکن یہ اس کا جُرم قرار دے دیا جاتا ہے اور اس طرح اسے اپنے دادا کے ترکہ سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اگر اس کا باپ زندہ ہوتا تو وہ برابر کا حصہ لیتا۔ وہ مر چکا ہے۔ اس لیے اب خالد کو کچھ نہیں مل سکتا۔ اس کا چچا جائداد کا وارث ہو گا۔

اب آئیے اس طرف کہ ہمارے فقہا اس کے لیے دلائل کیا پیش کرتے ہیں۔ اس باب میں دو دلیلیں اہم ہیں۔

وہ کہتے ہیں کہ جو شخص مرنے والے کے ساتھ کسی دوسرے شخص کے واسطہ سے رشتہ رکھتا ہے وہ اس کی موجودگی میں ترکہ نہیں پا سکتا جو اس سے براہ راست رشتہ رکھتا ہے۔

یعنی خالد کا رشتہ اپنے دادا زید کے ساتھ اپنے والد بکر کے واسطے سے ہے براہ راست نہیں، ٹھیک ہے لیکن بکر تو مر چکا ہے۔ اس لیے اب خالد اور اس کے دادا (زید) کے درمیان کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس کا چچا (عمر) درمیان میں واسطہ نہیں بن سکتا۔ اس لیے کہ خالد کا اپنے دادا سے رشتہ اپنے چچا عمر کے واسطہ سے نہیں۔ اپنے باپ کے واسطہ سے تھا۔ اور یہ واسطہ اب درمیان سے نکل چکا ہے۔

اب اس مقام پر یہ معلوم کرنا دلچسپی سے خالی نہیں ہو گا کہ ہمارے فقہا خود اپنے وضع کردہ اصول پر بھی قائم نہیں رہتے۔ وہ خالد کو اپنے دادا (زید) کی وراثت سے تو محروم کرتے ہیں۔ لیکن اگر زید کی زندگی میں خالد مر جاتے۔ تو اس کی جائیداد زید کو دیتے ہیں یعنی دادا تو یتیم پوتے کا براہ راست رشتہ دار ہوتا ہے۔ لیکن وہی پوتا اپنے دادا کا براہ راست رشتہ دار نہیں ہوتا۔

اب ان کا دوسرا اصول لیجیے۔ دراصل یہ دوسرا اصول ہی وہ محکم اصول قرار دیا جاتا ہے۔ جس کی رُو سے یتیم پوتا وراثت سے محروم کر دیا جاتا ہے۔ اصول یہ ہے

الاقرب فالاقرب: یعنی قریب کے رشتہ دار کے ہوتے ہوئے بعید کا رشتہ دار محروم رہتا ہے۔

(دادا اور پوتے والی مثال میں) چونکہ عمر (زید کا بیٹا ہونے کی جہت سے) زید کا قریب کا رشتہ دار ہے۔ (اس لیے خالد (جو پوتا ہونے کی جہت سے زید کا بعید کا رشتہ دار ہے) عمر کی موجودگی

میں محروم رہ جائے گا۔

زید

بکر (قریب کا رشتہ دار)   عمر (قریب کا رشتہ دار)

خالد (عمر کی موجودگی میں زید کا بعید کا رشتہ دار)

اول تو یہ سُن لیجیے کہ ہمارے فقہا خود اپنے اس اصول پر بھی قائم نہیں رہتے اصول یہ ہے کہ:۔

"قریب رشتہ دار کی موجودگی میں بعید کا رشتہ دار محروم رہ جاتا ہے۔"

مثلاً رشید کا انتقال ہوگیا۔ اس کا دادا ابھی موجود ہے اور بیٹا بھی ظاہر ہے کہ بیٹا قریب کا رشتہ دار ہے۔ اور دادا بعید کا۔ لہٰذا اس کے بیٹے کی موجودگی میں اس کے دادا کو کچھ نہیں ملنا چاہیئے۔ لیکن ہمارے فقہا دادا کو حصہ دیتے ہیں اور اس طرح خود اپنا قائم کردہ اصول بھی قائم نہیں رہنے دیتے۔

اب آیئے اُس اصول کی طرف اُس اصول کو اس آیت سے مستنبط کیا جاتا ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ نَصِيبًا مَّفْرُوضًا (۴/۷)

مردوں کو حصہ ملے گا' اُس میں سے جو والدین اور اقرباء نے چھوڑا ہے۔ اور عورتوں کو حصہ ملے گا اُس میں سے جو والدین اور اقرباء نے چھوڑا ہے۔ خواہ ترکہ تھوڑا ہو یا بہت ایک معیّن حصہ (جو بعد میں بیان کیا گیا ہے)

یہ آیت میراث کے قانون کی تمہید ہے۔ اس وقت ہم اس عظیم اصول کی تشریح میں نہیں جانا چاہئیے۔ جو اُس قانون میں بیان کیا گیا ہے۔ نہ ہی اس میں کہ جب والدین خود اقرباء میں شامل ہیں تو ان کا الگ ذکر کیوں کیا گیا۔ یہ نکات اپنے مقام پر سامنے آئیں گے۔ اس وقت صرف نقطۂ زیرِ نظر سامنے رہنا چاہیئے۔ آیت میں اقربون آیا ہے جس سے مطلب یہ ہے کہ چونکہ رشتہ دار قرابت کے لحاظ سے قریب اور بعید ہوتے ہیں۔ مثلاً والدین، اولاد، اولاد کی اولاد، بہن بھائی، چچا، پھوپھی وغیرہ اور یہ ممکن نہیں کہ سب کے سب، خواہ قریب ہوں یا بعید، ایک ساتھ وارث ہوں اس لیے وراثت

کا مدار اقربیت پر ہے۔ یعنی میّت کے ترکہ میں اسی کو حصہ ملے گا جس کا وہ (مرحوم) اقرب ہوگا۔ قرآن نے یہ کہا ہے کہ اقرباء جو چھوڑ کر مریں اس میں سے ان مردوں اور عورتوں کو حصہ ملے گا۔ یہ نہیں کہا کہ میّت کے اقربین کو حصہ ملے گا۔ یہ فرق بڑا نازک ہے۔ اور اس کو نظرانداز کر دینے سے تدوین فقہ کے وقت یہ اصول بنایا گیا ہے کہ میت کا قریبی رشتہ دار اپنے سے دُور کے رشتہ دار کو محروم کر دیتا ہے۔ اور اس اصول کی بنا پر یتیم پوتے کو مرنے والے کے بیٹے کی موجودگی میں وراثت سے محروم کر دیا۔

یہ فرق چونکہ بڑا نازک ہے اس لیے اسے اور وضاحت سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ تمہارے اقرب جو چھوڑ کر مریں اس کی تقسیم یوں ہوگی۔ یعنی دیکھنا یہ ہوگا کہ مرنے والا اپنے زندہ رشتہ داروں میں سے کس کس کا اقرب تھا۔ اقرب کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اور میّت میں کوئی درمیانی واسطہ موجود نہ ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ زندہ رشتہ داروں میں سے جو میّت کا سب سے قریبی ہو اسے حصہ ملے گا جو اس سے دور کا رشتہ دار ہو اسے حصہ نہیں ملے گا۔ ہر اقرب کو حصہ ملے گا۔ یعنی ہر اُس رشتہ دار کو جس کے اور میّت کے درمیان کوئی واسطہ موجود نہ ہو۔ مثلاً

سعید ——— کریم کا دادا زندہ ہے

رحیم ——— کریم کا والد فوت ہو چکا ہے

متوفی کریم ——— اس کی وفات ہوئی ہے

رشید ——— کریم کا بیٹا زندہ ہے

کریم کا قریب ترین رشتہ دار رشید ہے (بیٹا جو بلاواسطہ رشتہ دار ہے) سعید (کریم کا دادا) کریم کا بالواسطہ رشتہ دار ہے۔ اگر یہ اصول مان لیا جائے کہ قریب ترین کی موجودگی میں اس سے بعید رشتہ دار محروم ہو جاتا ہے تو رشید کی موجودگی میں سعید کو محروم ہو جانا چاہیئے۔ لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ رحیم کی وفات کے بعد سعید اور رشید دونوں کریم کے اقرب ہو گئے۔ اوپر کی طرف کریم اور سعید کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ اور نیچے کی طرف کریم اور رشید کے درمیان کوئی واسطہ نہیں۔ لہٰذا اقرب کے معنی ہوئے وہ رشتہ دار جس کے اور متوفی کے درمیان متوفی کی وفات کے وقت کوئی واسطہ موجود نہ ہو۔ جب یہ صورت ہے، تو پھر پہلی مثال کو سامنے لایئے۔

جس طرح اوپر کی مثال میں رحیم کی وفات سے سعید اور کریم اقرب (براہ راست رشتہ دار) ہو گئے تھے۔ اسی طرح بکر کی وفات سے زید اور خالد اقرب (براہ راست رشتہ دار) ہوگئے ہیں۔ اور براہ راست رشتہ دار (اقرب) وارث ہوتا ہے لہذا خالد کو زید کے ترکہ میں سے حصہ ملے گا۔ حامد کو نہیں ملے گا۔ کیونکہ اس کے اور زید کے درمیان عمر موجود ہے۔ اگر عمر بھی فوت ہوچکا ہوتا۔ تو پھر خالد کی طرح حامد کو بھی حصہ مل جاتا۔

فقہا نے اقرب کا استعمال ورثہ (زندہ رشتہ داروں) کے لیے کیا جس سے بہت سی غلطیوں میں پڑ گئے۔ قرآن کے بیان کردہ اصولوں کے بعد ہم کو صرف یہ متعین کرنا تھا کہ میت کس کس کا اقرب ہوتا ہے۔ اس کے سوا اور کسی قاعدے کے بنانے کی ضرورت ہی نہ تھی۔ فقہ نے لفظ اقرب کی نسبت غلطی کی اور پھر جو قواعد اس پر متفرع کئے ان پر عمل کرنا ناممکن ہوگیا۔ جس کی وجہ سے کہیں تو اپنے بنائے ہوئے قواعد کے خلاف چل نکلے۔ اور کہیں قرآن کے بھی خلاف۔

اس سے یہ مراد نہیں کہ ہمارے فقہا (رحمہم اللہ) نے دانستہ ایسا کیا ہے۔ ہر انسان سے تفقہ میں غلطی کا امکان ہے اس لیے قصور اُن کا بھی نہیں۔ اصل میں قصور ہے اس ذہنیت کا جس کی رُو سے یہ عقیدہ بنا لیا گیا کہ اسلاف میں سے جو کچھ کسی نے کہدیا ہے، وہ منزّل من اللہ کی طرح تنقید کی حد سے بالا ہے۔ اس لیے اس کے متعلق کسی پس آئند کا سوچنا بہت بڑا گناہ ہے۔ ہمیں اپنے اسلاف کی فکر کے نتائج پر آنکھیں بند کرکے چلتے جانا چاہیئے۔ اسلاف پرستی اس قوم کو لے ڈوبی۔ اسی ایک مسئلۂ وراثت کو لیجیئے۔ قرآن نے وصیّت کا حکم دے کر انفرادی مصالح کی حفاظت کا پورا پورا سامان کر دیا ہے۔ فقہ اور روایات نے وصیّت کو ممنوع قرار دے کر ان تمام مصالح کو ختم کر دیا جس سے عجیب عجیب قسم کی الجھنیں پیدا ہوگئیں۔ پھر قانون وراثت میں تفقہ کی غلطیوں نے قرآنی قانون کو کچھ سے کچھ بنا دیا جس سے کروڑوں جائز وارث اپنے آباؤاجداد کی جائیدادوں سے محروم ہوگئے۔

اگر اسلاف پرستی نہ ہوتی تو ایک کی اجتہادی غلطی کی گرفت دوسرا کر لیتا۔ اور اس طرح اس کے نقصانات آگے نہ بڑھتے۔ اس ایک مثال سے آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جب ہم یہ کہتے ہیں کہ قانونِ اسلامی کا مدار قرآن پر ہونا چاہیئے تو اس سے کیا مراد ہوتی ہے، آپ اندازہ فرمائیے کہ اگر ہم نے اس فیصلہ کے بعد کہ ہماری حکومت کا آئین اسلامی ہونا چاہیئے۔ آئین و قانون سازی کا کام اُن کے سپرد کر دیا جن کا عقیدہ ہے اور فقہ اور روایات میں جو کچھ لکھا چلا آ رہا ہے وہ وحی منزّل کی طرح منزّہ عن الخطاء ہے اور ہمیں اس پر تنقید کا کوئی حق نہیں۔ تو ان کا وضع کردہ آئین و قانون کس حد تک قرآنی ہو سکتا ہے؟ قرآنی آئین و شریعت صرف قرآن سے اخذ کیا جا سکتا ہے، جب ہم قرآن سے باہر جائیں گے، تو قدم قدم پر ٹھوکریں کھائیں گے[1]۔

وَفِيهَا بَصَائِرُ لِلنَّاسِ (۱۹۵۲ء)

---

۱۳ ——— اوقاف

ہمارے بزرگوں میں سے کسی نے اپنی جائیداد کا ایک حصہ اس غرض کے لیے وقف کر دیا تھا کہ اس کی آمدنی سے ایک خانقاہ (مزار) کی دیکھ بھال کا انتظام کیا جائے۔ ہم اس وقف کے متولی ہیں، قبر پرستی کو شرک سمجھتے ہیں۔ اب سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کی صورت کیا ہو۔ کیا آپ تحریر فرمائیں گے کہ وقف کی اصلی حیثیت کیا ہے؟

جواب۔

وقف کی شرعی حیثیت اہل فقہ اور اہل حدیث دونوں کے ہاں مسلّم چلی آ رہی ہے۔ وقف سے مفہوم یہ ہے کہ الوقف لا یملك ولا یوھب ولا یورث یعنی وقف نہ کسی کی ملکیت ہوتا ہے نہ

---

[1] للہ الحمد کہ اب فیملی لاز میں یتیم پوتے کا حصہ تسلیم کر لیا گیا ہے اگرچہ علماء حضرات نے اس کی سخت مخالفت کی تھی۔ (۱۹۶۴ء)

فروخت کیا جا سکتا ہے۔ نہ ہبہ کیا جا سکتا ہے۔ نہ اس میں وراثت جاری ہوتی ہے۔ لیکن جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس قسم کے وقف کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ بلکہ یہ قرآن کے منشاء کے خلاف ہے قرآن میں انتقالِ اموال کی جتنی شکلیں بیان ہوئی ہیں۔ ان میں سے کہیں بھی اس قسم کے وقف کا جواز نہیں نکلتا۔ مثلاً خرید و فروخت، بخشش، وصیت، وراثت، قرض، خیرات وغیرہ میں سے کوئی ایسی شکل نہیں جس میں منتقل کردہ مال دوسرے کی ملکیت میں نہ چلا جائے، اور اس پر پہلے مالک کا بدستور قبضہ رہے۔ اور یہ قبضہ اس کی زندگی تک ہی محدود نہ ہو بلکہ ابدالآباد تک مسلسل چلا جائے۔ کیونکہ قبضہ کے معنی یہ ہیں کہ مال کا تصرف مالک کی مرضی کے مطابق ہو۔ اور وقف کی یہی خصوصیت ہے کہ اس میں قیامت تک مال موقوف کی مرضی کے مطابق صرف ہوتا ہے۔ اس کے خلاف نہیں ہو سکتا۔

اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ درحقیقت وقف کا جذبۂ محرکہ صاحب اموال و جائیداد کی وہ ہوسِ اقتدار ہے جس کی بنا پر وہ دوسروں سے اپنی مرضی کے مطابق کام کراتے ہیں۔ موت کا ہاتھ اس قوت و اختیار کو ان سے چھیننا چاہتا ہے۔ لیکن انہوں نے اس کی بقا کی یہ شکل پیدا کر لی ہے کہ وہ اپنی جائیداد کو وقف کر جائیں۔ اور اس طرح قیامت تک ان کی مرضی و منشا جاری و ساری رہے۔ یہاں یہ کہا جائے گا کہ وقف عام طور پر "نیک کاموں" کے لیے کیا جاتا ہے، اس لیے اوقاف تو قوم کا مستقل سرمایہ ہوتے ہیں۔ لیکن ذرا سوچئے کہ قوم کے کام تو وہی سرمایہ آ سکتا ہے جو قوم کی ضرورت کے وقت کام آئے اور قوم کی ضرورتیں صبح و شام بدلتی رہتی ہیں۔ مستقبل کی ضروریات کا تعین مُردوں کے سپرد کر دینا قوم کو ماضی کی زنجیروں کے ساتھ باندھ دینا ہے۔ جو مر چکا ہے اسے کیا علم کہ قوم کو آج کس چیز کی ضرورت ہے۔ وہ قوم کے سرمایہ (یعنی جائیداد موقوفہ کو جامد (FREEZE) کر کے رکھ دیتا ہے۔ غور کیجئے کہ اگر تمام صاحب جائیداد اپنی اپنی جائیداد کو مخصوص مقاصد کے لیے وقف کرتے جائیں۔ تو کچھ عرصہ کے بعد قوم ان مخصوص مقاصد کے علاوہ باقی امور کے لیے پائی پائی کی محتاج ہو جائے۔ "نیک کام" وہ ہے جو دنیا میں خدا کا قانون رائج کرنے والے نظام کی تقویّت کا موجب ہے۔ اس تقویّت کے لئے اسباب و ذرائع آئے دن بدلتے رہتے ہیں۔ بحالتِ امن اس تقویّت کا راز کسی اور چیز میں ہوتا ہے اور بحالت جنگ اس کے تقاضے کچھ اور ہو جاتے ہیں۔ وقس علیٰ ہذا۔ اسی لیے اگر ہر صاحب جائیداد، قومی سرمایہ کو ان مقاصد کے ساتھ وابستہ کرتا جائے۔ جنہیں وہ اپنی دانست اور اپنے زمانہ میں "نیک کام" سمجھتا

تھا تو اس سے قوم محتاج سے محتاج تر ہوتی جائے گی۔

کہا جاتا ہے کہ جب ایک شخص اپنے مال میں وصیّت کر سکتا ہے۔ تو وقف بھی تو وصیّت ہی کی ایک شکل ہے۔ لیکن ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وصیّت میں موصی کے مرنے کے بعد جس کے حق میں وصیّت کی گئی ہے وہ اس مال کا مالک بن جاتا ہے۔ اور اسے اپنی منشاء کے مطابق تصرّف میں لا سکتا ہے۔ برعکس اس کے وقف میں متولّی کو اس مال میں کسی قسم کے تصرّف کا اختیار نہیں ہوتا۔ اسے وصیّت کرنے والے کی مرضی کے مطابق صرف کرتے رہنا ہوتا ہے۔

لہٰذا قرآن کی رُو سے وقف کا کوئی جواز نہیں نکلتا۔ اگر کوئی شخص اپنے مال کو "نیک کاموں" میں صرف کرنا چاہتا ہے تو اس کی صحیح صورت یہ ہے کہ مال بروئے وصیّت ملّت کے نظامِ اجتماعی کے سپرد کر دیا جائے کہ وہ جس طرح مناسب سمجھیں اسے استعمال میں لے آئیں۔ یعنی ضروریات کا تعیّن زندوں کے سپرد ہو نہ کہ مُردوں کے اختیار میں۔

لیکن جس قوم نے "خدائی اختیارات" کو بھی مُردوں کے ہاتھ میں دے رکھا ہو وہ انسانی اختیارات کو ان کے ہاتھ سے چھیننے پر آمادہ کیوں ہونے لگی؟ (۱۹۶۳ء)

---

۱۴ — کیا خدمتِ دین کا معاوضہ لینا جائز ہے؟

سرگودھا سے ایک صاحب لکھتے ہیں کہ اس بات کی تصریح فرمائی جائے کہ دین کی تبلیغ و تعلیم کے معاوضہ کی طلب گاری کس حد تک جائز ہے۔ آج کل کے علماء کا ذریعہ معاش ہی یہی ہے۔

طلوعِ اسلام

یہ سوال بڑا اہم ہے کہ دین کی تبلیغ اور تعلیم کا صحیح نظام کیا ہے اور جو لوگ ان امور کی سرانجام دہی کے لیے مامور کئے جائیں، ان کے معاش کی صورت کیا ہونی چاہیئے۔ اس وقت بھی جب اسلامی نظامِ مملکت

موجود نہ ہو۔ اور اس نظام کے تابع بھی۔

اس سے ظاہر ہے کہ اس سوال کے دو حصے ہیں۔ ایک یہ کہ اسلامی نظام میں اس کی کیا شکل ہوگی اور دوسرا یہ کہ جب وہ نظام قائم نہ ہو اس وقت کیا صورت ہوگی۔

جہاں تک اسلامی نظام میں تعلیم کا تعلق ہے، ظاہر ہے کہ اس میں دین۔ دنیا سے الگ ہوتا ہی نہیں۔ اس میں یہ شکل ہوتی ہی نہیں کہ اذان دینے، نماز پڑھانے، وعظ کہنے اور فتوے دینے کے لیے کوئی الگ جماعت ہو۔ مذہبی پیشوائیت کا یہ تصور اس زمانے کا پیش کردہ ہے جب دین اور سیاست میں افتراق ہو گیا۔ دین، مذہب میں تبدیل ہو گیا اور یوں ہمارے ہاں بھی، دیگر اہلِ مذاہب کی طرح مذہبی پیشواؤں کا الگ گروہ پیدا ہو گیا۔ دین کے نظام میں وہ تمام امور جنہیں مذہبی پیشوائیت نے اپنی تحویل میں لیا تھا، دین کے اجزا، فلہذا امورِ مملکت تھے اور مملکت ہی انہیں سرانجام دیا کرتی تھی۔ اس مقصد کے لیے جو عمّال مقرر کئے جاتے تھے ان کے معاش کی ذمہ داری بھی مملکت کے سر ہوتی تھی۔ چنانچہ اس باب میں سربراہ مملکت سے لے کر نیچے تک، ہر ایک کی کفالت مملکت کی طرف سے ہوتی تھی۔ اس سلسلہ میں اور تو اور خود نبی اکرمؐ کے معاش کی کفیل بھی مملکت ہی تھی۔ یہی صورت، خلفائے راشدینؓ کی تھی۔ ان کا سارا وقت امورِ مملکت (یعنی خدمتِ دین) میں صرف ہو جاتا تھا۔ اس لئے ان کی ضروریات مملکت کی طرف سے پوری ہوتی تھیں۔ قرآن کریم میں جو آیا ہے کہ حضرات انبیاء کرامؑ (مع نبی اکرمؐ) اپنی قوم سے کہا کرتے تھے کہ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ۔ میں تم سے کوئی معاوضہ نہیں مانگتا، تو اس کے مخاطب وہ غیر مسلم ہوتے تھے جن تک یہ حضرات اپنی دعوت پہنچاتے تھے، نہ کہ وہ لوگ جو ان کی دعوت قبول کر کے، ان کے نظام میں شامل ہو جاتے تھے اور اس سے مراد اگر اپنے لوگ بھی لے لیے جائیں تو اس اعلان کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ ان سے انفرادی طور پر کوئی معاوضہ نہیں مانگتے تھے۔ ان کا معاوضہ اجتماعی نظام کے ذمے ہوتا تھا۔ اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ (میرا اجر اللہ کے ذمہ ہے) کے یہی معنی تھے کہ میں ان امور کو فریضۂ خداوندی سمجھ کر سرانجام دیتا ہوں اور اس کا معاوضہ نظام خداوندی کے ذمہ ہے۔ انفرادی طور پر کسی کے ذمہ نہیں۔ سربراہِ مملکت سے نیچے اتریئے تو یہی صورت عمّال حکومت کی تھی۔ چنانچہ قرآن کریم نے محصلین زکوٰۃ (حکومت کی آمدنی وصول کرنے والوں) کی کفالت کا ذکر خاص طور پر کیا ہے۔ اذان۔ امامت۔ خطابت۔ تعلیم۔ سب اعمالِ مملکت کے فرائض تھے۔ باقی رہی دین کی تبلیغ،

سودہ عمال حکومت کے علاوہ انفرادی طور پر بھی ہر مومن کا فریضہ تھی۔ لہٰذا اس کے معاوضہ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔

اب رہا وہ دور جس میں اسلامی نظام قائم نہ ہو، (جیسا کہ اس وقت ہے) تو اس سلسلہ میں موجودہ صورتِ حال نہ صرف بڑی نا اطمینان بخش بلکہ تباہ کن بھی ہے۔ اب اذان۔امامت۔خطابت۔وعظ نصیحت وغیرہ سب کا شمار "خدمتِ دین" کے زمرے میں کر لیا گیا ہے اور اس خدمت کو وہ لوگ سنبھال لیتے ہیں، جن کا ذریعہ معاش کوئی اور نہیں ہوتا۔ اس کے لیے بھی ایسی شکل نہیں کہ اس مقصد کے لیے جس قدر ضرورت ہو اسی کے مطابق لوگ پیدا ہوں۔ (جیسا کہ ملک کے دوسروں شعبوں میں ہوتا ہے) اس کے لیے ہر سال ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ایسے لوگ نکلتے چلے آ رہے ہیں اور چونکہ ان کے لیے خالی اسامیاں موجود نہیں ہوتیں۔ اس لیے وہ اپنی جگہ آپ پیدا کر لیتے ہیں۔ اور اس کا معاوضہ قوم سے وصول کرتے ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ کتنی مساجد ہیں جنہیں امام مسجد اپنی جگہ پیدا کر لینے کے لیے بنوا ڈالتے ہیں۔ اسی طرح جگہ جگہ وعظ کہتے پھرتے ہیں۔ قوم سے روپیہ بھی وصول کرتے ہیں اور احسان بھی دھرتے ہیں کہ وہ دین کی خدمت سرانجام دیتے ہیں۔ یہ خدمت اس کے سوا اور کیا ہوتی ہے کہ اُمّت میں باہمی نفرت اور عداوت کے جذبات کو مشتعل کیا جاتا ہے۔ اور بھائی کو بھائی سے الگ کر کے رکھ دیا جاتا ہے۔ اسی طرح وہ طالب علم جو مذہبی دارالعلوموں سے فارغ ہو کر نکلتے ہیں تلاش معاش میں سرگرداں پھرتے ہیں۔ اور جب انہیں کہیں اور جگہ نہیں ملتی تو وہ ایک مدرسہ قائم کرنے کی تدبیر کر لیتے ہیں۔ آپ سوچئے کہ اس طرح ملک میں ایسے لوگوں کی تعداد کس قدر بڑھتی جا رہی ہے جو خود کمانے کے قابل نہیں اور دوسروں کی کمائی پر بوجھ بنتے ہیں۔ ایسے ملک کی معاشی حالت کبھی سُدھر ہی نہیں سکتی۔

اس وقت ہمارے ہاں مساجد سے صرف اتنا کام لیا جاتا ہے کہ دن میں پانچ مرتبہ نماز پڑھ لی جائے اور جمعہ کے روز خطبہ سنا دیا جائے۔ پہلے تو یہ دیکھئے کہ اتنے سے کام کے لئے لاکھوں روپے کی عمارت باقی تمام وقت بیکار پڑی رہتی ہے۔ پھر اس کام کے لیے کم از کم ایک مؤذن اور ایک امام۔ اور بعض مساجد میں خطیب۔ مستقل طور پر رکھے جاتے ہیں جن کا فارغ وقت کاٹے نہیں کٹتا۔ انسان بالآخر کتنا وقت سو کر گذار سکتا ہے؟ مؤذن کے لیے تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ایک شخص کو اوقاتِ مقررہ پر اذان دینی ہوتی ہے۔ اس لیے موجودہ حالات میں اس مقصد کے لیے کسی ایک آدمی کا تعین

ضروری ہے۔ لیکن امامت کے لیے تو اس کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا کہ ایک شخص جس نے بالآخر خود بھی نماز پڑھنی ہے، اس لیے تنخواہ دار ہو کہ وہ باقیوں سے ذرا آگے کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہے، ویسے بھی امامت کے لیے مسئلہ یہ ہے کہ جس قدر نمازی جمع ہوں۔ ان میں سے جو شخص دوسروں کی نسبت قرآن سے زیادہ واقف ہو، اسے وہ نمازی امام منتخب کر لیں۔ اس کام کے لیئے ایک الگ مستقل آدمی مقرر کر رکھنا خالص پاپائیت ہے۔ یہی صورت جمعہ کی نماز اور خطبہ کی ہونی چاہیئے۔ حاضر نمازیوں میں سے جو شخص زیادہ صاحبِ علم ہو وہ لوگوں کو کام کی باتیں بتائے۔ خطبہ کے معنی ہی دوسروں کو مخاطب کرنا یا ان سے بات چیت کرنا ہے۔ کرنے کا کام یہ ہے کہ مساجد میں اسکول قائم کرائے جائیں اور ان کا نظام الاوقات ایسا رکھا جائے کہ نماز کے وقت نمازی ان میں نماز بھی ادا کر لیں۔ اسکول کا مدرس، مسجد کی حفاظت بھی کرے اور وقت پر اذان بھی دے دے۔ یہ شخص جو اس کام کے لیئے اپنا سارا وقت دے گا، یقیناً اس کا مستحق ہو گا کہ اس کی ضروریات کی مکتفل قوم ہو۔ اس کے لیئے معاوضہ بالکل جائز ہو گا۔ اس کی یہ خدمت غیر اسلامی نظام میں بھی، ایک حیثیت سے "دین کی خدمت" تصور کی جا سکے گی کیونکہ بچوں کو صحیح تعلیم دینا، دین کی خدمت ہے، بشرطیکہ اس تعلیم کو محض "مذہبی تعلیم" تک محدود نہ کر دیا جائے۔ جب ہم مذہبی اور دنیاوی تعلیم کو یک جا کر دیں گے تو وہ دینی تعلیم ہو جائے گی۔

اب رہا تبلیغ کا سوال، سو (اس وقت) یہ خود مسلمانوں کے اندر بھی ہو گی۔ اور غیر مسلموں میں بھی۔ مسلمانوں کے اندر اس لیئے کہ مسلمان، قرآن سے بہت دور چلا گیا ہے اور ہمارا مروجہ اسلام، دین خداوندی سے کچھ الگ چیز ہو چکا ہے۔ مسلمانوں کے سامنے دین کا صحیح تصور لانے کی بے حد ضرورت ہے۔ مسلموں سے ہماری مراد یہ ہے کہ اس وقت عیسائی مشنریز، مسلمانوں کے ممالک میں سیاسی مقاصد کے پیش نظر، بڑی شدت اور تیزی سے عیسائیت کی تبلیغ میں مصروف ہیں۔ اس خطرہ کی مدافعت نہایت ضروری ہے۔ ویسے بھی قرآن کریم کے پیغام کا دوسرے انسانوں تک پہنچانا اُمت مسلمہ کا اوّلین فریضہ ہے۔

اب اگر قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں جو ان مقاصد کے لیے موزوں سمجھے جاتے ہیں، اور ان کا سارا وقت یا اس کا بیشتر حصہ اس کے لیئے وقف ہو جاتا ہے، تو ان کی کفالت بھی بہر حال قوم کے ذمے ہو گی۔ ان سے یہ کہنا کہ حضرات انبیاء کرامؑ کا مسلک یہ تھا کہ "لا اسئلکم من اجر" ہم اس کے لیے کچھ معاوضہ نہیں چاہتے، اس لیئے اس خدمت کا معاوضہ لینا، انبیاء کرامؑ کے مسلک کے خلاف

ہے اس آیت سے بھی غلط استدلال کرنا ہے اور حقیقت سے بھی چشم پوشی۔ لیکن یہ کام کسی تنظیم کے تابع ہونا چاہیئے جو اس کا فیصلہ کرے کہ کس جگہ کس کام کی ضرورت ہے۔ اس کے لیئے کون سا آدمی موزوں ہے اور اس کی کفالت کا انتظام کس طرح ہوگا یہ نہیں کہ جس شخص کا جی چاہے خود ہی یہ کام شروع کر دے اور پھر قوم سے تقاضا کرے کہ وہ اس کی کفالت کا انتظام کرے۔ اس وقت یہ تو ممکن نظر نہیں آتا کہ اس قسم کی کوئی کلی تنظیم عمل میں آ جائے۔ اس لیئے سر دست انتظام مختلف اداروں یا جماعتوں کو ہی کرنا ہو گا۔ جو تنظیم یا جماعت یا ادارہ ایسے افراد کے سپرد اس قسم کا کام کرے، وہ ان کی ضروریات پوری کرنے کا انتظام بھی کرے۔ ان افراد کے لیئے اس قسم کا معاوضہ لینا عیب کی بات نہیں۔ (۱۹۶۳ء)

---

۱۵ اورنگ زیب کی روزی کا سلسلہ

ایک صاحب لکھتے ہیں۔ میں نے ایک تاریخ کی کتاب میں دیکھا ہے کہ اورنگ زیب قرآن شریف کی کتابت کر کے روزی کماتا تھا اور اس پر گذارہ کرتا تھا۔ یہ بات کچھ عجیب سی معلوم ہوتی ہے۔ کیا آپ اس پر کچھ روشنی ڈالیں گے؟

طلوع اسلام

ہماری کتب تواریخ میں کونسی بات عجیب سی نہیں ہوتی جو اس ایک بات پر تعجب آئے۔ سب سے پہلے تو یہ دیکھئے کہ اورنگ زیب قلعہ دہلی کے محلات میں رہتا تھا۔ اس کا گھرانا بہت بڑا تھا۔ ان کے ساتھ ہزاروں کی تعداد میں ملازمین کا لشکر تھا۔ کیا ان سب کا گذارہ اورنگ زیب کی کتابت کی کمائی پر ہوتا تھا؟ یا یہ صورت تھی کہ ان کا لاکھوں روپے ماہوار کا خرچ تو حکومت کے خزانے سے ادا ہوتا تھا اور اورنگ زیب اپنی روٹی کتابت کر کے کھاتا تھا؟ سوچئے کہ وہ روزانہ کتنی کتابت کر لیتا ہوگا۔ اور اس کی اُجرت اسے کس قدر ملتی ہوگی! کیا اس اُجرت پر اس کی دال روٹی چل سکتی ہے!

اب اس مسئلہ کے دوسرے پہلو پر غور کیجئے۔ اگر اورنگ زیب واقعی ایسا کرتا تھا تو اس سے زیادہ

غیر ذمّہ دار کوئی اور بھی ہو سکتا ہے ؟ سارے ہندوستان پر اس کی حکومت تھی۔ امور مملکت اس قدر اہم اور پیچیدہ تھے کہ اس کی تمام تر توجہات ان کے حل کے لیئے درکار تھیں۔ کروڑوں انسانوں کی جان، مال، عزت و آبرو کی حفاظت اس کی ذمہ داری میں داخل تھی۔ ملک میں سیاسی خلفشار ایسا تھا کہ اسے اپنی عمر کے آخری پچیس سال دکن میں میدان جنگ میں گذارنے پڑے۔ اگر وہ ان تمام ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال کر اپنا وقت کتابت میں صرف کرتا تھا کہ اس سے دال روٹی کے لیئے پیسے کمائے، تو ایسے شخص کو تختِ حکومت پر نہیں، کسی مسجد کے حجرے میں بیٹھے ہونا چاہیئے تھا۔!

اس کا تیسرا پہلو ایسا ہے جو سب سے اہم ہے۔ اورنگ زیب کے متعلق یہ خیال عام ہے کہ وہ بڑا دیندار۔ متقی اور پرہیزگار بادشاہ تھا۔ (ممکن ہے کہ وہ ایسا ہی ہو) اور یہ چیز ہمارے ذہنوں میں راسخ ہے کہ یہ بات تورّع اور پرہیزگاری کے خلاف ہے کہ بادشاہ یا اولی الامر میں سے کوئی اور اپنی ضروریات کے لیے حکومت کے خزانے سے کچھ لے۔ یہی وجہ ہے کہ جن بادشاہوں کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ وہ بڑے متقی اور پرہیزگار تھے۔ ان کے متعلق اس قسم کی باتیں بھی بیان کی جاتی ہیں کہ فلاں ٹوپیاں بنا کر گذارہ کیا کرتا تھا اور فلاں قرآن شریف کی کتابت کر کے۔ حالانکہ یہ خیال ہی سرے سے باطل ہے کہ متقیوں اور پرہیزگاروں کے لیے حکومت کے خزانے سے کچھ لینا جائز نہیں۔ ہمارے سامنے سب سے پہلے خود نبی اکرمؐ کی مثال موجود ہے۔ حضورؐ کی دعوئے نبوت سے پہلے کی زندگی کے متعلق یہ معلوم ہے کہ آپ تجارت کیا کرتے تھے۔ لیکن دعویٰ نبوت کے بعد جب آپ کا سارا وقت اس مشن کے لیئے وقف تھا یہ کہیں سے متحقق نہیں کہ آپ نے اپنی معاش کے لیے کوئی کام کیا ہو۔ مکّہ کی زندگی کے متعلق اس باب میں تفصیل سے کچھ معلوم نہیں لیکن مدینہ کی زندگی میں یہ بات واضح ہے کہ حضورؐ کی معاشی ضروریات مملکت کی طرف سے پوری ہوتی تھیں۔ یہی کیفیت خلفائے راشدینؓ کی تھی۔ ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے۔ جو شخص اپنی زندگی ایسے بلند مقاصد کے لیئے وقف کر دے اسے اگر روٹی کے فکر سے آزاد نہ کیا جائے تو یہ چیز ان بلند مقاصد کے حصول کے راستے میں رکاوٹ بن جائے گی۔ اس لیئے کہ اسے جو وقت ان مقاصد کی کامیابی کے لیئے صرف کرنا تھا وہ اسے حصول معاش کی نذر کر دینا پڑے گا اور مشن کے نقطۂ خیال سے یہ سودا جس قدر خسارے کا ہے اس کی وضاحت کی ضرورت نہیں۔ یہ بات صرف امور مملکت تک محدود نہیں۔ ان کے علاوہ بھی جو شخص اپنا وقت ملّت کی بہبود کے کاموں کے لیئے وقف کر دے، ملّت کے لیے ضروری ہے کہ

وہ اس کے کفاف کی ذمہ داری لے۔ اور یہ بات ذرا بھی قابلِ اعتراض نہیں کہ وہ اس کفاف کو قبول کر لے۔

لیکن یہ ہمارے ہاں تو باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہاں اگر کوئی شخص اپنا کماتا کھاتا ہے، قوم سے کچھ نہیں لیتا۔ اور اپنے آپ کو قوم کے کاموں کے لیئے وقف کر دیتا ہے تو بجائے اس کے کہ قوم اسے فکرِ معاش سے فارغ کر دے۔ اُلٹا تقاضا ہوتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ قوم کے حوالے کر دے؟ یعنی وہ اپنا سب کچھ قوم کے حوالے کر دے اور اس کے بعد خود بھوکا مرے! قائدِاعظم کے خلاف ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا تھا کہ وہ اپنا سب کچھ قوم کو کیوں نہیں دے دیتے۔ نیز یہ بھی اعتراض ہوتا تھا کہ وہ اپنی ذات پر اتنا خرچ کیوں کرتے ہیں! یعنی دوسرے لوگ جو اپنا کاروبار کرتے تھے۔ اور قوم کو یہ پوچھتے تک نہ تھے ان کے متعلق کوئی محاسبہ نہیں کرتا تھا کہ وہ اپنی ذات پر کس قدر خرچ کرتے ہیں۔ لیکن اس شخص (قائدِاعظم) نے چونکہ اپنے آپ کو قومی کاموں کے لیے وقف کر رکھا تھا اس لیے (گویا) قوم کو حق حاصل ہو گیا تھا کہ وہ ان کے متعلق ہر وقت محاسبہ کرتی رہے۔ اگر قوم کوئی فنڈ اکٹھا کر کے ان کی تحویل میں دے دیتی تو اس کے متعلق اسے محاسبہ کرنے کا حق حاصل تھا۔ لیکن اگر وہ اپنی کمائی میں سے اپنے آپ پر خرچ کرتے تھے تو قوم کو کیا حق حاصل تھا کہ ان پر محاسبانہ تنقید کرے۔ قوم کو تو ان کا شکر گذار ہونا چاہیئے تھا کہ قوم سے کچھ نہیں لیتے اور قوم کا اس قدر کام کرتے ہیں۔ لیکن جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے اس قوم کا باوا آدم ہی نرالا ہے۔ یہاں یہ ذہنیت عام ہے کہ جو نہی کوئی شخص ملّی کاموں کے لیے آگے بڑھا، انہوں نے اسے ہدفِ تنقید بنایا۔

(سنہ ۱۹۶۳ء)

۱۶۔ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا

طلوعِ اسلام کے اگست۔ستمبر کے مشترکہ شمارہ میں، ہم نے "اورنگ زیب کی روزی" کے سلسلہ میں لکھا تھا کہ جن لوگوں کا وقت ملک و ملّت (بلکہ قرآن کے الفاظ میں انسانیت) کی فلاح و بہبود کے کاموں کے لیئے وقف ہو، انہیں اپنی معاش کے لیئے ملک و ملّت سے کچھ لے لینا، جرم نہیں، اس ضمن میں ہم نے

نے خود نبی اکرمؐ اور خلفائے راشدینؓ کے عمل سے شہادت پیش کی تھی کہ ان کا سارا وقت، قرآن کی تبلیغ۔ جماعت کی تنظیم اور (بعد میں) امورِ مملکت کی سرانجام وہی میں صرف ہوتا تھا اس لیے انہیں فکرِ معاش سے آزاد کر دیا گیا تھا۔ اس ضمن میں ایک صاحب نے یہ دریافت کیا ہے کہ کیا یہ چیز وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِيْ ثَمَنًا قَلِيْلًا (۲/۴۱) کے تحت نہیں آجاتی؟ یعنی کیا، قرآنی خدمت کے معاوضہ میں کچھ لینا، قرآنی آیات کو بیچنا نہیں؟

پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ اگر اس آیت کا مفہوم یہی لیا جائے تو قرآنی تبلیغ۔تعلیم، قرآنی جماعت کی تنظیم قرآنی معاشرہ کی تشکیل۔ حتیٰ کہ قرآنی مملکت کی تنسیق کے تمام کام بند ہو جائیں، یا کم از کم اطمینان بخش طریقہ سے کبھی نہ چل سکیں۔ اس لیئے کہ جو لوگ ان امور کو سرانجام دینے کے قابل ہوں اگر انہیں اپنا وقت اور توانائی حصولِ معاش کے لیے صرف کرنا پڑے، تو ان بلند مقاصد کے لیئے وقت اور توانائی کہاں سے آئے گی؟ ایسے لوگوں کو فکرِ معاش سے آزاد کر دینا درحقیقت جماعتی زندگی میں تقسیمِ عمل کا تقاضا ہوتا ہے۔ قرآنی مقاصد کی بر و مندی کے لیئے ایک جماعت وجود میں آتی ہے ان میں مختلف صلاحیتوں کے افراد ہوتے ہیں۔ جن افراد میں تعلیم و تبلیغ و تنظیم و تنسیق کی صلاحیت ہوتی ہے، انہیں وہ جماعت، فکرِ معاش سے آزاد کر دیتی ہے۔ تاکہ وہ اپنا سارا وقت انہی مقاصد کے لیے صرف کر سکیں۔ اس جماعت کی کمائی درحقیقت، جماعت کے سارے افراد کی مشترکہ تحویل میں رہتی ہے جسے حسبِ ضرورت صرف کیا جاتا ہے۔ یہی کیفیت قرآنی مملکت کی ہوتی ہے۔ اس میں بھی مملکت کی آمدنی ملّت کی مشترکہ تحویل میں رہتی ہے۔ جسے حسبِ ضرورت صرف میں لایا جاتا ہے۔ اس میں جن لوگوں کے سپرد قرآنی تعلیم و تبلیغ اور نظم و نسق سے متعلق امور کر دیئے جاتے ہیں، وہ جماعت یا امّت سے اپنی قرآنی خدمات کا معاوضہ نہیں لیتے۔ وہ ان کی کفاف اس لیئے لیتے ہیں کہ اپنا سارا وقت ان مقاصد کے حصول کے لیئے صرف کر سکیں۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کی طرف حضرت عمرؓ نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کی توجہ ان کے خلیفہ منتخب ہو جانے پر دلائی تھی۔ حضرت صدیق اکبرؓ خلیفہ منتخب ہو جانے کے بعد حسبِ معمول کپڑا بیچنے کے لئے نکلے تو حضرت عمرؓ نے ان سے کہا کہ اب آپ ایسا نہیں کر سکتے۔ اب آپ کا وقت، آپ کا اپنا نہیں رہا۔ یہ امّت کی ملکیت ہو گیا ہے اس لیئے آپ کو اس کا حق حاصل نہیں رہا کہ آپ اسے جس طرح جی چاہے صرف کریں۔ حضرت صدیق اکبرؓ نے کہا کہ اس صورت میں میری معاش کا کیا ہوگا؟ انہوں نے کہا کہ اس فکر امّت کو ہو گی جس نے آپ کا

وقت لے لیا ہے۔

آیت وَلَا تَشْتَرُوْا .... کا مفہوم اس سے ملحقہ آیت نے واضح کر دیا ہے۔
دونوں آیات ساتھ ملا کر دیکھنے سے بات واضح ہو جاتی ہے۔ پہلے کہا ہے۔ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰیٰتِیْ ثَمَنًا قَلِیْلًا۔ وَاِیَّایَ فَاتَّقُوْنِ۔ تم میری (خدا کی) آیات کو دنیاوی مفاد کی خاطر مت بیچو، (جو ان مقاصد عالیہ کے مقابلے میں جن کی طرف یہ آیات دعوت دیتی ہیں، بہر حال قلیل و کاسد ہیں یا تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو۔ اگرچہ اس آیات کے اتنے حصے نے (کہ تم قوانین خداوندی کی نگہداشت کرو) بھی بات کسی حد تک واضح کر دی ہے لیکن اگلی آیت میں اس کی تشریح آ گئی ہے۔ یعنی وَلَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ (۲/۴۲) تم تلبیس حق و باطل نہ کرو۔ حق کو بلا آمیزش پیش کرو۔ اسے باطل کے ساتھ خلط ملط کر کے، اس کا نام شریعت خداوندی نہ رکھو۔ اور حق کو چھپاؤ نہیں۔ درآنحالیکہ تم جانتے ہو کہ ایسا کرنا کس قدر ظلم عظیم ہے، یہ ہے آیات خداوندی کو بیچنا یعنی جب کوئی ایسا موقع آئے جس میں اپنے (یا اپنے حمایتیوں اور ساتھیوں کے) کسی مفاد پر زد پڑتی ہو، تو اول تو حق کو سامنے نہ آنے دیا جائے اور اگر مجبوراً اسے پیش کرنا ہی پڑے تو اسے بلا آمیزش سامنے لانے کے بجائے باطل کے ساتھ خلط ملط کر کے پیش کر دیا جائے۔ یہ ہے وہ جرم عظیم جس سے روکا گیا ہے۔ مذہبی پیشوائیت ہمیشہ یہی کرتی ہے۔ اور چونکہ ایسا کرنے میں ان کے اپنے مفاد کا تحفظ پیش نظر ہوتا ہے۔ اس لئے اسے "آیات فروشی" سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ایسا کرنے والا سنگین ترین جرم کا مرتکب ہوتا ہے، خواہ وہ اس کے معاوضہ میں محسوس طور پر کسی سے کچھ بھی نہ لے (واضح رہے کہ معاوضہ کی بیسیوں شکلیں ایسی ہیں جن میں بظاہر معاوضہ کچھ نہیں دکھائی دیتا مثلاً عزت الاثم یعنی اپنے ایگو کی جھوٹی تسکین۔ تحفظ پندار وغیرہ۔ لیکن یہ معاوضہ روپے پیسے کے معاوضہ سے کہیں زیادہ اور وزنی ہوتا ہے۔ کتنے لوگ ہیں جو گرہ سے روپیہ صرف کر کے اس "معاوضہ" کو حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں) لہذا دیکھنا یہ چاہیئے کہ کوئی شخص کتمان حقیقت اور تلبیس حق و باطل تو نہیں کرتا۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو یہ "آیات فروشی ہے" خواہ وہ اس کا معاوضہ نقدی میں وصول نہ بھی کرے۔

اور جو ایسا نہیں کرتا بلکہ بلا آمیزش حق بیان کرتا ہے اور اپنے آپ کو اس مقصد کے لیئے وقف کر دیتا ہے تو اس کا اپنی جماعت یا امت سے اپنے کفاف کے لیئے کچھ لے لینا، اس آیت کے تحت بالکل نہیں آتا بلکہ وہ اگر فکر معاش کے، نسبتاً پست مقصد کی خاطر ان بلند مقاصد کے لیئے اپنے آپ کو وقف نہیں کرتا، تو اس

کا یہ فیصلہ درست نہیں۔ جیسا کہ ہم حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکر صدیقؓ کے قصّہ میں دیکھ چکے ہیں۔ اس قسم کی جماعت کی عدم موجودگی میں اگر کوئی شخص اپنے طور پر کسی داعیٔ قرآن کی مدد کرتا ہے اور اس کی وہ مدد اس کی حق گوئی کے راستے میں حائل نہیں ہوتی بلکہ وہ اُس کی ممد معاون بنتی ہے، تو اس قسم کے تعاون یا معاونت کا قبول کر لینا بھی اس آیت کے تحت نہیں آسکتا۔ اس کے برعکس اگر کوئی شخص جانتے بوجھتے کتمانِ حقیقت یا تلبیسِ حق و باطل کرتا ہے، اور اسے خود اپنی کمائی سے پیدا کردہ دولت کے ذریعے پھیلاتا ہے، تو یہ بھی "آیات فروشی" کرتا ہے۔ اس لیے کہ جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے، آیات اللہ کی قیمت صرف نقدی میں نہیں لی جاتی۔ اس کی بیسیوں اور شکلیں بھی ہیں۔ (سنہ ۱۹۶۴ء)

۱۷- بہ صد چشمِ نم!

روزنامہ مشرق (لاہور) بابت ۷، فروری ۱۹۶۴ء میں شائع شدہ ایک خبر۔

"گذشتہ شب چشتیاں کی گیارہ سالہ بچی بلقیس بیگم میو ہسپتال میں انتقال کر گئی۔ پانچ روز قبل اس کی معمر والدہ فضل بی بی اور اس کا بھائی بشیر نہایت کسمپرسی کی حالت میں اسے لے کر لاہور پہنچے تھے۔ اور ایک تانگے والا ان کا وہ صندوق لے کر فرار ہو گیا۔ جس میں فضل بی بی کے بیان کے مطابق ضروری کپڑوں کے علاوہ بچی کا کفن بھی رکھا تھا۔ فضل بی بی نے نمائندہ مشرق کو بتایا کہ ہسپتال میں بلقیس داخل ہو گئی مگر اس کے ساتھ مجھے نہیں رہنے دیا گیا۔ اس نے کہا کہ میں دو دن تک بچی کی شکل دیکھنے سے محروم رہی اور اور ہسپتال کے گیٹ پر پڑی ہر آنے جانے والے کا منہ دیکھتی تھی۔ اس نے بتایا کہ میں نے سنا تھا کہ لاہور میں اہل دل حضرات کی کمی نہیں مگر میری مصیبت میں کسی نے میری حوصلہ افزائی نہ کی۔ اور میری بچی کا کفن تک چھین لیا۔ مرحوم بلقیس بیگم کے بھائی بشیر نے بتایا کہ اخبار میں ہماری داستان سُن کر ایک صاحب نے مجھے سات روپے دیئے جو میں نے قرضہ حسنہ سمجھ کر قبول کر لیئے۔ اس نے کہا کہ لاہور میں ہمارا جاننے والا کوئی نہ تھا۔ والدہ کے لیے کھانے پینے اور بیمار بہن کی ضروریات کا انتظام کرنا بہر حال میرے ذمّہ تھا۔ جس

کی تکمیل کے لیئے میں نے دو دن تک لاہور میں مزدوری تلاش کی اور مارا مارا پھرا مگر کسی نے بھی مجھے مزدوری نہ دی۔ والدہ دو دن تک فاقوں کا شکار رہی اور میں نے لنڈے بازار میں اپنے جوتے اور پگڑی فروخت کی اور والدہ اور اپنے لئے روٹی کا انتظام کیا۔"

اس کے بعد خبر میں کہا گیا ہے کہ دوسرے دن اس بچی کا انتقال ہو گیا۔ یہ سب کچھ اس لاہور میں ہوا جس میں خیر سے اُس رسولؐ کے لاکھوں نام لیوا بستے ہیں جس نے فرمایا تھا کہ :۔

"جس بستی میں ایک فرد نے رات بھوکے بسر کی، اس بستی کی حفاظت کی ذمہ داری خدا کے ہاں سے ختم ہو جاتی ہے"۔

اور یہ اس رمضان المبارک کے مہینے میں ہوا جس میں ایک ایک مسجد میں ختمِ قرآنِ کریم پر ہزاروں روپے تزئین و آرائش پر خرچ ہو جاتے ہیں۔ اولئك حبطت اعمالهم کا یہ کیسا عبرت انگیز منظر ہے۔

(دسمبر ۱۹۶۴ء)

۱۸۔ مُجرم کون ہے

۲۷ اگست ۱۹۶۴ء کے روزنامہ مشرق (لاہور) میں حسب ذیل خبر شائع ہوئی ہے۔

"ماں سے سولہ دن کی بچی کا بھوک سے تڑپنا نہ دیکھا گیا اور وہ دیوانوں کی طرح بچی کو لے کر گھر سے باہر نکل آئی۔ اس نے ایک خاتون کا پرس چھین کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن پکڑی گئی۔ ماں کی اس حرکت سے بچی کی بھوک تو ختم نہ ہو سکی البتہ اس کی زندگی کا (۱۷) واں دن حوالات کی آہنی سلاخوں کے پیچھے گذرا۔

حشمت بی بی نے بتایا کہ پانچ سال قبل اس کی شادی ملتان روڈ کے ایک نوجوان مسکین سے ہوئی تین سال تک دونوں میاں بیوی بڑی خوشگوار ازدواجی بسر کرتے رہے۔ چند ماہ پہلے اچانک اس کا شوہر بیمار ہو گیا اور اس کی بیماری طول پکڑتی

چلی گئی۔ حشمت بی بی نے شوہر کا علاج کرانے کے لیے اپنی تمام پونجی لٹا دی۔ لیکن وہ صحت یاب نہ ہوا آخر اسے ملازمت سے علیحدہ کر دیا گیا۔ اب حشمت بی بی پر گھر کے اخراجات کا بوجھ بھی آ پڑا اور اس نے محنت مزدوری کر کے اپنا اور اپنے خاوند کا پیٹ پالنا شروع کر دیا۔

سولہ روز قبل حشمت بی بی کے ہاں ایک بچی پیدا ہوئی اور اس طرح اس کی مزدوری بھی چھوٹ گئی۔

حشمت بی بی نے کہا کہ وہ گذشتہ چار دنوں سے بھوکی تھی۔ اور اس فاقہ نے اس کی سولہ دن کی بچی کو بھی نڈھال کر دیا۔ اس سے بچی کی حالت نہ دیکھی گئی اور وہ اسے لے کر دودھ کی تلاش میں گھر سے باہر نکل آئی۔ حشمت بی بی نے کہا کہ اس نے کئی لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلایا۔ لیکن کسی نے اس کی داد رسی نہ کی۔ آخر اس نے ایک خاتون کا پرس چھین کر بھاگنا چاہا۔ تو پولیس نے اسے پکڑا اور حوالات میں بند کر دیا۔"

ہم نہیں جانتے کہ اس کے بعد اس خاتون پر کیا گذری اور وہ اب کہاں ہے۔ نہ ہی ہم نے مزید تحقیق کے لیئے اس خبر کو اپنے ہاں شائع کیا ہے۔ ہم جو کچھ کہنا چاہتے ہیں وہ یہ ہے کہ بے شک پولیس کی یہ ذمہ داری ہے کہ اگر کوئی شخص کسی دوسرے کی چیز کو زبردستی چھینتا ہے تو اسے حراست میں لے لے، لیکن سوال یہ ہے کہ کیا یہ بھی کسی کی ذمہ داری ہے یا نہیں کہ جو بچی اس طرح بلک بلک کر بھوک سے جان دے رہی ہو اس کے لیئے سامان زیست مہیا کیا جائے؟

ہمارے موجودہ معاشرہ میں تو یہ کسی کی بھی ذمہ داری نہیں۔ اس لیئے نہیں کہ یہاں ایسے مخیّر افراد موجود نہیں۔ یہ بات افراد کے بس کی نہیں۔ یہ ذمہ داری وہ معاشرہ اپنے سر لے لیتا ہے جو قرآن کی رُو سے قائم ہوتا ہے۔ یہ تمام خرابیاں اس معاشرہ کے نہ ہونے سے پیدا ہوتی ہیں۔ جب قرآنی معاشرہ قائم ہو جاتا ہے تو اس میں آپ کو یہ الفاظ سنائی دیتے ہیں کہ:-

"اگر دجلہ کے کنارے کوئی کُتا بھی بھوک سے مر جائے
تو خدا کی قسم عمرؓ سے اس کی بھی باز پرس ہو گی۔"

(دسمبر ۱۹۶۴ء)

۱۹ —— اسلامک سوشلزم

ایک صاحب کہتے ہیں۔ طلوع اسلام کی سابقہ اشاعت (بابت اگست۔ ستمبر ۱۹۶۱ء) میں آپ نے اسلامک نیشنلزم کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس سے بہت سے شبہات رفع ہوگئے۔ اس سے درحقیقت مراد یہ ہے کہ مسلم نیشن ایمان کے اشتراک سے وجود میں آتی ہے اور نسل۔ رنگ۔ وطن کی تفریق مسلمانوں کے اُمتِ واحدہ ہونے کے راستے میں حائل نہیں ہوتی۔ اسی سلسلہ کی ایک اصطلاح "اسلامک سوشلزم" ہے۔ اخبارات میں شائع شدہ خبروں کے مطابق .... نے، تیسرے پنجسالہ منصوبہ کے مقدمہ میں اس سلسلہ میں لکھا ہے کہ

> معاشی اور معاشرتی دائروں میں ہمارے پیشِ نظر منتہٰی یہ ہے کہ ہم بتدریج پاکستان میں اسلامک سوشلزم قائم کر دیں۔ اسلامک سوشلزم کی اصطلاح رفاہی مملکت (WELFARE STATE) کی اصطلاح کے قریب مترادف ہے اس فرق کے ساتھ کہ رفاہی مملکت کے نصب العین کے علاوہ اسلامک سوشلزم اس بات کا بھی خیال رکھے گی کہ ملک کا کلچرل اور مذہبی ورثہ محفوظ رہے اور وہ معاشی ترقی کے اندھے جذبہ کی بھینٹ نہ چڑھ جائے۔ لہٰذا اسلامک سوشلزم کا تصور، رفاہی مملکت کے تصور سے کہیں زیادہ وسیع ہے اور ایک فرد کی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہے۔ (پاکستان ٹائمز ۴ ۶/۴ ۳۰)

اس سے واضح ہے کہ پاکستان میں معاشی ترقی کا منتہیٰ مغربی ممالک کی رفاہی مملکت نہیں بلکہ دین کی اقدار کا تحفظ بھی اس کے اندر آجاتا ہے۔ یہ تشریح اطمینان بخش ہے۔ لیکن میرا خیال یہ ہے کہ ہم ان اصطلاحات کی بجائے، اپنی اصطلاحات کیوں نہ استعمال کیا کریں۔ یہ ظاہر ہے کہ نیشنلزم، سوشلزم، رفاہی مملکت کی اصطلاحات عصرِ حاضر میں ایک خاص مفہوم کی حامل ہیں۔ اول الذکر دونوں اصطلاحات، اسلام کے بنیادی اصولوں کی نقیض ہیں اور تیسری اصطلاح اتنی ناقص ہے کہ اسے اسلامی رنگ دینے کے

لیئے خاصے اضافہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ اس کے برعکس اگر ہم مسلم نیشنلزم کی جگہ اُمتِ مسلمہ (یاملت اسلامیہ) کی اصطلاح استعمال کریں اور اپنے معاشی پروگرام کے منتہٰی کی "اسلام کے معاشی نظام" کی اصطلاح سے تعبیر کریں، تو یہ اصطلاحات جامع بھی ہونگی اور اپنے مقصد و منتہٰی کی رُو سے واضح بھی، مجھے یاد پڑتا ہے کہ طلوع اسلام میں اس سے پہلے ان امور کے متعلق کچھ لکھا تھا۔ لیکن اگر ان کی پھر وضاحت ہوجائے تو اچھا ہے۔

طلوع اسلام

آپ کو ٹھیک یاد پڑتا ہے۔ طلوع اسلام ان موضوعات پر ایک بار نہیں بلکہ متعدد بار لکھ چکا ہے بلکہ لکھتا چلا آرہا ہے۔ قرآن کریم نے ہمیں ایک نظام زندگی دیا ہے اور اس نظام کی تعبیر کے لیئے اس کی اپنی اصطلاحات ہیں۔ نہ یہ اصطلاحات کسی اور نظام پر فٹ بیٹھتی ہیں اور نہ ہی کوئی دوسری اصطلاح اس نظام کے متعلقہ گوشہ کی صحیح تعبیر کرسکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہر نظام کی مخصوص اصطلاحات ہوتی ہیں۔ اور وہی اصطلاحات اس نظام کی تعبیر کرسکتی ہیں۔ مثلاً سوشلزم ایک خاص معاشی نظام کی اصطلاح ہے۔ نہ یہ اصطلاح کسی اور نظام کے لیئے استعمال ہوسکتی ہے۔ اور نہ ہی کوئی اور اصطلاح اس نظام کی صحیح تعبیر کرسکتی ہے۔ اسی طرح نیشنلزم کی اصطلاح ہے۔ اس لیئے ہمیں اسلامی نظام اور اس کے مختلف گوشوں کی تعبیر کے لیے اسی کی اصطلاحات استعمال کرنی چاہئیں۔

لیکن اس باب میں ہمارے ارباب حل و عقد کی جو دشواریاں ہیں۔ ان کا بھی ہمیں احساس ہے۔ مثلاً آپ نے لکھا ہے کہ ہمیں "اسلام کا معاشی نظام" کہنا چاہیئے۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اسے کون متعین کرے گا کہ اسلام کا معاشی نظام کیا ہے؟ معاشی نظام تو ایک طرف یہاں یہی متعین نہیں ہو پایا کہ خود اسلام کیا ہے اور مسلمان کسے کہتے ہیں، اسلام ہر فرقہ کا الگ الگ ہے۔ اس قدر الگ کہ ایک فرقہ کا اسلام دوسرے فرقے کے نزدیک کفر ہے۔ اور مسلمان کی تعریف کے سلسلہ میں حضرات علماء کرام کی طرف سے جو کچھ منیر کمیٹی کے سامنے پیش کیا گیا تھا اس پر ایک زمانہ شاہد ہے۔ یہ وجہ ہے کہ ہمارے ارباب بست وکشاد "اسلام" کا نام لیتے، یا اس کی طرف کسی اسکیم کی نسبت کرتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ نہ معلوم اسے کیا معانی پہنا دیے جائیں۔ وہ بچارے تو مملکت کو اسلامی کہہ کر بھی عجیب مشکل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ ہر بوالہوس اٹھتا ہے اور چلّا چلّا کر کہتا ہے کہ یہاں جو کچھ ہورہا ہے وہ غیر اسلامی ہے، حکومت ہمارے حوالے کرو تاکہ ہم اسے صحیح معنوں

ہیں اسلامی بنائیں۔ اسلام کے ان مدعیان کی حالت یہ ہے کہ ۱۹۵۶ء کے دستور پاکستان میں یہ شق رکھی گئی کہ ملک میں کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں ہوگا تو انہوں نے شادیانے بجائے کہ مملکت مسلمان ہوگئی ہے لیکن جب ۱۹۶۲ء کے دستور میں لکھا گیا کہ ملک میں کوئی قانون اسلام کے خلاف نہیں بنے گا تو ہنگامہ برپا کر دیا گیا کہ یہ غیر اسلامی ہے۔ اب اس شق کو بدل کر پھر "کتاب وسنت" کے الفاظ لکھ دیئے گئے ہیں لیکن ان کے نزدیک یہ دستور پھر غیر اسلامی کا غیر اسلامی ہی ہے۔ یہاں تو "اسلام" کو تماشا بنا دیا گیا ہے۔ اور جب دین مذہبی پیشوائیت کے ہتھے چڑھ جائے تو وہ اسی طرح تماشا بن جایا کرتا ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اس مشکل کا حل کوئی نہیں۔ اس کا حل موجود ہے۔ اور نہایت اطمینان بخش حل۔ یعنی آپ "اسلامی نظام معاشی" کہنے کے بجائے قرآن کا معاشی نظام کہئے۔ بات صاف واضح اور متعین ہو جائے گی۔ قرآن سے دو قسم کے معاشی نظام مرتب ہو ہی نہیں سکتے۔ اس کا نظام متعین ہے اور اسی لیے اس نظام کی اصطلاحات کے معانی بھی متعین ہیں۔ یہ کیجئے اور دیکھئے کہ کس طرح یہ تمام دشواریاں ختم ہو جاتی ہیں۔ لیکن اس کے لئے سب سے بڑی دشواری یہ ہے کہ ہمارا مذہبی پیشواؤں کا طبقہ، قرآن کا نام تک سننے کے لئے تیار نہیں۔ یہ اس لئے کہ قرآن کے نام سے ہر بات متعین ہو جاتی ہے اور تمام مسلمانوں کو ایک مرکز پر جمع ہو جانا پڑتا ہے۔ اس کے برعکس "کتاب وسنت" کہنے سے ہر فرقہ کو اپنے وجود کی سند مل جاتی ہے اور مذہب کے خلاف اڈے قائم رہتے ہیں۔

لیکن اس الجھاؤ کو بالآخر ختم کرنا پڑے گا۔ کوئی قوم ذہنی اور نظری انتشار کی حالت میں زیادہ عرصہ تک نہیں رہ سکتی۔ یا اسے اس انتشار کو ختم کرنا ہوگا۔ اور یا یہ انتشار اُسے ختم کر دے گا۔ اس قسم کے انتشار کو ختم کرنے کے لیے بس ایک عزم راسخ کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر ہمیں یہ میسر آ گیا تو ہم بچ جائیں گے، ورنہ انتشار نے آج تک کسی قوم کو زندہ چھوڑا نہیں۔ اس کے لئے اس صاحب عزم کو کرنا یہ ہوگا کہ زندگی کے ایک ایک شعبے کے متعلق قرآن جو نظام دیتا ہے، اسے واضح اور نکھری ہوئی شکل میں مدوّن کیا جائے اور پھر اسے مملکت میں بتدریج عملی شکل دی جائے اور اس کے لئے اصطلاحات بھی قرآن ہی کی استعمال کی جائیں۔ یاد رکھیے۔ قرآن اپنا مخصوص نظام رکھتا ہے اور اس میں کسی قسم کے پیوند کو برداشت نہیں کر سکتا۔ وہ اس باب میں کس حد تک غیر لچکدار ہے۔ اس کا اندازہ کرنے کے لئے سورۂ محمدؐ کی آیات

نمبر ۲۶، ۲۵ کو سامنے لایئے۔ آیت نمبر ۲۵ میں کہا گیا ہے کہ دین سے مرتد کون ہوتا ہے؟ اور آیت نمبر ۲۶ میں اس کا جواب ان الفاظ میں دیا گیا ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں۔ قَالُوْا لِلَّذِيْنَ كَرِهُوْا مَا نَزَّلَ اللّٰهُ سَنُطِيْعُكُمْ فِيْ بَعْضِ الْاَمْرِ (۴۷/۲۶) جو ان لوگوں سے جنہیں قرآن سخت ناگوار گزرتا ہے کہتے ہیں کہ ہم بعض امور میں تمہاری اطاعت کریں گے یعنی دین سے وہی لوگ نہیں پھرتے جو دین کو چھوڑ کو کوئی اور مذہب اختیار کر لیتے ہیں۔ دین سے وہ بھی پھر جاتے ہیں جو دین کے نظام میں کسی غیر دینی نظام کو پیوند لگا لیتے ہیں اور اس طرح خدا اور طاغوت میں مفاہمت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی حقیقت کو اس نے سورہ بقرہ کی اس آیۃ جلیلہ میں دھرایا ہے جس میں کہا گیا ہے کہ جو لوگ کتاب کے ایک حصے پر ایمان رکھتے ہیں اور دوسرے سے انکار کرتے ہیں انہیں اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلّت و خواری نصیب ہوتی ہے۔ اور آخرت میں بھی عذاب شدید۔ (۲/۸۵) اور اس پیوند سازی کے معنی یہی نہیں کہ آپ ایک بات قرآن کی لے لیں اور دوسری بات (مثلاً) عیسائیت کی یا کسی سیکولر نظام (مثل مغربی جمہوریت یا کمیونزم کی) پیوند سازی یہ بھی ہے —— اور یہ سنگین قسم کی پیوند سازی ہے۔ کہ آپ کچھ باتیں قرآن کی لے لیں اور کچھ باتیں وہ لے لیں جو اسلامی شریعت کے نام سے ہم میں مروّج چلی آرہی ہیں لیکن قرآن کے خلاف جو جاتی ہیں۔ قرآن کریم کی رو سے اس قسم کی پیوند سازی بھی دین سے ارتداد ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ہماری مذہبی پیشوائیت جس اسلام کو پیش کر رہی ہے وہ تو ہے ہی اس قسم کی پیوند سازی۔ جن لوگوں کا عقیدہ یہ ہو کہ اگر کسی معاملہ میں ان کی مروّجہ شریعت اور قرآن میں تضاد واقعہ ہو تو قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھا جائے، ان کے ہاں خالص قرآن کا دین مل کس طرح سکتا ہے!

دیکھنا یہ ہے کہ یہ سعادت کس کے حصے میں آتی ہے کہ وہ یہاں خالص دین خداوندی (قرآنی نظام) متشکل کر دکھائے۔ یہ شہد خالص اسی کو مل سکے گا جو نہ تو مکھیوں کی بھنبھناہٹ سے گھبرائے، اور نہ ہی ان کی نیش زنی سے خوف کھائے۔

وذالك من عزم الامور (۱۹۶۴ء)

۲۰۔ روس میں سزائیں

سوال :۔ عام طور پر کہا جاتا ہے کہ اگر لوگ فکر معاش سے آزاد ہو جائیں تو جرائم کا ارتکاب نہیں ہوتا۔ یا کم از کم جرائم بڑی حد تک کم ہو جاتے ہیں۔ روس نے اپنے ہاں ایک جدید معاشی نظام رائج کیا ہے جس سے مقصود یہ بتایا جاتا ہے کہ لوگ فکر معاش سے آزاد ہو جائیں۔ کیا اس نظام کی ترویج کے بعد، روس میں جرائم (بالخصوص سنگین جرائم) میں کمی واقع ہو گئی ہے یا ان کی صورت بدستور ہے۔؟

جواب :۔ روس کے صحیح حالات بہت کم باہر آتے ہیں کیونکہ وہاں فولادی پردے لٹکے رہتے ہیں۔ لیکن وہاں کی قانونی حالت کے متعلق جو خبریں باہر آتی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں سنگین جرائم کی زیادتی ہو رہی ہے۔ یہ نتیجہ اس حقیقت سے اخذ کیا جا سکتا ہے کہ وہاں جن جرائم کی سزا موت ہے ان کی فہرست میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔ روس میں ۱۹۱۷ء کے انقلاب کے بعد سزائے موت منسوخ کر دی گئی تھی کیونکہ اسے زارِ روس کے عہد استبداد کی یادگار سمجھا جاتا تھا۔ لیکن اس کے چند ہی ماہ بعد (۱۹۱۸ء میں) اس سزا کو پھر رائج کرنا پڑا۔ اسے ۱۹۲۰ء میں پھر منسوخ کر دیا گیا لیکن چند ہی ماہ بعد اسے دوبارہ رائج کرنا پڑا۔ اسٹالن کے عہد اقتدار میں ان جرائم کی فہرست بڑھتی گئی جن کی سزا موت تھی۔ جبکہ ایک وقت میں وہاں اس فہرست میں ۴۲ جرائم مندرج تھے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد ۱۹۴۷ء میں اسے پھر منسوخ کر دیا گیا لیکن ۱۹۵۰ء میں اسے پھر زندہ کرنا پڑا۔ اسٹالن کی وفات کے بعد (۱۹۵۴ء میں) اس کی توقع تھی کہ شاید یہ فہرست کچھ سکڑ جائے لیکن اس میں مزید وسعت آ گئی۔ اس وقت وہاں اکثر جرائم کی سزا موت ہے۔ مثلاً مملکتی یا معاشرتی مقبوضات کی بڑے پیمانے پر چوری۔ بنکوں کی جعل سازی، منصوبہ بندی سے متعلق امور کے حساب کتاب میں فریب دہی، مملکت کے حفاظتی دستوں پر حملہ۔ کرنسی کا غیر قانونی کاروبار۔ زنا بالجبر۔ رشوت، اصلاحی اداروں کے کارندوں کا ڈسپلن کا پابند نہ رہنا[1] وغیرہ۔

---

[1] ہماری ان معلومات کا ماخذ، جرنل اوف دی انٹرنیشنل کمیشن اوف جورسٹس کا ستمبر ۱۹۶۴ء کا شمارہ ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بیشتر جرائم کی وجہ معاشی کشمکش اور دولت کی ناہموار تقسیم ہوتی ہے۔ لیکن جس فلسفہ پر روس کے اشتراکی نظام کی عمارت استوار ہوئی ہے اس کی رُو سے ان کے معاشی نظام میں بھی جرائم میں کمی واقع نہیں ہو سکتی، یہ تو ہو سکتا ہے کہ بھوک کی وجہ سے پیدا ہونے والے جرائم میں وہاں کمی ہو جائے۔ اور سزائے موت کے جرائم کی فہرست میں وسعت اس حقیقت پر دال ہے کہ وہاں چھوٹے چھوٹے نہیں بلکہ سنگین جرائم میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب زندگی کا تصور خالصتہً مادی ہو یعنی اس میں وحی کی رُو سے عطا شدہ مستقل اقدار، قانون مکافات، حیات آخرت کا تصور ہی نہ ہو تو پھر کونسا جذبۂ محرکہ جرائم کو روک سکے گا۔ یہ چیز صرف قرآن کے نظام زندگی میں ممکن ہے جس کا اوّلین مقصد انسان کے قلب و نگاہ میں انقلاب پیدا کرنا ہوتا ہے۔ معاشی نظام تو اس انقلاب کے ثمرات شیریں کا صرف ایک توشہ ہوتا ہے۔ یہی وہ نظام ہے جس میں سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں نظاموں کی خرابیوں کا ازالہ ہو جاتا ہے۔ جیسا کہ ہم اکثر کہا کرتے ہیں، سرمایہ داری جذام اور فالج ہے اور اشتراکیت سرسام۔ صحیح انسانی زندگی قرآنی نظام ہی میں حاصل ہو سکتی ہے جس کی بنیاد صحیح تعلیم پر قائم ہوتی ہے۔ فریضۂ رسالت۔ یعلمھم الکتاب والحکمۃ ویزکیھم کے معنی ہی یہ ہیں۔ یعنی کتاب اور حکمت پر مبنی تعلیم اور اس کے نتیجہ میں وہ نظام جس میں ہر فرد کو بھرپور سامان نشوونما ملتا جائے۔ یہی ہے وہ نظام جس میں جرائم اس طرح ناپید ہو جاتے ہیں کہ جب عہد صدیقیؓ میں مجسٹریٹ کی اسامی کو تجربتہً وجود میں لایا گیا تو سال بھر کے بعد اسے منسوخ کرنا پڑا کیونکہ اس عرصہ میں کوئی مقدمہ ہی اس کے ہاں پیش نہیں ہوا۔

آپ کو شاید اس کا علم ہو کہ اس وقت دنیا میں سب سے بہتر رفاہی مملکت سویڈن کی ہے جہاں ہر فرد کو سامان زیست باافراط حاصل ہوتا ہے۔ لیکن دنیا میں سب سے زیادہ خودکشی کے واقعات بھی سویڈن میں ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ وہی یورپ کا مادی تصورِ حیات ہے۔

(۱۹۶۴ء)

---

۲۱ - کیا خدا عادل ہے

لائلپور سے ایک صاحب نے ہمیں ایک سوال بھیجا جس کا موضوع یہ تھا کہ "کیا خدا عادل ہے"۔ ہم نے انہیں لکھا کہ سوال ایسا نہیں جس کا جواب ایک خط میں دیا جا سکے۔ اس اہم اور بنیادی سوال کے سمجھنے کے لیئے نظام کائنات۔ قانونِ مکافاتِ عمل۔ انسانی اختیار و ارادہ۔ انسانی دنیا میں خدا کا طریق کار۔ فرد اور معاشرہ کے تعلقات۔ ظالم کے ظلم میں خود "مظلوموں" کا حصہ وغیرہ بیسیوں گوشے سامنے آئیں گے جو بڑی تفصیل چاہتے ہیں۔ اس لیئے اس سوال کو زبانی گفتگو سے سمجھنا زیادہ آسان ہوگا۔ لیکن ان کا اصرار ہے کہ ان کے سوال کا جواب لکھ کر ہی دیا جائے۔ اور اسے طلوعِ اسلام میں شائع کیا جائے۔ ہم شروع ہی میں اس امر کا اعتراف یا اظہار ضروری سمجھتے ہیں کہ ہمارے اس جواب میں بھی وہ تمام متعلقہ گوشے تفصیلاً سامنے نہیں آ سکتے جن کا ذکر ہم نے اوپر کیا ہے۔ جواب بہرحال مختصر ہوگا اور صرف اصولی حیثیت لیئے ہوئے۔ آپ پہلے ان کا سوال ملاحظہ فرمایئے۔

سوال۔ میں دیکھتا ہوں کہ اسلام کا خدا عادل کے نام مشہور ہے۔ لیکن اس کے باوجود میری سمجھ میں یہ بات نہ آ سکی کہ وہ کیسا عادل خدا ہے، جو اس دنیا میں ایک غریب آدمی کو ساری عمر تڑپتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ لیکن اس میں اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ وہ اس غریب کے آنسوؤں کو خشک کر سکے۔ اس کے درد کی دوا بن سکے۔ بلکہ ہم دیکھتے ہیں کہ اس غریب کی زندگی میں المیہ پر المیہ ٹوٹتے ہیں۔ لگاتار حادثات اس کی کمر توڑتے رہتے ہیں۔ مزید برآں وہ آدمی ہوتا بھی نیک ہے، خدا کے قرآن کو سینے سے لگائے رکھتا ہے۔ ساری دنیا گواہی دیتی ہے کہ اس جیسے نیک طینت آدمی بار بار پیدا نہیں ہوتے۔ لیکن اس کے باوجود ظلم و ستم کا شکار رہتا ہے، اس کے برعکس ایک امیر فسق و فجور کی زندگی بسر کرتا ہے، دولت اس کے قدموں کو بوسہ دیتی ہے، دنیا کی تمام آرائشیں اس کو ہدیہ تبریک پیش کرتی ہیں۔ اس طرح بہت کم دیکھنے میں آیا ہے کہ رشوت خور کو اس دنیا میں پوری سزا مل ہی جائے۔ ایک چور بعض اوقات تو قانون کی نظر میں چور ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات قانون کو اس کی چوری کا علم ہی نہیں ہوتا۔ ایک ایٹم ۱۰ لاکھ جانیں تلف کرنے

کے بعد قانون کی نظر میں صرف پھانسی کا مستحق ہوتا ہے۔ دیکھئے اس سوال کو حل کرنے میں بعض علماء کرام آخرت کے جواز میں دلیل نکالتے ہیں، جو میرے نظریے کے خلاف ہے میں صرف خدا کو مانتا ہوں۔ آخرت کے متعلق میرا ایمان ابھی تشکک کی دہلیز پر ہی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ ایک عادل خدا اگر صرف آخرت میں ہی عدل کر سکتا ہے اور اس دنیا میں بالکل خاموشی سادھے ہوئے ہے تو کیا یقین کہ آخرت میں بھی وہ عدل کر سکے یا نہ ــــ اس لیے میرا سوال یہ ہے کہ خدا عادل ہے تو اتنا ظلم کیوں ہو؟ اگر نہیں تو اس قسم کے خدا پر جو عدل نہیں کر سکتا، کون یقین کرے۔ ؟

جواب: ۱۔ سوال کے آخری حصہ میں جو کچھ کہا گیا ہے وہ کوئی نئی بات نہیں۔ فلسفہ اخلاق میں یہ "معمہ" بہت قدیم اور مشہور ہے کہ اگر شر، خدا کی مرضی سے موجود ہے تو خدا خیر نہیں ہو سکتا۔ اور اگر وہ خدا کی مرضی کے خلاف موجود ہے تو خدا قادر مطلق نہیں ہو سکتا۔ لفظی طور پر یہ معمہ بڑا مشکل نظر آتا ہے لیکن جب اسے قرآن کی روشنی میں دیکھا جائے تو بڑا آسان ہو جاتا ہے۔ یہ بات محض ضمناً سامنے آگئی ہے ہمارے زیرِ نظر سوال کا تعلق عدل سے ہے۔

۲۔ سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ خدا نے اپنے لیے (قرآن میں) عادل کا لفظ استعمال نہیں کیا۔ اس نے جو کچھ کہا ہے وہ یہ ہے کہ اس نے کائنات کے نظم و نسق کے لیے (جس میں انسانی دنیا بھی شامل ہے) کچھ قوانین مقرر کر دیے ہیں اور ان قوانین میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ لہٰذا یہاں ہر بات قانون کے مطابق عمل میں آتی ہے اور اگر عدل کی تعریف یہ ہے کہ جو بات قانون کے مطابق ہو اسے عدل کہا جاتا ہے تو اس اعتبار سے آپ خدا کو عادل کہہ سکتے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ وہ کسی پر ظلم اور زیادتی نہیں کرتا۔ لوگ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں اور یہ بھی کہ ظلم پر مبنی نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

۳۔ ہمارے مستفسر کے ذہن میں خدا کے عادل ہونے کا تصور یہ ہے کہ جونہی کوئی شخص جھوٹ بولے اس کی زبان گنگ ہو جائے۔ جونہی کوئی کسی کی طرف نظرِ بد سے دیکھے تو اس کی آنکھ پھوٹ جائے۔ جونہی کوئی ظالم کسی کمزور کے خلاف ہاتھ اٹھائے تو اس کا بازو پتھر کا بن جائے۔ اگر ایسا ہو تو پھر خدا کو عادل مانا جائے۔ اور اگر ایسا نہ ہو (جیسا کہ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہوتا) تو پھر خدا عادل کس طرح کہا سکتا ہے، یعنی اگر خدا ہمارے تصور کے مطابق عادل ہو تو اسے عادل کہا جائے۔ اور اگر وہ عدل کے اس تصور پر پورا نہ اترے

تو اسے عادل کس طرح مانا جائے ؟

خدا نے انسان کو اختیار و ارادہ دیا ہے اور یہی اس کا مابہ الامتیاز شرف ہے۔ اسی سے وہ اپنے اعمال کے نتائج کا ذمہ دار قرار پاتا ہے۔ نیکی وہی نیکی ہے جسے انسان اپنے اختیار سے عمل میں لائے۔ انسان کی عظمت اس میں ہے کہ وہ بدی کی استعداد و استطاعت رکھتا ہوا بدی سے مجتنب رہے۔ ہم پتھر کو نیک نہیں کہہ سکتے۔ حالانکہ وہ ساری عمر برائی نہیں کرتا۔ ہم بکری کی شان میں کبھی قصیدۂ مدحیہ نہیں پڑھتے کہ اس نے ساری عمر کسی کا خون نہیں پیا۔ نہ مجبور کی نیکی نیکی ہے۔ نہ اس کی بدی بدی۔ سعدیؔ کے الفاظ ہیں

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

جس میں سر اٹھا کر چلنے کی استطاعت ہی اس کی انکساری اور خاکساری کبھی وجۂ تحسین نہیں ہو سکتی۔ اختیار و ارادہ کی قوت کے صحیح استعمال ہی سے انسان کی صلاحیتوں کی برومندی ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خدا نے انسان کو اختیار و ارادہ دیا ہے۔ تو وہ اسے کبھی سلب نہیں کرتا۔ خدا نے اپنے قادر مطلق ہونے کے باوجود اپنے آپ پر خود یہ پابندی عائد کر رکھی ہے۔ اور یہ اس کی عظمت کی دلیل ہے۔ ورنہ کوئی تنگ ظرف ہوتو اسے بات بات پر غصہ آجائے اور انسان کے اختیار کو جھٹ سلب کر کے اسے اپنی مرضی کے مطابق چلنے پر مجبور کر دے۔ ہمارے مستفسر نے خدا کے عادل ہونے کا جو تصور پیش کیا ہے، اس سے خدا کا نقشہ اسی قسم کا سامنے آتا ہے۔ یعنی خدا کو چاہیئے کہ وہ انسانوں کے معاملات میں انفرادی طور پر دخل دے اور جونہی کوئی بات اس کے منشاء کے خلاف ہونے لگے اسے اپنی قوت کے زور سے فوراً روک دے۔ آپ سوچیئے کہ اگر خدا نے یہی کچھ کرنا ہوتا تو اسے اس قدر طولِ عمل کی ضرورت ہی کیا تھی۔ وہ انسانوں کو (بھیڑ بکری کی طرح) پیدا ہی اس طرح کرتا کہ ان میں غلط راستے پر چلنے کی استطاعت ہی نہ ہوتی۔ لیکن ذرا سوچیئے کہ اس سے انسانی دنیا کا نقشہ کیسا ہوتا؟ یہ صاحب عقل و شعور اور ذوی اختیار و ارادہ انسانوں کی چلتی پھرتی زندہ اور متحرک دنیا نہ ہوتی بلکہ سنگ و خشت اور دام و دد کی دنیا ہوتی ہے۔ قرآن میں ہے وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً۔ اگر ہم چاہتے تو انسانوں کو پیدا ہی اس طرح کرتے کہ وہ ایک روش پر چلنے کے لیے مجبور ہوتے لیکن ہم نے ایسا نہیں کیا۔ انسان کو اس انداز سے پیدا کیا ہے کہ وَلٰكِنْ يُّضِلُّ مَنْ يَّشَآءُ وَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ۔ جس کا جی اپنے اختیار و ارادے سے سیدھے راستے پر چلے اور جس کا جی

چاہے غلط راستہ اختیار کرے۔ اور یہ اس لیے کہ لَتُسْـَٔلُنَّ عَمَّا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۹۳/۱۶) تاکہ ہر ایک پر اس کے کام کی ذمہ داری عائد ہو۔ اب ظاہر ہے کہ اگر ایسا ہو کہ جو شخص غلط قدم اٹھانے کا ارادہ کرے اس کا قدم ہی نہ اٹھ سکے، تو انسان کے صاحب اختیار وارادہ ہونے کا مقصد ہی فوت ہو جائے اور وہ اپنی مرضی سے نہیں بلکہ مجبوراً صحیح روش پر چلے۔ اس باب میں (کہ کسی کو جبراً صحیح روش پر نہ چلایا جائے) اسقدر احتیاط برتی گئی ہے کہ مخالفین رسول اللہ سے معجزات کا مطالبہ کرتے تھے اور خدا اس سے یہ کہہ کر انکار کر دیتا تھا کہ معجزہ دکھانے سے ذہنی جبر (MENTAL COMPULSION) کی کیفیت پیدا ہوتی ہے اور اس قسم کا اقرار انسان کی آزادیٔ فکر (FREE WILL) کا نتیجہ نہیں ہوتا اس لیے معجزہ دکھا کر مسلمان بنانا خدا کی اسکیم کے خلاف جاتا ہے، چہ جائیکہ ظالم کے ہاتھوں کو مافوق الفطرت قوت سے روک کر اسے ظلم سے باز رکھنا۔

۳۔ اب یہ دیکھئے کہ ظلم ہوتا کس طرح سے ہے اور انسانی معاشرہ میں خدا کا قانون مکافات عمل پیرا کس طرح ہوتا ہے۔ اگر معاشرہ کا نظام صحیح خطوط پر متشکل ہو تو اس میں کوئی کسی پر ظلم نہیں کر سکتا۔ اگر کہیں انفرادی طور پر کوئی شخص کسی پر دراز دستی کر ہی بیٹھے تو معاشرہ کا نظام اس کا فوری مواخذہ اور تدارک کر دیتا ہے۔ ظلم ہوتا ہی اس معاشرہ میں ہے جو غلط بنیادوں پر استوار ہو۔ لہٰذا سوال کسی فرد (ظالم) کے مواخذہ کا نہیں۔ اس غلط معاشرہ کے مواخذہ کا ہے۔ جس میں ظلم روا رکھا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بے شمار مقامات پر اس حقیقت کو واشگاف کیا ہے کہ خدا کا قانون یہ ہے جو نظام ظلم پر مبنی ہوگا۔ وہ کبھی کامیاب نہیں ہو سکے گا۔ خواہ نظم و نسق کی لاکھ تدبیریں اس کے استحکام کے لیے کوشاں کیوں نہ ہوں۔ عام طور سمجھا جاتا ہے کہ جو نظام، مادی قوتوں کو اکٹھا کر لے۔ اپنی حفاظت کے اسباب و ذرائع کو مستحکم کرلے۔ اپنے نظم و نسق کو نہایت حسن تدبر سے چلائے وہ نظام کسی کے مٹائے مٹ نہیں سکتا۔ لیکن خدا کا کہنا یہ ہے کہ یہ غلط ہے ہمارا قانون یہ ہے کہ ایسا معاشرہ تباہ ہو کر رہتا ہے۔ یہ ہے وہ مقام جہاں خدا کا عدل سامنے آتا ہے۔ قرآن کریم نے اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں تاریخ عالم کے متعدد شواہد پیش کئے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ قومیں قوت، دولت، شان و شوکت۔ سامان زیست۔ کثرت تعداد۔ ذرائع پیداوار وغیرہ کے اعتبار سے بڑی ممتاز تھیں لیکن چونکہ ان کا نظام ظلم پر مبنی ہے اس لیے ان کی دولت و قوت اور حسن تدبیر انہیں تباہی سے نہ بچا سکے۔ حتیٰ کہ ان کا علم و بصیرت بھی انکے کسی کام نہ آیا۔ وہ خدا کے قانون مکافات کو بے بس

نہ کر سکے۔ وہ قومیں تباہ ہو کر رہیں۔

۴۔ اس کے ساتھ ہی وہ ایک اور حقیقت کو بھی واضح کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں لوگوں کو دھوکا لگ جاتا ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ خدا کا عدل کوئی شے نہیں۔ نہ ہی اس کے قانونِ مکافاتِ عمل کی کوئی ہستی ہے۔ یہ سب باتیں ہی باتیں ہیں۔ وہ حقیقت یہ ہے کہ ہر عمل اور اس کے نتیجہ کے محسوس طور پر سامنے آنے میں، ایک وقفہ ہوتا ہے۔ جس طرح تخم ریزی اور فصل کے پکنے میں ایک مدت درکار ہوتی ہے۔ اسے خدا کا قانون تدریج کہا جاتا ہے۔ یعنی قوموں کا بتدریج آہستہ آہستہ تباہی کی طرف بڑھتے چلے جانا۔ یہ مہلت کا وقفہ بھی خدا کے قانون کے مطابق متعین ہوتا ہے۔ اگر اس قوم کی صلاحیتوں کا پلڑا بھاری ہے اور کمزوریاں اور لغزشیں کم ہیں۔ تو وہ وقفہ لمبا ہو جاتا ہے۔ قوم ڈوبتی اس وقت ہے جب اس کی کمزوریاں اس کی صلاحیتوں پر غالب آجاتی ہیں یہاں کمزوریوں اور صلاحیتوں سے مراد ہے غلط روشش اور صحیح روشِ زندگی۔ چونکہ قوموں کی زندگی دنوں اور مہینوں سے نہیں ماپی جاتی۔ وہ صدیوں کے حساب سے ماپی جاتی ہے۔ اس لیے یہ مہلت کا وقفہ بھی بعض اوقات سینکڑوں برسوں تک پھیل جاتا ہے۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کے لیے قرآن نے کہا ہے کہ خدا کا ایک ایک دن تمہارے حساب وشمار سے ہزار ہزار برس کا ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک فرد کی مدت العمر میں یہ وقفہ پورا نہیں ہو سکتا، اور یہی وجہ ہے کہ انسان اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتا ہے کہ یہ سب دعوے یونہی باتیں ہی باتیں ہیں۔ ہم اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھتے ہیں کہ ظالم اور جابر پنپتے چلے جاتے ہیں اور مظلوم ومقہور بیچارے پستے چلے جاتے ہیں۔ اگر خدا عادل ہوتا۔ یا اس کا قانونِ مکافات حقیقت ہوتا تو ظالم تباہ نہ ہو جاتے ؟

۵۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ مہلت کا عرصہ سکڑ کر کم بھی ہو سکتا ہے یا اتنے کا اتنا ہی طویل طویل رہتا ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ یہ کم ہو سکتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر انسانوں کی کوئی جماعت ایسی پیدا ہو جائے جو خدا کے قانون کے مطابق معاشرہ قائم کرنے کے لیے جدوجہد کرے۔ تو اس کے ہاتھوں ظلم واستبداد پر مبنی نظام کا خاتمہ دنوں میں ہو سکتا ہے۔ یعنی اگر انسان کا دست وبازو قانونِ خداوندی کا رفیق ودمساز بن جائے تو پھر صدیوں کے کام دنوں میں سرانجام پا جاتے ہیں۔ بالفاظ دیگر یوں کہیے کہ انسانی دنیا میں خدا کا قانون انسانوں کے حساب وشمار سے انسانوں کے ہاتھوں نتیجہ خیز ہوتا ہے۔ اور اس طرح وہ مہلت

کا وقفہ جس کے بعد غلط نظام نے تباہ ہونا تھا. صدیوں کے بجائے دنوں میں بدل جاتا ہے۔

ہمارے مستفسر نے کہا ہے کہ ایک شخص بڑا نیک ہے۔ وہ قرآن کو سینے سے لگائے رہتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس پر ظلم پر ظلم ہوتے ہیں۔ اس مقام پر ہمارے محترم مستفسر پھر ایک غلط فہمی میں مبتلا ہو گئے اس شخص کے نیک ہونے سے غالباً ان کی مراد یہ ہے، کہ وہ نماز روزے کا پابند ہے۔ صدقہ خیرات بھی کرتا ہے، اس کے عام اخلاق بھی اچھے ہیں۔ لیکن قرآن کی میزان میں نیکی اسی کو نہیں کہتے۔ اس کے نزدیک "نیک" وہ ہے جو غلط نظام کے الٹنے اور اس جگہ صحیح نظامِ خداوندی قائم کرنے کے ہر ممکن کوشش کرتا ہے اور یہ کام انفرادی طور پر نہیں ہو سکتا اس کے لیے یہ شخص اس جماعت کا فرد بن کر جدوجہد کرتا ہے جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ یعنی وہ جماعت جو غلط نظام کی جگہ صحیح نظامِ خداوندی قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے قرآن کی رو سے زندگی ہے ہی اجتماعی۔ اگر وہ شخص جو ہمارے مستفسر کے تصور کے مطابق بڑا نیک ہے اور قرآن کو سینے سے لگائے پھرتا ہے، لیکن ظلم پر مبنی نظام کے اندر خاموش زندگی بسر کئے جاتا۔ بلکہ ظلم پر ظلم سہے جاتا اور اس کے خلاف کچھ نہیں کرتا (بجز آہ فغاں کے) تو وہ شخص نہ صرف یہ کہ نیک ہی نہیں قرار دیا جا سکتا بلکہ وہ اس ظالم نظام کی تقویت کا (بالواسطہ) موجب بننے کی وجہ سے، عدالت خداوندی میں ظلم کی اعانت کا مجرم بھی قرار پاتا ہے۔ اس حقیقت کو قرآن نے اپنے تمثیلی انداز میں بڑی خوبصورتی سے بیان کیا ہے۔ وہ کہتا ہے جب جہنم میں تباہ ہونے والی قوم کے لیڈر اور ان کے متبعین جمع ہوں گے تو آپس میں ایک دوسرے کو الزام دیں گے کہ ہماری تباہی کا موجب تم ہو۔ ظاہر ہے کہ ان لیڈروں کے جرائم تو نمایاں طور پر سامنے ہوں گے لیکن یہ متبعین وہ ہوں گے جن کی ساری عمر ظلم وستم سہتے سہتے گذری تھی۔ جب یہ اپنے لیڈروں کو مورد الزام قرار دیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ اس باب میں تم بھی کم مجرم نہیں ہو۔ ان لیڈروں کی طاقت کا ذریعہ تم ہی تھے۔ تمہارے بل بوتے پر یہ اس قدر بدمست اور سرکش ہو رہے تھے، اگر تم ان کے مظالم برداشت کرتے چلے جانے کے بجائے، ان کے خلاف اُٹھ کھڑے ہوتے تو انہیں ان دراز دستیوں کی ہمت ہی نہ پڑتی۔ اس لیے ان کے مظالم میں تم بھی برابر کے شریک ہو۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ساتھ تم بھی جہنم کے عذاب میں مبتلا ہو۔ اس لیے جس مظلوم کو دیکھ کر ہم خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ وہ بھی درحقیقت بالواسطہ اس باطل نظام کا پرزہ ہوتا ہے۔

۹۔ تصریحات بالا سے واضح ہے کہ قوموں کی موت و حیات کے فیصلے قانونِ خداوندی کی رُو سے

ہوتے ہیں۔ اور اسی کا نام خدا کا عادل ہونا ہے۔ اس کا قانون یہ ہے کہ انہ لا یفلح الظالمون۔ جو نظام ظلم پر مبنی ہوگا وہ کبھی کامیاب نہیں ہوسکے گا۔ دوسری طرف واما ماینفع الناس فیمکث فی الارض (۱۳/۱۷) بقا اس نظام کے لیے ہے جو تمام نوع انسان کے لیے منفعت بخش ہو۔ یہی اچھے اور برے نظام کا معیار ہے اور اسی معیار کے مطابق کسی نظام کی فنا اور بقا کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اگر خدا کے اس قانون کو تسلیم نہ کیا جائے تو پھر معیار صرف یہ رہ جائے گا کہ جس نظام کی پشت پر مادی قوت زیادہ ہو وہ کامیاب و کامران ہو خواہ وہ کتنا ہی ظلم و استبداد پر مبنی کیوں نہ ہو۔ اور جس کے پاس نسبتاً کم طاقت ہو وہ تباہ ہو جائے خواہ وہ نوع انسان کے لیے کیسا ہی منفعت بخش کیوں نہ ہو۔ یعنی معیار صرف مادی قوت قرار پا جائے۔ اس بات کا اس پر کچھ اثر نہ ہو کہ خود وہ نظام کیسا ہے۔ قوموں کی تاریخ اور مورخین تہذیب کی تحقیقات اس نظریہ کی تغلیط کرتی ہیں۔ اور اس قانون کو صحیح قرار دیتی ہیں جس کا ذکر اوپر کیا جا چکا ہے۔ ایک اچھے نظام کی حفاظت کے لیے بھی مادی قوت کی ضرورت ہوتی ہے۔ لیکن اس نظام کی بنیادی اچھائی بھی ایک قوت اپنے اندر رکھتی ہے۔ جو اسے تباہ ہونے سے محفوظ رہنے میں بڑی مدد دیتی ہے۔

یہ ہے خدا کا "نظام عدل"

سنہ ۱۹۶۴ء

۱۶
متفرقات

۲۲۔ شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ

ایک محترمہ خاتون کا خط

محترم۔ السلام علیکم۔ آپ عورتوں کے حقوق کی بازیابی اور حفاظت کے لیے جو کچھ کر رہے ہیں، اس کے لیے اس طبقہ کو یقیناً آپ کا شکر گذار ہونا چاہیئے جہاں تک میرے علم میں ہے، پاکستان میں صرف آپ کی آواز ہے جس نے اس مظلوم طبقے کے حقوق کی حمایت کی ہے۔ اس سے اور کچھ نہیں تو کم از کم اتنا ضرور ہوا ہے کہ اس طبقہ کے دل میں یہ احساس پیدا ہو گیا ہے کہ یہ بھی انسان ہیں۔ ورنہ اس سے پہلے تو یہ خیال (بلکہ عقیدہ) ان کے دل میں راسخ کر دیا گیا تھا کہ انسان صرف مرد ہیں۔ عورتیں کوئی ایسی جنس ہیں جو انسانی سطح سے بہت پست ہیں۔ اس وقت میں آپ کی توجہ معاشرہ کی ایک ایسی خرابی کی طرف دلانا چاہتی ہوں جس نے ان بیچاریوں کے لیے ایک اور مصیبت پیدا کر دی ہے۔ عورتوں نے زندگی کی ضرورتوں کے لیے گھر سے باہر نکلنا شروع کیا ہے ان کی بچیاں اسکول جاتی ہیں۔ بڑی لڑکیاں کالجوں میں جاتی ہیں۔ لیکن بدقسمتی سے ہمارے نوجوان لڑکوں میں بدتمیزی کی ایسی لہر پیدا ہو گئی ہے کہ وہ ان عورتوں۔ لڑکیوں اور بچیوں کو چھیڑنے اور ستانے میں بڑی لذت لیتے اور فخر محسوس کرتے ہیں۔ اور حیرت اس پر ہے کہ یہ حرکات ایسے گھرانوں کے نوجوانوں کی طرف سے سرزد ہوتی ہیں جن کی اپنی مائیں اور بہنیں اسی زمرہ میں آتی ہیں جنہیں اس طرح تنگ کیا جاتا ہے۔ نتیجہ اس کا یہ ہے کہ کوئی شریف زادی گھر سے باہر نکل کر اپنے آپ کو محفوظ تصور ہی نہیں کر سکتی۔ بچیاں اسکول جانے سے گھبراتی ہیں۔ لڑکیاں کالج جانے سے ڈرتی ہیں۔ اور بڑی عورتیں کام کاج کے لیے باہر نکلنے سے جھجکتی ہیں۔ آپ غور کیجئے کہ جس معاشرہ میں حالت یہ ہو جائے کہ اس کی آدھی آبادی اپنے آپ کو ہر وقت غیر محفوظ پائے اس معاشرہ کا زندہ قوموں میں مقام کیا ہو سکتا ہے اور۔ آدھی آبادی وہ ہو جس کی گود میں آنے والی نسلوں کو پرورش پانا اور تربیت حاصل کرنا ہو۔ جس ماں کا دل ہر وقت خوف اور ہراس سے کانپتا رہے۔ جسے ہر مرد سے ہر وقت ڈر محسوس ہوتا رہے جو اپنے آپ کو کبھی

محفوظ تصور نہ کرے۔ جو بچہ اس کی گود میں پرورش پائے گا، اس کی نفسیاتی کیفیت کیا ہوگی۔ اور آگے چل کر اس کا کیریکٹر کس قسم کا بنے گا؟ حالت اس وقت یہ ہو چکی ہے کہ بچیاں اسکولوں اور کالجوں میں جاتی ہیں تو جب تک وہ خیریت سے واپس گھر نہ آجائیں، دل دھڑکتا رہتا ہے۔ وہ واپس آتی ہیں تو ڈری اور سہمی ہوئی۔ جب وہ بتاتی ہیں کہ راستوں میں بدتمیز لڑکوں نے کس طرح انہیں تنگ کیا تو خون کھولنے لگ جاتا ہے۔ لیکن کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس کا علاج کیا کیا جائے۔ اڑوس پڑوس والوں سے بات کیجئے تو ہر ایک یہی مشورہ دے گا کہ لڑکیوں کو باہر نکلنا ہی نہیں چاہیئے۔ حیرت ہے کہ اب یہ مشکل کسی ایک کی نہیں رہی۔ قریب قریب ہر ایک ماں باپ اس کا شاکی ہے۔ لیکن اس کے علاج کی طرف کوئی توجہ نہیں دیتا۔ ہر ایک اپنے آپ کو بے بس محسوس کرتا ہے۔ مجھے تو ایسا نظر آتا ہے کہ یہ سب اوباش پن کسی سوچی سمجھی اسکیم کے ماتحت ان لوگوں کی طرف سے کرایا جا رہا ہے جو عورتوں کے حقوق کے مخالف ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اگر عورتوں نے تعلیم حاصل کر لی تو یہ اپنے حقوق کی محافظ بن جائیں گی۔ اس لیے ان کی اسکیم یہ ہے کہ انہیں ڈرا دھمکا کر پھر گھروں کے اندر بند کر دیا جائے۔ میں اس نتیجہ پر اس لیے پہنچی ہوں کہ پہلے یہ ہوتا تھا کہ اگر راستے میں کوئی اوباش کسی عورت کو چھیڑتا تھا تو دوسرے لوگ اس کی مذمت کرتے تھے۔ لیکن اب یہ دیکھا گیا ہے کہ چھیڑنے والے اب یہ کہہ کر چھیڑتے ہیں کہ عورتوں کا باہر نکلنا اسلام کے خلاف ہے۔ اس لیے ہم اس خلافِ اسلام طریقہ کو بند کرنا چاہتے ہیں۔ اور راستہ چلنے والے نہ صرف یہ کہ ان کی مذمت نہیں کرتے بلکہ اسی قسم کے دو چار فقرے اور بڑھا کر ان کی حوصلہ افزائی کر دیتے ہیں آپ غور کیجئے کہ اس صورت حال کا نتیجہ کیا ہوگا؟ آپ براہ کرم اس کے متعلق کچھ تجیئے۔ اب تو پانی سر تک چڑھ آیا ہے۔ ان بیچاریوں کے لیے کوئی گوشہ بھی سکون اور حفاظت کا نہیں رہا۔ والسلام۔

طلوعِ اسلام

ہماری محترمہ بہن نے جس خرابی کی طرف ہماری توجہ مبذول کرائی ہے اس کا ہمیں بھی شدت سے احساس ہے۔ آئے دن اس قسم کی شکایات ہم تک پہنچتی رہتی ہیں۔ قرآن کریم کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ جب مسلمانوں کی جماعت ہجرت کے بعد مدینہ پہنچی ہے تو اسے وہاں اسی قسم کے حالات سے دوچار ہونا

پڑا تھا۔ وہاں کا اوباش طبقہ مسلمان شریف زادیوں کو راستوں میں تنگ کرتا تھا اور جب ان سے بازپرس کی جاتی تو وہ یہ کہہ دیتا کہ ہم پہچان نہیں سکے کہ یہ شریف عورتیں ہیں۔ ان کی اتمام حجت کے لیے قرآن کریم نے یہ حکم دیا کہ یٰاَیُّھَا النَّبِیُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِکَ وَ بَنٰتِکَ وَنِسَآءِ الْمُؤْمِنِیْنَ یُدْنِیْنَ عَلَیْھِنَّ مِنْ جَلَابِیْبِھِنَّ ط ذٰلِکَ اَدْنٰٓی اَنْ یُّعْرَفْنَ فَلَا یُؤْذَیْنَ ط وَکَانَ اللّٰہُ غَفُوْرًا رَّحِیْمًا (۳۳/۵۹) اے نبی! تم اپنی عورتوں۔ بیٹیوں اور مسلمانوں کی عورتوں سے کہہ دو کہ وہ باہر نکلتے وقت، اپنے جلباب اوڑھ لیا کریں۔ یہ اس لیے مناسب ہے کہ وہ پہچانی جائیں اور شریر طبقہ انہیں تنگ نہ کرے۔" (جلباب) اوورکوٹ کی قسم کا کپڑا ہوتا تھا جسے عام لباس کے اوپر پہن لیا جاتا تھا جیسے آج کل نرسیں یا ڈاکٹر (DOCTORS) پہنتے ہیں) یہ حفاظتی تدبیر تھی جسے قرآن نے اس ہنگامی ضرورت کو پورا کرنے کے لیے تجویز کیا۔ لیکن اگر وہ لوگ اس پر بھی عورتوں کو چھیڑنے سے باز نہ آئیں تو پھر کیا کیا جائے؟ قرآن کریم نے کہا یہ سوال ایسا نہیں جسے اسی طرح چھوڑ دیا۔ یہ معاشرہ کا بیحد اہم سوال ہے۔ اور اس کا مؤثر حل نہایت ضروری ہے۔ فرمایا لَئِنْ لَّمْ یَنْتَهِ الْمُنٰفِقُوْنَ وَالَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِھِمْ مَّرَضٌ وَّالْمُرْجِفُوْنَ فِی الْمَدِیْنَةِ - اگر مدینہ کے منافق —— یعنی وہ لوگ جو بظاہر بڑے شریف نظر آتے ہیں لیکن ان کی نیتیں سخت خراب ہیں۔ ان کے دلوں میں روگ ہے۔ وہ شریف زادیوں کو تنگ کرتے ہیں اور پھر ان کے متعلق ایسی افواہیں پھیلاتے ہیں جن سے ان کی عزت پر حرف آجائے۔ اگر یہ لوگ اس حفاظتی تدبیر کے باوجود، اپنی حرکات سے باز نہ آئیں۔ تو۔ لَنُغْرِیَنَّکَ بِھِمْ۔ یہ نہیں کہ انہیں کھلی چھٹی دے دی جائے کہ وہ جو جی میں آئے کرتے پھریں۔ بالکل نہیں۔ اس طرح تو یہ لوگ شریف زادیوں کا باہر نکلنا محال کر دیں گے۔ تم اٹھو اور اس طرح ان کے پیچھے لگ جاؤ کہ ان کا اس شہر میں رہنا محال ہو جائے۔ ثُمَّ لَا یُجَاوِرُوْنَکَ فِیْھَآ اِلَّا قَلِیْلًا) یا تو یہ، اس شہر کو چھوڑ کر کہیں اور چلے جائیں اور اگر یہاں رہیں تو انہیں حقوق شہریت سے محروم کر دیا جائے۔ (مَّلْعُوْنِیْنَ) اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئیں تو اَیْنَمَا ثُقِفُوْٓا اُخِذُوْا۔ وہ جہاں بھی ہوں انہیں گرفتار کیا جائے۔ وَقُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا۔ (۳۳/۶۰-۶۱) اور ان کا خوب قتل کیا جائے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے، شریف زادیوں کے تنگ کرنے اور ان کے متعلق غلط افواہیں پھیلانے کو کس قدر سنگین جرم قرار دیا ہے۔ اس نے سزائے موت یا تو جرم قتل عمد کے لیے مقرر کی ہے اور یا مملکت کے خلاف بغاوت کے لیے۔ لیکن یہاں اس نے قُتِّلُوْا تَقْتِیْلًا کہہ کر اس جرم کو ان جرائم سے بھی زیادہ سنگین قرار دیا ہے۔ قرآن کریم عورتوں کی حفاظت کو انسانی جان اور مملکت کی حفاظت سے کم اہمیت نہیں

دیتا۔ وہ جانتا ہے کہ اگر کسی معاشرہ میں عورت اپنے آپ کو محفوظ تصور کرے تو اس معاشرہ کا توازن ہی قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی وہ حقیقت تھی جس کے پیشِ نظر نبی اکرمؐ نے اس قرآنی معاشرہ کا منتہیٰ جسے حضورؐ کے ہاتھوں متشکل ہونا تھا، یہ بتایا تھا کہ ایک عورت یمن سے شام تک تنہا سفر کرے گی اور اسے کسی قسم کا خوف و خطر نہیں ہوگا۔ یعنی حسنِ معاشرہ کی پہچان ہی یہ ہے کہ اس میں عورت، کسی جگہ بھی اپنے آپ کو غیر محفوظ نہ محسوس کرے۔

یہ ہے اس مرض کا وہ علاج جسے قرآن کریم نے تجویز کیا تھا۔ اور یہ علاج وقتی اور ہنگامی نہیں تھا۔ قرآن نے مندرجہ بالا آیات کے بعد کہا کہ سُنَّةَ اللّٰهِ فِي الَّذِينَ خَلَوْا مِن قَبْلُ۔ وَلَن تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلًا (۳۳/۶۱)۔ خدا کا یہ فیصلہ اور قانون نیا نہیں۔ ایسے واقعات اقوامِ گذشتہ میں بھی ہوتے رہے ہیں، وہاں بھی خدا نے یہی قانون دیا تھا۔ اب تمہیں بھی یہی کہا جا رہا ہے۔ اور اس کے بعد جب بھی اس قسم کے واقعات سامنے آئیں، خدا کے اس قانون کے مطابق عمل کرنا چاہیئے اس لیے کہ یہ خدا کا وہ قانون ہے جس میں تو کوئی تبدیلی نہیں پائے گا یہ اس کا غیر متبدل قانون ہے۔ جب اور جہاں بھی ایسی صورت پیدا ہو تو اس قانون پر عمل کیا جائے۔

آپ قرآن کریم کے اس قانون کی مختلف شقوں پر غور کیجئے۔ بات صاف ہو جائے گی۔

(۱) جہاں تک اس پہچان کا تعلق ہے کہ یہ لڑکیاں شریف زادیاں ہیں یا نہیں۔ اس کے لیے آج کل کسی امتیازی نشان کی ضرورت نہیں۔ اسکول میں جانے والی بچیوں اور کالج میں جانے والی لڑکیوں کے متعلق کسے دھوکا لگ سکتا ہے کہ وہ شریف زادیاں نہیں ہیں۔ اس لیے جو بدمعاش طبقہ انہیں راستوں میں تنگ کرتا ہے وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ ہم پہچان نہیں سکے تھے کہ یہ شریف زادیاں ہیں یا اوباش لڑکیاں۔

(۲) قرآن کریم نے پہلی حفاظتی تدبیر یہ بتائی ہے کہ ایسے بدمعاش عنصر کے خلاف پورے کا پورا معاشرہ اُٹھ کھڑا ہو۔ لوگ اس طرح ان کے پیچھے پڑ جائیں کہ ان کا جینا حرام ہو جائے۔ یا وہ اپنی ان حرکات سے باز آجائیں اور یا شہر (بلکہ ملک) چھوڑ دینے پر مجبور ہو جائیں۔

یہ ہے سب سے پہلا موثر قدم جسے قرآن نے اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے تجویز کیا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ معاشرہ کی ضمیر کو بیدار کیا جائے۔ لوگوں کو اس خطرے سے آگاہ کیا جائے۔ ان کے دل میں ان حرکات کے خلاف جذباتِ مذمت بیدار کئے جائیں تاکہ باہر نکلنے والی لڑکیاں اور عورتیں اسے محسوس

کریں کہ بدمعاش عنصر کو چھوڑ کر، ہر راہ رو، ان کی عزت کا محافظ اور ان کی ناموس کا پاسبان ہے۔ آج کل ہمارے ہاں ہر شہر اور ہر بستی میں یونین کونسلیں موجود ہیں۔ اگر ہر کونسل اپنے اپنے علاقے کا ذمہ لے لے کہ اس میں اس قسم کی کوئی حرکت نہیں ہونے پائے گی تو معاشرہ اس فتنہ سے پاک ہو جائے۔ علاوہ بریں، اس سلسلے میں ملک میں عام پراپیگنڈہ ہونا بھی ضروری ہے۔ جس طرح پچھلے دنوں، بچوں کے اغوا کے سلسلے میں رائے عامہ کو بیدار کرنے کے سلسلے میں پراپیگنڈہ کی ایک مہم شروع ہوئی تھی، اسی طرح اس مقصد کے لیے بھی ایک مہم شروع کی جائے اور اسے اس وقت تک جاری رکھا جائے جب تک معاشرہ سے اس خرابی کا کلیتہً استیصال نہ ہو جائے۔ یہاں تک افراد کے کرنے کا کام ہے۔ اس سے آگے قانون کی باری آتی ہے۔

۲۔ ملک میں ایسا واضح قانون ہونا چاہیئے کہ جو شخص اس جرم کا مرتکب ہو، اسے

(ا) پہلی مرتبہ یہ سزا دی جائے کہ اسے حقوق شہریت سے محروم کر دیا جائے۔

(ب) اگر وہ اس پر بھی باز نہ آئے تو اس کے وارنٹ بلا ضمانت جاری کئے جائیں۔ اور مجرم ثابت ہونے پر اسے کوڑوں کی سزا دی جائے۔ (یاد رہے کہ قرآن کریم نے پاک دامن عورتوں کے خلاف الزام تراشی کی سزا ۸۰ کوڑے مقرر کی ہے)

(ج) اور عادی مجرم کو سزائے موت دی جائے۔

واضح رہے کہ حکومت کا اولین فریضہ ملک میں امن قائم رکھنا ہے۔ قیامِ امن کے معنی یہ ہیں کہ ہر فرد معاشرہ، اپنی جان۔ مال۔ عزت کو ہر وقت محفوظ سمجھے، اور ملک میں بلا خوف و خطر نقل و حرکت کر سکے۔ جو لوگ حکومت کے اس بنیادی فریضہ کی سرانجام دہی کے راستے میں حائل ہوں اور ملک کی حالتِ امن کو خوف میں بدلنے کے درپے، انہیں سخت سزا دی جانی چاہیئے۔ اسی لیے قرآن کریم نے عورتوں کو تنگ کرنے والوں کے خلاف اس قدر سخت اقدامات کی تاکید کی ہے اور اسے خدا کا غیر متبدل قانون قرار دیا ہے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے ارباب حل و عقد اس طرف ضرور توجہ دیں گے۔

لیکن جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے، قانونی اقدامات سے پہلے، یہ کام انفرادی طور پر معاشرہ میں شروع ہو جانا چاہیئے۔ اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے۔ جب ہر فرد معاشرہ، ہر عورت اور لڑکی کی عزت کو خود اپنی بہن اور بیٹی کی عزت سمجھے، اور فتنہ پرور عناصر سے ان کی حفاظت ایسے ہی کرے جس طرح وہ

اپنی ماؤں۔ بہنوں۔ بیویوں اور بیٹیوں کی حفاظت کرتا ہے۔ اس لیے معاشرہ میں رائے عامہ کا بیدار کیا جانا اشد ضروری ہے۔ کیا ہم توقع کریں کہ ملک کے اخبارات اس باب میں قدم اٹھائیں گے؟ یا وہ اسی مشغلہ میں مصروف رہیں گے کہ اس قسم کے واقعات کی خبروں کو نمک مرچ لگا کر اور اس طرح انہیں سنسنی خیز بنا کر شائع کریں اور یوں قوم کی معصوم بیٹیوں کی ناموس کی تشہیر کرتے رہیں اور کبھی اتنا سوچنے کی بھی زحمت گوارا نہ کریں کہ

اے چشمِ اشکبار ذرا دیکھ تو سہی
یہ گھر جو بہہ رہا ہے کہیں تیرا گھر نہ ہو

(۱۹۶۴ء)

شریف زادیوں سے چھیڑ چھاڑ

سابقہ فروری کے طلوع اسلام میں ہم نے ایک محترمہ خاتون کا خط شائع کیا تھا جس میں کہا گیا تھا کہ آج کل ہمارے ہاں یہ وبا عام ہو رہی ہے کہ قوم کے نوجوان لڑکے گزرگاہوں پر شریف زادیوں کو تنگ کرتے ہیں۔ ہم نے اس پر انتہائی رنج و تاسف کا اظہار کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس کا علاج یہ ہے کہ اس قسم کے بدنہاد، فتنہ پرور لوگوں کو عبرت آموز سزائیں دی جائیں۔ اس پر ہمیں (بزعم خویش) "دیندار" طبقہ کی طرف سے کئی ایک خط موصول ہوئے ہیں۔ ان میں سے ایک کا نمونہ ملاحظہ ہو۔

> طلوع اسلام ملک میں بے حیائی پھیلانے کا ٹھیکہ دار بن گیا ہے۔ بجائے اس کے کہ یہ ان عورتوں اور جوان لڑکیوں سے کہتا کہ تم گھروں سے باہر کیوں نکلتی ہو۔ اندر کیوں نہیں بیٹھتیں۔ اس نے الٹا ان لڑکوں کو کوسنا شروع کر دیا اور اسطرح ان باہر پھرنے والیوں کی حوصلہ افزائی کر دی۔ (وغیرہ وغیرہ)

ہم اپنے ان بھائیوں کی خدمت میں عرض کرنا چاہتے ہیں کہ طلوع اسلام نے جو کچھ کہا تھا اپنی طرف سے نہیں کہا تھا۔ خدا کا حکم پیش کیا تھا۔ خدا نے رسول اللہؐ سے کہا تھا کہ ان فتنہ پرور منافقین کی اتمام حجت کے لیے اپنی عورتوں سے تو یہ کہہ دو کہ وہ اپنے اوپر ایک کپڑا اوڑھ لیا کریں تاکہ یہ لوگ یہ نہ کہہ

سکیں کہ ہم پہچان نہیں سکتے تھے۔ کہ یہ عورت آوارہ ہے یا شریف زادی۔ اور اگر اس کے بعد یہ ان حرکات سے باز نہ آئیں تو انہیں سخت سزا دی جائے۔ جس میں سزائے قتل بھی شامل ہے (دیکھئے ۳۳/۶۰-۵۹)

افسوس ہے کہ ہمارے یہ معترض حضرات نزولِ قرآن کے وقت موجود نہ تھے ورنہ یہ ضرور اللہ میاں سے کہتے کہ (معاذ اللہ) "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ اس سے تو یہ عورتیں اور بیباک ہو جائیں گی۔ آپ ان سے کہئے کہ یہ گھروں سے باہر نہ نکلا کریں" اور ان چھیڑ چھاڑ کرنے والوں سے کہتے کہ شاباش! تم بہت بڑا کام کر رہے ہو۔ اگر یہ عورتیں پھر باہر نکلیں تو انہیں ایسا تنگ کرو کہ دوبارہ باہر آنے کا نام نہ لیں۔ اس کارِ خیر کا بہت بڑا اجر تمہارے نامۂ اعمال میں لکھا جائے گا" اسی قسم کا وہ طبقہ تھا جو رسول اللہ سے کہا کرتا تھا کہ اُئْتِ بِقُرْآنٍ غَيْرِ هَٰذَا أَوْ بَدِّلْهُ (۱۰/۱۵)۔ یہ قرآن ہماری منشا کے مطابق تعلیم نہیں دیتا۔ اس کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لاؤ۔ یا اس کے فلاں فلاں مقام میں ہماری حسبِ منشاء تبدیل کر دو۔ پھر ہم اسے مانیں گے۔ طلوعِ اسلام کا قصور صرف اتنا ہی ہے کہ یہ قرآن کریم کو اس کی اصلی شکل میں پیش کرتا ہے قرآن کا وہ مفہوم پیش نہیں کرتا جو لوگوں کی منشاء کے مطابق وضع کیا گیا ہو۔ واضح رہے کہ عورتوں کو گھروں میں بند رکھنا، قرآن کریم نے ایک جرم کی سزا کے طور پر تجویز کیا ہے۔ (۴/۱۵) اگر مقصد یہ ہوتا کہ عورتیں گھروں سے باہر ہی نہ نکلیں تو یہ کیوں کہا جاتا کہ قُلْ لِّلْمُؤْمِنِينَ يَغُضُّوا مِنْ أَبْصَارِهِمْ اور قُلْ لِّلْمُؤْمِنَاتِ يَغْضُضْنَ مِنْ أَبْصَارِهِنَّ (۲۴/۳۰-۳۱)۔ مومن مردوں اور عورتوں سے کہہ دو کہ اپنی نگاہیں نیچی رکھا کریں۔ وہ جو سورۂ احزاب میں "نبی کی عورتوں" سے کہا گیا ہے کہ وَقَرْنَ فِي بُيُوتِكُنَّ۔ اپنے گھروں میں وقار سے بیٹھیں۔ تو اس سے مراد یہ نہیں کہ وہ گھروں میں بند رہیں۔ باہر نکلیں ہی نہیں۔ ان الفاظ کی تشریح اگلے الفاظ نے کر دی، جہاں کہا گیا کہ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُولَىٰ۔ (۳۳/۳۳)۔ جس طرح زمانہ جاہلیت میں عورتوں کا حال تھا کہ وہ مردوں کے جذبات کو مشتعل کرنے کے لیے اپنی آرائش و زیبائش کی نمود و نمائش کرتی پھرتی تھیں۔ وہ کچھ نہ کریں۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے۔

(۱) عورتوں کو یہ حکم نہیں دیا گیا کہ وہ گھروں کے اندر بند رہیں۔ پابندِ مسکن رکھنا تو ایک جرم کی سزا ہے۔ (۴/۱۵)

(۲) وہ کام کاج کے لیے مردوں کی طرح باہر آجا سکتی ہیں۔ البتہ انہیں اس سے روکا گیا ہے کہ

وہ زیب وزینت کی نمائش یا حسن کی نمود کرتی پھریں۔

(۳) عورتوں کو چھیڑنا اور تنگ کرنا سنگین جرم ہے۔ معاشرہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ایسا کرنے والوں کو اس سے روکے اور اگر وہ اپنی حرکات سے باز نہ آئیں تو انہیں سخت ترین سزا دے۔

(۱۹۶۴ء)

---

۲۴ — مسلمانوں کے "حرم"

ایک صالح نوجوان جو حال ہی میں یورپ اور امریکہ وغیرہ کے سفر سے واپس آئے ہیں، ایک نہایت نازک سوال دریافت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ وہ مغربی ممالک میں جہاں بھی پہنچا، اس سے سب سے پہلا سوال یہ کیا گیا کہ تمہارے "حرم" کتنے ہیں۔ حرم سے ان کی مراد ہوتی ہے، بیویوں کا ریوڑ اور لونڈیوں کی پوری کی پوری کھیپ۔ اس کے بعد میں نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کے متعلق ان کا احساس یہ ہے کہ ان میں من حیث القوم جنسی جذبہ بڑا قوی اور شدید ہوتا ہے اور بدقسمتی سے ہماری تاریخ خود اس کی شہادت بہم پہنچاتی ہے۔ خواہ وہ پچھلی تاریخ ہو یا خود ہمارے زمانے کی تاریخ۔ قرآن کریم نے زنا کی سخت سزا مقرر کی ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ ہم میں زنا ایسا عام ہے بھی نہیں۔ لیکن اس کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمان اس معاملہ میں بڑا بدنام ہے۔ یورپ میں آج کل جنسی جذبہ کی جو شدت پائی جاتی ہے اس کی وجہ ظاہر ہے کہ وہاں زنا کو (سوائے بالجبر کے) معیوب ہی خیال نہیں کیا جاتا۔ لیکن جس قوم میں زنا کو اس قدر معیوب خیال کیا جاتا ہو ان میں جنسی جذبہ کی شدت کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کیا آپ بتائیں گے کہ اس کی وجہ کیا ہے؟

طلوع اسلام

جنسی جذبہ کے متعلق سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ بھوک یا پیاس کی طرح از خود بیدار نہیں

ہوتا۔ اسے انسان اپنے خیالات سے بیدار کرتا ہے اور اس کے لیے جس قدر زیادہ مواقع ممکن نظر آئیں اسی قدر زیادہ خیال اس کی طرف جاتا ہے۔ اور اسی نسبت سے بیدار بھی ہوتا ہے۔ سوال جائز یا ناجائز کا نہیں۔ نفسیاتی طور پر سوال مواقع (OPPORTUNITIES) کے کم یا زیادہ ہونے کا ہے۔ آپ نے کبھی اس پر غور کیا ہے کہ جس حلقہ کو محارم (PROHIBITED AREA) تصور کر لیا جاتا ہے (یعنی جن عورتوں یا مردوں سے نکاح حرام ہوتا ہے) اس میں جنسی جذبہ کا خیال تک بھی نہیں آتا۔ بیٹی بہن۔ خالہ۔ پھوپھی وغیرہ کے حلقہ میں انسان دن رات پھرتا رہتا ہے جنسی جذبہ کا تصوّر تک بھی پیدا نہیں ہوتا۔ قرآن کریم نے زنا کو سنگین ترین جُرم اور معیوب ترین حرکت قرار دینے کے بعد دوسرا قدم یہ اٹھایا تھا کہ محارم کا دائرہ بہت وسیع کر دیا تھا۔ مثلاً مسلمان مردوں کے لیے تمام غیر مسلم عورتیں (بجز اہل کتاب کی عورتوں کے) محرکات کی فہرست میں داخل۔ اور مسلمان عورتوں کے لیے تمام غیر مسلم مرد، محارم کے دائرے کے اندر۔ آپ غور کیجئے کہ مسلمان مرد، کفار اور مشرکین کی عورتوں کے اژدحام میں دن رات پھرتا رہے۔ چونکہ اس سے نکاح حرام ہے اس لیے اس کے دل میں ان کی طرف سے جنسی جذبہ کا خیال تک نہیں آئے گا۔ وہ سب اس کے نزدیک۔ ماؤں، بہنوں، بیٹیوں کے برابر ہوں گی۔ قرآن کریم نے اس ایک حکم سے ان غیر مسلم عورتوں کو مسلمانوں کی طرف سے کس طرح یکسر محفوظ اور مامون کر دیا کہ یہ ان کی طرف نگاہ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھ سکتے۔ اسی طرح مسلمان عورتوں کے نزدیک دنیا کے تمام غیر مسلم مرد بھائیوں اور بیٹوں کی مانند ہوں گے۔

اب لیجئے وہ حلقہ جس کے اندر نکاح ہو سکتا ہے۔ اس میں قرآن کریم نے وحدتِ زوج (MONOGAMY) کو عام اصول قرار دے کر شادی کے بعد دنیا بھر کی عورتوں کو محرکات کی فہرست میں داخل کر دیا۔ یعنی جب ایک شخص نے کسی عورت سے نکاح کر لیا تو چونکہ اس کی موجودگی میں وہ (بجز ہنگامی حالات کے) کسی دوسری عورت سے شادی نہیں کر سکتا اس لیئے جب تک وہ عورت زندہ یا اس کے نکاح میں ہے۔ دنیا کی تمام عورتیں اس پر حرام ہو گئیں۔ اسی طرح وہ مرد بھی باقی تمام عورتوں کے نزدیک باپ اور بیٹے کی طرح ہو گیا۔ اسے کسی اور عورت سے یا کسی عورت کو اس سے شادی کا خیال اسی صورت میں آ سکتا ہے جب اس کی پہلی بیوی مر جائے یا ان میں طلاق ہو جائے۔

آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے جنسی جذبہ کی تسکین کے مواقع کو کم از کم حد تک سیکڑ کر کس طرح اس

جذبہ کی بیداری کے نفسیاتی محرکات کو سمٹا دیا ــــ زنا حرام ــــ اور ایک عورت سے شادی کر لینے کے بعد اس کی موجودگی میں دنیا کی ہر عورت سے نکاح ناجائز۔ (بجز ان خصوصی حالات کے جن کا ذکر آگے چل کر آتا ہے) ۔یہ سب محرکات کی صف میں چلی گئی ہیں۔ اسی طرح تمام شادی شدہ مسلمان مرد، دنیا بھر کی عورتوں کے نزدیک محارم کی صف میں آگئے۔

لیکن مسلمان نے کیا کیا ؟ زنا کو تو حرام سمجھا لیکن جنسی جذبہ کی تسکین کے مواقع کو عام کر دیا۔ قرآن کریم نے ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیوی کی اجازت صرف ان استثنائی صورتوں میں دی تھی جب معاشرہ میں عورتوں اور یتیم بچوں کی کفالت اور حفاظت کا سوال ایک لاینحل مسئلہ بن جائے ۔ انہوں نے اسے عام اجازت قرار دے کر شادی ہو جانے کے بعد بھی، باقیماندہ عورتوں کو محرم نہ رہنے دیا۔ نہ ہی باقی عورتوں نے اس مرد کو محرم سمجھا۔ نتیجہ اس کا یہ کہ ہر مرد کو چھٹی مل گئی کہ وہ جس عورت کا خیال چاہے جی میں لے آئے اور سوچتا رہے۔ کہ اس سے شادی کی کیا صورت پیدا ہو سکتی ہے۔ اسی طرح ہر عورت یہ خیال کرتی رہے کہ اس کے نکاح میں جانے کی کیا شکل پیدا ہو سکتی ہے۔ چونکہ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) جنسی جذبہ کی بیداری، خیالات سے ہوتی ہے، اس سے اس قوم میں اس جذبہ کی مسلسل بیداری کی راہیں کھل گئیں ــــ پھر چونکہ مرد کو اس کا بھی اختیار مطلق دے دیا گیا کہ وہ جس وقت جی چاہے بغیر کوئی وجہ بتائے، بیوی کو طلاق دے سکتا ہے۔ اس لیئے چار تک کی تحدید بھی اس کے راستے میں حائل نہ ہو سکی۔ چار بیویوں کے بعد بھی اس کے لیئے اور عورتوں سے نکاح کر لینے کا راستہ کھول دیا گیا ــــ یعنی ایک کو طلاق دے کر اس کی جگہ دوسری بیوی لے آنے سے ــــ اس سے آگے بڑھے تو لونڈیوں کو حرم میں داخل کرنے لگے۔ (حالانکہ قرآن کریم نے غلاموں اور لونڈیوں کا تصور تک مٹا دیا تھا) کبھی دشمن کی قید کردہ عورتیں بطور لونڈیاں اور کبھی بازار میں بکتی ہوئی عورتیں ــــ اور چونکہ لونڈیوں کی تعداد پر بھی حدبندی نہ تھی اس لئے اس سے جنسی جذبہ کے اشتعال کی جو صورت پیدا ہو سکتی تھی وہ ظاہر ہے)۔

یہ ہیں وہ وجوہات جن کی بنا پر بدقسمتی سے ہماری قوم میں جنسی جذبہ کی بیداری اس افراط اور شدت سے پائی جاتی ہے۔ آپ زنا اور مبادیات زنا کو جرم اور معیوب حرکات قرار دے کر وحدت زوج کے قانون کو (بجز ہنگامی حالات کے) اصول بنا دیں۔ اس کے بعد دیکھیں کہ جنسی جذبات میں کس قدر سکون اور اعتدال پیدا ہو جاتا ہے ۔ اور معاشرہ میں عام عورتوں اور مردوں کے تعلقات کا وہ مسئلہ

جس نے اس وقت قوم کو اس قدر مضطرب و پریشان کر رکھا ہے اس کا حل بھی کس طرح خود بخود مل جاتا ہے۔ مسلمان مرد کے ہاتھوں تو دنیا کی ہر عورت اپنے آپ کو سب سے زیادہ محفوظ تصور کر سکتی ہے۔ اگر وہ شادی شدہ نہیں تو وہ اس کی طرف بُری نگاہ سے دیکھ نہیں سکتا، کیونکہ زنا اور مبادیاتِ زنا اس کے نزدیک انتہائی معیوب افعال اور جرائم ہیں۔ اور اگر وہ شادی شدہ ہے تو جب تک اس کی بیوی موجود ہے وہ عام حالات میں کسی عورت کے متعلق جنسی خیال تک بھی دل میں نہیں لا سکتا۔ وہ سب محرمات کی صف میں داخل ہیں۔

جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک سمیٹ دینے سے اتنا ہی نہیں ہوتا کہ معاشرہ میں سکون پیدا ہو جاتا ہے بلکہ یہ قوم زندگی کی خوشگواریوں میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھ جاتی ہے۔ مغرب کا مشہور ماہرِ جنسیات (J.D. UNWIN) اس ضمن میں لکھتا ہے:۔

کسی سوسائٹی میں تخلیقی توانائیاں باقی نہیں رہ سکتیں جب تک اس کی ہر نسل ان روایات میں پرورش نہ پائے جو جنسی اختلاط کے مواقع کو کم از کم حد تک محدود نہ کر دیں اگر وہ قوم اس قسم کے نظام کو (جس میں جنسی اختلاط کے مواقع کو قلیل ترین حد تک محدود کر دیا جائے) مسلسل آگے بڑھاتی جائے تو وہ شاندار روایات کی حامل بن جائے گی۔ (۱۹۶۴ء)

امتناعِ شراب کا حکم

اخبارات میں شائع شدہ ایک خبر سے معلوم ہوا ہے کہ اسلامی مشاورتی کونسل نے حکومت کو اپنی رائے سے مطلع کر دیا ہے کہ اسلام میں شراب واقعی ممنوع ہے۔ معلوم نہیں کونسل بیچاری کو اس حقیقت تک پہنچنے کے لیے کس قدر کوہ کنی اور خارہ شگافی کرنی پڑی ہو گی! بہر حال مقامِ تشکّر ہے کہ ان کی محنت ٹھکانے لگی اور انہیں بالآخر بالتحقیق معلوم ہو گیا کہ اسلام میں شراب ممنوع ہے۔

اصل میں قصور مشاورتی کونسل کا بھی نہیں۔ ان سے جب کسی معاملہ کے متعلق استفسار یا استصواب کیا جائے گا تو انہیں اس کے جواب میں اپنی رائے دینی ہی ہو گی۔ غور طلب بات تو یہ ہے کہ کیا یہ معاملہ ایسا تھا جس کے لیے اس تحقیق کی ضرورت پڑتی کہ اسلام میں شراب ممنوع ہے یا نہیں؟ نہ پینے والے تو ایک طرف، جو مسلمان بدقسمتی سے شراب پیتے ہیں انہیں بھی اس کا علم (بلکہ اقرار) ہوتا ہے کہ شراب ممنوع ہے۔ اصل میں طے کرنے کی بات اور تھی۔ اور ہمیں نہیں معلوم کہ وہ بات طے بھی کی گئی ہے یا نہیں۔ شراب کے متعلق زیر غور مسئلہ یہ ہے کہ ملک میں اس کا استعمال قانوناً ممنوع قرار دیا جائے اور ظاہر ہے کہ جب اسے قانوناً ممنوع قرار دیا جائے گا تو اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا بھی دی جائے گی۔ جب کسی چیز کو قانون کے دائرے میں لایا جائے تو قانون کا تقاضا یہ بھی ہوتا ہے۔ (بلکہ یہ اس کا اولین تقاضا ہوتا ہے) کہ جس چیز کو ممنوع قرار دیا جائے اس کے متعلق متعین طور پر بتائے کہ وہ کون سی چیز ہے جسے ممنوع قرار دیا جا رہا ہے۔ یعنی اس چیز کی تعریف (DEFINITION) دی جائے۔ لہٰذا قانون نافذ کرتے وقت اس بات کی صراحت ضروری ہو گی کہ "شراب" جسے قانوناً ممنوع قرار دیا جا رہا ہے۔ کس چیز کو کہتے ہیں۔ بظاہر یہ بات کچھ مضحکہ انگیز سی دکھائی دے گی کہ یہ متعین کیا جائے کہ "شراب" کسے کہتے ہیں۔ کہہ دیا جائے گا کہ ہم میں سے کون نہیں جانتا کہ شراب کسے کہتے ہیں۔ لیکن جن لوگوں کو قانون کی باریکیوں سے واقفیت ہے وہ جانتے ہیں کہ اس بات کے تعین کے بغیر قانون ناقص رہ جاتا ہے۔ بعض لوگ بیئر (BEER) کے متعلق کہہ دیتے ہیں کہ وہ شراب نہیں۔ اور خود ہمارے ہاں یہ مسئلہ شروع سے زیر بحث چلا آ رہا ہے کہ نبیذ شراب (خمر) میں داخل ہے یا نہیں۔ بنا بریں اس کا تعین ضروری ہے کہ شراب کسے کہتے ہیں۔ ہمیں معلوم نہیں کہ مشاورتی کونسل نے اس کی بابت بھی کوئی رائے دی ہے یا نہیں۔ لیکن ہمارا خیال ہے کہ اس باب میں ڈاکٹروں کی رائے زیادہ موزوں ہو سکتی ہے۔

دوسری بات اس سے بھی زیادہ اہم ہے۔ ہم اس حقیقت کو دہرانا چاہتے ہیں کہ اسلام میں شراب ممنوع ہے اور اسلامی معاشرہ میں اس کا استعمال قانوناً ممنوع ہونا چاہیئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ جن حالات میں ہمارا معاشرہ اس وقت گرفتار ہے ان میں اس قانون کو نافذ کس طریق سے کیا جائے؟ یہ ظاہر ہے کہ جو لوگ اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس حکم سے زیادہ کسی قانون

کی ضرورت ہی نہیں کہ اسلام نے جس شے کو ممنوع قرار دیا ہے اس سے باز رہنا ضروری ہے۔ قانون کی ضرورت ان لوگوں کے لیے پڑتی ہے جو یہ سب کچھ جانتے بوجھتے ایسے کاموں سے باز نہیں آتے۔
سوال یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے لئے قانون کس انداز سے نافذ کیا جائے کہ اس پر واقعی عمل ہونا شروع ہو جائے اور وہ لوگ شراب کے استعمال سے باز آ جائیں۔ اگر ایسا نہ کیا گیا تو خدشہ یہ ہے کہ اس قانون کا بھی وہی حشر ہوگا جو اس وقت کئی ایک دیگر قوانین کا ہو رہا ہے۔ رشوت، چور بازاری۔ اشیائے خوردنی میں ملاوٹ وغیرہ قانوناً منع ہیں لیکن یہ سب کچھ کھلے بندوں ہوتا ہے اور قانون بے چارہ اپنا سا مُنہ لے کر رہ جاتا ہے۔

قرآن کریم نے ایک چیز کہی ہے "کتاب" اور اس کے ساتھ دوسری چیز بتائی ہے "حکمت" کتاب کے معنی ہیں قانون اور حکمت کے معنی ہیں اس قانون کی غرض و غایت۔ اس کے مقاصد اور مصالح۔ اس کے مطابق زندگی گذارنے کے فوائد اور اس کی خلاف ورزی کے نقصانات۔ اس نے جس قانون کی پابندی کرانی ہوتی ہے، وہ اس کی حکمت کو اس انداز سے عام اور دل نشین کراتا ہے کہ انسان عقل وبصیرت کی رُو سے (RATIONALLY) اس نتیجہ پر پہنچ جاتا ہے کہ اس قانون کی پابندی واقعی اس کے فائدے کے لئے ہے۔ اس طرح اس کے دل میں اس قانون کا احترام پیدا ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد اس قانون کی خلاف ورزی وہی لوگ کرتے ہیں جو یہ سب کچھ جانتے بوجھتے اپنی من مانی کرنا چاہتے ہیں۔ ان کی اصلاح یا روک تھام سزا کے ذریعے (خواہ وہ صرف تادیب ہی کی شکل میں کیوں نہ ہو) کرائی جاتی ہے۔

قانون کے نفاذ کے لیئے اس طریق کار کی ضرورت اگرچہ ہر قانون کی صورت میں ضروری ہے لیکن ایسے امور کے سلسلہ میں جن کا انسان عادی ہو چکا ہو اور طبعی یا نفسیاتی طور پر اس عادت کا یک لخت چھوڑنا مشکل ہو، اس کی اہمیت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ مثلاً اگر آپ یہ قانون نافذ کرنا چاہیں کہ پاکستان میں مسلمانوں کے لیے خنزیر کے گوشت کا استعمال ممنوع ہے تو اسے آپ فی الفور بھی نافذ کر دیں تو اس میں کچھ مضائقہ نہیں۔ اس لئے کہ اگر کوئی شخص اس کا استعمال کرتا ہے تو اس کا یک لخت چھوڑ دینا کچھ مشکل نہیں۔ (اگرچہ ایسی صورتوں میں بھی اس قانون کی حکمت بیان کرنا بہت مفید ہوگا) لیکن (مثلاً) اگر آپ یہ قانون نافذ کرنا چاہیں کہ پاکستان میں تمباکو نوشی ممنوع ہے تو اس

قانون کو آپ شبا شب نافذ نہیں کر سکتے۔ اگر آپ ایسا کریں گے تو اس پر بالکلیہ عمل نہیں ہوگا۔ جو لوگ تمباکو کے عادی ہیں ان کے لیے ناممکن ہوگا کہ وہ اس کا استعمال یک لخت چھوڑ دیں۔ وہ اس قانون سے بچنے کی ہزار راہیں سوچیں گے۔ اس قانون کو مؤثر (EFFECTIVE) بنانے کے لیے ضروری ہے کہ آپ پہلے لوگوں کو متنبہ کریں۔ کہ اب قانون نافذ ہونے والا ہے۔ اس کے ساتھ ہی آپ تمباکو نوشی کے نقصانات کے متعلق عام پبلسٹی کریں اور ایسا مسلسل اور متواتر کرتے جائیں۔ اور لوگوں کی توجہ بار بار اس طرف منعطف کراتے رہیں۔ جب یہ خیالات فضا میں عام ہو جائیں تو پھر اس قانون کو نافذ کر دیں۔ اس طرح یہ قانون فی الجملہ مؤثر ہو جائے گا۔

نظر آتا ہے کہ قرآن کریم نے امتناع شراب کے سلسلہ میں یہی تدریجی طریق اختیار کیا تھا۔ شراب عربوں کی گھٹی میں پڑی تھی۔ ایسے لوگوں سے یہ تقاضا کرنا کہ وہ اس عادت کو یک لخت چھوڑ دیں نفسیاتی، ناممکنات میں سے تھا۔ چنانچہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ حضورؐ کی مکّی (تیرہ سالہ) زندگی میں امتناع شراب کا حکم نہیں دیا گیا۔ مدنی زندگی میں جب اس کے متعلق دریافت کیا گیا تو اتنا کہا گیا کہ قُلْ فِيهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَ اِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ط (۲/۲۱۹) ان سے کہہ دو کہ (خمر اور میسرہ میں) نقصانات بھی ہیں اور فائدے بھی۔ لیکن ان کے نقصانات ان کے فوائد سے کہیں زیادہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو لوگ نفع اور نقصان کا موازنہ کرتے کے بعد فیصلہ کرنے کی روش اختیار کئے ہوں گے انہوں نے اس تصریح کے بعد از خود شراب چھوڑ دی ہوگی۔

اس کے بعد اگلا حکم یہ آیا کہ لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوةَ وَ اَنْتُمْ سُكٰرٰى (۴/۴۳) جب تم ہوش میں نہ ہو تو اجتماع صلوٰۃ میں شریک نہ ہوا کرو۔ ظاہر ہے کہ بہت سے قلوب کے لیے یہ تہدید بھی بڑی کارگر ثابت ہوئی ہوگی۔ اس کے بعد سورۂ المائدہ میں یہ حکم آیا کہ "خمر اور میسرہ وغیرہ شیطانی افعال ہیں اور انسان کی کامیابی کی راہ میں سخت رکاوٹ کا باعث۔ اس لیے تم ان سے باز رہو" اس کے بعد اس قانون کی مزید حکمت بیان کرتے ہوئے کہا کہ یاد رکھو۔ یہ تم میں انفرادی کمزوری پیدا کرنے کے علاوہ باہمی عداوت اور کینہ پیدا کر دیں گے اور قوانین خداوندی کو پیش نظر رکھنے اور نظام صلوٰۃ کے قائم کرنے سے تمہیں روک دیں گے۔ اس کے بعد فرمایا۔ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ (۵:۹۱) کیا اس قدر وضاحت کے بعد بھی تم ان چیزوں سے باز نہیں رہتے؟

اب کون ایسا ہوسکتا تھا جو اس سے باز نہ آتا ؟ وہ جو کہا جاتا ہے کہ امتناع شراب کا حکم آنے پر مدینہ کی گلیوں میں ٹوٹے ہوئے پیمانوں کے ڈھیر لگ گئے۔ اور وہاں کی نالیوں میں شراب بہنے لگی، تو وہ اس مقام کا ذکر ہے جہاں تک ان لوگوں کو اتنے لمبے عرصہ کی تربیت کے بعد لایا گیا تھا۔ ایسے امور میں قانون کے نفاذ کے لیے قرآن کریم یہ حکیمانہ انداز اختیار کرتا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب وہ آخری حکم نافذ کرتا ہے تو اس کی خلاف ورزی نہیں ہوتی یوں قانون مؤثر (EFFECTIVE) بنتا ہے۔ ہمارے ہاں محراب و منبر کی طرف سے یہ تو بتایا جاتا ہے کہ جب امتناع شراب کا حکم آیا تو مدینہ کی گلیوں میں کیسے شراب بہنے لگی۔ لیکن یہ نہیں بتایا جاتا کہ ان لوگوں کو اس مقام تک کیسے پہنچایا کہ جب امتناعی حکم آیا تو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے جام و سبو کے ٹکڑے کر دیے۔ دوسری طرف حکومت کی یہ حالت ہے کہ اس نے کبھی اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی کہ جس قانون کو نافذ کرنا چاہتی ہے اس کی غرض و غایت اور مصالح و حکم کے متعلق عام پبلسٹی کی جائے۔ یا جن نقصان رساں امور کے لوگ عادی ہو چکے ہیں، یا وہ باتیں معاشرہ میں عام ہو چکی ہیں ان کے نقصانات کے متعلق لوگوں کو مسلسل اور متواتر متنبہ کیا جائے، حقیقت یہ ہے کہ حکومت کے ہاں مستقل شعبہ ہونا چاہیے جس کا یہ کام ہو کہ جو امور معاشرہ میں خرابیاں پیدا کرنے کا موجب ہیں لوگوں میں ان کے نقصانات کے متعلق عام پبلسٹی کی جائے اور اس طرح ان میں ایسی کیفیت پیدا کی جائے کہ وہ انہیں ترک کر دینے میں اپنا فائدہ محسوس کرنے لگیں، انہیں اس طرح سمجھانے کے بعد یہ بتایا جائے کہ یہ وجہ ہے کہ اسلام نے ان باتوں کو ممنوع قرار دیا ہے۔ اور اس کے بعد اسلام کے ان قوانین اور احکام کو معاشرہ میں نافذ کیا جائے۔ دوسری طرف ہمارے سکولوں اور کالجوں میں تعلیم ایسی دی جائے جس سے ان خرابیوں کے نقصان رساں اثرات کے خلاف نوجوان طالبعلموں کے دل میں نفرت اور بغاوت کے جذبات بیدار ہو جائیں اور وہ ان سے خود بھی محترز رہیں اور دوسروں کو بھی ان کی طرف آنے سے روکیں۔ حکومت نے اس سے تغافل برتا ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ قانون پر قانون نافذ کئے جاتی ہے۔ لیکن معاشرہ میں اصلاح کی صورت پیدا نہیں ہوتی۔

بنابریں، ہم ارباب حکومت سے گذارش کریں گے کہ وہ امتناع شراب کے متعلق قانون نافذ کرنا چاہتے ہیں (اور ظاہر ہے کہ مسلمانوں کے معاشرہ میں ایسے قانون کے متعلق دو آراء ہو نہیں سکتیں) تو اس کے لیے ایک تاریخ مقرر کرے، اور اس سے پہلے شراب کے نقصان رساں اثرات کے متعلق

اس قدر پبلسٹی کرے کہ اس سے فضا معمور ہو جائے اور (جیسا کہ ہم نے اوپر کہا ہے) اس کی ضرورت شراب تک ہی محدود نہیں۔ قرآن کریم نے جن جن امور سے روکا ہے، ان سب کے متعلق اس قسم کی مسلسل اور عام پبلسٹی کی ضرورت ناگزیر ہے۔ نہ صرف عام پبلسٹی بلکہ تعلیم کے ذریعے بھی ایسی فضا کا عام کرنا۔ پہلے یہ کیا جائے اور اس کے بعد ان قوانین کو ملک میں نافذ کیا جائے۔ اور جو شخص اس کے بعد ان کی خلاف ورزی کرے اسے سخت سزا دی جائے۔

بعض لوگوں کو یہ کہتے سُنا گیا ہے کہ شراب کے متعلق یہ کہیں نہیں کہا گیا کہ یہ "حرام" ہے اس لئے اس کا استعمال ممنوع ہونا چاہیئے۔ (گویا جن چیزوں کے متعلق "حرام" کا لفظ آیا ہے ان سے تو یہ حضرات بالکل پاک صاف رہتے ہیں اور شراب کے متعلق ان کی دشواری یہ ہے کہ اس کے لئے "حرام" کا لفظ نہیں آیا!!) خمر کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ یہ (۱) رجس ہے۔ رجس ایسے اضطراب انگیز امور کو کہتے ہیں جو انسان کو تباہی کی طرف لے جائیں (۲) شیطان کا فعل ہے (۳) اس سے باہمی عداوت اور بُغض پیدا ہوتا ہے (۴) یہ قوانین خداوندی کے اتباع کے راستے میں روک بن جاتی ہے (۵) اس سے انسان اپنے بلند مقاصد میں کامیاب نہیں ہوتا (۶) اس سے اس قدر اضمحلال اور افسردگی پیدا ہوتی ہے کہ انسان میں قوتِ عمل باقی نہیں رہتی ـــــ اور اس کے بعد کہا کہ

بتاؤ! تم اس سے باز آتے ہو یا نہیں

فرمایئے کہ ان تصریحات کے بعد اس کے متعلق کسی قسم کے شبہ کی گنجائش بھی باقی رہ سکتی ہے کہ اسلام میں شراب کا استعمال ممنوع ہے؟

اس سلسلہ میں البتہ ایک بات قابلِ غور ہے۔ بعض امراض ایسے ہیں جن میں ڈاکٹر شراب کے چند قطرات بطور دوائی استعمال کرتے ہیں ـــ یا انہیں ایسی دوائیاں تجویز کرنی پڑتی ہیں جن میں الکحل کی آمیزش ہوتی ہے (اور آج کل تو عام طور پر دوائیاں ایسی ہی ملتی ہیں) اور ان کے بغیر مریض کا علاج نہیں ہو سکتا۔ ہمارے خیال میں یہ صورتیں اس "اضطراری حالت" کے تابع آ جاتی ہیں جن میں قرآن نے حرام اشیاء کے استعمال کی بھی اجازت دی ہے۔ لیکن وہ اجازت صرف اضطراری حالت تک کے لیے ہے۔ لذت یابی یا قانون شکنی کے لیے نہیں۔ ایسے حالات کے لیے قانون میں گنجائش رکھنی ضروری ہو گی لیکن اس گنجائش کی شکل ایسی نہ ہو جس سے شراب کے دھارے عام بہنے لگ جائیں اور قانون بے چارہ

دیکھتے کا دیکھتا رہ جائے۔ ایسی صورتوں کو روکنے کا طریقہ بھی وہی ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ یعنی اس کے نقصان رساں اثرات کے خلاف عام پبلسٹی کی جائے۔ بالفاظ دیگر، تبلیغ اور تعلیم کے ذریعے، ذہنوں میں علیٰ وجہ البصیرت ایسا انقلاب پیدا کیا جائے جس سے قانون کا احترام، دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے تو نہ محراب و منبر سے اس آواز کا بلند ہونا کچھ نتیجہ پیدا کرسکتا ہے۔ کہ "اسلام نے فلاں چیز کو حرام قرار دیا ہے"۔ اور نہ ہی ایوان حکومت سے کسی قانون کا نفاذ اصلاح کی صورت پیدا کرسکتا ہے۔ جس طرح حکمت بلاکتاب (قانون) محض وعظ (SERMON) بن کر رہ جاتی ہے اس طرح کتاب بلاحکمت بار دوش ہو جاتی ہے۔ کتاب اور حکمت دونوں کے امتزاج سے صحیح نتائج مرتب ہوسکتے ہیں۔ اقبال کے الفاظ ہیں۔

رائے بے قوت ہمہ مکر و فسوں

قوتِ بے رائے جہل است و جنوں

پابندی اسی قانون کی بطیب خاطر ہوتی ہے جس کی افادیت کا دل معترف ہو۔ نہ اس کی جسے محض خارج سے عائد شدہ حکم سمجھا جائے اور اُسے مرگِ مفاجات سمجھ کر قبول کیا جائے۔ (۱۹۶۴ء)

مسلم اور مومن میں فرق

سوال

کیا قرآن شریف کی رُو سے مسلم اور مومن میں کوئی فرق ہے یا دونوں کا مطلب ایک ہی ہے۔ لفظ "مسلمان" تو قرآن شریف میں نہیں آیا۔

جواب

یہ ٹھیک ہے کہ "مسلمان" کا لفظ قرآن کریم میں کہیں نہیں آیا۔ جہاں تک مسلم اور مومن کا تعلق ہے، قرآن کریم نے ان الفاظ کو بالعموم

مرادف معانی میں استعمال کیا۔ اور ان دونوں میں فرق نہیں۔ لیکن ایک مقام ایسا ہے جس میں ان دونوں میں فرق بھی کیا گیا ہے۔ اور وہ مقام بڑا اہم ہے۔ بالخصوص ہماری موجودہ حالت کے پیش نظر۔ جب مدینہ میں اسلامی مملکت قائم ہوئی تو بہت سے بدوی قبائل (اعراب) اس سے متاثر ہو کر اسلام لے آئے۔ اور اپنے آپ کو مومن سمجھنے لگ گئے۔ قرآن کریم نے اس کے متعلق کہا قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا۔ یہ بدوی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِن قُولُوا أَسْلَمْنَا۔ ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے۔ تمھیں یہ کہنا چاہیئے کہ ہم نے اطاعت اختیار کر لی ہے (ہم "مسلم" ہو گئے ہیں) انگریزی زبان میں اسے کہیں گے (SURRENDERED)۔ اس لیے کہ وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ (۴۹/۱۴) "ابھی ایمان تمھارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا" اس سے مسلم (مسلمان) اور مومن میں فرق سامنے آ گیا۔ مومن تو وہ ہیں جو دل و دماغ کی کامل رضامندی سے، بغیر کسی اور جذبہ اور خیال کے، اس دین (نظام خداوندی) کی صداقت پر یقین کامل رکھیں۔ اور پھر صحیح تعلیم و تربیت سے ان کی کیفیت یہ ہو جائے کہ قوانین خداوندی کے مطابق زندگی بسر کرنا خود ان کا قلبی تقاضا بن جائے۔ وہ ان کے لیے خارج سے عائد شدہ احکام کی پابندی نہ ہو، بلکہ ان کے اندرونی تقاضے کی تسکین کا سامان ہو، جس طرح پیاس میں پانی پینا، کسی کے حکم کی اطاعت نہیں ہوتی۔ اپنے اندرونی تقاضے کی تسکین ہوتی ہے۔ یہ ہے وہ جماعت جس کے ہاتھوں نظام خداوندی کی بنیاد رکھی جاتی ہے اور جو اس کے قیام اور استحکام کے اولیں ذمہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے بعد بعض اور لوگ اس نظام میں داخل ہوتے ہیں جن کے متعلق یوں سمجھئے کہ وہ اپنے آپ کو SURRENDER کر دیتے ہیں۔ یہ SURRENDER کرنا ضروری نہیں کہ میدان جنگ ہی میں ہو۔ اس کی اور وجوہات بھی ہو سکتی ہیں۔ یہ اس نظام کا نظریہ بھی قبول کر لیتے ہیں۔ (اسے ایمان لانا یا مسلمان ہونا کہتے ہیں) اور اس کے احکام کی اطاعت بھی کرتے ہیں لیکن وہ اطاعت، قانون (حکومت) کی رُو سے کرتے ہیں۔ وہ ان کے دل کی پکار نہیں ہوتی۔ ان میں دو قسم کے لوگ ہو سکتے ہیں۔ ایک تو وہ جو محض کسی مصلحت کی بنا پر دکھاوے کے لیے اس نظام میں داخل ہو جائیں۔ انہیں منافقین کہا جائے گا۔ اور دوسرے وہ جو اس نظریۂ زندگی کو محض رسمی طور پر قبول کر لیں۔ انہیں منافق نہیں کہا جائے گا لیکن ہو سکتا ہے کہ ان کے دل میں اس نظریۂ حیات اور نظام زندگی کی طرف سے شکوک و شبہات ابھریں۔ یہ اگر اس نظام کی اطاعت کرتے رہیں اور ان کی ضروری تعلیم و تربیت

ہوتی رہے تو ان میں سے رفتہ رفتہ مومنین کے زمرے میں داخل ہوتے جائیں گے۔ اس لیے قرآن کریم نے ان اعراب کے متعلق جن کا ذکر پہلے آچکا ہے کہا کہ وَاِنْ تُطِیْعُوا اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْئًا۔ اِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ (۴۹/۱۴)

اگر تم اس نظام خداوندی کی اطاعت کرتے رہے تو تمھارے اعمال کے نتائج میں سے کچھ کم نہیں کیا جائے گا۔ اس سے یہ ہو جائے گا کہ تم میں جو کمی رہ گئی تھی اس کے مضر نتائج سے تمھاری حفاظت ہو جائے۔ اور اسکے ساتھ تمھاری ذات کی نشو ونما بھی ہوتی چلی جائے۔ اور یوں تم مومنین کے زمرہ میں شامل ہو جاؤ۔ اس لیے کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ آمَنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا۔ مومن وہ ہوتے ہیں جو (دل ودماغ کے کامل اطمینان کے بعد) اللہ اور رسولؐ پر ایمان لاتے ہیں اور پھر اس نظریہ زندگی کے متعلق ان کے دل میں کوئی شک وشبہ پیدا نہیں ہوتا۔ وَجَاھَدُوْا بِاَمْوَالِھِمْ وَاَنْفُسِھِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ۔ اور اس نظام کے قیام واستحکام کی خاطر اپنے جان اور مال سے مسلسل جدوجہد کرتے رہتے ہیں۔ اُولٰٓئِکَ ھُمُ الصّٰدِقُوْنَ۔ (۴۹/۱۵) یہ لوگ ہیں جو اپنے دعوئے ایمان میں سچے اور مومن کہلانے کے مستحق ہوتے ہیں۔ ان کے برعکس جنہیں (اعراب کے انداز کا) مسلم کہا گیا ہے ان کے متعلق کہا کہ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰہَ بِدِیْنِکُمْ ۔ ان سے کہو کہ کیا تم اللہ کو اپنی دینداری جتلاتے ہو؟ آپ نے غور کیا کہ اس سے ان کی اطاعت وفرمان پذیری کی صحیح کیفیت کس طرح نمایاں طور پر سامنے آجاتی ہے؟ یعنی یہ اطاعت ان کے دل کا تقاضا نہیں ہوتی۔ وہ دین کی خاطر کچھ کرتے ہیں تو اسے جتلاتے ہیں۔ کہا کہ ان سے کہہ دو کہ تمھارے جتلانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ تم کیا ہو اور کیا کرتے ہو اس لیے کہ) وَاللّٰہُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ۔ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ۔ اللہ کائنات کی ہر شے سے خوب واقف ہے۔

اس کے بعد ان کی ایک اور نفسیاتی کیفیت سامنے آتی ہے۔ کہا کہ یَمُنُّوْنَ عَلَیْکَ اَنْ اَسْلَمُوْا۔ اے رسول یہ لوگ تم پر احسان دھرتے ہیں کہ ہم اسلام لے آئے ہیں قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ ۔ ان سے کہو کہ اپنے اسلام کا احسان مت رکھو۔ بَلِ اللّٰہُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ ھَدٰکُمْ لِلْاِیْمَانِ۔ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ۔ (۴۹/۱۷) اگر واقعی سچے دل سے مسلمان ہوئے ہو تو تمھیں اس کا احساس ہونا چاہیئے کہ یہ اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمھیں زندگی کا صحیح راستہ دکھا دیا۔

قرآن کریم کی ان تصریحات سے مسلم اور مومن کا فرق سامنے آگیا۔ دورِ حاضر کی سیاسی اصطلاح میں یوں سمجھئے کہ اسلامی مملکت (نظامِ خداوندی) میں تین قسم کے شہری (CITIZENS) ہونگے۔

(۱) غیر مسلم یعنی جنہوں نے اسلام کے نظریۂ زندگی کو قبول نہ کیا ہو۔ ان کی حفاظت ہر طرح سے ہوگی لیکن انہیں پورے حقوقِ شہریت حاصل نہیں ہوں گے۔ یوں کہئے کہ یہ (NATURAL CITIZENS) ہوں گے۔

(۲) مسلم۔ جنہوں نے اسلامی نظریۂ زندگی کو قبول کر لیا ہو لیکن ہنوز اس کی روح ان کے دل کی گہرائیوں میں نہ اتری ہو۔ انہیں حقوقِ شہریت تو تمام کے تمام حاصل ہوں گے۔ لیکن مملکت کے ایسے امور جن کا تعلق اس نظام کی اصل و بنیاد سے ہو، وہ ان کے سپرد نہیں کئے جا سکیں گے۔ ان کی مناسب تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے گا۔ اور

(۳) مومن۔ اسلامی نظریۂ زندگی کی صداقت جن کی روح میں حلول کر چکی ہو۔ یہ اس نظام کے قیام و استحکام کے حقیقی ضامن ہوں گے۔

واضح رہے کہ مسلم اور مومن الگ الگ گروہ نہیں ہوں گے۔ یہ ایک ہی اُمت کے فرد ہوں گے۔ ان میں ایسا ہی فرق سمجھئے جیسا (مثلاً) ایک تعلیم یافتہ اور غیر تعلیم یافتہ مسلمان میں فرق ہوتا ہے۔ غیر تعلیم یافتہ مسلمانوں کو اُمت کا الگ گروہ نہیں قرار دے سکتے لیکن ان کے سپرد وہ کام بھی نہیں کئے جا سکتے جن کے لیے تعلیم کا ہونا ضروری ہے۔

ہم (موجودہ مسلمان) کس شق میں شامل ہیں اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں اس میں شبہ نہیں کہ ہم اسلامی نظریۂ زندگی کا اقرار کرتے ہیں۔ اس لیے ہم مسلم ہیں۔ غیر مسلم نہیں ہیں۔ اس اعتبار سے، ایک مسلمان اور دوسرے مسلمان میں (امت کا فرد ہونے کی حیثیت سے) کوئی فرق نہیں کیا جا سکتا۔ "پیدائشی مسلمانوں"، کو مسلمان نہ سمجھنا اور اپنے آپ کو مسلمان قرار دینا، انانیت کی سرکشی اور تکبر نہیں تو جہالت کی خود سری ضرور ہے یہ کہنا بھی زیادتی ہوگا کہ امت میں کوئی مومن نہیں۔ البتہ یہ واضح ہے کہ ایسی کوئی جماعت نظر نہیں آتی جو مومنین پر مشتمل ہو۔ اپنی دینداری کی دھونس جما کر اپنے آپ کو مومن تسلیم کرانے والوں کے متعلق ہم قرآن کا فیصلہ اوپر دیکھ چکے ہیں۔۔۔ اندریں حالت، اگر ہم کسی ملک میں اسلامی نظام قائم کرنا چاہیں تو اس کی یہی صورت ہو سکے گی کہ۔

(i) موجودہ مسلمانوں کو قانون کے ذریعہ اس نظام کا پابند بنایا جائے۔اور

(ii) آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ اس نظام کی صداقت ان کے دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہو جائے اور احکامِ خداوندی کی اطاعت ان کا اندرونی تقاضا ہو۔

اِس طریق کار اور اُس طریق میں جسے نبی اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا، تقدم و تاخر کا فرق ہے۔ لیکن یہ فرق ناگزیر ہے۔ اس لیے کہ جب حضورؐ نے اپنی دعوت پیش کی ہے تو اس وقت مسلم کوئی نہیں تھا۔ سب غیر مسلم تھے۔ ان غیر مسلموں میں سے جو بھی اسلام قبول کرتا تھا مومن کی حیثیت سے قبول کرتا تھا۔ لہذا سابقون الاولون کی یہ جماعت مومنین کی جماعت تھی۔ یہی وہ "مہاجر و انصار" تھے، جنہیں قرآن نے "مومن حقاً" کہہ کر پکارا ہے۔ اسلامی نظام کی بنیاد اسی جماعت کے ہاتھوں رکھی گئی تھی۔ اور یہی اس کی تشکیل و استحکام کے اولین ذمہ دار تھے۔ اس نظام میں "مسلم" بعد میں شامل ہوئے تھے۔ اس کے برعکس آج "مسلم" پہلے سے موجود ہیں۔ اور اس نظام کی تشکیل کا آغاز اگر کرنا ہے تو انہی سے کرنا ہے۔ ان "مسلموں" کو غیر مسلم قرار دے کر براہ راست مومن پیدا کرنے کی جو مہم ہمارے ہاں شروع ہوئی تھی (خواہ اسے میرزا غلام احمد صاحب نے شروع کیا ہو یا سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب[1] نے) اس کا نتیجہ ہم دیکھ چکے ہیں۔ ایک غیر مسلم، کسی کے ہاتھ پر "بیعت کرنے سے" مسلم تو ہو سکتا ہے لیکن ایک مسلم، محض کسی کے ہاتھ پر بیعت کر لینے سے مومن نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے تعلیم و تربیت کے مناسب پروگرام کی ضرورت ہو گی۔

طلوعِ اسلام کی دعوت یہی ہے کہ پاکستان میں قرآنی قوانین کے نفاذ سے موجودہ مسلمانوں کو ان کا پابند بنا دیا جائے ــــ اور آنے والی نسلوں کی تعلیم و تربیت اس انداز سے کی جائے کہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں سے اُبھرے۔ (سنہ ۱۹۶۴ء)

---

[1] جب مودودی صاحب نے اپنی جماعت کی تاسیس کی ہے تو اس میں داخل ہونے والوں کی تجدید ایمان اپنے ہاتھ پر کرائی تھی۔

غیر مسلموں کے نیک اعمال کا بدلہ

سوال

کہا جاتا ہے کہ نجات صرف مسلمان کی ہوسکتی ہے۔ کافر کی نہیں ہوسکتی ایک غیر مسلم بڑے نیک کام کرتا ہے۔ وہ جھوٹ نہیں بولتا۔ چوری نہیں کرتا کسی کو ستاتا نہیں۔ خیرات کرتا ہے۔ غریبوں کی مدد کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ تو کیا اسے اس کے ان نیک کاموں کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔ اور اس کی اس لیے نجات نہیں ہوگی کہ وہ مسلمان نہیں ہوا اور ایک مسلمان محض اس لیے جنت میں چلا جائے گا کہ وہ مسلمان تھا خواہ اس کے اعمال کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں۔ اس سوال نے مجھے ایک مدت سے پریشان کر رکھا ہے اور اس کا تسلی بخش جواب کہیں سے نہیں ملتا۔

جواب

اس سوال نے صرف آپ ہی کو پریشان نہیں کر رکھا۔ بہت سوں کو پریشان کر رکھا ہے اور اس کا تسلی بخش جواب اس لیے نہیں ملتا کہ بنیادی طور پر یہ بات صاف نہیں کی جاتی کہ اسلام کہتے کسے ہیں۔ اور کفر ہوتا کیا ہے۔ یہ بنیادی چیز سمجھ میں آجائے تو اس (بظاہر) پریشان کن سوال کا جواب آسانی سے مل جاتا ہے۔ لہذا پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اسلام کے معنی کیا ہیں؟ یہ ہے کیا؟ کفر اور اسلام میں فرق کیا ہے؟ عام طور پر سمجھا یہ جاتا ہے کہ کفر اور اسلام میں فرق صرف کھانے پینے کی چیزوں میں جائز اور ناجائز کی تمیز یا پرستش کے طور طریقوں میں اختلاف ہے۔ اصل سب مذاہب کی ایک ہی ہے۔ مولانا آزاد مرحوم کے الفاظ میں "عالمگیر سچائیاں ہر مذہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں۔ فرق صرف ظاہری اعمال و رسوم میں ہے۔ اور اس فرق کا نجات و سعادت سے کچھ تعلق نہیں"۔ یہ ہے اسلام کے متعلق وہ بنیادی غلط فہمی جس کی وجہ سے وہ تمام سوالات سینے میں ابھرتے ہیں جس کا ذکر اوپر کیا گیا ہے۔ اور جو وجہ خلش و اضطراب بنتے ہیں۔

قرآن کریم چند مستقل اقدار۔ چند غیر متبدل اصول۔ چند ابدی حقائق عطا کرتا ہے جن کی بنیادوں پر انسانی معاشرہ کی تشکیل ہوتی ہے، کفران اصول اور حقائق سے انکار کا نام ہے۔ دیکھنے کی بات یہ ہے

کہ جن باتوں کو عام طور پر "نیک کام" کہا جاتا ہے (اور جن کی مثالیں آپ نے بھی پیش کی ہیں) اس معاشرہ میں جو خلاف قرآن بنیادوں پر استوار ہوتا ہے، ان کی حقیقت اور وزن کیا ہوتا ہے؟ یہ بات ایک مثال سے سمجھ میں آسکے گی۔ ہندو نظریۂ حیات کی رُو سے انسانوں کی تفریق و تقسیم پیدائش کی رُو سے ہو جاتی ہے۔ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ، محض پیدائشی نسبت سے، ہر شخص کے نزدیک واجب الاحترام ہوتا ہے اور اسے معاشرہ میں وہ مقام اور حقوق حاصل ہوتے ہیں جن میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہو سکتا۔ اس کے برعکس، شودر کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ، تمام عمر ذلت اور پستی کی زندگی بسر کرتا ہے اور کوئی طریق ایسا نہیں جس سے وہ معاشرہ میں عزت اور وقار کا مقام حاصل کر سکے۔ خواہ اس کے جوہر ذاتی کچھ ہی کیوں نہ ہوں[1]۔ براہمن ساری عمر اس نظریۂ زندگی کی تلقین کرتا رہتا ہے اور اسے خدائی تفریق قرار دیتا ہے جسے دنیا کا کوئی انسان مٹا نہیں سکتا۔ ہندو معاشرہ کی تشکیل اسی نظریہ حیات کے مطابق ہوتی ہے۔ اب آپ سوچئے کہ اگر یہ براہمن، جو ساری عمر اس معاشرہ کے بندھنوں کو مضبوط تر کرتا رہتا ہے۔ اور اس طرح کروڑوں انسانوں کو ذلت و خواری کے جہنم میں دھکیلتا چلا جاتا ہے۔ اگر یہ کہے کہ وہ چوری نہیں کرتا۔ جھوٹ نہیں بولتا۔ یا وہ مویشیوں کے پانی پینے کے لیے پیاؤ بنواتا ہے کوڑھیوں کی جھولی میں بھیک کے ٹکڑے ڈالتا ہے۔ یا اس قسم کے اور "دان پن" کا کام کرتا ہے۔ تو کیا اس کی یہ انفرادی "نیکیاں" انسانیت کی میزان میں کچھ بھی وزن رکھیں گی؟ کیا معاشرہ کو غلط بنیادوں پر استوار کرنے کا وہ جرمِ عظیم جس کا یہ مرتکب ہوتا ہے، ان "نیکیوں" کے صدقے میں قابلِ معافی تصور کیا جاسکے گا۔ اگر میزان کے ایک پلڑے میں یہ نیکیاں رکھی جائیں اور دوسرے پلڑے میں اس کا وہ جُرم، تو سوچئے کہ ان میں سے کون سا پلڑا بھاری ہوگا؟ ہماری بھول یہ ہے کہ ہم اس قسم کی انفرادی نیکیوں کو بہت بڑے ثواب کا کام سمجھتے ہیں اور اس حقیقت کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ وہ اصول و مبانی کیا ہیں

---

[1] اب یہی تفریق و تقسیم دولت کی رُو سے ہوتی ہے۔ امیر آدمی کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ ابتداء ہی سے جس مقام پر فائز ہوتا ہے غریب آدمی کا بچہ ساری عمر اس کا تصوّر نہیں کر سکتا۔ روح وہی ہے۔ صرف پیکروں کی تبدیلی ہوئی ہے۔ بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں۔ اگرچہ پیر ہے آدم
جواں ہیں لات و منات

جن کے مطابق انسانوں کی ہیئت اجتماعیہ کی تشکیل ہوتی ہے۔ اصل شے وہ نظام ہے جسے انسان قائم کرتا اور اس کے اندر زندگی بسر کرتا ہے۔ اگر وہ نظام صحیح ہے تو اس کے اندر اس قسم کی انفرادی نیکیاں انسانیت ساز نتائج مرتب کرتی ہیں۔ اگر وہ نظام ہی باطل کی تخریبی بنیادوں پر استوار ہے تو اس میں افراد کی اس قسم کی نیکیاں اس جرم کا کفارہ نہیں بن سکتیں جو انسانیت کا گلا گھونٹنے کے لئے روا رکھا جا رہا ہے۔

قرآن کریم یہودیوں کے متعلق کہتا ہے کہ انہوں نے نظامِ زندگی ایسا قائم کر رکھا تھا جس میں خود ان کے اپنے افراد ایک دوسرے کا گلا کاٹتے تھے اور بالادست لوگ کمزوروں اور ناتوانوں کو ان کے گھروں سے نکال باہر کرتے تھے۔ اس کے بعد جب ان لوگوں کو دوسرے قید کر لیتے تھے تو یہ فدیہ دے کر انہیں چھڑا لیتے تھے اور اسے بڑا نیکی کا کام تصور کرتے تھے حالانکہ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ۔ خود ان لوگوں کو گھروں سے باہر نکال دینا سخت جرم تھا۔ اس جرم کے ارتکاب پر تو ان کے دل میں کوئی خلش پیدا نہیں ہوتی تھی لیکن قیدیوں کو چھڑا کر ثواب حاصل کرنے کے لیے وہ آگے بڑھتے تھے۔ اس کے بعد قرآن کریم نے ایک عظیم اصول بیان کیا ہے جو اس باب میں بڑی واضح راہ نمائی دیتا ہے۔ وہ ان سے کہتا ہے۔ اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۔ کیا تم یہ طرزِ عمل اختیار کرنا چاہتے ہو کہ ضابطہ خداوندی کے ایک حصہ پر ایمان رکھو اور اس کے دوسرے حصے سے انکار کرو۔ اگر یہی روش جاری رکھنا چاہتے ہو تو سُن رکھو کہ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۔ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ (۲/۸۵)۔ اس روش کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اس دنیا میں بھی ذلت وخواری کی زندگی بسر کروگے اور قیامت میں سخت ترین عذاب میں مبتلا ہوگے۔ آپ نے غور کیا کہ قرآن کریم نے یہاں کس قدر بلیغ اور بلند اصول بیان کیا ہے؟ ظاہر ہے کہ قیدیوں کو فدیہ دے کر چھوڑانا بہر حال ایک نیک کام ہے جس کا اجر ملنا چاہیئے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ انسانیت پر ظلم کرنے والے غلط نظام کے اندر اس قسم کی انفرادی نیکیاں موجب ثواب نہیں بن سکتیں۔ اس جرم کا سیلاب، اس قسم کی جزئی "مرمتوں" کو بہا کر لے جاتا ہے۔ اور اس تمام عمل کا کُلی نتیجہ تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

اسی قسم کی غلط ذہنیت قریش مکہ کی تھی جس کی طرف ان کی توجہ مبذول کراتے ہوئے ان سے کہا

گیا کہ اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ جَاهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں کو پانی پلانے کے لیے سبیلیں لگا دینا یا خانہ کعبہ کی تعمیر و تزئین کے کاموں میں حصہ لینا اس شخص کے اعمال کے برابر ہے جو صحیح نظامِ زندگی کی ابدی حقیقتوں (ایمان باللہ اور ایمان بالآخرت) پر یقین رکھتا ہے اور پھر اس نظام کے قیام اور استحکام کے لیے مسلسل جدوجہد کرتا رہتا ہے؟ تم اپنے ذہن سے کچھ ہی کیوں نہ فیصلہ کر لو۔ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ۔ میزانِ خداوندی میں ان کا وزن برابر نہیں ہو سکتا۔ غلط نظام قائم کرنیوالے اس قسم کے انفرادی نیک کاموں کے باوجود ظالم رہتے ہیں اور خدا کا قانون یہ ہے کہ ظلم کرنے والوں پر نجات و سعادت کی راہیں کبھی کشادہ نہیں ہوتیں۔

وَاللّٰهُ لَا يَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ (۹/۱۹)

ہمارا خیال ہے کہ ان مختصر سی توضیحات سے یہ حقیقت آپ کے سامنے آگئی ہو گی کہ "کافر" کے نیک اعمال میزانِ خداوندی میں وزن کیوں نہیں رکھتے! جو شخص کسی مملکت کے خلاف بغاوت کیلئے اُٹھ کھڑا ہو، ذاتی طور پر کتنا ہی اچھا شہری کیوں نہ ہو اس کی یہ انفرادی خوبیاں جرمِ بغاوت کا کفارہ نہیں ہو سکتیں۔ کفر درحقیقت نظامِ خداوندی کے خلاف بغاوت کا نام ہے — خواہ وہ بغاوت عملی ہو یا ذہنی و اعتقادی)۔

باقی رہا یہ کہ مسلمان، بغیر نیک اعمال کے بھی جنت میں جائے گا تو یہ "حدیث بے خبراں" ہے۔ جس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ جنت تو نام ہی اعمال کے فطری نتائج کا ہے۔ وَتِلْكَ الْجَنَّةُ الَّتِيْٓ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔ (۴۳/۷۲) البتہ اس ضمن میں دو ایک بنیادی باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

(۱) اگر کہیں صحیح قرآنی نظام قائم ہے — یا اس کے قیام کے لیے جدوجہد کی جا رہی ہے تو اس میں اگر کسی سے سہواً اور خطاءً کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہو گئی ہے اور وہ اس پر نادم ہو کر آئندہ اس سے محتاط رہتا ہے تو اس کے اعمالِ حسنہ کا پلڑا بھاری رہے گا۔

(۲) اگر مسلمان بھی غیر قرآنی نظام پر رضامند ہو چکا ہے تو اس نظام کے اندر اس کی انفرادی نیکیاں

وہ نتائج مرتب نہیں کرسکتیں جن کا نتیجہ جنّت کی زندگی ہوتا ہے. ہم (مسلمان) صدیوں سے اس غلط ذہنیت کا شکار ہیں جن کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں کے نیک لوگوں کی نیکیاں بھی کوئی نیک نتیجہ مرتب نہیں کرتیں۔ یہی وہ غلط ذہنیت ہے جس کی اصلاح کے لیے قرآن کریم نے واضح الفاظ میں کہا تھا کہ

نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا مُنہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ نیکی تو اس کی ہے جو

(i) خدا پر۔ آخرت پر۔ ملائکہ پر۔ کتب خداوندی پر اور انبیاء پر ایمان رکھتا ہے۔ (یعنی ان اصولوں پر جو نظامِ خداوندی کی بنیاد بنتے ہیں)

(ii) مال اور دولت کی محبت کے باوجود، اسے ضرورت مند، قریبیوں۔ یتیموں۔ مسکینوں نادار مسافروں۔ محتاجوں کے لیئے دے دیتا ہے۔ نیز دوسروں کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرانے کے لیے۔

(iii) جو نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ قائم کرتا ہے۔

(iv) جو اپنے عہد کا پابند ہوتا ہے اور اس عہد میں بنیادی حیثیت اس عہد کی ہوتی ہے جو اس نے اپنے خدا سے کر رکھا ہوتا ہے۔ اور جس کی رُو سے اس نے اپنا مال اور جان خدا کے ہاتھوں بیچ دیا ہوتا ہے۔ ($\frac{9}{111}$)

(v) جو ان مصائب و مشکلات میں جو اس راہ میں اسے درپیش ہوں ثابت قدم رہتا ہے۔

یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دعویٰ ایمان کو سچ کر دکھاتے ہیں۔ اور یہی ہیں جنہیں متقی کہا سکتا ہے۔ ($\frac{2}{177}$)

نیکی ان لوگوں کی ہے نہ کہ ان کی جو غیر خداوندی نظام پر مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ان کا نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور دیگر انفرادی نیکیاں انہیں جنّت کا وارث بنا دیں گی۔

آپ نے غور فرمالیا کہ غیر مسلموں کی انفرادی نیکیاں تو ایک طرف، خود ان مسلمانوں کی انفرادی نیکیاں، جو غیر خداوندی نظام پر مطمئن ہوں۔ میزانِ خداوندی میں کیا وزن رکھتی ہیں؟ انفرادی نیکیاں نہایت ضروری ہیں۔ لیکن یہ نیکیاں صحیح نتائج پیدا ہی اس وقت کرتی ہیں جب یہ صحیح قرآنی نظام

کے اندر سرزد ہوں۔ غلط نظام ہیں یہ تعمیر انسانیت کے نتائج مرتب ہی نہیں کرسکتیں۔ دریاؤں اور ندیوں کا میٹھا پانی، انسانوں اور حیوانوں کے لیے زندگی بخش اور زمین مُردہ کے لیے حیات آور ہوتا ہے۔ لیکن وہی پانی سمندر کے اندر پہنچ کر اپنی تمام زندگی بخش صلاحیتیں کھو دیتا ہے۔ دہی کے برتن میں جتنا دودھ جی چاہے ڈالتے جائیے۔ سب دہی بنتا جائے گا۔ قرآنی نظام۔ یا اس نظام کے قیام کے لیے جدوجہد۔ اور اس کے ساتھ اخلاقی نیکیاں۔ یہ ہے وہ پروگرام جسے قرآن "ایمان اور اعمال صالح" کی جامع اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے اور جس کا لازمی نتیجہ اس دنیا اور اس کے بعد کی زندگی دونوں میں جنت کی وراثت ہے اور یہ پروگرام قرآن کے سوا اور کہیں نہیں مل سکتا۔ (سنہ ۱۹۶۴ء)

اخلاقی اور روحانی ترقی

سوال

ہم عام طور پر سنتے رہتے ہیں کہ اسلام، مادی۔ اخلاقی اور روحانی ترقی کا ضامن ہے "مادی ترقی" قابلِ فہم ہے۔ "اخلاقی ترقی" کی بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ لیکن یہ "روحانی ترقی" کیا ہے اور اسلام اس کا کس طرح ضامن ہوتا ہے؟۔

جواب

اس کا جواب تو انہی سے مانگئے جو ان الفاظ کو پیش کرتے ہیں۔ لیکن مشکل یہ ہے کہ اس کا جواب ان کے پاس بھی کچھ نہیں ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ہاں اکثر الفاظ ایسے ہیں جن کی کیفیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ اسماء سمیتموھا انتم وآباءکم (چند نام ہیں جنہیں تم نے یا تمہارے آباؤ اجداد نے رکھ چھوڑا ہے) ان الفاظ کو ہم صبح شام رٹتے اور دہراتے رہتے ہیں اور کبھی نہیں سوچتے کہ ان کا مطلب کیا ہے۔

"اخلاقی ترقی" کے معنی یہ ہیں کہ اسلام کے مطابق زندگی بسر کرنے سے، انسان کے اخلاق بلند ہو

ہوجاتے ہیں اور اخلاق، سیرت وکردار ہی کا دوسرا نام ہے۔اب سوال یہ ہے کہ کیا سیرت کی پاکیزگی اور کردار کی بلندی کے بعد کوئی اور چیز بھی باقی رہتی ہے جسے " روحانی ترقی "سے تعبیر کیا جاتا ہے؟ کیا اخلاقی بلندی (سیرت وکردار کی رفعت) میں شرفِ انسانیت کی انتہائی منزل نہیں آجاتی؟ یہ بات تو واضح ہے کہ مادی ترقی اور چیز ہے اور اخلاقی برتری اور شے۔یہ ہوسکتا ہے کہ کسی فرد یا قوم کو مادی ترفع حاصل ہو لیکن اس کی اخلاقی سطح پست ہو۔یہ وجہ ہے کہ اسلامی طرز زندگی کے نتائج کے لئے مادی ترقی کے ساتھ اخلاقی برتری کا اضافہ ضروری ہوتا ہے۔لیکن اخلاقی برتری کے بعد وہ کونسی چیز باقی رہ جاتی ہے جسے "روحانی ترقی" سے تعبیر کیا جاتا ہے؟

یہ ظاہر ہے کہ قرآن کریم، شرفِ انسانیت کی جس انتہائی بلندی کو بطور نصب العین پیش کرتا ہے۔حضور نبی اکرمؐ کی ذات گرامی، اس ارفع و اعلیٰ مقام کی مظہر اتم ہے۔اس کے لئے قرآن کریم کہتا ہے کہ اِنَّكَ لَعَلٰى خُلُقٍ عَظِيْمٍ (۶۸/۴)۔"اے رسول! تو اخلاق کے عظیم ترین مقام پر فائز ہے"۔ قرآن کریم نے حضورؐ کے لیے اخلاقی بلندی کا ذکر کیا ہے۔"روحانی ترقی" کا کہیں ذکر نہیں کیا اب سوال یہ ہے کہ اخلاقی بلندی کے بعد وہ روحانی ترقی کون سی ہے جس کا ذکر نبی اکرمؐ کی ذاتِ گرامی کے سلسلے میں تو آیا نہیں لیکن جس کا ہم اس طرح دن رات چرچا کرتے رہتے ہیں؟ اصل یہ ہے کہ انگریزی زبان میں تین الفاظ تھے MATERIAL یعنی مادی MORAL یعنی اخلاقی۔ اور SPIRITUAL یعنی روحانی۔ہم نے اپنے ہاں انہی اقنوم ثلاثہ کو دہرانا شروع کر دیا اور اس کا خیال تک نہ کیا کہ عیسائیت نے تو مادہ (MATTER) اور روح (SPIRIT) کی ثنویت کے لیے اس اصطلاح کو وضع کیا تھا۔ اور مادہ کو قابلِ نفرت قرار دینے کے بعد اس کی ضد SPIRIT کو انسانی ترقی کا منتہیٰ ٹھہرایا تھا۔ لیکن اسلام میں اس کی قسم کی ثنویت نہیں۔ نہ ہی اس کے نزدیک مادہ قابلِ نفرت شے ہے، پھر ہم SPIRIT کا لفظ کس منطوق کے لیے بولتے ہیں۔ہم نے اس اصطلاح کو "عیسائیت" سے مستعار لے کر اپنے "تصوف" میں داخل کیا اور اس طرح روحانی ترقی انسانی شرف کی منتہیٰ قرار پا گئی۔ اور پھر اس کا چرچا شروع کر دیا کہ شریعت کی پابندی سے اخلاقی بلندی حاصل ہوتی ہے۔ اور طریقت کی پابندی سے روحانی ترقی۔یعنی جس (اخلاقی) بلندی کو اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرمؐ کا مقام

بلند قرار دیا ہے۔ تصوف کے اس تصوّر کی رُو سے اس مقام سے اونچا ایک اور مقام بھی ہے جسے روحانی ترقی کہا جاتا ہے۔ یعنی (معاذ اللہ۔ معاذ اللہ) خود نبی اکرمؐ کے مقام (خلق عظیم) سے بھی بلند مقام!

پھر سُن لیجئے کہ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کی اخلاقی بلندی ہی کا ذکر کیا ہے۔ روحانی ترقی کا کہیں ذکر نہیں کیا اس لیے خدا کی اس شہادت کے پیشِ نظر اسلام میں سیرت کے اعتبار سے اخلاقی بلندیوں سے اونچا کوئی اور مقام نہیں۔ (نبوت البتہ اور چیز ہے جس کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔)

(۱۹۶۴ء)

حقوقُ اللہ اور حقوقُ العباد

سوال

ہم بچپن سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کی اصطلاحات سنتے چلے آ رہے ہیں۔ حقوق العباد کی بات تو سمجھ میں آتی ہے۔ لیکن یہ "حقوق اللہ" کیا ہیں، اس کی بابت وضاحت کر دیجئے۔

جواب

قرآن کریم میں حقوق العباد کا ذکر آیا ہے۔ لیکن حقوق اللہ کا کہیں ذکر نہیں آیا۔ مثلاً فِیۡۤ اَمۡوَالِهِمۡ حَقٌّ مَّعۡلُوۡمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالۡمَحۡرُوۡمِ (۲۴/۷۰) "ان کے مال میں سائل و محروم کا ایسا حق ہے جو معلوم ہے۔" یا وَاٰتِ ذَا الۡقُرۡبٰى حَقَّهٗ وَالۡمِسۡكِيۡنَ وَابۡنَ السَّبِيۡلِ ... (۱۷/۲۶) قریبی رشتہ دار اور مسکین اور مسافر کو اس کا حق دے دو۔ اس قسم کی قرآن کریم میں اور آیات بھی ہیں۔ ایک جگہ "خدا کے حق" کا بھی ذکر ہے لیکن وہ حق بھی دراصل بندوں ہی کا ہے۔ سورۂ انعام میں ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے باغات اور کھیتوں میں پھل اور فصلیں پیدا کی ہیں۔ تم اس پیداوار کو اپنے کام میں لاؤ وَاٰتُوۡا حَقَّهٗ يَوۡمَ حَصَادِهٖ .... (۶/۱۴۲) اور "فصل کاٹنے کے دن اس کا حق ادا کرو۔" ظاہر ہے کہ یہاں جس چیز کو اس کا (خدا کا) حق" کہا گیا ہے، یہ وہی ہے جسے دوسرے مقامات میں

محتاجوں اور ضرورت مندوں کا حق قرار دیا گیا ہے۔ جس طرح "خدا کو قرضہ دینے" سے مراد ہے۔ انسانیت کی فلاح و بہبود کے کاموں کے لیے نظامِ خداوندی کو اپنا مال دے دینا۔ یا جہاں کہا گیا ہے کہ خدا نے مومنین کا مال اور جانیں خرید لی ہیں" تو اس سے بھی مقصود یہی ہے کہ جماعتِ مومنین اپنے مال اور اپنی جانوں (اور جذبات) کو قوانینِ خداوندی کے مطابق صرف کرنے کے لیے وقف کر دیتی ہے ان مقامات سے ظاہر کہ حقوق اللہ، حقوق العباد سے الگ کچھ اور نہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیت میں جو ثنویت تھی کہ ــــ خدا کا حصہ، خدا کو دو اور قیصر کا قیصر کو ــــ تو اسی تصوّر کو ہمارے ہاں حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تفریق کی شکل میں پیش کر دیا گیا۔ لیکن اسلام میں اس تفریق کی کوئی گنجائش نہیں۔ دین نام ہے انسانوں کے باہمی تعلقات یا معاملات کو قوانین خداوندی کے مطابق استوار یا طے کرتے کا۔ جس چیز کو فرد کی اصلاح (یا انسانی ذات کی نشوونما) کہا جاتا ہے۔ اس کا عملی مظاہرہ بھی انسانوں کے باہمی تعلقات اور معاملات کے صحیح خطوط پر متشکّل ہونے کی صورت میں ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص پہاڑ کے کسی غار یا جنگل میں ایسی جگہ رہتا ہے، جہاں کوئی دوسرا انسان نہیں بستا۔ اور اس طرح اس کا معاملہ کسی دوسرے انسان سے نہیں پڑتا۔ تو اس کے لیے نہ دین کی ضرورت کا سوال پیدا ہوتا ہے نہ وحی کی راہ نمائی کا۔ نہ اس کے لیے حقوق العباد ہوتے ہیں نہ حقوق اللہ۔ اس کی یہ زندگی انسانی سطح کی زندگی ہوتی ہی نہیں۔ حیوانی سطح کی ہوتی ہے۔

عام طور "عبادت" کو حقوق اللہ سے تعبیر کیا جاتا ہے لیکن قرآنی تصورِ حیات کی رُو سے عبادات بھی مقصود بالذات نہیں۔ ان سے مقصد، انسان کی ایسی اصلاح ہوتی ہے جس سے انسانوں کے باہمی تعلقات میں خوش اسلوبی پیدا ہو۔ اور ان کے معاملات، عدل اور احسان کی مستقل اقدار کے مطابق طے پائیں۔ اسی لئے "عبادات" بھی درحقیقت حقوق العباد کی حسن کارانہ انداز سے ادائیگی کا ذریعہ ہیں۔

(۱۹۶۴ء)

تعلق باللہ سے مراد

<u>سوال</u>

میں آپ کے درس میں اکثر شریک ہوتا ہوں۔ آپ اس میں قرآن شریف کے حقائق کو خوب بیان کرتے ہیں۔ اس کے احکام کی حکمت وغیرہ کی بھی خوب وضاحت کرتے ہیں۔ لیکن میں محسوس کرتا ہوں کہ اس میں <u>تعلق باللہ</u> کی بات کوئی نہیں ہوتی۔ کیا آپ کے نزدیک اس کی کوئی اہمیت نہیں ؟

<u>جواب</u>

میں سمجھ نہیں سکا کہ تعلق باللہ سے آپ کا مطلب کیا ہے ؟ میں اپنی بصیرت کے مطابق جو کچھ سمجھ سکا ہوں وہ یہ ہے کہ ہمارا اور خدا کا تعلق اس کتاب کے ذریعہ سے ہے۔ جو اس نے ہماری راہ نمائی کے لیے نازل کی ہے۔ اس کے علاوہ خدا اور بندے کا تعلق میری سمجھ میں نہیں آتا۔ حضرات انبیائے کرامؑ کا خدا سے تعلق وحی پانے کا تھا وہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ اب ہم میں اور خدا میں واسطہ اس کی کتاب عظیم ہی ہے۔

جب ہم اس کی کتاب پڑھتے ہیں تو خدا ہم سے ہمکلام ہوتا ہے کیونکہ اس نے وہ باتیں ہم ہی کو مخاطب کر کے کی ہیں۔ خدا کی اس ہمکلامی میں کسی کی تخصیص نہیں۔ اس نے اس میں "الناس" (تمام لوگوں) کو مخاطب کیا ہے۔ لہذا جب ہم قرآن کریم کو پڑھتے اور پڑھاتے اور سمجھتے سمجھاتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں تو خدا سے ہمارا تعلق قائم ہو جاتا ہے۔ جب ہم اسے چھوڑ دیتے ہیں تو خدا سے تعلق منقطع ہو جاتا ہے۔ خدا کے ساتھ اس تعلق میں کوئی راز نہیں۔ کوئی سر مستور نہیں۔ کوئی باطنیت نہیں۔ یہ تعلق کھلے بندوں قائم ہوتا ہے۔ ڈنکے کی چوٹ قائم ہوتا ہے۔ ہر ایک اس تعلق کو دیکھ سکتا ہے۔ پرکھ سکتا ہے۔ خود قائم کر سکتا ہے۔ قائم کرا سکتا ہے۔ یعنی خود علم و بصیرت کی رُو سے قرآن کو سمجھ سکتا ہے۔ دوسروں کو دلیل و برہان کی رُو سے سمجھا سکتا ہے۔ خود اس پر عمل کر سکتا ہے۔

خلق قرآن کو لیجیئے ۔ صدیوں تک بغداد کی گلیوں میں مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہتا رہا۔ محض اس لئے کہ ایک فریق، دوسرے فریق کو اس کا حق نہیں دیتا تھا کہ وہ اس کے عقیدے کے خلاف اپنے عقیدہ کا اظہار کرے جونہی کسی نے کسی ایسے خیال کا اظہار کیا جو ان کے خلاف ہو اُسے انہوں نے مُرتد قرار دے دیا ہے۔ اور چونکہ یہ عقیدہ وضع کر لیا گیا تھا کہ مرتد کی سزا قتل ہے اس لیے اس کا خون مباح ہو گیا۔ آج بھی ان کی یہی حالت ہے ۔ جس سے انہیں اختلاف ہوا اس کے خلاف کفر کا فتویٰ صادر کر دیا اور اس طرح معاشرہ میں اس کا گلا گھونٹ کر رکھ دیا۔ یہ تو غنیمت ہے کہ اس وقت زمام اقتدار ان کے ہاتھ نہیں اس لیے معاملہ صرف کفر سازی اور عوام کی اشتعال انگیزی تک رہتا ہے۔ کل کو اگر (خدا نہ کرے) اختیارات ان کے ہاتھ میں آ گئے تو پھر دیکھئے گا کہ جن امور کو آپ بنیادی حقوق انسانیت قرار دیتے ہیں، ان کے ہاتھوں ان کا کیا حشر ہوتا ہے۔ آپ اظہار خیال کا حق لئے پھرتے ہیں، یہ کسی کو جینے کا حق بھی نہیں دیں گے ۔ ان کے ضابطہ قوانین میں حق کا تصور ہی نہیں۔ ہر بات ان کی خوشنودئ مزاج پر منحصر ہوتی ہے ۔ (سنہ ۱۹۶۴ء)

زمانے کے تقاضے

ایک صاحب لاہور سے دریافت کرتے ہیں کہ آج کل عام طور پر یہ بات سُننے میں آتی ہے۔ اور طلوع اسلام خود بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ اسلام زمانے کے تقاضوں کو پورا کرتا ہے ۔ ہمیں زمانے کے تقاضوں کے ساتھ چلنا چاہیئے۔ لیکن زمانے کے تقاضے تو آئے دن بدلتے رہتے ہیں، کیا ان کے ساتھ اسلام بھی آئے دن بدلتا جائے گا۔ مثلاً ۔ آج کل زمانے کا تقاضا ہے کہ عورتیں عریاں لباس پہنتی ہیں۔ کلبوں میں جا کر ناچتی ہیں۔ جیم خانوں میں شراب کا دور چلتا ہے ۔ کیا اسلام کو ان کا ساتھ دینا ہو گا ؟ اگر اسلام ایسا نہیں کرے گا تو زمانے کے تقاضوں کا ساتھ کس طرح دے گا !

طلوعِ اسلام

جس غلط فہمی میں ہمارے یہ مستفسر مبتلا ہیں اس میں آج کل بہت سے لوگوں کو مبتلا پایا گیا ہے۔ درحقیقت ہمارے ہاں ایک رَو پیدا کی گئی ہے۔ جس سے اس قسم کی غلط فہمیاں دانستہ پھیلائی جاتی ہیں ورنہ بات کچھ ایسی مشکل یا الجھاؤ کی نہیں، پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ ایک چیز ہے کسی معاشرہ کی روش اور دوسری چیز ہے زمانے کا تقاضا۔ جو مثال ہمارے مستفسر نے پیش کی ہے وہ معاشرہ کی روش ہے۔ زمانے کا تقاضا نہیں۔ لہٰذا سب سے پہلے ہمیں ان دونوں باتوں کا فرق ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ اب آیئے اسلام کی طرف۔

قرآن کریم نے بعض احکام دیئے ہیں اور بعض اصول۔ اس کے احکام ہوں یا اصول وہ سب غیر متبدّل ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ اگر کسی معاشرہ کی روش ان کے خلاف جاتی ہے تو ہمیں اس روش میں تبدیلی کرنی ہوگی نہ کہ قرآن کے احکام و اصول میں تبدیلی۔

جہاں تک قرآن کے اصولوں کا تعلق ہے انہیں عملی شکل دینے کے لئے فقہی قوانین مرتب کئے جاتے ہیں۔ یہ قوانین اس زمانے کے حالات کو پیش نظر رکھ کر مرتب کئے جاتے ہیں جن میں ان اصولوں کو عملاً نافذ کرنا مقصود ہو۔ اگر وہ حالات باقی نہ رہیں تو ان فقہی قوانین میں بھی تبدیلی کی جائے گی تاکہ نئے قوانین بدلتے ہوئے حالات کے مطابق عمل پذیر ہو سکیں۔ اس کو زمانے کا تقاضا کہا جاتا ہے۔ یعنی اپنے زمانے کے حالات۔ جب ہم کہتے ہیں کہ ہمیں اپنے زمانے کے تقاضوں کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ تو اس سے مطلب یہ ہے کہ قرآن کے اصولوں کی روشنی میں جو فقہی قوانین کسی گذشتہ زمانے میں مرتب ہوئے تھے اگر ہمارے زمانے کے حالات بدل گئے ہیں تو ہمیں ان قوانین میں بھی مناسب ردّوبدل کر لینا چاہیئے۔ ان جزئی قوانین میں اس قسم کا ردوبدل، اسلام کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔ مثلاً نبی اکرمؐ کے زمانے میں بعض لوگوں کو مملکت کی طرف سے کچھ مالی امداد دی گئی تھی۔ انہیں مؤلفتہ القلوب کہا جاتا ہے جس کا ذکر خود قرآن میں ہے (۹/۶۰) حضرت عمرؓ نے اپنے زمانے میں اس امداد کو یہ کہہ کر بند کر دیا کہ جن حالات میں وہ امداد دی گئی تھی وہ اب باقی نہیں رہے لہٰذا قرآن کا یہ حکم ملتوی رہے گا۔ اسی طرح نبی اکرمؐ اور عہدِ صدیقیؓ میں قانون یہ تھا کہ مفتوحہ زمینیں سپاہیوں

میں تقسیم کر دی جاتی تھیں۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں جب عراق کا وسیع زرعی رقبہ مملکت کے ہاتھ آیا تو حضرت عمرؓ نے سابقہ قانون پر ازسرِ نو غور کیا اور بدلے ہوئے حالات کے مطابق اسے بدل دیا۔ وہ زمینیں سپاہیوں میں تقسیم کرنے کی بجائے مملکت کی تحویل میں لے لی گئیں۔ اسی طرح عہدِ صدیقیؓ تک یہ قاعدہ تھا کہ مملکت کی جس قدر نقد آمدنی ہوتی اسے ساتھ کے ساتھ تقسیم کر دیا جاتا۔ حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک طرف یہ آمدنی بہت بڑھ گئی۔ دوسری طرف مملکت کی مستقل ضروریات کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ ان بدلے ہوئے حالات کے ماتحت آپ نے سابقہ قاعدہ کو بدل دیا اور اس آمدنی کو بیت المال میں داخل کر کے باقاعدہ حساب کتاب کا محکمہ (دیوان) کھول دیا۔ اس قبیل کی بہت سی مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔ ہمارے خارج از قرآن، احکامِ شریعت اس زمانے کے حالات کو پیشِ نظر رکھ کر مدوّن کئے گئے تھے۔ جس زمانے میں وہ مرتب ہوئے تھے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان احکام کا ازسرِنو جائزہ لیں اور حالات کی تبدیلی سے جن میں کسی تبدیلی کی ضرورت ہو ان میں مناسب تبدیلی کر لی جائے یہ ہے مطلب۔ زمانے کے تقاضوں۔ یا "بدلے ہوئے حالات" کا ساتھ دینے کا۔ نہ یہ کہ جس چیز کو خدا نے ناجائز قرار دیا ہے اسے جائز قرار دے دیا جائے۔ اس قسم کا اختیار کسی فرد۔ معاشرہ یا حکومت کو حاصل نہیں۔ جس طرح ہمیں مروجہ قوانینِ شریعت کا جائزہ لینا چاہیے۔ اسی طرح آج کل کی معاشرتی روشوں کا بھی محاسبہ کرنا چاہیئے۔ ان میں سے جو روش بھی قرآن کے کسی حکم یا اصول کے خلاف ہو اسے بدل دینا چاہیئے۔

پھر سُن لیجئے کہ دین، قوانین یا اصولوں کی حیثیت سے قرآن کریم کے اندر مکمل ہو چکا ہے۔ جو کچھ قرآن میں ہے وہ غیر متبدّل ہے۔ قرآنی اصولوں کی روشنی میں جو جزئی قوانین مرتب ہوں گے اور ان اصولوں پر عمل پیرا ہونے کے لئے جو طریقے اختیار کئے جائیں گے وہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق بدلے جا سکیں گے۔

و ذالک الدین القیم

(۱۹۶۴ء)

عالم کسے کہتے ہیں

ایک صاحب لکھتے ہیں کہ طلوع اسلام کے لٹریچر میں عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ ہمارے علمائے کرام، علم سے بے بہرہ ہیں، یہ حضرات اپنے آپ کو عالم کہتے ہیں۔ اتنے سال تحصیل علم کے لیے صرف کرتے ہیں۔ اگر یہ علم سے بے بہرہ ہوتے ہیں تو پھر عالم کسے کہا جائیگا۔

طلوع اسلام

ہم اپنے مستفسر سے یہ عرض کریں گے کہ وہ اس بات پر غور کر کے خود ہی جواب دیں کہ اگر ایک شخص قرآن کریم کو حفظ کرے تو کیا آپ اسے قرآن کا عالم کہیں گے ؟ آپ اسے قرآن کا عالم کبھی نہیں کہیں گے حالانکہ اسے سارا قرآن حفظ یاد ہے۔ یہ اس لیے کہ اس نے قرآن کریم کے الفاظ یاد کئے ہیں۔ ان پر غور و فکر نہیں کیا۔ عقل و بصیرت سے کام لے کر اس کے مطالب معلوم کرنے کی کوشش نہیں کی۔ یاد رکھئے۔ کسی چیز کے حفظ کرنے میں عقل و فکر کو کچھ واسطہ نہیں ہوتا۔ اس لیے حفظ کرنے کو علم نہیں کہا جا سکتا۔

ہمارے علمائے کرام کی بعینہٖ یہی حالت ہے۔ انہوں نے قدیم زمانے کی کتابوں کو اسطرح حفظ کیا ہوتا ہے کہ انہیں معلوم ہوتا ہے کہ فلاں مسئلہ کے متعلق فلاں کتاب میں کیا لکھا ہے، فلاں امام نے کیا کہا ہے۔ فلاں مفسر کا کیا قول ہے۔ فلاں محدث کا کیا ارشاد ہے۔ جو کچھ انہیں ان کتابوں میں لکھا ملتا ہے وہ اسے حرفاً حرفاً نقل کر دیتے ہیں اس میں اپنی عقل و فکر کو قطعاً دخل نہیں دینے دیتے۔ انہیں اس کی اجازت ہی نہیں ہوتی۔ وہ ایسا کر ہی نہیں سکتے، اب ان کے متعلق زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انہیں معلومات (INFORMATIONS) حاصل ہوتی ہیں لیکن آپ یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کا علم بہت ہے۔ قرآن کریم نے علم کی تعریف خود بیان کر دی ہے۔ جب کہا کہ لَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ۔ جس بات کا تمھیں "علم" نہ ہو اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ اس کے بعد ہے۔ کہ

اِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ اُولٰٓئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُوْلاً (۱۷/۳۶)۔

یاد رکھو تمھارے سمع۔ بصر۔ اور قلب (فؤاد) ہر ایک سے اس کے متعلق پوچھا جائے گا۔ لہٰذا قرآن کی رُو سے "علم" وہ ہے جس میں سننے دیکھنے کے علاوہ انسان کی فکری صلاحیتوں فؤاد۔ (MIND) کا بھی دخل ہو۔ جو معلومات محض سمع، بصر پر مبنی ہوں اور ان میں انسان کے اپنے فہم وتدبر کا دخل نہ ہو' وہ علم کی تعریف' میں نہیں آتیں۔ ہمارے علماء کرام کا سارا "علم" سمع و بصر پر موقوف ہوتا ہے۔ یعنی یا کتابیں رٹ لینا اور یا استاد کی سنائی ہوئی باتوں کو محفوظ کر لینا (خواہ حافظہ کی مدد سے یا تحریر کے ذریعے)۔ ان کی فکری صلاحیتوں کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے کہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے' انہیں اس کی اجازت ہی نہیں کہ جو کچھ چلا آرہا ہے اس میں عقل وفکر کو دخل دے سکیں۔ یہ ان کے نزدیک بدعت اور الحاد ہے۔ ان میں سب سے بڑا عالم وہ ہوگا جو سب سے زیادہ حوالے دے سکے۔ ہم اسی لیے انہیں عالم کے بجائے (CATALOGUER) کہا کرتے ہیں۔ علامہ اقبالؒ نے انہیں کے متعلق کہا تھا کہ:-

فقیہہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

قرآن نے اسکو "حمل اسفار" (۶۲/۵)۔ کتابیں اٹھائے اٹھائے پھرنے سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اپنے محدود سے دائرے میں معلومات کے حافظ ہوتے ہیں۔ عالم نہیں ہوتے جن لوگوں کے مسلک میں عقل وفکر سے کام لینا حرام ہو وہ عالم ہو کیسے سکتے ہیں؟ ان سے کسی مسئلہ کے متعلق پوچھئے۔ یہ بیس استادگن دیں گے اور درجنوں حوالے پیش کر دیں گے۔ لیکن ان سے اگر یہ پوچھئے کہ ایسا کیوں کرنا چاہیئے تو اس کا ان کے پاس کوئی جواب نہیں ہوگا۔ بجز کفر کے فتوے کے۔ کیا علم اسی کو کہتے ہیں؟ (۱۹۹۴ء)

اختلافات کی نوعیت

جب ہم کہتے ہیں کہ مسلمانوں کے مختلف فرقوں کے مسالک کو مستند مان لیا جائے تو اس قسم

کے قوانین مرتب ہی نہیں ہو سکتے جنہیں تمام مسلمان اسلامی تسلیم کر لیں۔ کیونکہ ان فرقوں میں باہمی اختلافات بڑے شدید ہیں تو اس کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ نہیں۔ یہ اختلافات محض فروعی ہیں انہیں ایسی اہمیت حاصل نہیں۔

اہلِ حدیث کے ترجمان (الاعتصام) میں احناف کے ساتھ ایک بحث چل رہی ہے۔ اس سلسلہ میں اس کی ۱۳ دسمبر کی اشاعت میں شائع شدہ ایک مضمون میں لکھا ہے۔

یہ تو ایک اصل کی ایک جزی کو نہایت اختصار سے نقل کیا گیا ہے۔ اگر اس پر اور دیگر سینکڑوں اصول جو نصوص اور ائمہ اہلِ حدیث کی تردید کے لیے وضع کئے گئے ہیں، بحث و تمحیص کے لیے قلم کو اجازت دی جائے تو ایک مبسوط کتاب مرتب ہو جائے۔ وہ کون سا بزرگ ہے جس نے حنفیّت کے کسی مسئلہ سے اختلاف کیا ہو، اور پھر اس کو خارج از اسلام کرنے کے لیے اصول نہ وضع کئے گئے ہوں۔ اصول سے ہٹ کر ویسے بھی احناف کرام کی ائمہ اہلِ حدیث کے متعلق گفتگو اس طرح کی ہوتی ہے۔ جس کا نمونہ آپ فاضل دیوبند کے کلام میں ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ ہم اگر ان کے بزرگوں کے بزرگوں کے وہ اقوال اور ملفوظات جو اہلِ حدیث کی تحقیر و تنقیص میں ان کی کتابوں میں موجود ہیں، پیش ہی کریں تو غالباً اس کو بھی ہماری کم ظرفی اور چھچھورے پن پر محمول کریں گے۔

(الاعتصام ۱۳ دسمبر ۶۳ء صہ ۲)

آپ ان الفاظ پر ایک مرتبہ پھر غور فرمائیے کہ

وہ کون سا بزرگ ہے جس نے حنفیّت کے کسی مسئلہ سے اختلاف کیا ہو اور پھر اسے خارج از اسلام کرنے کے لیے اُصول نہ وضع کئے گئے ہوں۔

اس کے بعد آپ سوچئے کہ کیا ان فرقوں کے اختلافات محض فروعی ہیں جنہیں چنداں اہمیت حاصل نہیں یا ایسے بنیادی کہ ان کی بنا پر ایک دوسرے کو خارج از اسلام قرار دیا جاتا ہے؟ اور ان دونوں فرقوں کا دعویٰ یہ ہے۔ (بلکہ ہر فرقے کا دعویٰ) کہ ہمارے احکام "کتاب و سنّت" پر مبنی ہیں۔ جہاں تک کتاب اللہ کا تعلق ہے اس کا دعویٰ یہ ہے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مجھ میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ اب آپ سوچئے کہ جس کتاب کا دعویٰ یہ ہو (اور اس دعوے کی صداقت پر ہمارا ایمان ہو) تو کیا یہ کسی طرح بھی ممکن ہے کہ جن احکام کی بنیاد ایسی کتاب پر ہو ان میں

اس قدر اختلافات ہوں؟ اگر اسے تسلیم کر لیا جائے کہ ایسا ممکن ہے تو اس کتاب کا یہ دعویٰ (معاذ اللہ) غلط ثابت ہو جاتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ یہ تمام اختلافات، کتاب اللہ سے ہٹ کر اور چیزوں کو بنیاد قرار دے لینے سے پیدا ہوتے ہیں۔

اور پھر یہ بھی سوچئے کہ جب تک آپ ان چیزوں کو بنیاد تسلیم کرتے رہیں گے، ان اختلافات کے مٹنے کی کوئی صورت پیدا ہو سکے گی؟ ایسا کبھی نہیں ہو سکے گا۔ ہماری ہزار برس کی تاریخ خود اس پر شاہد ہے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ ان اختلافات کے مٹنے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ ہم کتاب اللہ کو بنیاد تسلیم کریں۔ اسی سے ایسے احکام و قوانین مرتب ہو سکیں گے جن کا اطلاق اسلامی قوانین کی حیثیت سے تمام مسلمانوں پر یکساں طور پر ہو سکے گا۔

پاکستان میں قانون سازی کا یہی وہ اصول ہے جس کی طرف ہم دعوت دیتے چلے آرہے ہیں لیکن فرقوں میں جکڑی ہوئی مذہبی پیشوائیت کی طرف سے جس کی اس قدر مخالفت ہو رہی ہے۔

سوال یہ ہے کہ کیا اس کے علاوہ کوئی اور صورت بھی ہے جس سے تمام مسلمانوں کے لئے مشترکہ اسلامی قوانین مرتب کئے جا سکیں؟ ہمارے قدامت پرست مذہبی طبقہ کی طرف سے اس کا کوئی جواب نہیں دیا جاتا — نہ ہی دیا جا سکتا ہے۔

یاد رکھئے۔ جب تک یہ شکل اختیار نہیں کی جائے گی، ہمارے فرقے نہیں مٹ سکیں گے — اور فرقے نہیں مٹیں گے تو ہم خود مٹ جائیں گے۔ (دسمبر ۱۹۶۴ء)

الیکشن کی وبا

ایک صاحب لکھتے ہیں:۔ الیکشن آرہے ہیں اور ان کی وجہ سے ملک میں اختلاف انگیزی اور تفرقہ بازی کی وبا عام شروع ہو گئی ہے۔ ایک فریق دوسرے فریق کے ساتھ مصروف نبرد آزمائی ہے۔ ایک پارٹی دوسری پارٹی کے خلاف آمادۂ جنگ و جدال ہے۔ کیا یہ الیکشن کسی طرح ختم نہیں کئے جا سکتے!

طلوعِ اسلام

یہ وبا الیکشنوں کی وجہ سے نہیں ہے۔ الیکشن صرف دیوانے کے لیے "ہُو" کا کام دیتے ہیں۔ اس کی بنیادی وجہ اور ہے۔ ۱۹۶۲ء کے دستور پاکستان میں جو چند کام کی باتیں تھیں ان میں ایک یہ بھی تھی کہ ملک کی سیاسی پارٹیوں کا وجود اور "پرسنل لا" کے سلسلہ میں مذہبی فرقہ بندیوں کی تمیز ختم کر دی گئی تھی یہ اقدام بڑا مستحسن تھا۔ لیکن آپ کے ہاں کی اسمبلیوں نے خیر سے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ سیاسی پارٹیوں کو پھر سے وجود میں لے آئیں اور عائلی قوانین میں مذہبی فرقہ بندی کو (جسے قرآن کریم بہ نصِ صریح شرک قرار دیتا ہے) پھر سے اُجاگر کر دیا اور اس پر مسرّت کے شادیانے بجائے کہ شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم۔ یہ تمام سر پھٹول، یہ جنگ و جدل۔ یہ نبرد آزمائیاں اور اختلاف انگیزیاں سب سیاسی پارٹیوں کے وجود کا فطری نتیجہ ہیں۔ اسلام نے وحدتِ انسانیت کا اصول دیا تھا۔ نبی اکرمؐ نے اپنی عدیم المثال تعلیم و تربیت سے اُمتِ واحدہ پیدا کی تھی۔ اس میں نہ سیاسی پارٹیوں کی لعنت تھی نہ مذہبی فرقوں کا شرک ایک امت۔ ایک مرکز۔ ایک ضابطہ قوانین۔ ہماری مذہبی پیشوائیت نے اس اُمت کو بہتر فرقوں میں تقسیم کر دیا۔ اور سیاسی مفاد پرستوں نے پارٹیوں کی طرح ڈال دی۔ قرآن کریم نے سیاسی پارٹیوں کو حکمتِ فرعون کی دسیسہ کاری سے تعبیر کیا تھا۔ اب کہا جا رہا ہے کہ "اسلام جمہوریت کا مذہب ہے اور جمہوریت کا نظام سیاسی پارٹیوں کے بغیر چل ہی نہیں سکتا" یاد رکھیئے۔ جو نظام اُمت کے اختلاف کے بغیر چل نہیں سکتا وہ کبھی اسلامی نظام نہیں ہو سکتا۔ جس جمہوریت میں پارٹیوں کا وجود لاینفک ہو وہ اسلام کا نظام نہیں مغرب کی لادینی جمہوریت کا نظام ہے۔ اسلامی نظام کا مقصد قوانین خداوندی کا عملی نفاذ ہوتا ہے اور یہ مقصدِ بلند پوری اُمت کی مشاورت سے حاصل ہوتا ہے۔ جس جگہ بھی الیکشن سے مقصود کسی خاص پارٹی کا برسرِ اقتدار آنا ہو گا وہاں تفرقہ بازی اور اختلاف انگیزی ناگزیر ہو گی۔ مقصد، نظامِ خداوندی کا قیام سامنے رکھیئے اور پھر دیکھیئے کہ اُمت میں کس طرح وحدت پیدا ہوتی ہے۔

(۱۹۶۴ء)

قومی یادگاریں

سوال دنیا میں بھی عام رواج ہے اور ہمارے ہاں بھی اب اس کی طرح پڑ رہی ہے کہ مشاہیر یا بڑے بڑے واقعات کی یادگاریں تعمیر کی جائیں۔ قرآن شریف کا اس باب میں کیا فیصلہ ہے؟

جواب اگر کسی شخص نے نوعِ انسان کی منفعت بخشی کا کوئی بڑا کام سرانجام دیا ہے۔ تو اسکی یادگار اس کے عظیم کام کی یاددہانی کا ذریعہ ہوتی ہے تاکہ اس سے آنے والی نسلوں کے دل میں اسی قسم کے کام کرنے کا جذبہ پیدا ہو۔ اس مقصد کے پیشِ نظر اس قسم کی یادگار قائم کرنا مفید ہوتا ہے۔ جو یادگاریں نظامِ خداوندی کے قیام و استحکام سے متعلق ہوں قرآن نے انہیں شعائر اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ اسی طرح ایسے عظیم واقعات جو اس سلسلہ میں رونما ہوں ان کی یاد قائم رکھنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ انہیں قرآن کریم نے ایام اللہ سے تعبیر کیا ہے اور ان کی یاددہانی بھی ضروری قرار دی ہے۔ چنانچہ فرعون اور حضرت موسیٰ کی آویزش کے سلسلہ میں کہا ہے وَ ذَكِّرْهُم بِأَيَّامِ اللَّهِ (۱۴/۵) انہیں ایام اللہ کی یاد دلاؤ۔ اگر اس قسم کے اہم واقعات کی یاد کے لئے کوئی عمارت تعمیر کی جاتی ہے تو وہ بھی مفید نتائج پیدا کرتی ہے۔

لیکن اس سلسلہ میں ایک بنیادی اصول کا پیشِ نظر رکھنا ضروری ہے۔ اور وہ یہ کہ یادگار ایسی ہونی چاہیے جو لوگوں کو فائدہ پہنچائے۔ محض ایک ستون کھڑا کر دینا یا مینار بنا دینا جس کی افادی حیثیت کچھ نہ ہو، اسراف بیجا ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ حضرت ہودؑ نے قومِ عاد کی غلط کاریوں کی جو فہرست پیش کی تھی اس میں یہ بھی تھا کہ اَتَبْنُوْنَ بِكُلِّ رِيْعٍ آيَةً تَعْبَثُوْنَ۔ (۲۶/۱۲۸) تم اونچے اونچے مقامات پر ایسی یادگاریں تعمیر کرتے ہو جن کا مصرف کوئی نہیں ہوتا۔ وہ بے کار عمارت ہوتی ہے۔ تعبثون (ع۔ ب۔ ث) سے ہے۔ جس کے معنی بے کار، بے غرض و غایت۔ بے مطلب یعنی عبث ہیں۔ ہم نے ہندوستان میں صدیوں تک حکومت کی۔ لیکن غور کیجئے کہ اس ملک میں بڑے بڑے عظیم الشان مقبروں کے علاوہ اس دورِ حکومت کی یادگار کیا ہے۔ ان مقبروں پر کروڑوں روپے صرف آ گئے۔ لیکن سوچئے کہ ان کی (خود اس وقت جب وہ تعمیر کئے گئے تھے۔ یا آج) افادی حیثیت کیا ہے؟ وہ سب بیکار عمارتیں ہیں۔ ان کے برعکس (مثلاً) سرسید کی یادگار (علی گڑھ کالج) کو

دیکھیے علوم و فنون کا ایک چشمۂ جاریہ ہے۔ جس کے ایک گوشے میں اس کے بانی کی سادہ سی قبر ہے۔ جو کچھ کالج کی عمارت پر صرف کیا تھا اگر اس سے سرسید کا عالیشان مقبرہ بنا دیا جاتا تو سوچیے کہ وہ سرسید کی بہتر یادگار ہوتی یا کالج بہتر یادگار ہے۔

ہم اتنا اور واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ جب ہم نے کہا ہے کہ ان عمارات کی افادی حیثیت ضرور ہونی چاہیئے۔ تو اس سے ہمارا یہ مطلب نہیں کہ ان میں جمالیاتی پہلو نہیں ہونا چاہیئے۔ جمالیاتی پہلو تو انسانی زندگی کی تاریک راتوں کے لئے چاندنی ہے۔ اسے کیسے نظر انداز کیا جا سکتا ہے۔ لیکن اگر اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تو اس کے ساتھ افادی پہلو کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ زندگی کے لئے دونوں کا امتزاج ضروری ہے۔ بہرحال یادگار ایسی ہونی چاہیئے جو منفعت بخشی اور جمال آفرینی کی جوئے رواں ہو۔ نہ کہ عبث و بیکار عمارت۔

(۱۹۶۴ء)

اقوامِ مغرب کیلئے وحی کی ضرورت

لاہور سے ایک صاحب دریافت کرتے ہیں کہ آپ نے طلوعِ اسلام کی سابقہ اشاعت میں کمیونزم کے متعلق ایک صاحب کے استفسارات کے جواب میں جو کچھ لکھا ہے اس سے میرے کئی ایک شکوک رفع ہو گئے۔ اور اس سلسلہ میں کئی ایک ایسے کانٹے نکل گئے، جن کی خلش ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا۔ لیکن جن کا مداوا کہیں سے نہیں ملتا تھا۔ اب میں خود ایک سوال پوچھنے کی جرأت کر رہا ہوں اور وہ یہ کہ یورپ کی کئی ایک رفاہی مملکتوں (WELFARE STATES) کے تذکرے سننے میں آتے ہیں۔ مثلاً انگلستان کی مملکت۔ کہ وہاں کوئی شخص بھوکا نہیں ہوتا۔ کوئی شخص ضروریاتِ زندگی سے محروم نہیں ہوتا۔ ہر ایک کے لیے روزگار مہیا کیا جاتا ہے۔ بیکاروں کو الاؤنس ملتا ہے۔ بوڑھوں کو پنشن ملتی ہے۔ بیماروں کا علاج مفت ہوتا ہے۔ بچوں کی تعلیم مفت ہوتی ہے۔ بے گھر لوگوں کو نہایت آسان قسطوں پر مکانات بنوا دیئے جاتے ہیں۔ اور اس قسم کی سہولتیں صرف ان کی اپنی قوم کے افراد تک محدود نہیں۔ جو دوسرے لوگ بھی وہاں جا کر بسنے لگ جائیں وہ بھی ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ لوگ اس قسم کے نظامِ معاشرہ تک کس طرح پہنچے ہیں ان کے سامنے تو قرآن کی تعلیم نہیں تھی۔

اور مذہب کی جو تعلیم ان کے سامنے تھی اس میں "دنیاوی زندگی" سے متعلق باتوں کا کوئی حصہ ہی نہ تھا۔ اس کے ساتھ ہی یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ان لوگوں کو اسکے بعد بھی قرآنی تعلیم کی ضرورت رہے گی۔ اگر رہے گی تو کس کمی کو پورا کرنے کے لئے۔

طلوعِ اسلام پہلے تو یہ سمجھ لیجئے کہ یہ مفروضہ صحیح نہیں کہ ان لوگوں کے سامنے قرآن کریم کی تعلیم نہیں تھی۔ یہ لوگ صدیوں سے قرآن کی تعلیم سے آشنا ہیں۔ اس میں شبہ نہیں کہ ان کے مذہب پرست متعصب طبقہ نے ان کے سامنے اسلام کی بڑی رنگ آمیز تصویر پیش کی ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہاں ایسے لوگ بھی ملتے ہیں جنہوں نے قرآن کی تعلیم کا اپنے طور پر مطالعہ کیا ہے۔ اور صاف وشفاف نہ سہی تو کم ازکم اس کے اصولوں کا دھندلا سا تصوّر ان کے سامنے ضرور ہے۔

لیکن جہاں یہ صورت نہ ہو وہاں عقل کا تجرباتی طریق کارفرما ہوتا ہے۔ جسے ہم "خدا کے کائناتی قانون" کی اصطلاح سے تعبیر کیا کرتے ہیں۔ اسی کو زمانے کا تقاضا بھی کہا جاتا ہے۔ آپ یورپ کی تاریخ پر نگاہ ڈالئے جب سے اس کا مسلمانوں سے میل جول شروع ہوا خواہ وہ صلیبی جنگوں کے میدانوں میں تھا یا اندلس کی فکرگاہوں میں افراد کے حقوق کا تصوّر ان کے سامنے آیا۔ اگر وہ قرآنی وحی پر ایمان لاتے تو ان حقوق کو بلاتوقف وتاخیر عمل میں لے آتے انہوں نے ایسا نہ کیا اور عقل کے تجرباتی طریق کو اپنا راہ نما بنایا۔ اس کا نتیجہ یہ کہ انہیں اپنے موجودہ مقام تک پہنچنے میں کئی صدیاں لگ گئیں۔ یہ جو ہم ان کے ہاں افراد کے حقوق کا نقشہ دیکھتے ہیں۔ وہ اسی کا نتیجہ ہے۔

لیکن انہیں اب بھی وحی کی راہ نمائی کی ضرورت ہے اور اس کے بعد بھی ضرورت رہے گی۔ انکے ہاں افراد کے حقوق کا جذبۂ محرکہ نیشنلزم ہے۔ انسانیت کا تصوّر نہیں ہے۔ یورپ اور امریکہ کی مختلف اقوام، اپنی اپنی قوم کو زیادہ سے زیادہ خوش حالیاں اور فارغ البالیاں پہنچانے کی فکر میں رہتی ہیں۔ اپنی قوم کے باہر کے انسانوں کا سلب ونہب (EXPLOITATION) ان کے نزدیک نہ صرف جائز بلکہ واجب قرار پاتا ہے۔ اس کا پتہ اس وقت چلتا ہے جب ان کی قوم کے کسی مفاد کا تصادم کسی غیر قوم کے مفاد سے ہوتا ہے۔ اس وقت دیکھئے کہ وہ قوم انسانیت کے تمام تقاضوں کو بالائے طاق رکھ کر کس طرح درندوں کی طرح قوم مخالف پر جھپٹتی ہے آپ انڈونیشیا سے لیکر مراکش تک اور دوسری طرف افریقی اقوام پر نگاہ ڈالئے اور پھر دیکھئے کہ وہی اقوام یورپ اور امریکہ جو عام حالات میں اس قدر مہذب اور شریف نظر آتی ہیں۔ اسوقت

کیا بن کر سامنے آتی ہیں جب ان کا اپنا مفاد، ان اقوام کے مفاد سے ٹکراتا ہو۔ انسانیت کا تصور تو بڑی چیز ہے وہ اس وقت عام معاشرتی اصول و آداب تک کو بھی خیرباد کہہ دیتی ہیں۔ اور ایسے ایسے حربے استعمال کرتی ہیں۔ جن پہ عظمت انسانیت ماتم کرے اور احترام آدمیت خون کے آنسو بہائے۔ یہ ٹھیک ہے کہ انگلستان میں بسنے والے پاکستانیوں کو وہاں دوائی مفت مل جاتی ہے۔ (بشرطیکہ وہ وہاں کی انشورنس فیس ادا کرتا ہو) لیکن آپ نے کبھی اس پر بھی غور کیا کہ اسی پاکستان کے غریب اور مفلوک الحال انسانوں کی محنت کی کمائی کا کس قدر عظیم حصہ دوائیوں کی قیمت کے طور پہ ہر سال انگلستان اور امریکہ جا پہنچتا ہے۔ وہ یہاں کے غریبوں کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لیتے ہیں تاکہ ان کی اپنی قوم کے افراد کے چہروں کی سُرخی میں فرق نہ آنے پائے۔ اور اس میں سے دو چار پونڈیں وہاں کے مقیم پاکستانیوں کو بھی دے دیتے ہیں تاکہ انہیں انسانیت کا ہمدرد اور غیروں کا بھی خواہ سمجھا جائے۔

اقوام مغرب کو اپنی اپنی قوم کے افراد کے حقوق کے تصور تک پہنچنے میں صدیاں لگ گئیں اور اس دوران میں جو کچھ ان اقوام پر گذری اس پر ان کی تاریخ شاہد ہے۔ اب اگر انہوں نے احترام آدمیت اور وحدت انسانیت کی منزل تک پہنچنے کے لیے عقل کے تجرباتی طریق ہی کو اپنا امام قرار دیا تو نہ معلوم اس مقصود تک پہنچنے میں انہیں کتنے دن لگ جائیں اور اس عرصے میں انسانیت کو جن تباہیوں سے دوچار ہونا پڑے۔ اس کا کون اندازہ لگا سکتا ہے۔ پہلے زمانے میں تو پھر بھی انسانوں کو شمشیر و سناں سے ہلاک کیا جاتا تھا۔ لیکن اب سائنٹفک ایجادات نے انسانوں کی تباہی کے لیے ایسے اسباب و ذرائع وضع کر دیئے ہیں کہ دنیا کے اکثر مفکر اس خیال سے لرزاں و ترساں ہیں کہ اگر تیسری عالمگیر جنگ چھڑ گئی تو دنیا میں انسانوں کا وجود تک باقی نہیں رہے گا۔ اندریں حالات، اب انسانیت اسے AFFORD ہی نہیں کر سکتی کہ دنیا عقل کے تجرباتی طریق کی سُست رفتاری سے وحدتِ انسانیت کی منزل تک پہنچے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اقوام مغرب کو قرآن کی تعلیم سے روشناس کرایا جائے تاکہ وہ وحی کی راہ نمائی میں اس منزل تک جلد از جلد پہنچ سکے۔ اور عالمگیر انسانیت اس تباہی سے بچ جائے۔ جو بصورتِ دیگر اس کی تقدیر مبرم نظر آتی ہے۔ ۱۹۶۴ء

قرآن کریم اور عقل انسانی

لاہور سے ایک صاحب نے ذیل کے چار سوالات بھیجے ہیں۔

۱ قرآن مجید ایک الہامی کتاب ہے۔ آپ کے نزدیک اس کے حق میں عقلی و نقلی، داخلی اور خارجی شہادتیں کیا ہیں ؟

۲ اگر یہ کہا جائے کہ قرآن مجید ایک وجدانی تخلیق ہے تو اس کی تردید میں آپ کا کیا جواب ہوگا ؟

۳ کیا عقل اس وحی ربانی یعنی قرآن کی ترجمانی تصریح اور تشریح کرنے کی اہل ہے ؟ اگر یہ کہا جائے کہ عقلِ انسانی کی رسائی وہاں تک پہنچ چکی ہے کہ اسمیں تصریح و تشریح کی صلاحیت آگئی ہے تو پھر یہ ماننا پڑے گا کہ اب شارع اور مفسرِ حقیقی کی ضرورت باقی نہیں ؟ اندریں صورت ہم یہ ماننے پہ مجبور ہوں گے کہ عقل اس حد تک پختہ ہوگئی ہے کہ وہ وحی کا احاطہ کرنے کے قابل ہے تو پھر وحی کی ضرورت جو تکمیلِ عقل انسانی کے لئے لازمی تھی غیر ضروری ہو جاتی ہے اور اس کو چھوڑ دینا چاہیئے ؟

۴ اگر یہ مانیں کہ عقل انسانی اپنے ارتقاء کے لیے وحی کی اب بھی محتاج ہے تو اس سے استفادہ کرنے کے لیے اس مفسر اور شارع کی جو وحی کے جُزو پہ کلیتہً اور کاملاً احاطہ اور اطلاع رکھتا ہو موجودہ زمانے میں اس کی نشاندہی کی جائے۔

مندرجہ بالا استفسارات کا جواب اگر انفرادی طور پر دیا جا سکے۔ تو یہ عنایت خصوصی ہوگی۔ ورنہ بصورت دیگر ازراہ لطف مطلع فرمایا جائے کہ آپ کے کس مجلہ عالیہ میں جوابات اشاعت پذیر ہوں گے تاکہ اسے خرید لیا جائے۔ والسّلام۔

جواب (۱) سب سے پہلے اتنا واضح کر دینا ضروری ہے کہ قرآن کریم کے لیے "الہامی" کا لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیئے۔ (اس کے لیے یا کسی دوسری آسمانی کتاب کے لیے یہ لفظ قرآن میں نہیں آیا) یہ وحیٔ خداوندی ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ کتاب رسول اللہ کے اپنے ذہن کی تخلیق نہیں۔ اسے خدا نے رسول پر نازل کیا اور حضور نے اسے اسی طرح انسانوں تک پہنچا دیا سو وحی خداوندی میں OBJECTIVITY کا تصور بنیادی ہوتا ہے اس میں SUBJECTIVITY کا کوئی دخل نہیں ہوتا۔ یہ خصوصیت صرف وحی کو حاصل ہے جہاں تک داخلی اور نقلی شہادت کا تعلق ہے، قرآن کریم شروع سے اخیر تک اس حقیقت کو واضح الفاظ میں بیان کئے جاتا ہے کہ اسے خدا نے وحی کیا۔ (وَاُوْحِیَ اِلَیَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ۔ ۶/۱۹ ؛ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۱۲/۳ ؛ وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰی اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی۔ ۵۳/۳-۴ وغیرہ) اس کی دلیل اس کا دعوے ہے کہ (وَاِنْ كُنْتُمْ

فِیْ رَیْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰی عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَۃٍ مِّنْ مِّثْلِہٖ ...... (۲:۲۳)۔ "اگر تمہیں اس میں شک ہو جو ہم نے اپنے بندے پر نازل کیا ہے تو تم اس کی مانند ایک سورت بنا کر دکھاؤ"۔ چونکہ یہ چیلنج تمام انسانوں کے لئے ہے۔ (ہر قوم کے انسانوں کے لئے اور ہمیشہ کے لیے) اس لئے اس سے مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ یہ انسانی کوشش کی تخلیق نہیں اور یہ حقیقت کہ اس چیلنج کو آج تک کسی نے قبول (ACCEPT) نہیں کیا۔ اس دعوے کی صداقت کی دلیل ہے۔

قرآن کریم کے من جانب اللہ ہونے کی ایک عقلی دلیل تو وہی ہے جس کا ہم نے ابھی ابھی ذکر کیا ہے یعنی اس کا یہ چیلنج کسی نے قبول نہیں کیا۔ اس کے بعد اس تیرہ سو سال کی انسانی تاریخ خود اس کی شہادت بہم پہنچاتی ہے۔ تفصیل اس اجمال کی طول طویل ہے اور اس کا ایک استفسار کے جواب میں سمٹانا مشکل۔ اسلئے سر دست چند ایک مثالوں پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مثلاً۔

نزول قرآن کے وقت ساری دنیا کا فیصلہ یہ تھا کہ ملوکیت کا نظام سیاست عین "فطرتِ انسانی" کے مطابق ہے۔ بادشاہ ایشور کا اوتار اور خدائی اختیارات کا حامل ہوتا ہے۔ اس سے بہتر نظام کوئی اور ہو نہیں سکتا۔ قرآن نے اس کی تردید کی اور کہا کہ انسانوں کو اپنے معاملات (وحی کی مستقل اقدار کی روشنی میں) باہمی مشاورت سے طے کرنے چاہئیں۔ کسی انسان، یا انسانوں کی جماعت کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسانوں پر حکومت کرے۔

۲ انسانی ذہن کا اس زمانے تک یہ فیصلہ تھا کہ غلاموں کا وجود انسانی معاشرہ کے لیے ضروری ہے اور فطرت کی صحیح تعلیم کا نتیجہ قرآن کریم نے یہ انقلابی تصور دیا کہ کسی انسان کا دوسرے انسان کو اپنا غلام بنا لینا یکسر خلافِ انسانیت ہے۔

۳ اس زمانے میں انسانوں کی تقسیم و تفریق پیدائش کے اعتبار سے ہوتی تھی۔ برہمن کا بیٹا، برہمن اور محض برہمن کے گھر پیدا ہو جانے سے واجب التکریم: بادشاہ کا بیٹا شاہزادہ، لارڈ کا بیٹا لارڈ، سردار کا بیٹا سردار، قرآن کریم نے کہا کہ یہ تقسیم یکسر غلط ہے۔ پیدائش کے اعتبار سے کسی انسان کو دوسرے انسان پر فوقیت نہیں۔ فوقیت ہر انسان کے جوہر ذاتی اور سیرت و کردار کی بنا پر ہونی چاہیئے۔

۴ اس زمانے میں انسان مختلف گروہوں، قبیلوں اور نسلوں میں بٹے ہوئے تھے۔ قرآن کریم نے کہا کہ تمام انسان ایک خاندان کے افراد اور ایک درخت کی شاخیں ہیں۔ لہذا تمام دنیا کے انسانوں کو اُمّت واحدہ (ایک قوم) کی حیثیت سے رہنا چاہیے۔ ان کا ایک اجتماعی نظام اور ایک ضابطہ زندگی ہونا چاہیئے۔

آپ ذرا سوچیے کہ اگر اس نظریہ کو صحیح تصور کر لیا جائے کہ ختم نبوت کے بعد خدا کی کتاب کو سمجھانے کے لئے ضروری ہے کہ خدا ہی کی طرف سے کوئی انسان آئے تو یہ اس کتاب کا کتنا بڑا نقص ہوتا۔ اگر کوئی مصنف ایک کتاب تصنیف کرے اور اسے عام افادہ کے لیے شائع کرے لیکن اس کے بعد ضرورت یہ لاحق ہو کہ اس کتاب کو سمجھانے کے لیے وہ اپنے ہاں سے " ٹرینڈ ٹیچرز " بھیجا کرے تو فرمایئے اس کتاب کے متعلق آپ کا کیا خیال ہو گا؟ قرآن کریم کا دعویٰ ہے کہ وہ صاف، واضح، آسان، غیر مبہم کتاب ہے۔ اور اس کی تعلیم غور و فکر سے سمجھ میں آ سکتی ہے۔ اس لیے اس کے سمجھانے کے لیے خدا کو اپنی طرف سے " ٹرینڈ ٹیچر " بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ اگر انسانوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ماسورین من اللہ کی ضرورت باقی ہوتی تو سلسلۂ نبوت ختم کیوں کیا جاتا۔ نزول قرآن کے وقت رسول کی ضرورت اس لئے تھی کہ قرآن نجماً نجماً نازل ہو رہا تھا۔ اور رسول اللہ اس کے مطابق معاشرہ متشکل کرتے جاتے تھے۔ قرآن مکمل ہو گیا۔ اور اس کی وارث اُمت وجود میں آ گئی۔ لہذا نبوت ختم ہو گئی۔ اور قرآن اور اُمت آگے بڑھتے چلے گئے۔ ان کی موجودگی میں کسی " مامور من اللہ " کی ضرورت نہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ " شارع " خدا کے علاوہ کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ انسان خدا کی عطا کردہ " شریعت " کو نافذ کرتے ہیں۔ شریعت وضع نہیں کرتے۔ اس اعتبار سے شریعت اور دین سے مفہوم ایک ہی ہے اگرچہ عام مفہوم کے اعتبار سے دین کو اصول اور شریعت کو اس کی جزئیات سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۶۴ء

تلاعب بالدّین

دار العلوم دیوبند سے شائع ہوتے والے ماہنامہ تذکرہ کی فروری ۱۹۶۴ء کی اشاعت میں معارف و حقائق کے زیر عنوان حسب ذیل نوادرات شائع ہوئے ہیں۔

۱ امام شافعیؒ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ میری بیوی کے پاس ایک کھجور تھی۔ میں نے اس کو یہ کہہ دیا کہ اگر تو نے یہ کھجور کھا لی تو تجھ پر طلاق اور اگر پھینک دیا تو تب بھی طلاق۔ اب کیا کرنا چاہیئے۔ آپ نے جواب دیا کہ آدھی کھائے اور آدھی پھینک دے۔ (حرملہ بن یحییٰ)

۲ ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا جو پانی میں کھڑی تھی کہ اگر تو اس پانی میں ٹھہری تو تجھ پر طلاق اور نکلی تب

بھی طلاق۔ تو ہم دیکھیں گے کہ اگر یہ پانی جاری تھا اور اس شخص نے کوئی خاص نیت نہیں کی تھی تو اس پر طلاق واقع نہ ہو گی۔ چاہے وہ نکل آئے یا کھڑی رہے، لیکن اگر وہ پانی کھڑا ہوا تھا تو اس کی صورت یہ ہو گی کہ اسے فوراً کوئی دوسرا شخص زبردستی اٹھا کر پانی سے باہر لے آئے۔ (کتاب الاذکیا)

۳ ایک شخص نے اپنی بیوی کو جو کہ سیڑھی پر تھی یہ کہا کہ اگر تو اس سیڑھی پر چڑھی یا اس سے نیچے اتری یا تو نے اپنے آپ کو نیچے گرایا یا کسی نے تجھے نیچے اتارا تو تجھ پر طلاق ہے۔ تو اس سے رہائی کی صورت یہ ہو گی کہ ایک سیڑھی اس کے برابر رکھدی جائے اور وہ اس سیڑھی پر منتقل ہو جائے۔

۴ ایک شخص نے گھر والوں کے ساتھ مل کر بہت سی کھجوریں کھائیں، پھر بیوی سے یہ کہدیا کہ اگر تو نے میرے سامنے کھجوروں کی ان تعدادوں کا ذکر نہ کیا جو میں نے کھائی ہیں تو تجھ پر طلاق۔ اس سے رہائی کی یہ صورت ہو گی کہ جس قدر کھجوریں کھانے کا زیادہ سے زیادہ احتمال ہو وہ عورت ایک سے لیکر اس عدد تک گنتی چلی جائے۔ اس گنتی میں صحیح عدد بھی اس کے سامنے مذکور ہو ہی جائے گا۔

۵ ایک شخص نے اپنی بیوی کے پاس پانی کا ایک بھرا ہوا پیالہ دیکھا تو اس نے کہا یہ پانی مجھے پلا دو۔ اس نے انکار کیا تو اس شخص نے کہا اگر تم نے اس پانی کو پیا یا اس کو گرایا یا اس پیالہ میں چھوڑ دیا۔ یا کسی اور کو پلا دیا تو تم پر طلاق۔ تو اس سے رہائی کی یہ صورت ہو گی کہ اس پیالہ میں کوئی ایسا کپڑا ڈال دیا جائے جو اس پانی کو جذب کرلے۔

طلوعِ اسلام

قرآن کریم نے طلاق کے سلسلہ میں فرمایا تھا کہ

وَلَا تَتَّخِذُوْٓا اٰيٰتِ اللّٰهِ هُزُوًا (۲/۲۳۱)

اللہ کے احکام کے ساتھ مذاق مت کرو

مسلم نیشنلزم

قرآن کریم نے دنیا کو جس قدر انقلابی نظریات عطا کئے ہیں ان میں ایک (اور نہایت اہم اور بنیادی) نظریہ یہ بھی ہے کہ قوم کی تشکیل آئیڈیالوجی (ایمان) کے اشتراک سے ہوتی ہے نہ کہ وطن، زبان، نسل، رنگ وغیرہ کے اشتراک سے۔ اس نے یہ نظریہ عطا کیا اور نبی اکرمؐ نے اس کے مطابق ایک نئی اُمت کی

تشکیل کر کے بتا دیا کہ یہ کس قدر ممکن العمل نظریہ ہے۔ اس نئی امت کے ساتھ ایک مملکت بھی وجود میں آئی جسکی وسعتیں آہستہ آہستہ حدود فراموش ہوتی چلی گئیں اور مختلف جغرافیائی حدود میں بسنے والے مسلمان اس کے دائرے کے اندر آتے چلے گئے۔ اس مملکت کا مرکز ایک ہی تھا۔ صرف انتظامی سہولتوں کی خاطر اسے مختلف ولایتوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اس تقسیم سے نہ مملکت کی مرکزیت پر کوئی اثر پڑ سکتا تھا نہ امت کی وحدت پر۔ ایک امت ایک مملکت۔ ایک مرکز۔ ایک قانون۔

آج ہماری حالت یہ ہے کہ دنیا کے مختلف حصوں میں بسنے والے مسلمانوں کی مملکتوں کا مجموعی رقبہ قرن اوّل کی مملکت کے رقبہ سے کہیں زیادہ ہے۔ اسی طرح ان کی آبادی بہ حیثیت مجموعی، ان کی آبادی سے کہیں بیش۔ لیکن مملکتیں مختلف حصوں میں بٹی ہوئی ہیں۔ اور ہر ایک کی مرکزیت الگ الگ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مسلمان ایک دین کا تصور رکھنے کے باوجود ایک قوم نہیں ہیں۔ ہر مملکت میں بسنے والے مسلمان اپنے آپ کو الگ قوم تصور کرتے ہیں۔ اور ان کے باہمی تعلقات اسی طرح باہمی معاہدات سے استوار ہوتے ہیں جس طرح غیر مسلم اقوام کے تعلقات ان کے باہمی معاہدات کی رُو سے قائم ہوتے اور ٹوٹتے ہیں یا جس طرح مسلمانوں کے تعلقات معاہدات کی رُو سے غیر مملکتوں کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں۔ اس اعتبار سے دیکھئے تو ان میں آئیڈیالوجی (ایمان یا دین) کے اشتراک کا زبانی دعویٰ ان کی عملی زندگی پر کہیں اثر انداز نہیں ہو رہا ۔۔۔۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مردہ آن ایمان کہ نابید در عمل۔ اس زبانی دعویٰ کا فائدہ کیا ہے جو عمل سے ظاہر نہ ہو۔

سوال یہ ہے کہ ان حالات میں مسلمانوں کے وحدت امت کے نظریہ کو ایک زندہ حقیقت بنانے کیلئے کیا کیا جائے! یعنی جہاں تک نصب العین کا تعلق ہے اس میں کوئی کلام ہی نہیں کہ اسلام کی رُو سے قوم کی تشکیل آئیڈیالوجی کی وحدت سے ہوتی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس نصب العین تک پہنچنے کے لئے کرنا کیا چاہیئے۔ ہمارے نزدیک اس کے لیے حسب ذیل پروگرام عمدہ نتائج کا حامل ہو سکتا ہے۔

۱ سردست مسلمانوں کی موجودہ مملکتوں کی الگ الگ حیثیتوں کو اعلیٰ حالہ رہنے دیا جائے اور ان کی اس حیثیت کو تسلیم کر لیا جائے۔

۲ ہر مملکت کے اندر اس نظریہ کو عام کیا جائے کہ قرآن کی رُو سے قومیت کی بنیاد آئیڈیالوجی کے اشتراک پر ہے۔ اس نظریہ کے مطابق اس مملکت کی حدود کے اندر بسنے والے مسلمان اپنے آپ کو غیر مسلموں سے الگ قوم تصور کریں اور اس کے اعلان سے کوئی جھجک اور ندامت محسوس نہ کریں۔

۳ جو مملکتیں اس نظریہ پر عمل پیرا ہو جائیں ان میں بین الملکتی تعلقات نئے خطوط پر استوار کیے جائیں۔ ان میں بنیادی تبدیلی یہ ہونی چاہیے کہ

الف ایک مملکت کا مسلمان باشندہ دوسری مملکت میں جائے تو اسے اگر ابتداءً اس مملکت کی شہریت کے کلی حقوق نہ بھی دیئے جا سکیں تو بھی اسے نقل و حرکت کی ایسی سہولتیں بہم پہنچائی جائیں کہ وہ اپنے آپ کو اس مملکت میں اجنبی محسوس نہ کرے۔ مثلاً پروانہ راہداری یا زرِ مبادلہ کی سہولتیں۔

ب ان میں اقتصادی معاہدات اس قسم کے ہوں کہ آہستہ آہستہ ان کی معاشی ناہمواریاں دور چلی جائیں اور ایک مملکت کی خوشحالی میں دوسری مملکت کے باشندے بھی شریک ہو سکیں۔ مثلاً اگر ایک مملکت میں سوءِ اتفاق سے قحط پڑ گیا ہے اور دوسرے مملکت کے پاس غلہ فاضلہ ہے تو اسے اس مملکت کے باشندوں کے لیے دے دیا جائے

ج سب سے بڑی بات یہ کہ ان مملکتوں کی خارجہ پالیسی ایسی ہو کہ ایک مملکت کے مسلمان کی تلوار دوسری مملکت کے مسلمان کے خلاف کسی صورت میں نہ اُٹھے۔

۴ رفتہ رفتہ ان مملکتوں میں باہمی وفاق کی شکل پیدا کی جائے۔ اس وفاق کی بنیاد وحدتِ قانون پر ہو۔ اس کا عملی طریقہ یہ ہونا چاہیئے کہ یہ مملکتیں قرآن کریم کو قانون کی بنیاد تسلیم کریں۔ اور جن امور میں قرآن نے صرف اصولی راہ نمائی دی ہے۔ ان کی جزئیات ہر مملکت کے مقامی یا مخصوص تقاضوں کو سامنے رکھ کر متعین کی جائیں۔

۵ اسی طرح ان مملکتوں کا نصابِ تعلیم اس طرح مرتب کیا جائے کہ قرآن کریم کی عطا کردہ مستقل اقدار ہر جگہ مشترک ہوں۔

اگر کوئی دو مسلمان مملکتیں بھی اس قسم کا اتحاد کر لیں تو یہ "وحدت" کی طرف ایک اہم قدم ہو گا۔ کچھ عجیب نہیں کہ اس کے بعد یہ کسی شکل میں مشترکہ مرکز پر بھی متفق ہو جائیں۔ بُعدِ مکانی اب ان امور میں قطعاً حائل نہیں ہو سکتا۔ اگر مغربی اور مشرقی پاکستان اس قدر بُعدِ مکانی کے باوجود ایک وحدت بن سکتے ہیں تو (مثلاً) پاکستان اور ایران یا پاکستان اور افغانستان میں ایسی صورت کیوں نہیں پیدا ہو سکتی! ان میں تو بُعدِ مکانی اس سے بھی کم ہے اس کیلئے اوّلین قدم یہ ہے کہ خود اس مملکت کے اندر وحدت پیدا ہو۔ یعنی اس میں نسلی، جغرافیائی، سیاسی حتیٰ کہ مذہبی گروہ بندیوں کو ختم کر کے وحدتِ امت پیدا کی جائے۔ اور یہ بات اسی صورت میں پیدا ہو سکے گی کہ ہم اپنے معاشرہ کی عمارت قرآن کریم کی بنیادوں پر استوار کریں یعنی پہلے آئیڈیالوجی کے اشتراک سے خود ایک

قوم بنیں اور اس کے بعد دوسروں کو وحدت کی دعوت دیں۔ ہمارے نزدیک "مسلم نیشنلزم" کا مفہوم یہی ہے۔ اور اسی سے آخر الامر ہم وحدت امت کے نصب العین تک پہنچ سکتے ہیں۔ اور یہی وحدت پھر عالمگیر انسانی برادری کی تشکیل کا ذریعہ بن سکے گی۔ جو اسلام کا مقصود ہے۔ ۱۹۶۴ء

نوجوانوں کے دل کی دھڑکن

اس خط کو ملاحظہ فرمائیے۔

محترمی ایڈیٹر صاحب طلوع اسلام کراچی۔ تسلیم! طلوع اسلام کافی عرصہ سے مطالعہ کر رہا ہوں۔ آپ کا طرز استدلال اور اجتہاد قابل داد ہے اور آپ کی روشن دماغی مسلّم۔ قرآن فہمی میں جو ملکہ آپ کو حاصل ہے۔ شائد ہی کسی کو ہو۔ مگر آپ کی یہ ذہانت اور استدلال اسلام کے راستہ کی مشکلات کو رفع نہیں کر سکتا۔ چونکہ جو واقعات صدیوں سے صفحہ تاریخ پر ثبت ہیں۔ طلوع اسلام کے مٹانے سے مٹ نہیں سکتے۔ اور اگر آپ آج پونے چودہ سو سال بعد ان واقعات کو توضیح توجیح کر ان کے گھناؤنے پن کو دور کرنا چاہیں تو میرا خیال ہے یہ ایک سعی لاحاصل ہو گی۔

اسلامی نظام ایک واہمہ ہے

آپ ہر بار اسلامی نظام کو پیش کر کے یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ اسلام سے بہتر نظام اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ مگر آپ کی طرح خوش عقیدہ اور لوگ نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اسلامی تاریخ کا ایک ایک ورق بار بار یہ دہرا رہا ہے کہ اسلامی نظام ایک واہمہ ہے۔ جس کی کوئی اصلیت نہیں۔ یہ اُمرا اور حکمران طبقہ کے ہاتھ میں ایک ایسا سحر ہے جس سے وہ جس وقت چاہیں عوام کو سُلا سکتے ہیں اور ان کی آنکھوں سے اس کا اثر زائل ہی ہونے نہیں دیتے۔ اس کے سوا اگر اور کوئی اسلامی نظام ہے۔ تو وہ ممکن ہے کہ آپ کے یا اور کسی کے ذہن میں موجود ہو تو ہو مگر آج تک نہ تو تاریخ نے اس نظام کی کبھی جھلک دیکھی۔ اور نہ آئندہ کبھی دیکھ سکے گی۔ کیونکہ دوسرے نظاموں کی طرح یہ مفروضہ نظام کچھ عرصہ زندہ رہ کر ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا اور خدا کی مشیّت بھی یہی ہے کہ کوئی نظام پائیدار نہ ہو۔ کیونکہ انسان ارتقاء کی منازل طے کر رہا ہے۔ اور اگر کوئی

مستقل نظام اس پر مسلط کر گیا۔ تو اس کا ارتقاء رک جائے گا۔ جو سراسر خلاف قانون قدرت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کوئی بھی نظام خواہ وہ انسان کا بنایا ہوا ہو یا اسے خدا کا بنایا ہوا کہا جائے۔ وہ روئے زمین پر کہیں بھی متواتر قائم نہیں رہ سکتا۔ اس میں تغیر و تبدل زمانہ کی ضروریات کے مطابق ہوتے رہتے ہیں۔

دورِ اول کی تاریخ

آپ کے مبینہ نظام اسلام نے کیا کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ اس وقت جبکہ حضورؐ علیہ الصلوٰۃ و السلام کو رحلت فرمائے ابھی زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا۔ حضورؐ کے صحابہ کرامؓ نے کیا کچھ کیا۔ خلیفہ اوّل کو کس نظام نے تلوار کی گھاٹ اتارا[1]۔ خلیفہ دوم حضرت عمرؓ کو کس نظام نے موت کے گھاٹ اتارا۔ حضرت عثمانؓ پر کیا بیتی۔ حضرت علیؓ کا کیا حشر ہوا۔ حضرت حسنؓ اور حسینؓ کس قربان گاہ پر بھینٹ چڑھے۔ ان کا کیا حشر ہوا۔ اور اس کے بعد آج تک کیا ہو رہا ہے۔ اسلامی تاریخ کا وہ کون سا صفحہ، صفحہ نہیں، سطر بلکہ وہ کون سا لفظ ہے جو بے گناہوں کے خون سے نہ لکھا گیا ہو۔ خیر اس پر آپ کہہ سکتے ہیں کہ اسلامی نظام صرف خلافت راشدہ تک ہی قائم رہا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا۔ اس سے اسلام بری الذمہ ہے۔ مگر کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ کو کیوں قتل کیا گیا اور ان کے قاتل کو کیوں سزا نہیں دی گئی اور حضرت عثمانؓ کے قتل کا قصاص لینے والے امیر معاویہ نے نیزوں پر قرآن لٹکا کر کیوں علیؓ کی توجہ کو لڑنے سے روک دیا۔ اور کہا کہ تمام جھگڑوں کا فیصلہ قرآن کو درمیان میں رکھ کر بذریعہ ثالثی کیا جائے۔ اور پھر ثالثی فیصلہ کا کیا حشر ہوا۔ کیا اس جنگ میں دونوں اطراف سے صحابہ عشرہ مبشرہ موجود نہ تھے۔ وہ صحابہ موجود نہ تھے جنہوں نے رسول پاکؐ کی صحبت سے فیض حاصل کیا تھا۔ کیا وہ اسلامی نظام سے واقف نہ تھے۔ پھر کیوں خونریزی ہوئی۔ اور وہ بھی اس وقت جبکہ حضور پاکؐ کو رحلت فرمائے زیادہ عرصہ نہ گزرا تھا۔ اور ان کے فیض سے براہ راست مستفیض ہونے والے صحابہؓ کرام اسلامی نظام کو ہم اور آپ سے بدرجہا بہتر سمجھتے تھے وہ دوبارہ اسلامی نظام کو کیوں نہ زندہ کر سکے۔ کیا خدائی نظام ایسا ہی ہے کہ دنیا کی تاریخ میں صرف چند سال اپنی جھلک دکھا کر ہمیشہ کے لیے غائب ہو جاتے۔ اور اس کے مقابلہ میں انسان کا بنایا ہوا نظام ہزارہا سال تک چلتا رہے۔ کیا اس سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ نعوذ باللہ اللہ میاں سے تو اس کے بندے ہی زیادہ سمجھدار ہیں کہ وہ ایسا نظام قائم کرتے ہیں جو اللہ میاں کے نظام کے مقابلہ میں زیادہ مقبول ہوتا ہے اور زیادہ عرصہ چلتا ہے۔

---

[1] : خلیفہ اوّل کو کسی نے تلوار کی گھاٹ نہیں اتارا تھا۔ طلوع اسلام

محترم مدیر صاحب یاران سبکسار تو محمل تک جا پہونچے ہیں اور آپ قوم کے دامن کو پکڑ کر آج سے تیرہ سو سال پہلے کے دور وحشت کی طرف گھسیٹ رہے ہیں ۔

اسلامی آئین کیا ہے | آپ کس نظام کو ہم پر مسلّط کرنا چاہتے ہیں ۔ آج تک اس کی کوئی باقاعدہ تشکیل ہوئی ۔ آئین اسلامی کی کوئی کتاب چھپی ۔ یا ویسے ہی آئین کا مجموعہ تیار کیا گیا ؟

جہاں تک میرا خیال ہے بلکہ یقین ہے کچھ بھی نہیں کیا گیا ۔ آپ سے پوچھا جائے اسلامی آئین کیا چیز ہے آپ قرآن کی ایک دو آیت پڑھ کر تفسیر کرنے لگیں گے ۔ کسی حنفی سے پوچھا جائے ۔ وہ بخاری ، مشکوٰۃ یا فقہ کی کتاب کا حوالہ دے گا ۔ شیعہ سے پوچھا جائے تو وہ مجتہدین کے اقوال کے حوالے دینے لگے گا ۔ اور باقی لوگوں سے پوچھنے پر بھی اسی قسم کا جواب ملیگا ۔ مگر آج تک نہ ہی کسی فرقہ کے علماء نے آئین کی کتاب مرتب کی ہے اور نہ ہی اجتماعی طور پر تمام فرقوں کے علماء نے کوئی آئین بنا کر پیش کیا ہے ۔ آئین کے مطابق جو استدلال کیا جاتا ہے کہ وہ کسی ایک شخص کی رائے تو ہو سکتا ہے ۔ مگر اسے قرآن حدیث یا فقہ کا منشاء نہیں کہا جا سکتا ۔

ان حالات میں کیا یہ بہتر نہیں کہ ہمارا آئین زمانہ کے مطابق ترقی یافتہ اصولوں پر وضع کیا جائے تاکہ ہم دنیا کی دیگر اقوام کے شانہ بشانہ مادی ترقی کر سکیں ۔ اور عالم اسلام پر جو ذلت اور نحوست چھائی ہوئی ہے اسے اس سے نجات دلا سکیں ۔ اور اگر خدانخواستہ کسی قسم کا کوئی مبینہ اسلامی نظام قائم کر دیا گیا تو اس کا حشر معلوم ۔ کیونکہ بنو امیہ اور بنو عباس کی صدیوں کی کشمکش کی تاریخ شاہد ہے ۔ اور یہاں بھی وہی تاریخ دہرائی جائے گی ۔ یہ مرزائی ہے اسے وزارت خارجہ سے الگ کر دو اور مرزائیوں کو اقلیتی فرقہ قرار دو ۔ یہ شیعہ ہے اسے وزارت یا سفارت سے نکال دو کیونکہ یہ کافر ہے صحابہؓ پر سب وشتم کرتا ہے ۔ یہ وہابی ہے یہ فقہ کو نہیں مانتا اسے بھی نکال دو ۔ اور یہ اہل قرآن ہے اسے بھی کراچی سے شہر بدر کر دو ۔ کیونکہ یہ محدثین کی سرقریہ جا سے جمع کی ہوئی احادیث کا منکر ہے ۔ اس لیے کافر ہے ۔ اور یہ آپ کون سا اسلامی نظام قائم کریں گے ۔ کیا آپ بقول شیعہ حضرات حق خلافت سادات کو تفویض فرمائیں گے ۔ اگر نہیں تو شیعہ حضرات آپ سے کیسے تعاون کریں گے ۔ کیا آپ خلیفہ ثانی مرزا محمود احمد کو خلیفہ اوّل پاکستان تسلیم کریں گے ۔ نہیں تو پھر مرزائی صاحبان کیوں ایسے نظام کو تسلیم کریں گے ۔ اسی طرح دوسرا کونسا فرقہ ہو گا جو اسلامی آئین کی تشکیل میں آپ کا ساتھ دے ۔

آپ میرا یہ طویل خط بھی کے لیے میں معافی چاہتا ہوں پڑھ کر مجھے گمراہ کر سکتے ہیں ۔ کافر کہہ سکتے ہیں کمیونسٹ یا اور جو کچھ آپ کے ذہن میں آئے کہہ سکتے ہیں ۔ مگر خدارا حقائق کو نظرانداز نہ کریں ۔ قوم کو تباہی اور بربادی کے غار میں نہ دھکیلیں ۔ بار بار اسلامی آئین کی رٹ نہ لگائیں ۔ یہ ایک واہمہ ہے ۔ خوش اعتقادی ہے ۔ ہٹ دھرمی اور ضد ہے ۔ جس کو حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں ۔ اگر اللہ تعالیٰ نے کوئی آئین بنا کر بھیجا ہوتا تو یقیناً وہ اس کے نفاذ کے لیے حالات پیدا کر دیتا ۔ اور اپنے ہمہ گیر آئین سے کبھی بھی اپنے بندوں کو محروم نہ کرتا ۔ اس کا آئین یہی ہے جو چل رہا ہے ۔ اور زمانے کے ساتھ چلتا رہے گا ۔ اس میں حالات کے مطابق ترامیم اور تنسیخ ہوں گی ۔ ایک آئین کو ختم کر کے دوسرا بہتر آئین نافذ بھی کیا جاتے گا ۔ یہی مشیت ربی اور سنت اللہ ہے ۔ جو ازل سے ابد تک چلی جانے گی ۔

یہ عریضہ بے ربط سہی ۔ مگر میں صرف اتنی استدعا کرتا ہوں کہ آپ صحابہ عشرہ مبشرہ نہیں بن سکتے ۔ ابوبکرؓ، عمرؓ عثمانؓ اور علیؓ نہیں بن سکتے ۔ اگر یہ بھی نہیں بن سکتے تو اسلامی آئین کیسے نافذ کریں گے ۔ جس نظام کو پہلے دو خلفاء نے مضبوط کیا وہ عثمانؓ اور علیؓ کے دور خلافت میں کیوں رُو بہ انحطاط ہو گیا ۔ آپ اس بارے میں غور فرمائیں کیا یہی مشیت الٰہی نہیں تھی کہ وہ نظام ختم ہو کر ایک اور نظام جنم لے ۔ اور پھر ایک اور ، اور ، اور یہ سلسلہ چلتا رہے ۔

میں پھر اس طویل خط کے لیے معافی چاہتا ہوں اور آپ اسے مطالعہ کر کے جو بھی سخت سے سخت الفاظ میرے لیے استعمال کریں گے انہیں میں خندہ پیشانی سے قبول کروں گا کیونکہ مجھے معلوم ہے کہ میں نے آپ کے جذبات کو بہت بڑی ٹھیس پہنچادی ہے ۔ اور اگر اس ٹھیس سے کوئی آواز پیدا ہو تو مجھے یہ برداشت کرنا پڑے گی ۔

اچھا ۔ زیادہ آداب

طلوعِ اسلام

اس خط کو ہم نے اس لیے شائع کیا ہے کہ یہ صرف مراسلہ نگار کے ذاتی خیالات کا آئینہ دار نہیں بلکہ ترجمانی کر رہا ہے ۔ ہماری موجودہ نسل کے نوجوانوں کے عام خیالات کی جو اسلام کے متعلق ان کے دل میں پیدا ہو کر ذہنی انتشار کا باعث اور انہیں اسلام سے متنفر کرنے کا ذریعہ بنتے ہیں ۔ ہمارے پاس اس قسم کے خطوط عام طور پر آتے رہتے ہیں ۔ ان کے علاوہ اکثر نوجوانوں کی طرف سے زبانی گفتگو میں بھی اسی قسم کے اعتراضات پیش کئے جاتے ہیں ۔ بنابریں اسے زیادہ مناسب سمجھا گیا کہ اس کا جواب انفرادی نہیں بلکہ عمومی حیثیت سے بذریعہ طلوعِ اسلام دیا جائے ۔ اس خط میں بہت سی تلخیاں اور بہت

کچھ غلطیاں بھی ہیں ۔ لیکن ہم ان جزئیات سے صرف نظر کر کے صرف اصولی جواب پر اکتفا کریں گے۔

مراسلہ نگار نے جو کچھ لکھا ہے اس کا ماحصل یہ ہے کہ اسلامی نظام چند دنوں کے لیے قائم ہوا اور اس کے بعد ختم ہو گیا۔ اگر یہ نظام مبنی بہ صداقت تھا اور اس میں آگے بڑھنے کی صلاحیت تھی تو ہمیشہ کے کیوں قائم نہ رہا۔ چونکہ یہ نظام نہ تو آگے بڑھ سکا اور نہ ہی آج کہیں قائم ہے۔ اس لئے اس نظام کے احیاء اور از سرنو قیام کی دعوت اور کوشش ایک مقدس آرزو ہے۔ اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ ہمیں اس خوش عقیدگی سے دامن چھڑا کر اسی قسم کا نظام قائم کر لینا چاہیے جس قسم کے نظام دنیا کی اور قوموں میں قائم ہیں۔

اسلامی نظام آگے کیوں نہ چلا

معترض کے نزدیک کسی اصول یا نظام کے سچا ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس پر تمام انسان یا کم از کم انسانوں کا کوئی گروہ ہمیشہ کاربند رہے اور اسی طرح وہ اصول یا نظام مسلسل آگے بڑھتا چلا جائے۔ یہ دلیل بڑی کمزور اور ایک بنیادی غلط فہمی پر مبنی ہے۔ مثال کے طور پر اسے یوں سمجھنا چاہیے کہ جب سے انسانی شعور پیدا ہوا ہے یہ حقیقت بطور مسلمہ تسلیم کی گئی ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا بُرا ہے۔ دنیا میں کوئی ایسا نہیں جو اس اصول سے انکار کرتا ہو اور انسانی تاریخ میں کوئی دور ایسا نہیں آیا جب اس اصول سے انکار کیا گیا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ یہ بھی ایک حقیقت ہے جس سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ تمام انسانی تاریخ میں (سوائے جستہ جستہ لمحات کے) کوئی بھی دور ایسا نہیں آیا جس میں انسانوں نے کوئی ایسا نظام قائم کیا ہو جو خالص سچائی پر مبنی ہو۔ آپ گزشتہ تاریخ کو چھوڑیئے، خود لیجئے زمانے پر نگاہ ڈالیے ہر شخص یہ کہتا ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے اور جھوٹ بولنا بُرا ہے۔ لیکن (تقریب قریب) ہر شخص جھوٹ بولتا ہے۔ اگر مندرجہ بالا دلیل کو صحیح مانا جائے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ چونکہ انسانوں نے ہمیشہ سچ نہیں بولا۔ اور آج بھی کوئی نظام ایسا نہیں جو سچائی پر مبنی ہو۔ اس لئے یہ اصول ہی غلط ہے کہ سچ بولنا اچھا ہے۔ اور جھوٹ بولنا بُرا چونکہ تمام انسان جھوٹ بولتے ہیں۔ اسلئے صحیح راہ عمل یہی ہے کہ جھوٹ کو محکم اصول تسلیم کر کے اسی کے مطابق زندگی کا نظام بنا لیا جائے۔ خدا نے بھی یہ کہہ کر کہ جھوٹ بُری چیز ہے ایک تجربہ کیا تھا جو (معاذ اللہ) ناکام ثابت ہوا۔ اس کے مقابل میں انسانوں کا نظام جو جھوٹ پر مبنی ہے اچھا بھلا چلتا رہا ہے۔ اس لیے یہی راہ ثواب کی ہے۔

اسے بھی چھوڑیئے، روزمرہ کی زندگی پر نگاہ ڈالیئے۔ ہر ذیابیطس کا مریض اچھی طرح جانتا ہے کہ میٹھا کھانا اس کے لیے موجب ہلاکت ہے۔ لیکن اس کے باوجود آپ دیکھیں گے (کہ چند مستثنیات کے علاوہ)

ہر مریض میٹھا کھالیتا ہے اور پھر چیختا چلاتا ڈاکٹر کے پاس پہنچتا ہے۔ ڈاکٹر دوائی دیتا ہے اور میٹھے سے سخت پرہیز بتاتا ہے۔ مریض تین چار دن تک اس پر عمل کرتا ہے۔ اور پھر میٹھا کھانا شروع کر دیتا ہے۔ آپ کی مندرجہ بالا دلیل کی رو سے یہ ماننا پڑے گا کہ چونکہ عام مریض پرہیز شکن واقع ہوئے ہیں اور ڈاکٹروں کے منع کرنے کے باوجود میٹھے سے باز نہیں آتے اس لیے یہ اصول ہی غلط ہے کہ میٹھا ذیابیطس کے مریضوں کیلئے مہلک ہے۔ صحیح اصول یہ ہے کہ ذیابیطس کے مریض خوب میٹھا کھائیں۔

اسلام اور مسلمانوں میں فرق

اب آیئے اس شبہ کی طرف جو اسلام کے متعلق عام طور پر ذہنوں میں پیدا ہو رہا ہے۔ اور جس کا اظہار اوپر کے خط میں کیا گیا ہے۔ اس شبہ کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم عام طور پر اسلام اور مسلمانوں کو ایک فرض کر لیتے ہیں۔ ہم نے تاریخ میں دیکھا کہ آج سے چودہ سو برس پہلے ایک خاص خطۂ زمین کے انسانوں نے زندگی کے کچھ اصولوں کو اپنایا اور اس سے نہایت شاندار نتائج برآمد ہوگئے۔ اس کے بعد ہم تاریخ میں دیکھتے ہیں کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ قوم قعر مذلت میں گر گئی۔ اور اس میں وہی خرابیاں پیدا ہوگئیں جو دنیا کی دوسری قوموں میں پیدا ہوتی ہیں۔ ہم اس سے فوراً اس نتیجہ پر پہونچے کہ وہ اصول اس قسم کے تھے کہ ان سے ہنگامی طور پر اچھے نتائج پیدا ہو سکتے تھے۔ لیکن ان میں یہ صلاحیت نہ تھی کہ وہ مستقل طور پر ان نتائج کو برآمد کرتے رہتے۔ حالانکہ جو کچھ ہوا وہ صرف یہ تھا کہ ایک قوم نے ان اصولوں کو ضابطہ زندگی بنایا اور زندگی کی کامیابیاں حاصل کرلیں۔ کچھ وقت کے بعد اس قوم نے ان اصولوں کو چھوڑ دیا اور ان نتائج سے محروم ہوگئی۔ جو ان اصولوں پر کاربند ہونے کی وجہ سے پیدا ہوئے تھے۔ فرمایئے کہ اس میں ان اصولوں کا کوئی قصور ہے؟ آپ کہتے یہ ہیں کہ چونکہ اس قوم نے ان اصولوں کو ہمیشہ کے لیے اپنے ساتھ نہ رکھا۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اصول اس قابل تھے ہی نہیں کہ وہ زمانے کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دے سکتے۔ لیکن یہ مفروضہ بالبداہت غلط ہے۔ آیئے، ہم دیکھیں کہ وہ اصول زمانہ کے بڑھتے ہوئے تقاضوں کا ساتھ دیتے ہوئے آگے چل رہے ہیں یا نہیں دنیا پیچھے چھوڑ کر آگے بڑھ آئی ہے۔ تاریخ ہمیں یہ بتاتی ہے کہ اس خاص قوم نے تو ان اصولوں کو چھوڑ دیا۔ لیکن انسانیت بحیثیت مجموعی غیر شعوری طور پر انہی اصولوں کی طرف بڑھے چلی جا رہی ہے اس کا ثبوت ذیل کی تصریحات سے ملیگا۔

کیا اسلام آگے بڑھ رہا ہے یا نہیں

(۱) نزول قرآن کے وقت یعنی چھٹی ساتویں صدی عیسوی میں بادشاہت (MONARCHY) ایک ایسا

مسلمہ نظامِ حکومت تھا۔ جس کے غلط ہونے کا تصور تک بھی ذہن میں نہیں آسکتا تھا۔ بادشاہ کو "ایشور کا اوتار" اور خود خداوند سمجھا جاتا تھا۔ ہر گردن اس کے حقوقِ خداوندی (DIVINE RIGHTS) کے سامنے جھکی ہوئی تھی۔ قرآن نے یہ انقلاب انگیز آواز بلند کی کہ ملوکیت وجہ فسادِ آدمیت ہے۔ کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر حکومت کرے۔ نہ ہی کوئی انسان پیدائشی طور پر یہ حق لے کر دنیا میں آتا ہے کہ اسے دوسرے انسانوں سے بڑا سمجھا جائے۔ بڑائی کا معیار جوہرِ ذاتی ہے نہ کہ نسبتی انتساب۔ انسانوں کے باہمی معاملات عدل اور انصاف کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے پانے چاہئیں۔ ایک قوم نے اس اصول کو اختیار کیا۔ اور اس کے انسانیت ساز نتائج سے بہرہ یاب ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے اس اصول کو چھوڑ دیا۔ لیکن ذرا دیکھئے کہ ان تیرہ سو سال میں عام انسانیت کا قدم اس اصول کی طرف اٹھتا گیا ہے۔ جو قرآن نے پیش کیا تھا یا اس اصول کی طرف جسے نزولِ قرآن سے پیشتر ایک مسلّمہ کی حیثیت سے عام اصول مانا جاتا تھا۔

ملوکیت

دنیا کی تاریخ شاہد ہے کہ انسانیت غیر شعوری طور پر اسی راستہ پر بڑھتی چلی آرہی ہے۔ جسے قرآن نے تجویز کیا تھا اور اس راستہ کو چھوڑ چکی ہے (یا چھوڑتی چلی جارہی ہے) جسے انسانوں نے اس سے پہلے اپنے ذہن سے وضع کیا تھا۔ دنیا سے کئی بادشاہتوں کے نام مٹ چکے ہیں اور شاہوں کے تاج آئے دن فضا میں اڑتے دکھائی دیتے ہیں۔ جو سمجھدار ہیں وہ خود اس اصول کو اختیار کئے جارہے ہیں۔ جو از خود نہیں چھوڑتے ان سے زمانے کے تقاضے مار مار کر تخت و تاج چھین رہے ہیں۔ آج دنیا میں شاید ہی کوئی انسان ایسا موجود ہو جو یہ کہے کہ ملوکیت صحیح نظامِ حکومت ہے۔

ہم اپنے بھائی سے پوچھتے ہیں کہ کیا دنیا قرآن کے تجویز کردہ نظام کو قبول کر رہی ہے یا اس نظام کو جو اس سے پہلے انسانوں نے خود وضع کیا تھا۔ اور یہ بھی پوچھتے ہیں کہ کیا قرآن کا دیا ہوا اصول صرف چند دنوں کیلئے چلا تھا یا تیرہ سو سال سے برابر آگے بڑھتا چلا آرہا ہے۔

پیشوائیت

(۲) نزولِ قرآن کے وقت ایک مسلّمہ اصول یہ تھا کہ کچھ انسان ایسے ہوتے ہیں جو خدا اور بندے کے درمیان واسطہ بنتے ہیں۔ انہیں مذہبی پیشوا یا (PRIESTS) کہا جاتا تھا۔ قرآن نے یہ زلزلہ انگیز آواز بلند کی کہ خدا اور بندے کا تعلق (اس کے ہمہ گیر قانون کی رُو سے) براہِ راست ہے اور پیشوائیت مفاد پرست انسانوں کا خود ساختہ تصور ہے۔ ایک قوم نے اس اصول کو اپنایا اور ان کے

قلوب وا ذہان ان زنجیروں سے آزاد ہو گئے جو پیشوائیت کی عقیدتمندیاں وضع کئے چلی آرہی تھیں۔ اس کے بعد انہوں نے اس اصول کو چھوڑ دیا اور پیشوائیت کی لعنت پھر سے ان کے دل ودماغ پر مسلط ہو گئی لیکن آپ دیکھئے کہ آج انسانیت کا رُخ اس تصور کو مٹانے کی طرف ہے یا اسے مستحکم کرنے کی طرف آپ دیکھیں گے کہ آج انسان پیشوائیت سے بیزار ہو چکا ہے اور اس سے نجات حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن کوشش کر رہا ہے۔

مدار قومیت

(۳) نزول قرآن سے پہلے دنیا کے انسان قبیلوں اور قوموں میں بٹے ہوئے تھے اور نسلی وجغرافیائی امتیازات انسان اور انسان کے درمیان حد فاصل بن رہے تھے قرآن نے آکر ان تمام خود ساختہ حدود بندیوں کو مٹایا۔ اور انسانوں کو اس اصل عظیم سے روشناس کرایا کہ تمام انسانوں کی پیدائش نفس واحدہ (جرثومۂ زندگی) سے ہوئی ہے۔ اس لیے تمام انسان بلا تمیز نسب و وطن ایک عالمگیر برادری کے افراد ہیں۔ ایک خطۂ زمین میں اس اصول کو اپنایا گیا اور دنیا نے دیکھا کہ کس طرح مختلف نسلوں اور مختلف وطنوں کے انسان ایک امت بن گئے کچھ عرصہ بعد یہ اصول فراموش کر دیا گیا اور وہ قوم پھر خود ساختہ گروہ بندیوں میں بٹ گئی۔ لیکن آپ سوچئے کہ آج انسانیت کا قدم ان گروہ بندیوں اور حدود سازیوں کو مستحکم کرنے کی طرف ہے یا ان کو مٹا کر ایک عالمگیر نظام قائم کرنے کی طرف۔ آپ دیکھیں گے کہ آج ہر اہل فکر اسی کوشش میں ہے کہ ان امتیازات کو مٹا کر تمام انسانوں کو ایک برادری میں منسلک کر لینے کا نظام قائم کیا جائے کہیئے کہ انسانیت اسلام کے بتائے ہوئے اصول کو اپنا رہی ہے یا اس کو جسے انسانوں نے خود وضع کیا تھا۔

سرمایہ داری

(۴) نزول قرآن سے پہلے سرمایہ داری اور مفاد پرستی ہر انسان کا پیدائشی حق سمجھا جاتا تھا۔ صاحب اقتدار گروہ رزق کے سرچشموں پر قبضہ کر لیتا تھا۔ اور اس طرح زیر دست انسانوں کا خون چوستا تھا۔ قرآن نے یہ انقلاب آفریں اصول پیش کیا کہ رزق کے سرچشمے افراد کی ملکیت میں نہیں دیے جا سکتے۔ انسانوں کے اجتماعی نظام کی بنیادی ذمہ داری ہے کہ وہ تمام انسانوں کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرے۔ جو نظام اس ذمہ داری کو پورا نہیں کرتا، اسے باقی رہنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ ایک جماعت نے اس اصول کو اپنایا اور وہ زمین و آسمان کی برکتوں سے مالا مال ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے اسے چھوڑ دیا اور پھر سرمایہ داری اور مفاد پرستی کے جذام میں مبتلا ہو گئی۔ لیکن یہ دیکھئے کہ اس تیرہ سو برس میں، عام انسانیت کا رخ سرمایہ داری اور مفاد پرستی کی طرف بڑھ رہا ہے یا اسے انسانیت کے لیے لعنت قرار دیا جا رہا ہے۔

آج حالت[1] یہ ہے کہ خود پاکستان میں زمین پر افراد کی ملکیت کو قانوناً تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی زمینداروں کے گھروں سے ان کی زمینوں کی پیداوار کو ڈھونڈ ڈھونڈ کر برآمد کیا جاتا ہے اور اسے نظام اجتماعی کی تحویل میں دیا جاتا ہے تاکہ وہ ضرورتمندوں کی ضرورت کو پورا کرے۔ جو زمیندار اپنے غلہ کی مقدار سے حکومت کو مطلع نہیں کرتا، یا غلہ کی برآمدگی میں رکاوٹ ڈالتا ہے اسے گرفتار کیا جاتا ہے۔ اور سزا کا مستوجب قرار دیا جاتا ہے۔ اس قسم کے زمیندار ہر شخص کی نگاہ میں سوسائٹی کے بدترین مجرم تصور کئے جاتے ہیں۔ یعنی ایک طرف زمین پر ان کا حق ملکیت بھی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اور دوسری طرف انہیں اس کی قطعاً اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ زمین کی پیداوار کو اپنی تحویل میں رکھ سکیں۔ حتیٰ کہ اب یہ بھی تجویز ہے کہ اس قسم کا قانون بنا دیا جائے کہ زمینداروں کو اس کی اجازت نہ ہو کہ اپنی زمینوں میں جو کچھ جی میں آئے کاشت کریں۔ انہیں مجبور کیا جائے کہ وہ اپنی زمین وہ کاشت کریں جس کی اہل ملک کو ضرورت ہو۔ آپ نے دیکھا کہ زمانے کے تقاضے کس طرح مار مار کر انسانی نظام کو قرآنی اصولوں کی طرف لا رہے ہیں۔ کہیئے، انسان خدا کے دیئے ہوئے اصولوں کو اختیار کر رہا ہے یا اپنے خود ساختہ نظام کو۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی مثالیں دی جا سکتی ہیں۔ لیکن ہم اس کی ضرورت نہیں سمجھتے۔ پیش نظر مقصد کے لیے اتنی ہی مثالیں کافی ہیں۔ ان سے ظاہر ہے کہ قرآنی اصول اپنی اندرونی قوت سے از خود انسانی معاشرہ کی بنیادیں بنتے چلے جا رہے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ ان اصولوں کے اس طرح نافذ العمل ہونے کی رفتار بہت سست ہے۔ کیونکہ انسان انہیں مختلف تجربوں کے بعد اختیار کرتا ہے جس میں بہت زیادہ وقت بھی صرف ہوتا ہے۔ اور فساد انگیزیوں اور خونریزیوں سے اس کی بہت سی قوتیں بھی ضائع ہو جاتی ہیں۔ اگر انسان وحی پر ایمان لا کر بلا تجربہ ان اصولوں کو اختیار کر لے تو ان کے نتائج کی رفتار بہت تیز ہو جاتی ہے۔ اور اس میں زیادہ قوت بھی صرف نہیں ہوتی۔

اب مراسلہ نگار کے خط کا وہ حصہ سامنے آتا ہے جس کا تعلق تاریخ سے ہے نہ کہ اسلامی نظام کے اصولوں سے ہم یہ دیکھ چکے ہیں کہ قرآن کے اصولوں میں یہ قوت موجود تھی کہ وہ ایک دفعہ قائم ہونے کے بعد

[1] یہ خط ۱۹۵۳ء سے بھی پہلے لکھا گیا تھا۔ اس زمانے میں پاکستان میں یہی حالات تھے۔ اس کے بعد یہاں اصلاح اراضی کا قانون نافذ ہوا جس کی رو سے کسی زمیندار کے پاس پانچ سو ایکڑ سے زیادہ زمین نہ رہنے دی گئی۔ (کاغذوں میں)۔

مسلسل آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں۔ یعنی یہ اصول جب انسانی ہاتھوں سے قائم ہوتے تھے۔ تو انسانی ہاتھوں سے ہی آگے بڑھ سکتے ہیں۔ اگر انسانی ہاتھوں نے انہیں آگے نہ بڑھایا۔ بلکہ انہیں چھوڑ دیا تو یہ انسانی ہاتھوں کا نقص ہے نہ کہ قرآنی اصولوں کا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ میں کیا گزری۔ بنو امیہ اور سادات میں کیا آویزش

ہمارے اسلاف

ہوئی۔ دمشق اور بغداد کے مناقشات نے کیا شکل اختیار کی۔ مسلمانوں کی جماعتیں کس طرح ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما ہوئیں۔ یہ باتیں ایک قوم کی تاریخ سے متعلق ہیں۔ اس کے متعلق قرآن کا صرف ایک فیصلہ ہے اور وہ یہ کہ

تلك امة قد خلت لها ما كسبت ولكم

ما كسبتم ولا تسئلون عما كانوا يعملون (۲/۱۳۴)

یہ ایک قوم تھی جو گزر چکی۔ جو کچھ انہوں نے کیا ان کے نتائج ان کے لیے تھے۔ اور جو کچھ تم کرو گے اس کے نتائج تمہارے لیے ہیں۔ تم سے قطعاً یہ نہیں پوچھا جائیگا کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔

اس لیے آج ہمارے لئے اس بحث میں الجھنا بے کار ہے کہ انہوں نے کیا کیا تھا۔ کیوں ایسا کیا۔ طلوع اسلام سے کبھی یہ "سعی لاحاصل" سرزد نہیں ہوئی کہ آج پونے چودہ سو سال کے بعد ان واقعات کو نوچ نوچ کر ان کے گھناؤنے پن کو دور کرے۔ وہ اتنا ضرور کہتا ہے کہ جو چیز فی الحقیقت گھناؤنی نہ تھی لیکن جسے بعد کی سازشوں نے خواہ مخواہ گھناؤنا بنا کر پیش کیا ہے۔ اس کے گھناؤنے پردے چاک کر کے اس کی اصلی صورت میں پیش کر دیا جائے۔ ولو کرہ المشرکون

اب رہا یہ سوال کہ ہماری یہ کوشش ایک واہمہ سے زیادہ حیثیت نہیں رکھتی کہ قرآنی نظام پھر سے قائم ہو جائے۔ کیونکہ ہم اصحاب عشرہ مبشرہ نہیں بن سکتے۔ سو عرض یہ ہے کہ قرآنی نظام کسی خاص عشرہ مبشرہ

قرآنی نظام اور اشخاص

کا محتاج نہیں ہے۔ ہر زمانہ میں قائم کیا جا سکتا ہے۔ اور جن انسانوں کے ہاتھوں سے اس کا قیام عمل میں آئے گا۔ وہی مبشرین بن جائیں گے آپ یہ فرماتے ہیں کہ کہ جب یہ نظام حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کے زمانے میں قائم نہ رہا تو ہم اسے کس طرح قائم کر سکتے ہیں۔ لیکن ہم یہ عرض کرتے ہیں کہ جب وہ نظام حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں انسانوں کے ہاتھوں سے قائم ہو گیا تھا تو وہ ہی نظام آج قائم ہو سکتا ہے۔ عمرؓ کو عمرؓ اسی نظام کی برکتوں نے بنا دیا تھا نہ کہ عمرؓ نے اس نظام میں وہ برکتیں پیدا کر دی تھیں۔ وہ نظام اپنی تمام ممکنات کو لیے ہوئے آج بھی

اسی طرح موجود ہے۔ جو انسان چاہیں اس سے اسی قسم کی برکات حاصل کر کے وہی کچھ بن سکتے ہیں۔ جو کچھ اس نے اس سے پہلے بنایا تھا۔ قرآن کو محفوظ رکھنے کے معنی ہی یہی ہیں کہ یہ نظام ہر دور کے انسانوں کے ہاتھوں نافذ العمل ہو سکتا ہے۔ یہ وہ حقیقت تھی جس کی طرف حضرت ابوبکرؓ نے عام مسلمانوں کی توجہ اس وقت مبذول کرائی تھی جب رسول اللہ صلعم کی وفات سے ان کے ذہنوں میں اس خدشہ کے پیدا ہونے کا امکان نظر آتا تھا، کہ اب یہ نظام آگے نہیں چل سکے گا۔ عین اس وقت حضرت ابوبکرؓ نے ان سے کہا تھا کہ یہ نظام کسی خاص شخصیت کے سہارے سے وابستہ نہیں۔ یہ زندہ خدا کا دیا ہوا زندہ نظام ہے جو ان تمام انسانوں کے ہاتھوں سے قائم رہ سکتا ہے۔ جو اسے قائم رکھنا چاہیں۔ اور اس پر انہوں نے قرآن کی یہ آیت پیش کی تھی کہ

وما محمد الا رسول قد خلت من قبله الرسل

افان مات او قتل انقلبتم علی اعقابکم

محمد ایک رسول تھے۔ جن سے پہلے اور بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں۔ تو کیا اگر وہ مر گئے یا قتل ہو گئے تو تم پچھلے پاؤں لوٹ جاؤ گے؟

آپ لکھتے ہیں کہ اس نظام کو ختم کرنے سے اللہ کا منشا یہ تھا کہ ایک آئین کو ختم کر کے دوسرا بہتر آئین نافذ کر دیا جائے گا۔ سو اول تو یہ دیکھئے کہ آپ خود اس کا رونا رو رہے ہیں کہ اسلام کا بہترین نظام ختم ہوا تو اس کے بعد اس قوم نے وہ نظام اختیار کر لیا جو تمام برائیوں کا منبع تھا۔ اور اس کے ساتھ ہی آپ یہ بھی کہہ رہے ہیں کہ خدا کی مشیت یہ تھی کہ اس نظام کو ختم کر کے اس سے بہتر نظام قائم کر دیا جائے گا۔ ان دونوں چیزوں میں جو تضاد ہے وہ واضح ہے۔ اصل یہ ہے کہ آپ بھی اس مغالطہ میں مبتلا ہیں کہ اسلامی نظام ایک جامد (RIGID) نظام ہے جو انسانی ارتقاء کے ساتھ ساتھ نہیں چل سکتا۔ اس لیے ضرورت ہے کہ ایک نظام کو ختم کر کے اس کی جگہ دوسرا نظام دیا جائے۔ اور یہ سلسلہ آگے چلتا رہے۔ ذرا یہ سمجھ لیجیے کہ اسلامی نظام کہتے کسے ہیں۔ یہ تو آپ کو بھی تسلیم ہوگا کہ بعض اصول ایسے ہیں جو ابدی طور پر قائم رہتے ہیں۔ مثلاً

اسلامی نظام کیا ہے؟

عدل کا اصول، دیانتداری کا اصول۔ آپ یقیناً اس سے متفق ہوں گے کہ یہ ایسے اصول نہیں ہیں کہ ایک نظام ان کے مطابق قائم کیا جائے اور کچھ عرصہ بعد اس نظام کو چھوڑ کر ایک دوسرا نظام قائم کیا جائے۔ جو ظلم اور بددیانتی کے اصولوں پر استوار ہو۔ زمانہ کتنا ہی آگے بڑھتا چلا جائے عدل اور دیانت کے اصول اپنی جگہ قائم رہیں گے۔ اسی قسم کے اصولوں کو مستقل اقدار (PERMANENT VALUES) کہا جاتا ہے۔ قرآن کریم نے اسی قسم کے کچھ اصول دیئے ہیں۔

یہ غیر متبدل ہیں۔ اس کے بعد اس نے کہا ہے کہ ہر زمانے کے انسان اپنے اپنے زمانے کے تقاضوں کیمطابق ان غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت اور عقل و فکر کی رو سے اپنا نظام آپ وضع کریں ظاہر ہے کہ وہ غیر متبدل اصول جن کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے۔ ہمیشہ قائم رہیں گے۔ اور ان کی روشنی میں وضع کردہ نظام انسانیت کے ارتقاء کے ساتھ ساتھ بدلتا جائے گا۔ اب آپ فرمایئے کہ اس قسم کے نظام میں آپ کو کون سی چیز قابل اعتراض نظر آتی ہے اور اسے آپ کس طرح ناقابل عمل تصوّر کرتے ہیں کہ جو صرف ایک مرتبہ قائم ہوسکا اور اس کے بعد دوبارہ قائم نہیں ہوسکتا۔ اصل یہ ہے کہ جب آپ اسلامی نظام کا ذکر کرتے ہیں تو آپ کے ذہن میں ملّا کا پیش کردہ نظام شریعت ہوتا ہے۔ جو قرآنی نظام کی نقیض ہے۔ یہ تمام اعتراضات جو آپ نے اسلامی نظام پر وارد کئے ہیں۔ ملّا کے نظام شریعت پر وارد ہوتے ہیں۔ جس کی تمام جزئیات ناقابل تغیر و تبدّل قرار دی جاتی ہیں۔ آپ اس قرآنی نظام کو سامنے رکھیئے۔ جس کی طرف اوپر اشارہ کیا گیا ہے اور پھر فرمایئے کہ آپ کے اعتراضات میں سے کون سا اعتراض باقی رہ جاتا ہے۔ آپ کہتے ہیں کہ اسلامی نظام شیعہ سُنی، وہابی، مرزائی، چکڑالوی میں سے کس کے مطابق ہوگا۔ اور باقی فرقوں کو کیا جائے گا۔ آپ کو غالباً علم نہیں کہ شیعہ سُنی وغیرہ کے اختلافات ملّا کی شریعت کے پیدا کردہ ہیں۔ قرآن میں جاکر کوئی اختلاف باقی نہیں رہتا۔ یہ صرف ہماری خوش عقیدگی ہی نہیں بلکہ حقیقت نفس الامری ہے۔ جسے ہم ہر وقت ثابت کر سکتے ہیں۔ قرآن پر مسلمانوں کے ہر فرقہ کا ایمان ہے۔

اس لیے ہر مسلمان کے لیے قدر مشترک (COMMON FACTOR) بن سکتا ہے۔ قرآن کے اصولوں میں بھی کسی کو اختلاف نہیں۔ لہٰذا اس حد تک بھی تمام مسلمان ایک نقطہ پر جمع ہو سکتے ہیں۔ اب رہیں وہ جزئیات جو قرآنی اصولوں کی روشنی میں طے ہوں گی۔ تو اس کے لیے ہم اوپر لکھ چکے ہیں کہ وہ تمام مسلمانوں کے باہمی مشورہ سے عقل و فکر کی رُو سے طے ہوں گی۔ لہٰذا جو چیز ہماری باہمی مشاورت سے طے پا جائے اس میں اختلافات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔

اب صرف یہی سوال باقی رہ جاتا ہے کہ مسلمانوں کو اس بنیادی نقطۂ نظر پر کسطرح لایا جائے کہ ان کا نظام قرآن کے اصولوں کی روشنی میں باہمی مشاورت سے طے پائے گا۔ یہی وہ چیز ہے جس کے لیے طلوعِ اسلام کوشش کر رہا ہے۔ جو احباب اس مسلک کو صحیح سمجھتے ہیں ان کے لیے کرنے کا کام یہ ہے کہ وہ طلوعِ اسلام کی اس کوشش میں اس ہاتھ بٹائیں۔

آخر میں ہم اپنے بھائی سے اتنا اور کہنا چاہتے ہیں کہ آپ نے اپنے خط میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس

نوجوان طبقے کی مشکلات

کی وجہ سے ہم آپ کے خلاف کوئی سخت الفاظ استعمال نہیں کرنا چاہتے اس لیے کہ ان خیالات کے آپ خود ذمہ دار نہیں۔ ان کا ذمہ دار ہے اسلامی نظام کا وہ تصور جو ملّا نے پیش کر رکھا ہے۔ اور جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ نوجوانوں کے دلوں میں اسلام کے خلاف اس قسم کے خیالات پیدا ہوں۔ نوجوان بیچارے معذور ہیں ایک طرف انہیں کالجوں میں ہیگل کا فلسفہ اور آئین سٹائن کے نظریات پڑھائے جاتے ہیں اور دوسری طرف ان کے سامنے مذہب کا وہ تصور پیش کیا جاتا ہے۔ جس سے عقل ابا کرے اور علم شرمائے۔ اگر اس کے بعد ان کے دل میں مذہب کیطرف سے نفرت اور اس کے تصورات کی طرف سے سرکشی کے جذبات پیدا نہ ہوں تو اور کیا ہو گا۔ اس لیے ہمارا نوجوان طبقہ قابل نفرت نہیں مستحق ہمدردی ہے۔ اور اسی ہمدردی کا تقاضا ہے کہ ہم ان سے درخواست کیا کرتے ہیں کہ وہ مُلّا کے پیش کردہ مذہب کے بجائے قرآن کے دیئے ہوئے دین کے تصوّرات کو سمجھنے کی کوشش کریں اس باب میں جتنی حقیر سی کوشش طلوع اسلام کر سکتا ہے۔ وہ اس سے کبھی دریغ نہیں کرے گا۔ کیونکہ اسکا حقیقی مخاطب طبقہ نوجوانوں ہی کا گروہ ہے۔ (۱۹۵۳ء)

مکرر

یہ خط آج سے بارہ تیرہ سال پہلے کا ہے۔ اس دوران میں طلوع اسلام اپنی اس کوشش میں برابر مصروف رہا کہ قوم کے سامنے اسلام کے صحیح نظام کو پیش کرے اور نوجوان تعلیم یافتہ طبقہ کو بتائے کہ پاکستان کی آیڈیالوجی کیا ہے اور کس طرح وہ نظام ہماری (اور نوع انسانی) کی مشکلات کا حل اپنے اندر رکھتا ہے۔ جسے قرآن کریم نے پیش کیا تھا۔ اس کے ساتھ ہی ہم ارباب اقتدار کی توجہ اس بنیادی حقیقت کی طرف مبذول کراتے رہے کہ جب تک ہمارے نظام تعلیم کو بدلا نہیں جائیگا قوم کا قدم اصلاح کی طرف نہیں اٹھ سکے گا۔ اس لیے کہ آج کے نوجوان ہی کل کی قوم ہوتے ہیں۔ جب آپ ان نوجوانوں کے قلب و دماغ کی تربیت صحیح خطوط پر نہیں کرتے تو قوم کا قدم کسطرح صحیح خطوط کے مطابق اٹھے گا۔ لیکن افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ اس طرف کوئی توجہ نہ دی گئی۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قوم کا نیا طبقہ پورے طور پر فکر و نظر کی پریشانی کا شکار ہے۔ جس کے مظاہرے آئے دن کے خلفشار سے ہوتے رہتے ہیں۔ اس خلفشار کے خلاف (وہ جب بھی رونما ہوتا ہے) ہنگامی اقدامات کئے جاتے ہیں۔ جن سے یہ مرض صرف دب جاتا ہے۔ اس کا ازالہ نہیں

ہوتا۔ بلکہ وہ پہلے سے زیادہ گہرائی تک پہنچ جاتا ہے۔ یاد رکھئے! اس کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ اپنے نظام تعلیم کو کلیتہً بدل دیں اور اس کی جگہ ایسا نظام رائج کریں جس میں طالب علموں کو بتایا جائے کہ انسانی زندگی کا مقصد کیا ہے۔ وہ تعلیم کیوں حاصل کر رہے ہیں۔ اس تعلیم کا قرآن کی پیش کردہ مستقل اقدار سے کیا تعلق ہے۔ ان اقدار کی روشنی میں اس تعلیم کے ماحصل کو کس طرح نوعِ انسان کی بہبود کے لیے صرف کیا جائے گا۔ انسان، پاکستانی اور مسلمان ہونے کی حیثیت سے ان پر کیا ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ اسلامی نظام کیا ہے اور وہ کس طرح نافذ کیا جاتا ہے۔ اس کے انسانیت ساز نتائج کیا ہیں وغیرہ وغیرہ۔ جب تک اس قسم کا نظام تعلیم رائج نہیں کیا جائے گا ہمارے نوجوانوں کا قلبی اضطراب اور ذہنی خلفشار بڑھتا جائے گا۔ خدا کرے کہ قوم کا سنجیدہ طبقہ اس طرف توجہ کرے۔

(۱۹۶۵ء)